پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد ۱ | ستمبر ۱۹۳۶ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل

انگریزی زبان میں ایک مثل مشہور ہے: "قمچی کا دھیان اور لڑکے کا مارنا"۔ یورپ کے مدرسین اس کلیے پر ایک مدت تک عمل پیرا رہے اور ہندوستان میں آج بھی بیشتر مدرسین اس ... سمجھتے ہیں۔ البتہ، نئی روشنی کے مدرسین اس پیناک ... ے ہیں اور یوں مدر... دو حریف نظر پڑتے ہیں: ایک جسمانی سزا کا قائل و حامی۔ دوسرا اس سے برگشتہ اور نشاکی۔ فریقین دلائل پیش کرتے ہیں، تو پہلا یوں گویا ہوتا ہے:

"جناب بچے اور شیطان میں ایک جزو مشترک ہے، اور لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ آپ ذرا ایک جماعت کو پڑھائیں، دو چار روز میں خود حقیقت حال آشکار ہو جائیگی۔ آپ مغز کھپا رہے ہیں اور بھو رام سو رہا ہے۔ آپ حساب کا نیا قاعدہ سمجھا رہے ہیں اور عزیز حسن پرکار چبھو چبھو کر اپنے پاس بیٹھنے والے کو عا... تا ہے۔ آپ بار بار کہتے ہیں۔ لڑکو سنو یہ قاعدہ ضروری ہے اور یہ بات دلچسپ ہے۔ وہ ذرا سی جھرجھری لیتے ہیں اور سیدھے ہو بیٹھتے ہیں، لیکن دم بھر میں پھر اس مستعدی کا اعلان تجدید شرارت سے ہوتا ہے، لیکن ایک دو چپت لگا دیجیے، ایک آدھ بیت جھاڑ دیجیے بس پھر سب متوجہ نظر آئینگے" فریق مخالف اس دعوے کے بطلان میں سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے: "جی بجا ارشاد ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ اب متوجہ ہو گئے مطلق نہیں۔ صرف جو فروشی اور گندم نمائی شروع ہو گئی۔ ظاہرا ہمہ تن توجہ اور اصل میں ان بچوں کے دل اور دماغ بھوت کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بدرجہ مجبوری اپنے اوپر جبر کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ گھنٹی بجی اور اس

؎ (SPARE THE ROD AND SPOIL THE CHILD)

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہیلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴/۱۱ پائی	۱۹	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ دوم	۸/۱۱ پائی
			۲۰	〃 〃 〃 حصہ سوم	۷/
۲	〃 دوسری 〃	〃 ۱/۶	۲۱	کام کی باتیں حصہ اول	〃 ۹/۳
۳	〃 تیسری 〃	〃۶/۷	۲۲	〃 〃 〃 دوم	〃 ۲/۳
۴	پیاری کہانیاں اول	۶/	۲۳	قصص ہند حصہ اول	〃 ۳/۲
۵	〃 〃 دوم	۵/	۲۴	〃 〃 〃 دوم	〃 ۲/۸
۶	〃 〃 سوم	۷/	۲۵	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱/
۷	میٹھی کہانیاں اول	۲/	۲۶	حسینہ اور وحشی	۱/۵ پائی
۸	〃 〃 دوم	۳/۷ پائی	۲۷	شہزادہ مہربان	〃 ۶/۲
۹	〃 〃 سوم	〃۱۱/۳	۲۸	راما سیتا	〃 ۱۱/۱
۱۰	〃 〃 چہارم	زیر طبع	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر لیلا رام	۳/
۱۱	〃 〃 پنجم		۳۰	دروپدی	۱/۸ پائی
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲/۹ پائی	۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ	〃 ۶/۴
۱۳	〃 〃 نمبر ۲	〃۱۰/۳	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید	۴/
۱۴	〃 〃 نمبر ۳	〃 ۳/۵	۳۳	راجہ اشوک	۵/
۱۵	انوار سہیلی کے انمول موتی	〃۸/۲	۳۴	مہارانا پرتاپ . . .	۲/۱ پائی
	〃 حصہ ۱ 〃 〃		۳۵	شہاب الدین شاہجہان	〃 ۱۰/۲
۱۶	〃 حصہ ۲ 〃 〃	〃۱۰/۴	۳۶	شیر شاہ سوری . . .	〃 ۱۱/۲
۱۷	〃 حصہ ۳ 〃 〃	〃۲/۵	۳۷	نصیر الدین ہمایوں . .	〃۱۰/۲
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اول	〃 ۷/۷	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر	〃 ۳/۲

انقباضِ دماغی کا آپ کو ثبوت ملا۔ لڑکے اٹھ اٹھ کر ایسے بھاگے جیسے قیدی رہا ہوا ہو"

فریقِ اول کہتا ہے: "جناب ماسٹر صاحب ہم بھی ٹریننگ کالج میں پڑھ چکے ہیں دریات میں ہم نے بھی بہت کچھ پڑھا ہے۔ جب کالج سے نئے نئے نکلے تھے تو ہمارے دل میں بھی یہی خیالات تھے، مگر اب مدرسی کرتے کچھ سال گزر گئے ہیں۔ اب ہم ٹریننگ کالج میں حاصل کردہ اصولِ تعلیم کو شک اور شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم ہی کیا ہمارے پرانے ہم پیشہ دوست بھی ہم سے متفق الخیال ہیں اور کہتے ہیں کہ واقعی لڑکے قمچی کے یار ہیں۔ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ سزا ضروری ہے، لیکن (پاسِ وضع کے باعث کہتے ہیں) ہم یہ مانتے ہیں کہ قصائی پن اور سزا و تادیب میں فرق ہے۔"

چونکہ دونوں فریقوں کا عقیدہ ہی یہ ہوتا ہے اور تصنع سے نہیں خلوص دل سے یہ دلائل پیش کرتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جماعتوں کے دعوے کا تجربہ کیا جائے تاکہ اصلیت کھلے۔

ہر ایک جماعت میں تین طرح کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اول: وہ، جو ہوشیار اور محنتی ہوتے ہیں، کام میں جی لگاتے ہیں اور ذہن رسا بھی ان کا معاون ہوتا ہے۔ یہ ہر جماعت میں پہلے، دوسرے یا ایسے ہی ممتاز درجے پر رکھے جاتے ہیں۔

دوسرے: وہ، جو حتی المقدور کام کاج بھی کرتے ہیں، سوچ بچار بھی۔ کاغذ کتاب سے تھوڑا بہت دل لگائے رکھتے ہیں اور بھلے بُرے پاس بھی ہو جاتے ہیں، یعنی، یہ جماعت کا متوسط طبقہ ہیں۔ استاد کو ان سے نہ کوئی شکایت، نہ کچھ فریفتگی۔

تیسرے: وہ، جو جماعت میں ایسی ہی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جیسے سماج میں باغی۔ کتاب انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، لکھنے پڑھنے سے دل گھبراتا ہے، معمولی نوشت و

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۳۹	نورالدین جہانگیر . . .	۲؍۳ پائی	۶۵	بہادر شہزادہ	۲؍۱ پائی
۴۰	شہاب الدین غوری . . .	۲؍۹ 〃	۶۶	نیلا باز	۲؍۱۱ 〃
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی . . .	۲؍۱۱ 〃	۶۷	جوتی موتی	۲؍۱۰ 〃
۴۲	فیروزالدین تغلق . . .	۳؍	۶۸	جواہرات کا خزانہ . . .	۳؍۷ 〃
۴۳	امیر تیمور	۲؍۷ 〃	۶۹	چھوا اور سونا ہوا باتصویر	۲؍۱۰ 〃
۴۴	پرتھوی راج	۲؍۸ 〃	۷۰	علی بابا چالیس چور	۴؍
۴۵	محمود غزنوی	۲؍۶ 〃	۷۱	علاؤ الدین و عجیب وغریب لیمپ	۲؍۶ پائی
۴۶	مصر کی داستان . . .	۳؍			
۴۷	جاپان کی کہانی	۴؍	۷۲	ملّادو پیازے کا سفر . .	۳؍
۴۸	چین کی کہانی	۳؍۶ 〃	۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳؍
۴۹	مستورات چین و جاپان . .	۴؍			
۵۰	ایران کی کہانی . . .	۲؍	۷۴	نیشاپور کا سوداگر	۲؍۱۱ پائی
۵۱	ایشیائی روم	۲؍۷ پائی	۷۵	پرستان کا موچی . . .	۳؍
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲؍۹ 〃	۷۶	سندر پیاری	۳؍
۵۳	لنکا	۱؍۱۱ 〃	۷۷	چاندی کی کنجی	۳؍
۵۴	بصرہ و بغداد	۵؍	۷۸	سلک جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گر)	۲؍۶ پائی
۵۵	یونان	۲؍	۷۹	〃 〃 نمبر۲ (اوج و پستی)	۱؍۱۱ 〃
۵۶	تین سوال	۲؍۷ پائی	۸۰	〃 〃 نمبر۳ (شہید الفت)	۱؍۶ 〃
۵۷	امرت ورشا	۳؍۱۰ 〃	۸۱	سلک جواہر مرد میدان	۱؍۶ 〃
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۲؍۶ 〃	۸۲	〃 〃 نیک و بد	۱؍۹ 〃
			۸۳	〃 〃 عیب و ہنر	۱؍۴ 〃
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳؍۹ 〃	۸۴	〃 〃 جہاں گرد	۱؍۶ 〃
			۸۵	〃 〃 جواب باصواب	۱؍۱۰ 〃
۶۰	〃 〃 دوم	۴؍۵ 〃	۸۶	〃 〃 سخاوت کی انتہا	۱؍۲ 〃
۶۱	خوفناک خواب	۲؍	۸۷	〃 〃 حسن تدبیر	۱؍۶ 〃
۶۲	ہیرا لال	۲؍۶ 〃	۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت . .	۱؍۳ پائی
۶۳	دولت کی پٹاری	۲؍۱ 〃			
۶۴	سادھو کی چکی	۲؍	۸۹	ڈرامہ غمخوار عالم . . .	۱؍۷ پائی

خواند بھی انھیں عذاب معلوم ہوتی ہے۔ مجبوراً بیگار پوری کرتے ہیں، لیکن ان کے دماغ مدرس کے "لقمہائے علم" سے الٹتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ آتا جاتا نہیں اور وہ اس کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

پہلا اکثر سزا سے مامون رہتا ہے، دوسرا کبھی کبھی مدرس کے غصے کی جھپٹ میں آ جاتا ہے اور تیسرا طبقہ تو ہر وقت دارو گیر ہی میں پھنسا رہتا ہے۔ بیکاری کا شغل شیطان سے یاری ہے۔ جب جماعت میں بیکار ہی بیٹھتے ہیں، تو شیطان سے یاری لامحالہ ہو جاتی ہے۔ جماعت کے رحمٰن یعنی مدرس اور ان طلبہ کے شیطان یعنی بدشوقی میں علیؑ کافر کا بیر ہے؛ اس لیے سزا اور تادیب کے لیے مدرس کا تختۂ مشق ہی آخر الذکر جماعت ہوتی ہے۔ مدرس کے لیے ہر طالب علم کی فرداً فرداً تدریس تو ممکن ہی نہیں۔ جماعت کو پڑھاتے ہوئے متوسط طبقہ ہی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ ہوشیار لڑکے تدریس میں صرف اس قدر ہی دلچسپی لیتے ہیں جتنی آموختے میں مگر غبی، کمزور اور پچھڑے ہوئے لڑکے اس میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتے۔ تجربہ کار اور موقع شناس مدرس ہر چند کہ متوسط طبقے پر اپنی توجہ جمائے رہتا ہے، لیکن گاہ گاہ ہوشیار لڑکوں کو بھی گدگدا دیتا ہے اور اکثر نکات ان کی دلچسپی کے بھی پیش کرتا ہے۔ مگر کمزور اور غبی لڑکوں سے بالعموم بہت کم دماغی تعلق رکھتا ہے۔ مدرس کو کیا کرنا چاہیے اس قدر گہرا اور پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اس پر شرح و بسط سے کچھ کہنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اچھے مدارس میں، جہاں سالانہ ترقی کے وقت سفارش کارگر نہیں ہوتی یہ دقت خود بخود بہت حد تک رفع ہو جاتی ہے اور متعدد طریقے ایسے ہیں، جن کی بدولت اس تفاوتِ دماغی کو کم کیا جا سکتا ہے اور جس قدر یہ کم ہوتا جاتا ہے اسی قدر سزا اور زدوکوب کی ضرورت بھی کم ہوتی جاتی ہے، لیکن ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔ اس لیے کچھ نہ کچھ سزا کی "ضرورت" باقی رہ جاتی ہے،

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت	۱/۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۲/۴ 〃
۹۲	〃 〃 〃 دوم	۲/۴ 〃
۹۳	〃 〃 〃 سوم	۲/۷ 〃
۹۴	جو مانگو	۳/
۹۵	اسرارِ دل	۵/
۹۶	جارج واشنگٹن . . .	۱/۶ پائی
۹۷	سکاؤٹوں کا بادشاہ . .	۱/۸ 〃
۹۸	لوہے کا بادشاہ . . .	۱/۶ 〃
۹۹	صابن کا بادشاہ . . .	۱/۱ 〃
۱۰۰	آزادی کا بادشاہ . . .	۱/۱۱ 〃
۱۰۱	ڈاکو کی مرّت	۲/۶ 〃
۱۰۲	چھومنتر	۴/۵ 〃
۱۰۳	فرصت کے کام . . .	۳/۴ 〃
۱۰۴	دنیا کے کام کاج . . .	۵/۵ 〃
۱۰۵	آداب و اخلاق . . .	۱۰/
۱۰۶	موقعہ	۵/۴ 〃
۱۰۷	نیک اطوار	۲/
۱۰۸	خوشی کا کھیل	۳/۱۰ 〃
۱۰۹	بہادر محمود	۱/۷ 〃
۱۱۰	سہراب و رستم . .	۲/۱ 〃
۱۱۱	دھوپ چھاؤں . . .	۳/
۱۱۲	راجہ ہرنبس چندر . .	۲/
۱۱۳	سنہری پرندہ	۲/۱ پائی
۱۱۴	گورو کے پانچ بچپن . . .	۱/۸ 〃
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن . . .	۱/۴ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	
۱۱۶	تبدیل قسمت	۱/۹ پاؤ
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳/
۱۱۸	راجہ گوپی چند . . .	۱/۷ 〃
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری . .	۱/۶ 〃
۱۲۰	بارہ بھائی	۱/۱۰ 〃
۱۲۱	مشاہیرِ عالم حصہ اوّل	۳/
۱۲۲	〃 〃 〃 دوم	۳/
۱۲۳	〃 〃 〃 سوم	۳/

کتب لائبریری

برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

۱	رسوم ہند حصہ اوّل	۶/۲ پائی
۲	〃 〃 دوم	۷/۴ 〃
۳	تخت سلیمانی	۸/۷ 〃
۴	الہ دین چراغ . . .	۴/۶ 〃
۵	رامائن کی کہانی . . .	۸/۲ 〃
۶	مہابھارت کی کہانی . . .	۵/۶ 〃
۷	پیارا گورو نانک . . .	۳/۷ 〃
۸	سیّد انشاء اللہ خاں انشا .	۴/۱ 〃
۹	سوانحعمری نواب مرزا خان داغ . .	۴/۲ 〃
۱۱	〃 نذلہ . . .	۳/۶ 〃
〃	میر درد . . .	۳/۴ 〃
〃	میر تقی . . .	۵/۵ 〃
〃	شبلی . . .	۴/۴ 〃
〃	مولانا نذیر احمد مرحوم	۳/۸ 〃

اورعام مدرس اسی ضرورت کے ماتحت مار پیٹ سے باز نہیں آتا۔

اس سزا او رتادیب کا مقصد کیا ہے؟

اولاً تو یوں سمجھیے کہ آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ جل گیا۔ آپ نے ربڑ کی گیند زمین پر ماری اور وہ اچھل گئی یعنی ، ہر عمل کے بعد ردعمل ہُوا۔ لڑکے نے کوئی حرکت خلاف آداب تدریس و تعلیم کی اور آپ نے اسے سزا دے دی۔ یہ نقطۂ خیال مدرسین کے شایانِ شان نہیں۔ اس میں جذبۂ انتقام کار فرما نظر آتا ہے اور مدرس منتقم نہیں۔ وہ تو مصلح اور دوست ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مدرسین اس اصول کے ماتحت طلبہ کو ہرگز سزا نہیں دے سکتے۔

ثانیاً : سزا کا مقصد تادیب ہو سکتا ہے ، یعنی ، ایک لڑکے نے کوئی ناشائستہ حرکت کی۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ ناشائستہ حرکت آپ کی موجودگی میں دوبارہ نہ ہو۔ آپ نے لڑکے کو سزا دے دی اور قصہ ختم کیا۔ مثال میں "انگلستان کے ایک مشہور جج کا ایک فیصلہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ اس جج کی عدالت میں ایک ایسا شخص پیش ہُوا جس نے مختلف لوگوں کی بھیڑیں چرائی تھیں۔ جج نے اسے قید کی سزا دی اور کہا کہ تمھیں اس لیے سزا نہیں دی جا رہی ہے کہ تم نے بھیڑیں چرائی ہیں ، بلکہ اس لیے کہ بھیڑیں نہ چرائی جائیں۔ اس فیصلے سے یہ ظاہر ہے کہ بھیڑ کی حفاظت مقصود تھی نہ کہ مجرم کی اصلاح۔ اب ظاہر ہے کہ سزا کا یہ اصول بھی مدرسین کے لیے قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتا۔

آپ لڑکے کی توجہ مار پیٹ سے حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اصول و قواعد اور ہیں اور اُن کی رو سے سزا کی اجازت نہیں۔ سزا تو صرف "اخلاقی" اصلاح کے لیے ہی جائز قرار دی جا سکتی ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب اور ذرایع سے کامیابی ممکن نہ ہو۔ اس تمام بحث سے سزا پر ایک معمولی سی روشنی پڑ گئی ہے اور اب یہ ممکن ہے کہ اس اجمال سے

آ

رس اپنے علم اور تجربے کی بنا پر ایک مفصل بحث مرتب کرلے جو سزا کے اہم مسئلے پر اس کی
بت کر سکے اور خود ہی یہ فیصلہ بھی کرسکے کہ سزا کب، کس طرح اور کیونکر دی جائے اور اس
ہیں و تعلیم کے سلسلے میں یہ ناگوار فرض کس طرح اپنی کرختی کی آلودگی سے پاک کیا جاسکتا

ہے۔

عورتوں کی تعلیمِ اُردو

خادم محی الدین صاحب، ایم ای ڈی، لکچرار گورنمنٹ کالج، لائل پور۔

ہندوستان کے مُسلم حلقوں میں بالعموم اور پنجاب اور صوبجاتِ متحدہ میں بالخصوص اُردو ذریعۂ تعلیم چلی آتی ہے۔ عورتوں میں اُردو کی تعلیم پر ہم ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس وقت اردو ہندوستان کے مسلم گھرانوں میں بخوبی رائج ہو چکی ہے اور ادبی لحاظ سے بھی نمایاں ترقی کر چکی ہے۔ عورت کا حلقۂ کار ہمارے ملک میں بالخصوص گھر کے دائرے ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہماری عورتیں معلمی اور ڈاکٹری کے سوا زندگی کے دوسرے کاروبار او پیشوں میں بہت کم حصہ لیتی ہیں۔ برخلاف اس کے مغربی دنیا میں عورتیں محرری، دکانداری، تار گھر، پولیس اور مختلف شعبوں میں مردوں کے ساتھ شریکِ کار ہیں۔ انگلستان میں بہت سی لڑکیاں بعض مخصوص پیشوں میں اپنی پسند کے بموجب حصہ لیتی ہیں، کیونکہ ان کے خیال کے بموجب وہ اس طریق سے خود مختاری اور خود اعتمادی حاصل کر سکتی ہیں۔ ان کی دلچسپیوں کا حلقہ، ہندوستانی عورتوں کے مقابلے میں، زیادہ وسیع ہے۔ انگلستان جیسے ملک میں ان کو آزادی، تعلیم اور مردوں کے ساتھ زندگی کے تمام کاموں میں مساوات جیسی نعمتیں میسر ہیں، لیکن ستر فی صدی حالتوں میں انگریز لڑکیاں کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں جس سے آمدنی ہو سکے۔ چونکہ ملک میں زندگی کا معیار بلند ہے اور سامانِ زیست مہیا کرنے کے لیے اقتصادی اور صنعتی کشمکش نہایت سخت، اس لیے گھر کا ہر فرد بشر، عورت ہو یا مرد، مجبور ہے کہ کچھ نہ کچھ روپیہ پیدا کرے۔ برخلاف

اس کے ہندوستان میں عورت کے عزیزو اقارب اس کی ضروریات مہیا کرتے ہیں اور اگر بدقسمتی سے عورت کے تمام رشتے دار اُسے اکیلا چھوڑ کر مر جائیں، تو وہ دوبارہ شادی کرنے پر مجبور رہوتی ہے تا کہ روزی کا سامان حاصل کر سکے۔ ہندوستان میں ہم اس بات پر مجبور نہیں کہ عورت پر خود روزی کمانے کا بار ڈالیں، اسی وجہ سے عورت کا کام زیادہ تر خانہ داری تک ہی محدود رہتا ہے۔

پس عورت کو تعلیم دینے کے لیے ہماری تمام کوشش اسی امر پر صرف ہونی چاہیے کہ عورتوں کو خانہ داری کی تربیت دلائیں، یعنی بحیثیت لڑکی، بیوی اور ماں اُسے گھر کے فرائض سے آگاہ کریں۔ اس حقیقت کا احساس انگلستان جیسے ملک میں بھی کیا گیا ہے، جہاں عورت پردے کی قیود سے آزاد ہے اور مرد کے ساتھ مختلف مشاغل میں حصہ لیتی ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت کا سب سے پہلا کام بچوں کو بولنا سکھانا ہے۔ ہر انسان کی سب سے پہلی معلّمہ عورت ہی ہے اور وہی بچوں کو دایہ خانے (نرسری) اور کنڈر گارٹن کی منازل میں تعلیم دیتی ہے۔ ایمرسن نے کہا ہے: "دنیا میں درس تدریس عورت ہی کے حصے میں آئی ہے اگر عورت زبان دانی کی تعلیم کی بنیاد مناسب طور پر رکھ سکے تو باقی ماندہ مدارج میں بچوں کی تعلیم خود بخود روبہ ترقی ہونے لگے گی۔" یہ نہایت ضروری ہے کہ پانچ سے دس سال تک کی عمر کے بچے زبان دانی کی تعلیم گھر ہی میں جاری رکھیں۔ پس ہمارے ملک میں ضرورت اس بات کی ہے کہ عورت کو اردو زبان کی پوری پوری تعلیم دی جائے۔

عورت کو اردو کی تعلیم دینے کے مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کرنا چاہیے: اول زبان دانی کی عام تعلیم، دوسرے زنانہ مدارس میں لڑکیوں کی مخصوص اردو تعلیم۔

اوّل الذکر صورت میں ہمارا طرزِ عمل گھر کے اندر رہنے والی پردہ دار عورتوں کی ضروریاتِ تعلیم کے مطابق ہونا چاہیے۔ آخر الذکر صورت میں ہمیں استانیوں کی تربیت اور ان لڑکیوں کی ضروریاتِ تعلیم پر غور کرنا چاہیے جنھیں اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہو۔ اردو کی عام تربیت

کا مسئلہ جس کا تعلق پردہ دار گھروں کے ساتھ ہے، دراصل بالغ عورتوں کی تعلیم سے تعلق رکھتا ہے اور یہ تعلیم بالغان کی ایک شاخ ہے۔ پنجاب اور دوسرے صوبوں میں ہندو عورتیں زنانہ مدارس میں تعلیم کا بیشتر فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اسی طرح بعض اور درسگاہوں مثلاً مدارس بالغان، یا دستکاری کے اسکولوں میں ہندو بیوہ اور دوسری عورتیں خانہ داری سے فراغت پا کر کوئی فن سیکھ سکتی ہیں، لیکن چونکہ مسلم عورتیں پردہ دار ہیں، لہٰذا وہ ان چیزوں سے اُس حد تک بہرہ اندوز نہیں ہو سکتیں۔ پس ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ان کے لیے تربیت یافتہ استانیاں مہیا کی جائیں۔ اس قسم کی اُستانیاں نسبتاً کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم زنانہ مدارس اس دوڑ میں ابھی بہت پیچھے ہیں اور اسی سبب سے ان کی تعلیم بھی ادھوری ہے۔ نہ فقط مسلمانوں بلکہ دوسری قوموں میں بھی ابھی مخلوط تعلیم تمام مدارج میں جاری نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے استاد لڑکیوں کو نہیں پڑھا سکتے۔ پس ان حالات میں اس مسئلے کی خاص مشکل مسلم بالغ عورتوں کی تعلیم ہے۔

اردو میں عورت کی عام تربیت بعض بیرونی ذرائع سے کی جاتی ہے مثلاً: شیرخوار بچوں کی بہبودی کی تحریک، جسے لیڈی چیمسفورڈ نے جاری کیا تھا اور بعد ازاں لیڈی ریڈنگ اور لیڈی ارون نے اس کی تکمیل کی۔ اسی طرح بچوں کی صحت کا ہفتہ، دستکاری کی نمائش اور اسی قسم کے سوشل مشغلے ہیں۔ جن میں بعض سوسائٹیوں کے زنانہ شعبے حصہ لیتے ہیں۔ ان مشاغل میں ضرورت ہے کہ بچوں کے رکھ رکھاؤ، بیمار کی غور و پرداخت اور عورتوں کے مختلف کاموں کے متعلق آسان اردو میں لکچر دیے جائیں۔ اس قسم کے تعلیمی کام میں یہ مقصد پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ عورت کی قوتِ گویائی میں ترقی ہو۔ اردو کی ابتدائی تعلیم کے متعلق گراموفون کے مختلف ریکارڈ اور ریڈیو کے لکچر خاص طور پر تیار کرانے چاہییں، جنھیں انجمن ترقی اردو کی زیرِ نگرانی تیار کیا جا سکتا ہے۔ ان ریکارڈوں کے ساتھ مطبوعہ کتابیں یا پمفلٹ ہونے چاہییں، جس طرح لنڈن کی لنگوافون

انسٹیٹیوٹ مختلف زبانوں مثلاً فرانسیسی، جرمن، اسپرانٹو، اطالوی اور روسی وغیرہ کے ریکارڈ تیار کرکے ٹیکسٹ یعنی درسی کتب کے ہمراہ فروخت کرتی ہے۔ زبان دانی کی یہ کل دارامداد ہمارے خوش حال مسلم گھروں میں ایک بیش بہا اور دلچسپ چیز ثابت ہو رہی ہے۔ اگر یہ ریکارڈ اہل زبان کی گفتگو سے بنائے جائیں تو ان کے سننے سے پنجابی عورتوں کے تلفظ اور گویائی میں ترقی ہوگی۔ عورت قدرتی طور پر قصہ گو واقع ہوئی ہے۔ ریڈیو اور گراموفون کے ذریعے دلچسپ قصے گھروں میں پیش کیے جا سکتے ہیں اور ان کی مدد سے بچوں کو قصہ گوئی بھی سکھائی جا سکتی ہے۔ اس مشین کی امداد کے علاوہ گھروں میں ہر عمر کی لڑکیوں اور عورتوں کے واسطے ان کے ماں باپ، بہن بھائی اور خاوند کو اردو افسانوں کا کافی ذخیرہ مہیا کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ قصے اور بعض اچھی نظمیں اور اسلامی حکایات لڑکیوں کو حفظ یاد کرانی چاہییں۔ اس ذریعے سے عورت کی تقریر میں ترقی ہوگی، اس لیے کہ قدرت نے عورت کو صاف اور شستہ گفتگو کرنے کی قابلیت عطا کی ہے۔ ایک ماہر تعلیم کی رائے ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں ہر زبان جلدی سیکھ سکتی ہے، کیونکہ اس کی گویائی کے اعضا زیادہ لچک دار ہوتے ہیں۔ بولنے اور پڑھنے کے علاوہ یہی مواد جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے، ریڈیو یا گراموفون سے سن کر یا کتاب سے پڑھ کر لکھایا بھی جا سکتا ہے۔

پڑھنے کے لیے لڑکیوں کے مناسب حال مضامین، خانہ داری اور عام واقفیت کے متعلق ہونے چاہییں۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا، سلائی کا کام اور حفظان صحت وغیرہ کے علاوہ فی زماننا عورتوں کے مخصوص رسائل ان کے لیے مہیا کرنے چاہییں۔ اس کے علاوہ اسی قسم کے گشتی کتب خانے جیسے بعض دیہات میں موجود ہیں، مختلف شہروں میں رائج کرنے چاہییں۔ بعض دلچسپ مقامات کی سیر، عملی جغرافیہ، تاریخ اور مطالعۂ قدرت کا جزو ہونا چاہیے۔ عورتوں کے لیے اردو کے خاص سلسلہ ہائے کتب تو پہلے ہی سے رائج ہیں، لیکن ان سب پر خانہ داری

یعنی، بیوی اور ماں ہونے کے فرائض کے لحاظ سے اور عورت کی ذاتی و مجلسی ضروریات اور فرائض کے نقطۂ خیال سے نظرثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلم عورتیں اپنی عیسائی اور ہندو بہنوں کے مقابلے میں تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ غنیمت ہے کہ اب مسلم لیڈیز کانفرنس جو ۱۹۲۳ء سے معرضِ وجود میں آئی، جابجا اپنے جلسوں کے ذریعے مسلم عورتوں کی عام آگاہی کا موجب ہے اسی قبیل کی اور زنانہ انجمنیں بھی وقتاً فوقتاً جلسے کرتی ہیں۔ یہ ایک ذریعہ ہے عام واقفیت اور علمی روشنی پھیلانے کا، لیکن اس قسم کی انجمنیں عموماً امیر خاتونوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور وہ مردانہ انجمنوں کی طرح وسیع حلقۂ اثر نہیں رکھتیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی انجمنوں کی سرکردہ اراکین اپنی جاہل اور غریب بہنوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے۔ عیسائی مشنریوں کی طرح ان کے گھروں میں جائیں اور تعلیم کا پیغام ان کو سنائیں۔ دیہات میں اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے، جیسا کہ مسٹر برین نے جابجا اس کی ترغیب دی ہے۔

زنانہ مدارس اور زنانہ کالجوں میں اردو کی تعلیم کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے تعلیم دہندگان کو لازم ہے کہ اردو کا کورس مرتب کرتے وقت لڑکوں اور لڑکیوں کے جسمانی اور نفسیاتی تفاوت کو بالخصوص ذہن میں رکھیں۔ لڑکیوں کے لیے ان کی مخصوص خانگی ضروریات کا لحاظ ضروری ہے۔ ہندوستان کے مذہبی اور معاشرتی حالات اسکول کے ثانوی حصے میں مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں دیتے۔ نوّے فی صدی حالتوں میں لڑکیاں شادی شدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لڑکیوں کا نصاب اردو مرتّب کرتے وقت ان کی زباندانی کے میلان کا لحاظ رکھنا چاہیے، کیونکہ لڑکیاں بالطبع علم ادب، السنہ، تاریخ، مضمون نویسی، قوتِ اظہار، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں لڑکوں پر فائق ہوتی ہیں۔ لڑکیوں کے پرائمری مدارس میں ان کا اردو نصاب

ب قریب وہی ہونا چاہیے جو لڑکوں کے لیے مخصوص ہے! البتہ گفتگو کے اسباق اور نظم خوانی پر
زور دینا چاہیے۔ جو لڑکیاں پرائمری مدارس سے ترقی پا کر اعلیٰ جماعتوں میں جائیں ان کا
ن دینا چاہیے اور کسی لڑکی کو پڑھائی میں کمزوری کی بنا پر فیل نہ کرنا چاہیے۔ بچیوں کو حوصلہ
ئی کی سخت ضرورت ہے۔ ان کی درسی کتب میں خانگی زندگی کے متعلق اسباق کا کافی ذخیرہ ہونا
ہیے۔ درجۂ ثانوی میں تعلیم کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ لڑکیوں کو ماں بننے کے فرائض سے آگاہ کیا
ئے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے خانگی ہائی جین، بچوں کا رکھ رکھاؤ اور خانہ داری کے
سباق ضروری ہیں۔ دیہاتی زنانہ مدارس میں ڈیری، مرغیاں پالنا، پھولوں کی کاشت، جنس
حفاظت وغیرہ ایسے مضامین داخل کر دینا چاہییں۔ زنانہ درسی کتب میں نظرِ ثانی کرنے
بعد اس کے ادبی مضامین میں تاریخی، اخلاقی اور سوانح عمری کے مواد کو داخل کرنے کی
ورت ہے ایسی کتب مثلاً، خواتینِ اسلام، تذکرۂ بہادرانِ اسلام وغیرہ کا مسلم زنانہ مدارس
رائج ہونا ضروری ہے۔ زمانۂ حال کے موجودہ مشہور مصنفین کی کتب کا مطالعہ کرانا چاہیے
س طرح تاریخِ ادبِ اُردو کے مختلف ادوار کو درجۂ ثانوی میں ذہن نشین کرانا چاہیے۔ اس
جے کی لڑکیوں کو ایسی نظمیں مثلاً: ماں کا خواب، تصویرِ مادر، (اقبال) مولانا حالی کی "چپ
داد" پڑھانی چاہییں۔ شوق قدوائی کی اعلیٰ نظم "عالمِ خیال" سے بڑھ کر اور کونسی نظم اس
ر کی لڑکیوں کے لیے ہو سکتی ہے، جن میں سے اکثر شادی شدہ یا شادی کے قریب ہیں۔
سلم لڑکیوں کے لیے علم ادب کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کی تعلیم بھی ازبس ضروری ہے۔
ن کے مطالعے میں حسن نظامی، راشد الخیری مرحوم اور ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کی تصانیف شامل
نی چاہییں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایسے مضامین پر انشا پردازی کرانی چاہیے، جن کا تعلق
انگی زندگی کے ساتھ ہو، مثلاً: والدین، بھائی بہن، استاد، عزیز و اقارب کے نام خطوط

لکھنا۔ مدرسے اور گھر کے روزانہ واقعات کا روز نامچہ لکھنا۔

مندرجۂ بالا کورس پرائمری اور درجۂ ثانوی میں ختم کرنا چاہیے۔ درجۂ ثانوی کے تیسرے سال میں فارسی کی تعلیم ضروری ہے۔ اردو اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے چونکہ اس درجے میں پہنچ کر اکثر لڑکیاں مڈل یا انٹرنس پاس کر کے تعلیم آسانی سے جاری نہیں رکھ سکتیں، اس لیے فارسی کی تعلیم لڑکی کی آخری تعلیمی منزل میں نہایت کارآمد ثابت ہو گی۔ درجہ ہائی سے پیشتر لڑکوں اور لڑکیوں کے کورس میں اختلاف رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہائی اسکول میں لڑکیوں کا اردو کورس قریب قریب وہی ہونا چاہیے جو لڑکوں کا ہے، البتہ مضمون نویسی میں شعر و شاعری داخل کرنا چاہیے، جیسا کہ انگریزی مدارس میں پایا جاتا ہے۔ نظم نویسی جواب مضمون کا جز ہونا چاہیے، اس لیے کہ ہندوستان کی گزشتہ اور موجودہ تاریخ میں بہت سی شاعرہ عورتوں کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً: میرا بائی، نور جہاں، زیب النسا، روپ متی، نواب شاہ جہاں بیگم شیریں، نواب شمس النسا، بیگم شرم وغیرہ۔ قواعد اردو میں علم عروض اور فصیح البیانی کے اصول کا مطالعہ کرانا چاہیے، اگرچہ یہ چیزیں امتحان میں داخل نہ کرنی چاہییں۔ اسی کے ساتھ لڑکیوں کے امتحان انٹرنس میں کسی ایک مصنف کی بیشتر تصانیف نصاب کا جز ہونی چاہییں۔ لڑکیوں کے انٹرنس کے امتحان کے لیے اردو کا مندرجۂ ذیل سلیبس تجویز کیا جاتا ہے:۔

عمر تیرہ تا چودہ سال پڑھنا: شرر، راشد یا نذیر احمد کے کسی مشہور ناول میں سے کسی باب کو پڑھ کر اس کا مطلب ادا کرنا۔

مضمون نویسی: مکالمہ، خطوط نویسی، پیراگراف یا جواب مضمون کا لکھنا۔

گرامر: نحوی ترکیب، کسی شعر کی تقطیع۔

عمر چودہ تا پندرہ سال۔ پڑھنا: پہلے سے قدرے مشکل۔

مضمون نویسی: نظم کا مطلب نثر میں ادا کرنا، افسانہ نویسی، نظم نویسی۔

گرامر: پہلے سے قدرے مشکل۔

درجۂ ایف اے میں پہنچ کر ایسی کتابیں پڑھانی چاہییں: مثلاً ابن الوقت (جو پہلے ہی سے رائج ہے)، مناجاتِ بیوہ، شکوۂ ہند، سرسید اور نذیر احمد کی مشکل تصانیف، رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کا انتخاب۔ کم وبیش اس قسم کا نصاب کورس میں پہلے ہی سے رائج ہے اور اس میں چنداں تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں۔

مندرجۂ بالا تجاویز اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ لڑکیوں کی اردو کی تعلیم میں زیادہ احتیاط اور غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر انگلستان میں انگریزی کی تعلیم میں لڑکیوں نے لڑکوں کے مقابلے میں امتیاز حاصل کیا ہے، تو اس کا باعث یہ ہے کہ وہاں زیادہ قابل اُستانیاں موجود ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہاں لڑکیوں کے مدارس میں اس مسئلے پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ اگر ہمیں ہندوستانی لڑکیوں کی زباندانی کی تعلیم میں کمی کرنے کی ضرورت لاحق ہے، تو وہ اس لیے کہ ان کے مشاغل کا حلقہ محدود ہے۔ پس ایسی حالت میں تعلیم کا معیار اور بھی بلند ہونا چاہیے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک ہمارے زنانہ مدارس میں اعلیٰ درجے کی اہلِ زبان ٹرینڈ استانیاں مہیا نہ کی جائیں۔ عورتوں کو بطور استانیوں کے نارمل اسکولوں اور ٹریننگ کالجوں میں داخل ہونے کے لیے خاص طور پر ترغیب دینے کی ضرورت ہے اور اس پر ویسی ہی محنت صرف ہونی چاہیے، جیسے ان کو تبلیغی کاموں اور دایہ گری کے لیے، طبی اور مذہبی درس گاہوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ پنجاب میں اس کام کی ابتدا ہو چکی ہے۔ گزشتہ دس بارہ سال کے دوران میں پنجاب

نے لڑکیوں کی تعلیم کے برخلاف تعصب کو مٹانے میں اولیں صف میں حصّہ لیا ہے اور لڑکیوں کی تعلیم کی موجودہ اور آئندہ ترقی سرکاری رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ حال ہی میں وزیر تعلیم پنجاب نے اعلان کیا تھا کہ زنانہ تعلیم پر اسّی ہزار روپیہ خرچ کیا جائیگا اور اس میں سے لڑکوں کو کچھ حصہ نہیں ملیگا۔ ہماری پنجابی عورتوں نے معلمی کے پیشے میں پورے زور کے ساتھ قدم اٹھایا ہے۔ بہت سی پنجابی لڑکیوں اور عورتوں نے مدرسی کی اسناد اور ڈگریاں حاصل کی ہیں اور بہت سی پنجابی عورتیں نارمل اسکولوں میں تربیت پا رہی ہیں۔ ان عورتوں میں عیسائی اور ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں پیش پیش ہے اور یہ ترقی نہایت تیزی سے جا رہی ہے۔ ان تمام کاموں میں عورت کی تربیت السنہ بیش از پیش درکار ہے اور استانیوں کی اردو کی تعلیم پر خاص توجہ کی اس لئے بھی ضرورت ہے۔ کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اسی مشترک ہندوستانی زبان میں مختلف فرائض انجام دیتے ہوئے، اظہارِ خیال کرتی ہیں اور کرینگی ۔

دوسری قسم کی خوراک

از

خان بہادر سید مقبول شاہ صاحب بی اے، آئی ای ایس (ریٹائرڈ)

(روغنیات (Fats) یعنی چکناہٹ)

روغنیات حرارت اور طاقت پیدا کرنے والی خوراک کی پہلی قسم ہے اور ان سے کاربن آب اور پروٹین کے مقابلے میں ۹ گنی سے بھی زیادہ طاقت اور حرارت پیدا ہوتی ہے، لیکن ان کی ہمیں زیادہ مقدار کی ضرورت نہیں ہوتی اور ان کا ہضم کرنا بھی مشکل ہے، جبتک کہ ان کے ساتھ بہت سا کاربن آب نہ کھایا جائے۔ جس طرح لکڑی کے بڑے بڑے کندوں کو جلانے کے لیے چھوٹی چھوٹی بہت سی لکڑیاں درکار ہوتی ہیں، اسی طرح ہمارے جسم میں روغنیات کے کارآمد ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان سے کئی گنی زیادہ کاربن آب خوراک استعمال کیجائے نیز جب تک ہمارے کھانے میں روح ۱، روح ب اور کچھ آیوڈین نہ پائی جائے، تب تک بھی روغنیات ٹھیک طور پر کارآمد نہیں ہوتے۔

روغنیات کی دو قسمیں ہیں؛ حیوانی اور نباتی۔ حیوانی روغن مکھن، گھی، چربی، دودھ، پنیر، بالائی، انڈوں کی زردی، مچھلی کے تیل، مچھلی کے گوشت، ہڈیوں کے گودے Marrow حیوانوں کے کلیجے اور چربی دار گوشت کے کھانے سے حاصل ہوتا ہے۔ بے چربی کے گوشت میں بھی پایا جاتا ہے، اگرچہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔ نباتی روغنیات میں سب نباتی تیل شامل ہیں مثلاً زیتون کا تیل، مونگ پھلی کا تیل، اخروٹ، بادام وغیرہ کا تیل، تل، سرسوں

وغیرہ کا تیل نباتی روغنیات میں ذلایتی گھی، یعنی، مارگرین اور کوکوجن بھی شامل ہیں۔ اگر پانی کی ملاوٹ نہ ہو تو نباتی اور حیوانی روغنیات غذا کے لحاظ سے برابر ہوتے ہیں، لیکن نباتی روغنیات میں یہ نقص ہوتا ہے کہ اگر تازہ تازہ بھی ہوں پھر بھی ان میں روح و بہت ہی کم ہوتی ہے اور ولایتی گھی میں تو بالکل ہوتی ہی نہیں گو یہ ہمارے بازاری گھی سے بہت صاف ستھرا ہوتا ہے۔ روح و ہمارے جسم کی پرورش اور تندرستی کے لیے اور ہم کو متعدی بیماریوں سے بچانے کے لیے نہایت ضروری ہے، اس لیے جن لوگوں کو دودھ، مکھن، گھی وغیرہ حیوانی روغنیات بالکل میسر نہ ہو سکیں اُن کو کم از کم ساگ اور زرد رنگ کی ترکاریاں مثلاً گاجریں اور ٹماٹو اور تازہ جمے ہوئے اناج ضرور کھانے چاہییں، تاکہ تھوڑی بہت روح و حاصل ہو جائے۔ جن لوگوں کی خوراک میں حیوانی روغنیات بالکل نہیں ہوتے، اُن کے پاؤں اور ٹانگیں سوج جاتی ہیں، کیونکہ اُن میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری ایسے لوگوں میں بہت عام ہوتی ہے جو محض نباتی روغنیات کھاتے ہوں۔

کیا اچھا ہوتا اگر ہمارے مُلک میں بھی اور مہذب ملکوں کی طرح، دودھ دینے والے جانوروں کی اچھی اچھی نسلیں پیدا کرنے کا عام رواج ہو جاتا، تاکہ سب لوگوں کو اچھی قسم کا دودھ، مکھن، گھی وغیرہ آسانی سے میسّر ہو سکتا۔ ہمارے ملک میں عام لوگوں کو نہ تو اچھی قسم کے جانور ہی رکھنے کا کچھ شوق ہے، نہ اُن کی پرورش کے لیے کوئی خاص انتظام کیا جاتا ہے۔ جب تک ان کی پرورش کے لیے ہر شہر اور ہر گاؤں میں اچھی اچھی چراگاہوں کا ٹھیک انتظام نہ کیا جائیگا تب تک نہ وہ اچھی طرح پرورش پائینگے، نہ اُن سے اچھی قسم کا دودھ، مکھن، گھی وغیرہ زیادہ حاصل ہو گا۔ ردی جانوروں کی پرورش میں بھی تقریباً اُتنا ہی خرچ آتا ہے، جتنا اچھی قسم کے جانوروں کی پرورش میں اور فائدہ

ن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نیز یہ بڑی غلطی ہے کہ ساری زمین کپاس، گنے، اناج،
یرہ کی کاشت ہی کے لیے رکھی جائے۔ جانوروں کی پرورش کے لیے عمدہ گھاس چارے
کوئی انتظام نہ کیا جائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جن جانوروں کا صرف خشک چارے
گذارہ ہو، اُن کے دودھ، مکھن وغیرہ میں روح (ا) بہت کم ہوتی ہے۔ جو دودھ اور گھی
میں گوالوں وغیرہ سے ملتا ہے، وہ بھی عموماً نہایت ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے، بلکہ
خالص دودھ اور گھی کا ملنا تو اب بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔

اسی طرح اگر مچھلی کا تیل بنانے کے لیے بھی بہت سے کارخانے ہمارے ملک
میں جاری ہو جاتے، تو اُس سے لوگوں کو روح (ا) اور روح (د) آسانی سے حاصل
ہو سکتی اور نباتی روغنیات استعمال کرنے والوں کو، جنھیں حیوانی روغنیات میسر نہیں
ہوتے، بہت فائدہ پہنچتا۔ شاید کچھ دنوں میں روح (ا) بھی، علاحدہ کی ہوئی، دوا کے طور
پہ بازاروں میں مل جایا کریگی۔ جیسے روح (د) اب ملتی ہے، پھر اُسے تیلوں میں ملا کر
استعمال کیا جائیگا تو تیل بہت مفید ہو جائینگے اور اُن کی کمی بہت حد تک رفع ہو جائیگی

روغنیات کے بہت سے فائدے ہیں: اوّل تو ان سے طاقت اور حرارت،
دیگر خوراکوں کی بہ نسبت زیادہ پیدا ہوتی ہے اور حیوانی روغنیات سے روح (ا) بھی حاصل
ہوتی ہے۔ دوسرے جتنی ہمارے جسم میں چربی ہو، اُتنا ہی ہم سردی سے محفوظ رہتے ہیں،
کیونکہ جسم کے اندر کی حرارت آسانی سے نہیں جاتی۔ پھر چربی سے ہمارا جسم بھی سڈول
رہتا ہے پھر یہ بھوک اور بیماری کے دنوں میں بھی ہمارے کام آتی ہے۔ مزید برآں اِس
سے ہمارے بعض نازک اعضا مثلاً گردے محفوظ اور رگ پٹھے چُست رہتے ہیں۔ تیسرے
اِس سے ہمارے معدے اور آنتوں کے اندر جو بڑا نازک مخمل جیسا استر ہوتا ہے، اُس کو

خوراک کے تیزاب وغیرہ سے نقصان نہیں پہنچتا۔ چوتھے، کیلسیم (چونا)، جو ہم مختلف خوراکوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور جو ہماری ہڈیوں اور دانتوں کے لیے نہایت ضروری ہے، وہ ہماری آنتوں میں روغنیات کی مدد کے بغیر جذب نہیں ہو سکتا۔ پانچویں، اس سے ہم جراثیم کے حملوں سے بہت کچھ محفوظ رہتے ہیں۔

ہماری عام نباتی خوراکوں میں بھی کچھ نہ کچھ چکناہٹ پائی جاتی ہے۔ مثلاً جو (Oats) باجرے اور جوار میں بہت سی چکناہٹ ہوتی ہے، گو میدے اور صاف کیے ہوئے سفید چاولوں میں بہت کم، ساگو اور ٹیپوکا میں ان سے بھی کم ہوتی ہے۔ سویا پھلی میں بھی چکناہٹ بہت ہوتی ہے، لیکن اور دالوں میں کم، پھر مٹر اور لوبیے میں تو بہت ہی کم ہوتی ہے۔ عام ساگ اور سرسوں وغیرہ کے ڈنٹھل دار ساگ میں، کرم کلے، ولایتی شلغم، بینگن، ہاتھی چک اور اسپرگیس میں بھی کچھ نہ کچھ چکناہٹ ہوتی ہے، لیکن اور ترکاریوں میں تو نام ہی کو ہوتی ہے۔ پھلوں میں بھی عام طور پر بہت ہی کم ہوتی ہے، البتہ زیتون اور اواکیڈو میں بکثرت ہوتی ہے۔ کھانڈ، قند، گڑ، شکر اور شہد میں چکناہٹ بالکل نہیں ہوتی۔

زیادہ چکناہٹ کھانے سے بدہضمی ہو جاتی ہے اور قبض بھی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اچھی طرح کارآمد نہ ہو جائے، تو اس سے بعض زہریلے مادے بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور ہمارے جسم کے اندر چربی جمع ہو کر جسم بہت موٹا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بڑی عمر میں روغنیات کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی، جتنی بچپن میں۔

کھانے کی چیزوں کو روغنیات میں تل کر کھانا اچھا نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے وہ دیر ہضم ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح سے روغن ان کے اندر گھس کر

ن کے چھوٹے چھوٹے ذروں کے گرد غلاف کی طرح لپٹ جاتا ہے، جس سے ہمارے ہاضمے کے رس اُس پر اچھی طرح عمل نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر ٹھنڈا مکھن یا گھی کھانے کے ساتھ کھایا جائے تو وہ خراب اثر پیدا نہیں کرتا، کیونکہ وہ ہاضمے کے عمل سے پہلے غذا کے اندر گھس کر اُس کے ذروں کے گرد نہیں لپٹ سکتا۔ سب سے اچھا روغن حیوانی روغنوں میں مکھن ہوتا ہے اور نباتی روغنوں میں پکے ہوئے زیتون کا تیل، کیونکہ اُن کی چکناہٹ ایسی حالت میں ہوتی ہے کہ اُس کے ذرے بالکل جُدا جُدا ہوتے ہیں اور ہمارے ہاضمے کے رس آسانی سے اُن پر اثر کر سکتے ہیں۔

ذیل کی ترتیب وار فہرست میں عام خوراکوں میں فی چھٹانک چکناہٹ کی مقدار درج کی جاتی ہے۔ جن خوراکوں میں چکناہٹ بہت کم ہوتی ہے۔ وہ اس فہرست میں درج نہیں کی گئیں۔

نمبر شمار	شے	فی چھٹانک چکناہٹ کی مقدار		
		تولہ	ماشہ	رتی
۱	مچھلی کا تیل	۴	۱۱	۳
۲	سب نباتی تیل	۴	۱۱	۳
۳	بناسپتی گھی	۴	۱۱	۳
۴	بھیڑ کی چربی	۴	۵	۰
۵	مکھن	۳	۱۰	۴
۶	گھی	۳	۱۰	۴
۷	اخروٹ	۳	۴	۰

نمبر شمار	شے	فی چھٹانک چکناہٹ کی مقدار		
		تولہ	ماشہ	رتی
۸	بادام	۲	۸	۰
۹	ناریل	۲	۵	۰
۱۰	مونگ پھلی	۱	۱۰	۰
۱۱	السی	۱	۷	۰

کاربن آب

کام والی خوراک کی دوسری بڑی قسم کاربن آب ہے۔ یہ ہماری خوراک کا سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے اور اس پر خرچ بھی سب سے کم آتا ہے۔ یہ نہ صرف طاقت اور حرارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے، بلکہ اس سے پروٹین اور روغنیات کے ہضم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے، بشرطیکہ بہت زیادہ نہ کھایا جائے۔ انسان کے جلد جلد بڑھنے کے زمانے میں بھی خوراک کے اور حصوں کی نسبت اسی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، لیکن ہمارے جسم کے اندر جاکر کاربن آب کے کارآمد ہونے کے لیے روح ب کا خوراک میں ہونا بہت ضروری ہے۔

اس کی دو بڑی قسمیں ہیں ایک نشاستہ جو ہمیں سب سے زیادہ اناجوں سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے مٹھاس یعنی گڑ، شکر، کھانڈ، شہد وغیرہ، جو گنّے اور پھل ترکاریوں سے حاصل ہوتی ہے۔ کاربن آب کی ایک قسم اور بھی ہے، یعنی نباتی خوراکوں کا ریشے دار ڈھانچہ جو اُن کے اندر باہر سب جگہ پھیلا ہوتا ہے اور اُن کے مختلف اجزا کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھتا

ہے، بلکہ نشاستے کے پردانے کے گرد بھی اس کا ایک غلاف ہوتا ہے اور جب تک وہ پکانے سے نرم ہو کر پھٹ نہ جائے نشاستہ ہضم نہیں ہو سکتا۔ اِس ڈھانچے کو حیوان تو ہضم کر لیتے ہیں اور اِس سے پرورش پاتے ہیں، لیکن انسان کے پیٹ میں عام طور پر ہضم نہیں ہوتا اور صرف آنتوں کو بھر کر اُن میں ایک خاص قسم کی لہروں والی حرکت (Paristabsis) پیدا کر دیتا ہے، جس سے خوراک کا فضلہ دمبدم آگے سرک کے آخر کو پاخانے کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نباتی ریشے دار ڈھانچہ ہماری خوراک میں ضرورت سے زیادہ ہو تو خوراک اچھی طرح جذب ہوئے بغیر ہی آگے سرک جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے جسم کی اچھی طرح پرورش نہیں ہوتی اور اِس سے ریح پیدا ہو جاتی ہے اور بدہضمی بھی ہو جاتی ہے۔ کاربن آب کی ایک اور قسم (Pectose) بھی ہوتی ہے، جو خاص طور پر پھلوں میں پائی جاتی ہے۔ اِس کے اُبالنے سے جیلی بن جاتی ہے، جو ایک نیم شفاف چپچپی سی چیز ہوتی ہے۔ یہ جام بنانے میں کام آتی ہے۔

کاربن آب سب سے زیادہ ہر قسم کی نباتی مٹھاس میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سفید کھانڈ میں خالص کاربن آب کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس سے کم کوئی ۷۰ فی صدی اناجوں میں پایا جاتا ہے، یعنی، چاول، گیہوں، مکئی وغیرہ میں، لیکن ٹیپوکا، ساگو اور اراروٹ میں اِن سے بھی زیادہ ہوتا ہے، یعنی، کوئی ۹۰ فی صدی۔ اناجوں کے بعد خشک پھلوں میں مٹھاس کی شکل میں اور اُن کے بعد سویا دال، مغزیات، بیج اور سکھائی ہوئی مٹر میں؛ لیکن مغزیات میں سے پیس نٹ میں تقریباً ۷۰ فی صدی ہوتا ہے۔ اِن سے بھی کم زمین کے اندر کی بعض ترکاریوں میں۔ مثلاً: آلو، لسن، انگریزی شلغم، پیاز، گاجر وغیرہ میں۔ تازہ پھلوں اور ساگ میں بہت کم ہوتا ہے، لیکن تازہ پھلوں میں سے کیلے، آلو بخارے،

آلوچے اور انگوروں میں کوئی ۲۰ فی صدی ہوتا ہے۔ گوشت اور انڈوں میں بالکل نہیں ہوتا۔ البتہ کلیجی، گردوں، مچھلیوں کے انڈوں، اور پنیر میں کچھ پایا جاتا ہے۔ دودھ میں کوئی بیسواں حصہ مٹھاس کی شکل (Lactose) میں ہوتا ہے۔ روغنیات، چائے اور کافی میں بالکل نہیں ہوتا۔

خوراک کے اور حصوں کی طرح کاربن آب حاصل کرنے کے لیے بھی ایک ہی قسم کی چیزیں کھانا اچھا نہیں۔ مثلاً اگر ہم اپنی روزانہ کاربن آب کی خوراک صرف سبزیوں اور پھلوں سے حاصل کرنا چاہیں، تو اتنی بھاری مقدار کھانی پڑیگی جس کو ہم ہرگز ہضم نہ کر سکینگے، کیونکہ ہمارا پیٹ مویشیوں جیسا نہیں۔ اگر محض مٹھاس ہی کھا کر حاصل کرنا چاہیں، تو اُس سے بھی نقصان پہنچیگا، کیونکہ یہ بڑی مقوی خوراک ہے اور زیادہ کھانا ٹھیک نہیں۔ اگر صرف دال مٹر اور مغزیات سے حاصل کرنا چاہیں تو ہمارے جسم میں پروٹین کی بہت زیادہ مقدار چلی جائیگی اور نقصان دیگی، اِس لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ مختلف غذائیں ملا جلا کر کھاتے رہیں تاکہ پروٹین، روغنیات، نمکیات اور غذائی رو میں بھی ساتھ ساتھ ٹھیک ٹھیک نسبت سے حاصل ہوتی رہیں۔ اِس طرح کاربن آب بھی اور خوراک کے اور حصے بھی اچھی طرح کارآمد ہو جائیں گے۔ یہی طریقہ خوراک کے اور حصوں کے حاصل کرنے میں بھی برتنا چاہیے۔

جس طرح انگریزوں میں عموماً بہت زیادہ گوشت کھانے سے کئی قسم کی تکلیفیں شروع ہو جاتی ہیں، اسی طرح ہمارے مُلک میں بھی کاربن آب بہت زیادہ کھانے سے مختلف قسم کی بیماریاں لگ جاتی ہیں، کیونکہ بہت زیادہ کاربن آب کھانے سے اس میں سے کچھ حصہ بغیر ہضم ہوئے آنتوں میں رہ جاتا ہے اور اس کے خمیر سے ریح اور خراش والے تیزاب

پیدا ہو جاتے ہیں، جس سے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ دست بھی لگ جاتے ہیں اور اس طرح پروٹین، نمکیات، غذائی روحیں بیشتر آنتوں میں جذب ہوئے بغیر ہی پاخانے کے ساتھ نکل جاتی ہیں۔ اِس سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے اور متعدی بیماریاں، مثلاً ہیضہ وغیرہ، جلد اثر کرتی ہیں۔ جو لوگ زیادہ کاربن آب کھاتے ہیں، وہ موٹے بھی بہت ہو جاتے ہیں اور اُن کے دانت بھی جلدی خراب ہو جاتے ہیں بہت مٹھائیاں اور چاول اور مٹھاس کھانے سے ذیابیطس کی بیماری بھی ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں میں جو ورزش نہیں کرتے اور جن کے دانت خراب ہوتے ہیں۔

امیروں اور مہذب قوموں میں سالم گیہوں کا آٹا استعمال کرنے کے بجائے کارخانوں کا تیار شدہ میدہ، جو دیکھنے میں بھی زیادہ اچھا ہوتا ہے اور جلد خراب بھی نہیں ہوتا، استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ میدے کی بنی ہوئی پکی پکائی ڈبل روٹی، بسکٹ، پیسٹری، مٹھائی وغیرہ خرید کر استعمال کی جاتی ہے، جس میں پکانے وغیرہ کی تکلیف نہیں کرنی پڑتی، لیکن جب بڑے بڑے کارخانوں میں میدہ تیار کیا جاتا ہے، تو گیہوں کے دانے کا اوپر کا پردہ اور اندر کا بیج، جس سے پودا پیدا ہوتا ہے، دونوں نکال دیے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی جو غذائی روحیں (روب اور خصوصاً روح ب) نمکیات (خاص کر فاسفورس اور کیلسیم) اور پروٹینیں، گیہوں میں ہوتی ہیں وہ بھی تقریباً سب کی سب نکل جاتی ہیں اور صرف نشاستہ باقی رہ جاتا ہے اور تھوڑی سی ادنٰے درجے کی پروٹین۔ اِسی طرح جب چاولوں کو گھر میں کٹوانے پھٹکوانے کے بجائے کارخانوں سے صاف کرایا جاتا ہے اور پھر اچھی طرح دھو کر اُبال کر، پیچ اُتار کر صرف خشکہ پکا کر استعمال کیے جاتے ہیں، تو ان میں بھی نشاستہ ہی نشاستہ باقی رہ جاتا ہے۔ اِس طرح ہم اِن مفید اناجوں کو بہت کچھ نکما

بنا دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اِن سب باجرہ، مکئی وغیرہ بہتر ہیں، کیونکہ ان سے ہم میدہ نہیں نکالتے اور سالم اناج کا آٹا اِستعمال کرتے ہیں۔ نیز ڈبل روٹی بنانے میں بھی بازاروں میں بجائے اصلی خمیر اِستعمال ہونے کے، جو ایک قسم کی نباتات سے حاصل ہوتا ہے عام طور پر بیکنگ پاوڈر (Baking powder) استعمال ہوتا ہے جس میں سوڈا ملا ہوتا ہے۔ اِس لیے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ اصلی خمیر میں رمح ب، بلکہ اُس کی سب قسمیں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں اور بیکنگ پاوڈر میں بالکل نہیں ہوتی۔ جو لوگ مجبوراً اس طرح کی تیار کی ہوئی خوراکیں استعمال کرتے ہوں اُن کو چاہیے کہ اِن کے ساتھ سبزی، ترکاری، پھل، دودھ، دہی اور ایسی وغیرہ بہت استعمال کریں تاکہ اُن کا نقص بہت کچھ رفع ہو جائے۔

نشاستہ ایسی خوراک ہے، جس کے لیے پکا کر کھانا سب خوراکوں سے زیادہ ضروری ہے، یعنی، یہ کسی صورت میں بھی بغیر پکائے نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ اِس کے ہر ذرے کے گرد ہضم نہ ہونے والے کاربن آب کا ایک غلاف (Cellalose) ہوتا ہے اور جب تک وہ غلاف حرارت سے پھٹ نہ جائے نشاستہ حل نہیں ہو سکتا، اِس لیے ضروری ہے کہ ہر قسم کی نشاستے والی خوراک کو استعمال کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح پکایا جائے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ نشاستے والی خوراک کو مُنہ میں اچھی طرح چبانا اور خاصی دیر تک مُنہ میں رکھنا سب خوراکوں سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ اس طرح وہ کھاری لعاب (Taleen) جو زبان کے نیچے کانوں کے سامنے کی گلٹیوں سے نکلتا ہے، نشاستے کے ساتھ اچھی طرح مل جاتا ہے اور اُس پر کیمیائی عمل کرکے ایک قسم کی کھانڈ بنا دیتا ہے۔ Mattsugar or Soluble Dextam اِس کے بغیر نشاستے والی خوراک ٹھیک طور پر ہضم

ں ہوتی۔ نشاستے والی خوراک پر جب تک معدے کا کھٹا رس اپنی تاثیر نہیں شروع کرتا تب منہ کے لعاب کا اثر جاری رہتا ہے۔ معدے کے کھٹے رس کی تاثیر کے بعد نشاستے پر ہاضمے کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ نشاستے والی خوراک کے ساتھ یا اُس کے بعد فوراً کھٹاس نہیں کھانی چاہیے، کیونکہ کھٹاس سے اُس کا ہاضمہ رُک جاتا ہے۔ اسی طرح نشاستے والی خوراک یا کسی اور خوراک کو گھی یا اور روغنیات میں تل کر کھانا بھی اچھا نہیں، کیونکہ اس سے چکناہٹ خوراک کے اندر گھس کر اُس کے ذروں کے گرد ایک غلاف سا بنا دیتی ہے جس سے ہمارے ہاضمے کے رس اُس پر اثر نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ آنتوں میں جا کر لبلبے کے رس سے چکناہٹ ہضم نہ ہو جائے۔ ہاں، ٹھنڈی بالائی یا ٹھنڈا مکھن روٹی کے ساتھ کھانے سے یہ نقصان نہیں ہوتا، کیونکہ اس طرح چکناہٹ کھانے کے اندر نہیں گھستی۔ حلوے بنانے میں چونکہ آٹے یا سوجی کو پہلے گھی میں بھون لیا جاتا ہے پھر پانی ملایا جاتا ہے، اس لیے وہ دیر ہضم نہیں ہوتا، کیونکہ پانی ڈالنے سے پہلے ہی نشاستہ نیم ہضم ہو جاتا ہے۔

ذیل میں سبزی، ترکاری اور پھلوں کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے، جس میں اُن کو کاربن آب کی فیصدی مقدار کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے تاکہ ذیابیطس والے بیماروں کو خوراک کا انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔

۱۔ سلاد، کھیرا، پالک، اسپیرگس، رباب، سلیری، گریپ فروٹ ایک سے تین فیصدی تک۔

۲۔ ٹماٹو، کرم کلہ، پانی کا ساگ، مولی، سمندری کیل، شلغم، گوبھی، بھنڈی، بینگن تین سے پانچ فیصدی تک

۳۔ لوبیا، چقندر، گاجر، پیاز، تربوز، سٹرابری، نیبو، اناس، سنگترہ، گوس بری، ۱۰ فیصدی تک

۴۔ سبز مٹر، ہاتھی چک، ولایتی شلغم، سوگی، خوبانی، ناشپاتی، سیب، چیری، بلیو بری، رس بری، سیاہ اخروٹ، بادام، پستہ۔ ۱۵ فیصدی تک

۵۔ بھنی ہوئی مٹر، سبز مکئی، اُبلے ہوئے چاول، آلوچے، کیلا، آلو بخارا، انگور، ۲۰ فیصدی تک

۶۔ چیسنٹ ۷۰ فیصدی تک

ہندوستان کی پرانی تہذیب و تعلیم

از

پروفیسر گوپال داس صاحب کھنہ، ایم اے، بی ٹی،

ہندوستان کی پرانی تہذیب و تعلیم پر بحث کرنے سے قبل ہم یہ بات بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم اس اہم مضمون پر محض تعلیمی نقطۂ نگاہ ہی سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرینگے اور اس مذہبی کھینچا تانی سے پرہیز کرینگے جس کی بنا پر اس ملک کی پرانی تہذیب کے متعلق لوگوں کی رایوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں ایک مؤرخ کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ وہ انسانی جماعتوں کے خاص وقت کے واقعات کو غیر جانب دارانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھے اور اُن میں جو انسانی جذبات پوشیدہ ہوں ان کو بخوبی سمجھ کر اس وقت کی انسانی تحریکوں کا صحیح نقشہ کھینچے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کے واسطے ان خیالات و جذبات کو، جن کے درمیان رہ کر اُس نے پرورش پائی ہو، بالکل ترک کر دینا بہت مشکل ہے اور خاص کر اپنی قوم کی قدیم تہذیب پر بحث کرنا اور اپنے جذبات کو بالکل دبائے رکھنا ناممکنات سے ہے۔ تاہم ہمارا یقین ہے کہ جہاں تک ایک مؤرخ کسی انسانی تحریک کو محققانہ نظر سے دیکھتا ہے، وہاں تک وہ ایک کامیاب مورخ کہلانے کا مستحق ہے، خصوصاً تعلیمی تذکروں میں انصاف اور غیر جانب داری اس کی کامیابی کی ایک نہایت ضروری شرط ہے۔

ہندوستان کی پرانی تہذیب و تعلیم کی خصوصیات

نسلی خصوصیت۔ جس وقت آریہ لوگ ہندوستان میں آئے، اُس وقت یہاں کول اور

وڑ قومیں آباد تھیں۔ کول اور دراوڑ لوگ زیادہ تر مادہ پرست تھے، یعنی، ان کی ضروریات
ت اپنے جسم کی پرورش و حفاظت ہی تک محدود تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت بھی انھیں
مانی ضروریات پر مبنی تھی، لیکن اس کے برعکس آریہ نسل کے لوگوں میں مادیات کے علاوہ
بہ روحانیت بھی بہت حد تک رونما تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنی ہمسایہ قوم سے بدرجہا زیادہ
مہذب گنے جاتے تھے۔ آج کل کے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انسانی ارتقا مادے سے روح
کی طرف ہوتا ہے، یعنی، شروع شروع میں انسان جسمانی ضروریات کے تابع رہتا ہے، لیکن
ں جوں زمانہ ترقی کرتا ہے، اس کے اندر غور و فکر کا مادہ نشو و نما پانے لگتا ہے، حتیٰ کہ
ب وہ ارتقا کے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے، تو اس میں تہذیب کی ساری خصوصیات آجاتی ہیں
س معیار کے مطابق آریہ نسل کے لوگوں کو ہم بہت مہذب لوگ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ان کی
بیت میں ان چیزوں کو دخل تھا، جن کی بدولت انسان تہذیب کے اعلیٰ مدارج تک صحیح
طور پر پہنچ سکتا ہے۔

ہندوستان کا محلِ وقوع۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ ایک قوم کی تہذیب پر ان قدرتی حالات کا، جن کے درمیان رہ کر اس نے پرورش پائی ہو، بہت بھاری اثر ہوتا ہے مؤرخوں کا خیال ہے کہ آریہ لوگ وسط ایشیا کے بنجر اور پتھریلے علاقوں سے چل کر شمال مغربی درّوں میں سے ہو کر ہندوستان آئے۔ چونکہ شروع شروع میں انھیں بہت سے جنگجو حریفوں کا مقابلہ کرنا پڑا، اس لیے ان کے اندر جسمانی دلیری اور بہادری کے جذبات موجزن رہے، لیکن جب وہ ملک پر قابض ہو گئے اور دشمنوں پر پورا تسلط جما لیا، تو ان کے خیالات کا رجحان آہستہ آہستہ جسمانی ضروریات سے روحانی مسرتوں کی طرف مائل ہونے لگا اور قدرت نے بھی اِس بارے میں ان کی خوب مدد کی، یعنی، ہندوستان کی جائے وقوع

ایسی تھی کہ سوائے شمال مغربی دروں کے انھیں کسی طرف سے بیرونی حملوں کا ڈر بالکل نہ تھا۔ شمال میں کوہ ہمالہ کی فصیل تھی۔ مشرق میں برما کی اونچی پہاڑیاں۔ جنوب میں گہرا سمندر اور مغرب میں ریگستانی علاقہ۔ اس کے علاوہ ملک کے اندرونی حصے کی فضا اس قدر خوشگوار تھی کہ ان کے اندر روحانی جذبات خود بخود نشوونما پانے لگے۔ ملک کے ایک طرف فلک بوس آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑ تھے تو دوسری طرف سیکڑوں ندیاں، جن کے دونوں کناروں پر ہزاروں میل تک سرسبز کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ ان نظاروں کو دیکھ کر آریہ لوگوں کے اندر خدا پرستی کا جوش پیدا ہوا۔ خدا کی شان کو انھوں نے پانی کی موجوں، سبزے کی لہروں اور بادلوں کی گرج میں محسوس کیا اور ان قدرتی مناظر کی مدح سرائی کی۔ مؤرخوں کا خیال ہے کہ وسط ایشیا سے آریہ نسل کی ایک جماعت تو ہندوستان میں آئی، دوسری یورپ کی طرف روانہ ہوگئی۔ جب ہم یورپ اور ہندوستان کے لوگوں کا مقابلہ کرتے ہیں، تو ہمیں ان دونوں میں سب سے بڑا اختلاف یہ نظر آتا ہے کہ یورپ کے لوگ نسبتاً زیادہ مادہ پرست ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں مادیت نے زیادہ ترقی کی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے آریہ لوگ روحانیت کی طرف ایسے مائل نظر آتے ہیں کہ ان کے اندر جسمانی ضروریات کے بجائے روحانی ضروریات کے لیے زیادہ تڑپ موجود ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں، لیکن سب سے اہم وجہ یہی ہے کہ ہندوستان ایک نہایت ہی زرخیز ملک واقع ہوا ہے اور چونکہ سیکڑوں سال تک یہاں کے لوگ بیرونی حملوں سے بے خوف رہے، اس لیے مادیات کے بجائے روح کی تربیت میں زیادہ تر مصروف رہے۔

مجلسی خصوصیّت۔ ہندو مجلسی زندگی کی سب سے اہم خصوصیّت اس کی ذات پات ہے

اور چونکہ اس تقسیم پر پرانا سلسلۂ تعلیم مبنی تھا اس لیے اس کی ماہیت کو بخوبی سمجھنا اشد ضروری ہے۔ عالموں کا خیال ہے کہ رگ وید کے زمانے میں چار ذاتوں کی تفریق اتنی واضح نہیں تھی، جتنی بعد میں ہوئی، یعنی، ایک ہی گھر کا مالک مختلف اوقات پر مختلف فرائض ادا کرتا تھا۔ پرستش کے وقت دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے گیت گاتا تھا، تو فصلوں پر کھیتی باڑی بھی خود ہی کرتا تھا اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے وقت خود ہی تلوار ہاتھ میں لیکر میدانِ جنگ میں اُتر آتا تھا، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان لوگوں کے فرائض زندگی بڑھتے گئے اور پھر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ سوسائٹی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے، تاکہ مجلسی زندگی میں زیادہ سہولت ہو۔ چنانچہ مذہبی رسوم کی ذمے دار جماعت کا نام برہمن رکھا گیا، جنگ آزما فرقے کا نام کھشتری۔ کاشتکاروں، زمینداروں اور تاجروں کا نام ویش، اور دستکاروں، صناعوں اور خدمت کرنے والوں کا نام شودر رکھا گیا۔ اس بارے میں یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے بھی اپنی کتب 'ری پبلک' اور 'لاز' میں اسی قسم کی تقسیم کی ہے۔ اُس نے ایک جمہوریت کا نقشہ کھینچا ہے جس میں ہر ایک شخص اپنی بساط کے مطابق سوسائٹی کی خدمت کرتا ہے۔ سب سے اعلیٰ جماعت فلسفہ دانوں کی ہے۔ ان کے بعد جنگی سپاہیوں کی اور پھر سوداگروں، دستکاروں اور کاریگروں کی۔ ان تینوں جماعتوں میں فلسفہ دان اور جنگی سپاہی سب سے اعلےٰ گنے جاتے تھے اور ملک کی باگ ڈور بھی زیادہ تر انھیں کے ہاتھ میں ہونے کا امکان تھا۔ ہندوستان میں بھی سوسائٹی کو چار حصص میں تقسیم کرنے کا مقصد یہی تھا کہ شیرازۂ مجلس کو مستحکم و مضبوط بنایا جائے۔ اس سے فائدہ یہ تھا کہ ہر فرد بشر اپنی بساط کے مطابق ترقی کر سکتا تھا: یعنی، کسی شخص کا رجحان فن سپاہ گری یا کاروبار یا دستکاری کی طرف ہو، تو وہ اس صیغۂ زندگی میں کمال حاصل کر سکتا

تھا اور اُسے اس میں سوسائٹی مدد دیتی تھی۔ اس انفرادی ترقی کے علاوہ یہ تقسیم مجلسی استعداد میں بھی اضافہ کرتی تھی۔

ہندوؤں کی پرانی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ذات پات کا سلسلہ کلیتہً کاروبار پر مبنی تھا، یعنی، جس طرح موجودہ زمانے میں، جو شخص جنگ میں کام کرتا ہے، اسے سپاہی کہا جاتا ہے۔ جو پڑھانے کا کام کرتا ہے وہ اُستاد کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ اسی طرح پرانے زمانے میں جو شخص جیسا کام کرتا تھا اس کے مطابق اس کی ذات سمجھی جاتی تھی۔ ہر ایک شخص کو حق تھا کہ وہ ایک ذات کو چھوڑ کر دوسری ذات میں داخل ہو سکے یعنی اگر ایک برہمن اپنی ذات کے فرائض کو چھوڑ کر فنِّ سپاہ گری سیکھنا شروع کر دیتا اور کھشتریوں کے سب فرائض ادا کرنے لگتا، تو اُسے خود بخود کھشتری کے نام سے پکارنے لگتے تھے۔ پرانی کتب میں اس قسم کے تغیّر و تبدل کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن، جوں جوں زمانہ تبدیل ہوتا گیا، ذات کی تقسیم مستقل ہوتی گئی اور بجائے کرم کے جنم پر مبنی ہونے لگی، یعنی، پہلے کوئی پیشہ کرنے والے کو اُس پیشے سے منسوب کرتے تھے، جیسے: لوہے کا کام کرنے والے کو لُہار کہتے تھے، لیکن اب پیدائش سے نسبت دینے لگے، مثلاً: لُہار کے بیٹے کو لُہار کہنے لگے، چاہے اُس نے لُہار کا پیشہ اختیار نہ کیا ہو اور اس طرح لازم ہو گیا کہ لُہار کا بیٹا لُہار ہی کا کام کرے۔ سنسکرت زبان میں ذات پات کے سلسلے کا دوسرا نام ”ورن آشرم دھرم“ ویوستھا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ برہمن کا لڑکا حتی الامکان برہمن کے فرائض سیکھے، کھشتری کا کھشتری کے اور ویش اور شودر کا ویش اور شودر ہی کے کام کاج میں مہارت پیدا کرے۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے کے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ برہمن کے لڑکے کے واسطے برہمن کے کاروبار سیکھنا بہ نسبت ایک کھشتری یا ویش کے لڑکے کے آسان ہو گا، اس لیے وہ اپنے ہی کام

میں مہارت حاصل کرے اور اسی طرح دیگر ذاتوں اور پیشوں میں بھی یہی اصول کام کرے تاکہ ہر ایک شخص اپنے پیشے میں سہولت سے کامل مہارت پیدا کر سکے اور پورا فائدہ اٹھا سکے اور مجلسی زندگی کی تعمیر و تہذیب میں پورا حصہ لے سکے۔ موجودہ زمانے میں ماہرینِ فن تعلیم کے نزدیک بھی تعلیم کا سب سے اونچا اصول یہی ہے کہ پہلے تو اس امر کی پڑتال کی جائے کہ طلبہ کا میلانِ طبع کیا ہے تاکہ اس کے مطابق اُن کی تربیت کی جائے، پھر ان طاقتوں کو سوسائٹی کی خدمت میں اس طرح لگایا جائے کہ اس سے مجلسی اقتدار حاصل ہو سکے۔ شروع شروع میں ہندوستانی سوسائٹی کی چہارگانہ تقسیم اور اس کی تعلیم و تربیت اسی اصول کے ماتحت کی گئی تھی، لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ تقسیم بجائے کرم کے جنم پر مبنی ہونے لگی، یعنی، برہمن کا لڑکا چاہے وہ برہمن کے فرائض ادا کرے یا نہ کرے برہمن کہلانے لگا اسی طرح کھشتری، ویش اور شودر کا لڑکا کھشتری، ویش اور شودر کہلانے لگا اور ادائے فرض کی شرط جو پہلے نہایت ضروری تھی مفقود ہو گئی۔ جس طرح ایک چشمے کا پانی چاہے کتنا ہی صاف و شفاف ہو، جوں جوں منبع سے دور ہوتا جاتا ہے راستے کا کوڑا کرکٹ، خاک دھول، گھاس پھوس مل مل کر گدلا میلا اور غلیظ ہو ہی جاتا ہے۔ یہی حال انسانی سوسائٹی کا ہے، جب تک بنیادی اصولوں کا خیال نہ رکھا جائے اور انھیں ان آلائشوں سے جو ان میں وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں پاک نہ رکھا جائے تو یقینی امر ہے کہ وقت پا کر زندگی کا معیار اس قدر بدل جائے کہ ان بنیادی اصولوں کا اصلی منشا ہی فوت ہو جائے۔ ہمارے خیال میں بعینہٖ یہی حالت ہندوؤں کی ذات پات کے نظام کی ہوئی۔

مذہبی خصوصیت۔ ہندوؤں کے پُرانے طریقۂ تعلیم کی بُنیاد ان کا دھرم ہے، جس کو سمجھنا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ان کے مجلسی نظام کو۔ ہم نے اس جگہ دھرم کا لفظ عمداً

استعمال کیا ہے، کیونکہ لفظ مذہب نہ تو اتنا وسیع المعنی ہی ہے، نہ ہندو زندگی کے مختلف پہلوؤں کی صحیح توضیح ہی کر سکتا ہے۔

ہندوؤں کے دھرم کے متعلق سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پیدائش سے لے کر موت تک اِنسان کے جتنے بھی فرائض ہیں وہ سب کے سب دھرم میں شامل ہیں، صبح کا نہانا، دو وقت کی سندھیا، والدین، اولاد اور میاں بیوی کے ایک دوسرے کی طرف فرائض سب کے سب دھرم کے مختلف حصے گنے جاتے ہیں۔ اِس واسطے پُرانے آریوں کی دھارمک (مذہبی) تعلیم کے نصب العین کو نظامِ حیات کہیں تو بجا ہو گا۔

ان کے دھرم کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُنھوں نے خدا کی شان کو قُدرت کے مختلف مناظر میں دیکھا اور ان مناظر کو ذی رُوح سمجھ کر ان کی پرستش شروع کی۔ اہلِ ہنُود کی پُرانی کُتب مقدسہ میں مندرجۂ ذیل امور دیکھنے میں آتے ہیں۔

۱۔ دیوتاؤں کی حمد و ثنا۔ یہ دیوتا عام طور پر قُدرت کے مختلف مظاہرات ہیں۔

۲۔ اِس بات کا اِعتراف کہ اِن دیوتاؤں کے اوپر ایک سب سے بڑا دیوتا ہے، جس کے قبضۂ اقتدار میں ان دیوتاؤں کا نظام ہے۔

۳۔ دیوتاؤں کو پرماتما کی مختلف صورتیں قرار دینا۔

۴۔ وحدۂ لاشریک خدا کا ذِکر۔ ایک ہی برہم ہے اِس کے سوا دوسرا کوئی نہیں۔

مغربی عالموں کا خیال ہے کہ ابتدا میں آریہ لوگ قدرت کے مناظر دیکھ کر ایسے متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے ہر ایک منظر میں کسی خاص طاقت کا ظہور سمجھا اور اُسے دیوتا کہہ کر اُس کی پرستش شروع کر دی۔

لیکن جب اِن کے خیالات کو فروغ حاصل ہُوا، تو بعض رشیوں نے اِس خیال کو

ر کیا کہ قدرت کے تمام تر مناظر ایک ہی خدا کے ماتحت ہیں اور سب دیوتا اس کی مختلف تصاویر
ہ مغربی علما کے نظریے کے مطابق واحد خدا کا جذبہ آریوں میں شروع شروع میں نہیں بلکہ بعد
ں پیدا ہوا، اس کے برعکس ہندو عالموں کا خیال ہے کہ ویدوں میں صرف ایک واحد خدا ہی
ا ہے اور دیوتاؤں سے مراد اسی ایک ذات کے مختلف اوصاف سے ہے۔

ایک اور خصوصیت قدیم ہندو دھرم میں یہ موجود تھی کہ ان کی ہر ایک مذہبی رسم کا
ج ہون یگیہ تھا۔ ایشور کی تعریف میں جو وید منتر گائے جاتے تھے۔ وہ اکثر ہون کنڈ کے ارد
د بیٹھ کر اگنی کے روبرو گائے جاتے تھے۔ ہر ایک گرہستی کے واسطے ضروری تھا کہ وہ اپنے گھر
ں آگ نہ بجھنے دے اور انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک بلکہ اس کے بعد بھی جو رسوم ادا
ی جاتی تھیں، سب کی سب ہون یگیہ کی مدد سے کی جاتی تھیں یعنی، ایک خاص طول و عرض
اگنی کنڈ بنایا جاتا تھا جس میں خاص مقدار میں خوشبودار اشیا ڈال کر آگ جلائی جاتی تھی،
ر خدا کی حمد و ثنا میں منتر پڑھے جاتے تھے۔ ہر منتر کے یا بہت سے منتر پڑھنے کے بعد
ون کنڈ میں گھی کی تھوڑی سی مقدار ڈالی جاتی تھی۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آریہ لوگ
ون یگیہ کو اتنا اہم کیوں سمجھتے تھے۔ ہمارے مطلب کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ ان رسوم نے
ن تعلیمی کوائف کو پیدا کیا۔ چونکہ ان کو ہون کرنے کے لیے خاص پیمائش کے کنڈ بنانے پڑتے
تھے، اس لیے انھوں نے الجبرا اور جیومیٹری کے علوم میں خوب ترقی کی۔ کبھی کبھی اس بات
ی بھی ضرورت ہوتی تھی، کہ ایک ایسا گول کنڈ بنایا جائے۔ جو رقبے میں ایک چورس کنڈ کے
ابر ہو یعنی، وہ لوگ دائرے کو مربع کے رقبے کے برابر بنا سکتے تھے۔ چونکہ مختلف رسوم خاص
اص اوقات پر کرنی پڑتی تھیں، اس واسطے ان لوگوں میں علم ہیئت و نجوم نے خوب ترقی
ی وغیرہ وغیرہ۔

ہندو دھرم کی اگلی منزل میں فلسفے کی ابتدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مذہبی رسوم حد سے تجاوز کر گئیں۔ تو کچھ عالموں نے ان کے برخلاف آواز اُٹھائی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ رشیوں نے زندگی کے ابدی اصولوں اور خُدا کی قدرت پر فلسفیانہ خیالات کا اِظہار کیا۔ جن کتب میں ان خیالات کا اِظہار ہے۔ اُنھیں اُپنشد اور آرنیک کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ کتابیں شاید دنیا کی سب سے پرانی کُتب میں سے ہیں، جن میں خُدا اور روح کی حقیقت پر بڑی فصاحت سے بحث کی گئی ہے۔ انھیں اگر ہندوستان کا گنجینۂ دانش کہیں تو بجا ہے۔

مندرجۂ بالا امور سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کے قدیمی نصابِ تعلیم میں دھرم کو کہاں تک دخل تھا، کیونکہ ہر طالب علم کا فرض تھا کہ دھرم کے اصلی معانی سمجھے، ویدوں اور دیگر متعلقہ علوم کا مطالعہ کرے، رسوم کو ٹھیک طور پر ادا کرنے کی استعداد حاصل کرے اور روح، مادے اور خدا کے متعلق رازہائے پوشیدہ سمجھنے کے لیے اُپنشدوں کا مطالعہ کرے۔ (باقی)

---

(۱) ہَون یگیہ۔ ایک معینہ رقبے کے گڑھے میں روغنیات اور خوشبودار اشیا ڈال کر آگ روشن کر کے اُس کے چاروں طرف بیٹھ کے ویدوں کے فقرے گا کر پڑھتے ہیں اور کبھی ہر فقرہ ختم ہونے پر کبھی چند فقروں کے بعد تھوڑا سا گھی آگ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ ایک قسم کی عبادت اور دیوتاؤں سے طلب خیر ہے۔

(۲) کنڈ۔ چھوٹا تالاب یا گڑھا۔ (۳) اگنی = آگ۔ (۴) منتر = فقرہ، جملہ، عبارت۔ (۵) سندھیا = دعا، عبادت۔

لڑکوں کیلئے اصولِ صحت پر پہلا لکچر

(گذشتہ سے پیوستہ)

از

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی، ایم اے، ادیب فاضل

اب ہم تمہیں ایک اور دلچسپ بات بتاتے ہیں اور وہ یہ کہ جب ہم تیرہ سال کی عمر کو پہنچتے ہیں، تو وہ گلٹیاں سست پڑ جاتی ہیں جو ہمارے جسم کو بڑھاتی ہیں۔ ان حالات میں ہمیں توقع کرنی چاہیے کہ ہمارا جسم بڑھنے سے رُک جاتا ہوگا، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمارا جسم اور بھی زیادہ رفتار سے بڑھتا ہے، جیسا کہ ہمیں اپنے کپڑوں کے چھوٹا ہو جانے سے پتہ چلتا ہے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا جسے ہر روز پانچ میل پیدل چل کر اسکول پہنچنا ہوتا تھا۔ اُس لڑکے کے چودھویں جنم دن پر اُس کی ماں نے اُسے نئے کپڑے تحفے کے طور پر دیے۔ لڑکا یہ دیکھ کر بہت خوش ہُوا، کہ اُن کپڑوں میں ایک ایسا پاجامہ بھی تھا، جو اُس کے قد سے ذرا لمبا تھا۔ دوسرے دن لڑکا بڑے شوق سے اسکول روانہ ہُوا تاکہ اپنے ہمجولیوں کو اپنا نیا پاجامہ دکھائے، لیکن پانچ میل کا سفر طے کرنے کے بعد جب وہ اسکول پہنچا، تو اُسے یہ دیکھ کر بہت رنج ہُوا کہ اِس عرصے میں وہ اِس قدر بڑھ چکا تھا کہ اُس کا پاجامہ چھوٹا ہو گیا تھا۔ ممکن ہے یہ سارا واقعہ گپ ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم تیرہ اور بیس سال کی عمر کے درمیان باقی عمر کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھتے ہیں، اِس لیے ہمیں اِس کی وجہ معلوم کرنی چاہیے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس عمر میں ہمارے جسم میں وہ گلٹیاں کام کرنا شروع کر دیتی

ہیں، جو اِس وقت تک بیکار رہتی ہیں۔ گویا کہ وہ سوئی ہوئی تھیں۔ اِس وقت یہ گلٹیاں بیدار ہوتی ہیں، اور وہ مادّے تیار کرتی ہیں۔ اِن گلٹیوں کو جنسی گلٹیاں کہتے ہیں اور یہ اُس تھیلی میں محفوظ ہوتی ہیں، جو تمھاری رانوں کے درمیان ہے۔ جب یہ گلٹیاں ایک مادہ تیار کر لیتی ہیں، تو یہ مادہ جسم میں جذب ہو جاتا ہے اور اُن گلٹیوں کو سست کر دیتا ہے، جو اب تک ہماری نشوونما میں مدد دیتی رہی تھیں۔ اگر جنسی گلٹیاں اپنا کام شروع نہ کریں، تو ہمارا جسم عام آدمیوں کی طرح نہ بڑھے۔ ہم بڑھتے رہیں، لیکن ہمارا حلیہ عام آدمیوں سے مختلف ہو۔ تیرہ سال کی عمر کے بعد کسی روز جب تم صبح جاگ کر اپنا منہ آئینے میں دیکھتے ہو، تو تمھیں اپنے چہرے میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ تمھارے اوپر کے ہونٹ پر کچھ بال اُگے ہوتے ہیں، جنھیں تم مونچھیں کہتے ہو۔ بس یہی چیز اس بات کی نشانی ہے کہ جنسی گلٹیاں مادہ تیار کر رہی ہیں۔ تم میں سے کچھ لڑکے شاید اسکول کے خوش آواز لڑکوں کے ساتھ دُعا یا گیت گاتے ہوں گے، لیکن ایک دن تمھیں اور لڑکوں سے الگ کر دیا جاتا ہے، کیونکہ تمھاری آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ تمھاری آواز میں بچپن کی حلاوت کے بجائے مردانہ بھاری پن آ جاتا ہے۔ خصوصاً جب یہ تبدیلی جاری ہوتی ہے تو اُس وقت تمھاری آواز نہ بچوں کی سی ہوتی ہے نہ بڑوں کی طرح، بلکہ اِس میں موٹر کے انجن کی طرح کھڑکھڑاہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ آواز کی یہ تبدیلی بھی جنسی گلٹیوں کے کام کی ایک اور دلیل ہے۔ اِس وقت تمھارے پٹھے سخت ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور تم ہر لحاظ سے مرد بننے لگتے ہو۔ بالفرضِ محال اگر یہ مادہ تمھارے جسم میں جذب نہ ہو، تو تم نہایت کم ہمت، بزدل، اور جلد گھبرا جانے والے انسان بنو۔

اگر تمھاری اماں رات کو جاگ کر کہیں، "بیٹا دیکھو تو نیچے چور معلوم ہوتا ہے"، تو تم خوشی سے یہ لفظ نہ کہہ سکو، "اچھا اماں میں جاکر دیکھتا ہوں"، بلکہ شاید تم اپنا منہ چادر میں چھپا لو اور یہ

اہر کرو کہ تم سو رہے ہو، لیکن چادر کے اندر اس شدت سے کانپتے رہو گویا مکان میں بھونچال آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مَیں نے بہت واضح طور پر تمھیں سمجھا دیا ہے کہ تمھاری نشوونما، تمھاری صحت اور تمھاری جرأت کا بیشتر مدار اُس مادے پر ہے، جو جنسی گلٹیوں سے نکل کر تمھارے جسم میں جذب ہوتا ہے۔

جنسی گلٹیاں جو دوسرا مادہ تیار کرتی ہیں وہ پہلے مادے سے مختلف ہوتا ہے، لیکن اسی کی طرح اہم، اِس لیے میں اِس کے متعلق بھی تمھیں کچھ بتاؤنگا۔ وہ ایک دودھیا رنگ کی رطوبت ہوتی ہے اور اُسے تخم (Semen) کہتے ہیں۔ وہ رطوبت گلٹیوں میں تیار ہو کر دو ایسے خانوں میں چلی جاتی ہے، جو اسٹور کا کام دیتے ہیں۔ وہ اسٹور مثانے (پیشاب کی تھیلی) کے قریب واقع ہیں۔ بعض وقت وہ اسٹور لبالب بھر جاتے ہیں۔ اُس وقت وُہ زائد تخم باہر پھینک دیتے ہیں۔ اب میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سارا عمل کس طرح ہوتا ہے؛ تاکہ جب تمھیں یہ واقعہ پیش آئے، تو تم اچھی طرح سمجھ سکو۔

بعض دفعہ رات کو تمھاری آنکھ کھل جائیگی اور تم دیکھوگے کہ وہ دودھیا رطوبت تمھارے جسم سے خارج ہو رہی ہے۔ وہ بالکل اسی طرح خارج ہوتی ہے جیسے ہم مثانے سے پیشاب خارج کرتے ہیں، یعنی، عضوِ تناسل کے راستے سے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تمھاری آنکھ کھلے بغیر تخم خارج ہو جاتا ہے اور صبح اُٹھ کر تُم دیکھتے ہو کہ ایک چھوٹا سا دھبا تمھارے پائجامے پر پڑا ہُوا ہے، کیونکہ یہ تخم نہایت قلیل مقدار میں خارج ہوتا ہے۔ بہر حال تمھارے جاگنے یا نہ جاگنے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر تم تندرست ہو اور کھیلوں میں باقاعدہ شریک ہوتے ہو تو تخم کا اخراج کبھی کبھی ہُوا کریگا، یعنی، کئی مہینے کے وقفے کے بعد۔ گو بعض لڑکوں کو یہ واقعہ ہفتے میں ایک بار یا دو بار بھی پیش آئیگا، لیکن اگر اس سے زیادہ بار ہو تو اِس سے نقصان

ہوتا ہے۔ اِن حالات میں تمھیں اپنے باپ سے اِس کا ذکر کرنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر یہ تندرستی کی علامت ہے اور اِس بات کی بھی کہ تم لڑکپن سے گزر کر جوان ہو رہے ہو۔

اب میں تمھیں اِن گلٹیوں کو تندرست رکھنے کے لیے چند ہدایات کروں گا صحت کے لیے یہ گلٹیاں بہت اہم ہیں، لیکن ہماری بے خبری میں انھیں نقصان پہنچنے کا بہت احتمال ہوتا ہے کیونکہ دوسری گلٹیوں کی طرح یہ اتنی محفوظ جگہ پر نہیں ہوتیں۔ مثلاً: اُس گلٹی کو دیکھو جو دماغ کے نیچے ہے۔ وہ ہڈیوں کے مضبوط قلعے میں بند ہے۔ اگر ہم اُسے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں، تو پہلے کھوپڑی کو ہتھوڑے سے توڑنا پڑیگا، تب کہیں جا کر اُس پر ضرب لگیگی۔ اِسی طرح جو گلٹی گردن میں ہے، اُس تک چاقو کی مدد کے بغیر رسائی نہیں ہو سکتی اور جو گلٹی چھاتی کی ہڈی کے نیچے ہے وہ اس قدر محفوظ ہے کہ جب تک آرہ نہ چلایا جائے اُس کے قریب نہیں جا سکتے۔

لیکن رانوں کے درمیان تھیلی میں، جو جنسی گلٹیاں ہیں، یہ کوئی اتنی محفوظ نہیں اِس لیے اِن کو ہر ایک طرح کی چوٹ سے محفوظ رکھنے کے لیے تمھیں عقل سے کام لے کر احتیاط کرنی چاہیے۔ ایک احتیاط یہ بھی ہے کہ تم اتنا چُست لباس نہ پہنو کہ اُس کا کپڑا جنسی گلٹیوں کو دباتا رہے۔ اِس طرح گلٹیاں غیر معمولی طور پر زیادہ کام کرتی ہیں اور یہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ رات کو پہننے والے کپڑے یا پائجامے کے متعلق بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اُس کا آسن کافی کشادہ ہو۔ تم میں سے بعض لڑکے سوتے وقت جنگلی چوہے کی طرح اپنے آپ کو سمیٹ لیتے ہیں، اس سے بھی گلٹیاں دب جاتی ہیں اور کام کرنے لگتی ہیں۔ نیز تمھیں چت لیٹنے کے بجائے پہلو پر سونے کی عادت ڈالنی چاہیے، تاکہ تمھارے لحاف یا چادر کا بوجھ اُن اعضا پر نہ پڑے۔

ممکن ہے کہ جب یہ گلٹیاں اپنا کام شروع کریں تو تمھیں کچھ خلش سی ہو یا عجیب سا احساس ہو۔ یہ بالکل قدرتی چیز ہے اور اِس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اِس

احساس کو رفع کرنے کے لیے اُن اعضا کو مت کھجلاؤ۔ اِس سے گلٹیوں میں اور ہیجان پیدا ہوگا۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آنکھ ملنے سے آنکھ میں خارش اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی حال اِن گلٹیوں کا ہے۔ غسل کے بعد سارے بدن کو تولیہ سے اچھی طرح پونچھ کر صاف کرنا ضروری ہے، لیکن جب تم اِن اعضا کو سکھانے لگو تو نہایت آہستگی اور آرام سے ایسا کرنا چاہیے، ممکن ہے کہ تمھاری کسی طرح کی بے احتیاطی سے تخم اپنے اسٹور سے باہر آجائے، درحالیکہ اسٹور ابھی تک بھرا بھی نہ ہو۔ اگر ایسا ہُوا تو اِس سے بہت نقصان ہوگا، کیونکہ تخم کا یہ اخراج اُس اخراج سے بالکل مختلف ہے، جو سوتے میں ہوتا ہے۔ اُس وقت تمھارا جسم خود یہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ اب اُس میں ضرورت سے زیادہ تخم ہے، لیکن ہمیں اپنی طرف سے تخم ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اِس سے صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

اِس تقریر کی ابتدا میں مَیں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ہمارے خیالات کس طرح ہمارے اعضا پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ بات اِن جنسی گلٹیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ہم جس طرح ان کے متعلق خیال کریں، اُسی طرح اِن پر اثر پڑتا ہے۔ اگر ہم اِن کا متواتر خیال نہ کریں، تو یہ اپنا کام خود بخود نہایت اچھی طرح کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے بعض لڑکے اِس بات کو نہیں سمجھتے اور جنسی اعضا کے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں، بلکہ غلیظ بکواس بھی کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے رہیں، تو ایک دن انھیں محسوس ہوگا کہ اُن کی یہ گلٹیاں بہت زیادہ کام کر رہی ہیں اور اِس طرح اُنھیں زندگی گزارنی دشوار ہو جائیگی۔

اگر تم کوئی سوال کرنا چاہو، تو میں خوشی سے اُس کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے آج یہ باتیں تم سے اِس لیے کہی ہیں کہ تم بڑے ہو کر نہایت تندرست اور تنومند نوجوان بنو۔ اگر تم جنسی گلٹیوں کو باقاعدہ کام کرنے کا موقع دو، تو وہ تمھیں

نہایت اچھا مرد بنا دینگی اور یہ کام کچھ مشکل بھی نہیں۔ تم اپنے خیالات نیک رکھو، صاف ستھرے رہو، باقاعدہ کھیل کھیلو اور اپنا کام تندہی سے کرو۔ گلٹیاں خود بخود اپنا کام باقاعدگی سے کرتی رہینگی۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اب تم اپنا فرض ادا کرو۔

ر۔ت

قوّتِ بیان کی تربیت

از

پنڈت وِتستہ پرشاد صاحب، فدا، بی اے

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا منشائے خاص فقط ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ طلبہ کو زبان پر اس قدر عبور حاصل ہو جائے کہ وہ اپنے دل کی بات اچھی طرح سے دوسروں پر ظاہر کر سکیں اور یہی ایک سچی انسانی خدمت ہے، جو مدارس کے ذریعے انجام دی جا سکتی ہے، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے اسکولوں میں اسی ایک پہلو میں طلبہ کی تربیت کی کمی رہ جاتی ہے تعلیم کے اثنا میں تو طلبہ اکثر خاموش رہ کر اپنا وقت گزار لیتے ہیں، لیکن جب وہ تعلیم سے فراغت حاصل کرکے زندگی میں داخل ہوتے ہیں، تو عموماً انھیں بے زبانوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ نہ تو وہ اپنے ذاتی حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ اپنے کسی ساتھی ہی کی دستگیری یا رہنمائی کر سکتے ہیں۔ دنیا میں بنی نوعِ انسان کو اکثر اوقات خوشی اور رنج کا اظہار کرنا پڑتا ہے اور ہر وہ شخص جو ان موقعوں پر اپنے دلی جذبات کا اظہار بخوبی کر سکتا ہے، سوسائٹی کا زیور اور مایۂ ناز سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی اسکول قوتِ بیان کی تربیت میں اپنے طلبہ کی مناسب رہنمائی نہیں کرتا، تو وہ کسی صورت میں بھی ایک کامیاب اسکول کہلانے کا مستحق نہیں۔

صوبۂ پنجاب کے مدرسین کو غالباً اس بات کا علم ہوگا کہ دنیا میں اس وقت ایک بین الاقوامی زبان کی تحریک جاری ہے۔ اس زبان کا نام ایسپرنٹو (Esperanto)

ہے۔ اس کا بانی وارسا کا ایک شخص ڈاکٹر زمین ہاف تھا۔ اس زبان کے حروف تہجی کی تعد
۲۸ ہے۔ اس کے الفاظ بہت آسان ہیں۔ اس کی ترویج کے لیے پیرس میں ایک کمیٹی قائ
ہے اور انگلستان میں بھی ایک ایسوسی ایشن اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کام کر رہی ہے۔ کیا
اسی قسم کی ایک تحریک اپنے ملک میں جاری نہیں کر سکتے۔ جس سے اور نہیں، تو ہندوستا
بھر کی زبان تو ایک کر سکیں؟ اس وقت بھی ایک زبان ایسی ضرور موجود ہے، جو کم و بیش تمام
ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ بہت سے ہندی، فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ
اُس میں موجود ہیں، بلکہ انگریزی کے بیسیوں نئے الفاظ بھی اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ آؤ
ہم اُسے ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیں اور اُس زبان کے نیچ کو بخوبی سمجھ کر اس کے
فروغ میں حصہ لیں۔

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہر ایک ملک کی تہذیب و تمدن کا انحصار اس کی زبا
پر ہے، اس لیے اپنے ملک کی زبان کی ترقی اور توسیع میں جو شخص بھی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے
جتنی بھی کوشش کرتا ہے، وہ مبارک ہے۔ اس بارے میں جو کوشش مدرسین سر انجام
کر سکتے ہیں، وہ عوام نہیں کر سکتے۔ آج کل کے طلبہ مستقبل کی قوم بنیں گے۔ اگر زمانۂ طالب علمی
میں ان کے دلوں میں زبان کی صحت اور اسلوبِ بیان کے محاسن کا شوق پیدا کر دیا جائے، تو
تمام عمر اُن کی طبیعت مذاقِ سلیم سے آشنا رہیگی۔ ہر ایک اسکول کی تعلیم کا نمایاں پہلو یہ
ہونا چاہیے کہ اُس کے طلبہ اپنے ملک کی زبان میں صحیح طور پر اظہارِ خیالات کر سکیں اور اُنھیں
اس بات کا فخر ہو کہ وہ اپنی زبان کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ اس خدمت کو نہ صرف ورنیکلر
مدرسین ہی اپنا شعارِ خاص سمجھیں، بلکہ ہر ایک اُستادِ اعلےٰ سے لیکر ادنےٰ تک اس کوشش
میں حصہ لے جب تک اس طرح کی ہمہ گیر کوشش نہیں کی جاتی، پوری کامیابی کا منہ دیکھنا

ا ہے۔

قوتِ بیان کی تربیت میں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ طلبہ بیباختگی سے
ت چیت کر سکیں۔ ہم اس مقصد میں جبھی کامیاب ہو سکینگے، جبکہ ہم گرامر کے بجائے زبان پر
رہ زور دینگے۔ گرامر سے ہم فقط افعال کی مختلف صورتوں سے آشنا ہو سکتے ہیں یا اسما کی
یر و تانیث کا ہمیں علم حاصل ہو سکتا ہے، لیکن یہ جاننا کہ بعض الفاظ کے ساتھ کن کن لفظوں
شست مناسب ہے، - زباندانی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مثلاً: آفتاب غروب ہو گیا۔ میری
یدوں پر پانی پھر گیا۔ میری آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس کا
ـ فق ہو گیا۔ مداری کے کرتب دیکھ کر ناظرین عش عش کرنے لگے۔ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔
ہ واہ کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ بارش کے بعد پھولوں کا رنگ کیسا نکھر آیا ہے۔ پھولوں کی گلابی
سکراہٹ کیسی دلآویز ہے۔

زبان سکھانے کے لیے ضروری ہے کہ اُستاد طلبہ کو اس طرح کے اسلوبِ بیان سے
وبی واقف کرے۔ سورج ڈوب گیا۔ زیادہ فصیح ہے لیکن سورج غائب ہو گیا یا چھپ گیا
اقِ سلیم کو مرغوب نہیں۔ میری امیدیں پانی میں غرق ہو گئیں یا میری آرزوئیں لہولہان ہو گئیں
یرے ہاتھوں کے کبوتر اڑ گئے۔ اُس کا رنگ ڈھل گیا۔ ناظرین واہ وا پکارنے لگے۔ تم تو کیم کا
باند ہو گئے۔ کیا چاند سا چہرہ نکل آیا۔ پھولوں کا رنگ چمک پڑا ہے۔ پھولوں کی رنگدار مسکراہٹ
ـ لآویز ہے، نہایت غلط جملے ہیں۔ حالانکہ ان کے مطالب بھی وہی ہیں، جو اوپر کی مثالوں کے،
لیکن سننے والوں کو خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے۔

ہمارے ملک میں تذکیر و تانیث کا اطلاق بے جان چیزوں پر بھی کر دیا گیا ہے یا
بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ ہمارے ملک کی کوئی چیز مطلقاً بے جان نہیں سمجھی جاتی، بلکہ وہ

یا تو مذکر ہے یا مؤنث ؟ کیا یہ اِس بات کا ثبوت نہیں کہ ہندوستان کی فضا ہی میں ایسی تاثیر ہے کہ ہم فطرت کی ہر ایک چیز کو زندگی سے لبریز سمجھتے ہیں اور اُس کی ہیئت یا نام سے جو اثر ہمارے دلوں پر پڑتا ہے۔ اس کی بنا پر ہم اسے مذکر یا مؤنث سمجھتے ہیں ؛ قمیص مؤنث ہے، لیکن ؛ انگرکھا مذکر۔ کرسی مؤنث ہے ، مگر سٹول مذکر۔ جنگ مؤنث ہے اور دنگا فساد مذکر۔ قیمت مؤنث ہے تو مول مذکر۔ انتظار مذکر ہے ، لیکن ملاقات مؤنث ۔ وغیرہ وغیرہ ، اس لیے اس بارے میں بھی مدرسین کو خاص خیال رکھنا چاہیے کہ جو اسم طلبہ کو سکھایا جائے ، ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ یہ مذکر ہے یا مؤنث ۔

زبان دانی کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ مرکب افعال کے مختلف معانی میں خاص مشق کرائی جائے ۔ مثلاً ؛ پھوٹ پڑنا ۔ آنسوؤں کے لیے بھی آتا ہے اور کونپلوں کے لیے بھی ہے ۔ اسی طرح سے سوتا اُبل آیا ۔ خون اُبل آیا ۔ زخم بھر آیا اور دل بھر آیا ۔ بچ گیا اور بچ نکلا ۔ دل بیٹھ گیا ، سکہ بیٹھ گیا ۔ اُٹھ بیٹھا ، کر بیٹھا ۔ کما بیٹھا ۔ آ پھنسا ، جا پھنسا ۔ اسی طرح چکنا مصدر سے افعال مرکب بنتے ہیں ۔ اسی قسم کے اور بہت سے فعل ایسے ہیں ، جن کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے ۔

انگریزی زبان میں بیسک انگلش (Basic English) کے نام سے ایک تازہ تحریک جاری ہے ، جس کا منشا یہ ہے کہ آسان آسان فعلوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جملے لگا کر مشکل الفاظ کا کام لے لیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اُدَق الفاظ سے پرہیز کیا جائے ۔ زبان اردو میں اس قسم کی تحریک بہت بار آور ہو سکتی ہے ۔

قوتِ بیان کی تزئین و تربیت کے لیے اردو اشعار کا برمحل استعمال نہایت ضروری ہے ۔ اِس مطلب کے لیے ہر ایک جماعت کے طلبہ کے پاس ایک پاکٹ بک موجود ہونی

۱؎ معنی : نقرہ ، بادام ، مشکل ۔

ہیے۔ مدرس کو چاہیے کہ طلبہ کے لیے بیس عنوان مقرر کر دے مثلاً خدا، قوم، زندگی، موت، ہندو مسلم اتحاد، حب الوطنی، ہمت، علم، انسانی ہمدردی، قدرتی مناظر، ماں باپ، استاد، دوستی، قناعت، اولالعزمی وغیرہ اور ان سے کہے کہ جس جس عنوان کے متعلق کہیں کوئی شعر دیکھیں اسنیں وہ نوٹ کرلیں۔ میں جس وقت اپنی جماعت میں کوئی شعر پڑھتا ہوں، میرے طلبہ نہایت شوق سے اسے نوٹ کر لیتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے کمزور طلبہ کو تاکید کی کہ ہر روز کم از کم آٹھ دس دن تک پانچ پانچ دفعہ اس شعر کو خوش الحانی سے پڑھا کرو۔ تمھارے دلوں کو ایک خاص تقویت حاصل ہو گی ؎

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

ایک ہفتے کے بعد دو طلبہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے، پنڈت جی۔ اس شعر نے ہمارے دل کی مایوسی کو بالکل دور کر دیا۔

ایک دفعہ میں نے اپنے طلبہ کو اپنے دو اشعار سنائے ؎

آنکھ سے دور سہی، دل سے مگر دور نہیں برق جو دل میں تڑپتی ہے سرِ طور نہیں
تیرا دیدار ہے بندے کی مساعی سے بعید تیری بخشش سے مگر کوئی بھی شے دور نہیں

بہت سے طلبہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ایک اور موقع پر میں نے اپنے طلبہ سے کہا۔ ؎

قفس میں بلبلو! بے سود استغاثہ ہے رکھو نوازشِ پروردگار سے مطلب
فراق دیدہ جو سوئے ہوئے ہیں تربت میں انھیں چراغِ سرِ رہگذار سے مطلب؟
خراب حال ہے لیکن فدا وطن ہے وطن
ہے آخرش اسی اجڑے دیار سے مطلب

روضۂ تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا سے

غدا کی شان ہے روضے کا عکس پانی میں　　　جھلک بہشت کی گویا ہے وارِ فانی میں

طلبہ نے فوراً یہ اشعار رٹ کر لیے۔ حاصل کلام یہ کہ طلبہ کو اشعار سے روحانی اُنس ہوتا ہے، اگر اُن کی توجہ اچھے اشعار کی طرف دلائی جائے، تو اس سے مذاق سلیم کی بنیاد ان کی طبیعت میں مستحکم کی جا سکتی ہے۔ یہاں پر میں ایک بات کی تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ طلبہ میں مبتذل اور فحش کلام سے نفرت بھی پیدا کرنی چاہیے تاکہ اُن کی بیاض میں سوائے افکارِ عالیہ کے کوئی بُرا شعر موجود نہ ہو۔

میں کسی آئندہ نمبر میں اساتذہ کے کلام سے زبانی یاد کرنے کے قابل اشعار کا ایک گلدستہ پیش کرونگا۔ اُمید ہے کہ برادرانِ ہم پیشہ اُنھیں پسند فرمائینگے اور اپنے طلبہ کو وہ تمام اشعار آہستہ آہستہ یاد کرا دینگے طلبہ کو فقط اشعار یاد ہی نہ کرائے جائیں، بلکہ اُن اشعار کی توضیح کی جائے اور پھر ویسی ہی تشریح اُن سے بھی کرائی جائے، بلکہ بحث طلب اشعار پر اُن سے بحث اٹھائی جائے۔

جہاں تک ہو سکے طلبہ کو الفاظ کے صحیح تلفظ سے آگاہ کیا جائے مُنتظِر، مُنتظَر، مُنتشِر، مُنتخَب، مُشکِل، مُضطَر، مُضِر، مُفِر، مُفتخِر، مُفتخَر، مَنطِق، مَنظر، رِفعت، سَبقت، نظر، خبر، شرف وغیرہ کو طلبہ نہایت صحت سے پڑھ سکیں۔ ناظِم، شامِل، قابِل، قاتِل، صابِر بر وزنِ فاعِل صحیح طور سے ادا کریں۔

اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبہ جات پر طلبہ سے گفتگو کی جائے اور انھیں ان کے متعلق روزمرہ اور محاورے کے الفاظ بتائے جائیں۔ پھر دیکھیے طلبہ کی قوتِ بیان میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے۔ ایک بیمار دوست سے ملاقات، ریل کا سفر، خرید و فروخت

[...]علق دوکانداروں سے بات چیت، درزی سے کپڑے سلوانے اور دام چکانے کے متعلق [...]ظا اور محاورے، گھڑی کی خرید و فروخت، کسی کتب فروش سے گفتگو، ملازمت کے لیے [...]سی فرم کے مینجر سے ملاقات، ایک انشورنس ایجنٹ کی ایک معمولی کلرک سے بات چیت اور [...]ندگی کا بیمہ کرانے کی تحریک، آسٹریلین ٹیم پر رائے زنی اور اس قسم کے اور بیسیوں مضامین منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

ایک اور نہایت عمدہ مشق زبان دانی سکھانے کی یہ ہے کہ مختلف پیشہ وروں کی نقلیں اتروائی جائیں۔ مثلاً: قلعی گر، لُہار، بڑھئی، سنگتراش، فوٹو گرافر، کانوں کا میل نکالنے والا، حجام، نانبائی، چنے بیچنے والا، قفلی والا، چورن والا، یہ لوگ اپنے اپنے کام کے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں، بلکہ اسکولوں کے عجائب گھروں میں ان تمام پیشہ وروں کی تصاویر ہونی چاہییں اور اُن کے اوزاروں کی تصویریں اور ان کے نام بھی موجود ہونے چاہییں۔

پنجاب کے اسکولوں کے جملہ مدرسین اس بات کا تہیہ کر لیں کہ ایک سال کے اندر اندر ہم طلبہ میں اپنے دیس کی مشترکہ زبان میں جسے فارسی رسم الخط میں لکھنے والے اردو اور دیوناگری میں لکھنے والے ہندوستانی کہتے ہیں پوری مہارت پیدا کر دینگے۔ تاریخ پڑھانے والا اُستاد اُنھیں تاریخ کے واقعات بیان کرنے کے قابل بنا دے۔ سائنس، ڈرائنگ، حساب، حفظانِ صحت و دیگر مضامین کے مدرسین اُنھیں اس قسم کی مہارت دلائیں کہ وہ اپنے دل کی بات نہایت اطمینان کے ساتھ بیان کر سکیں، یہاں تک کہ انگریزی کی ریڈروں کے جملہ مضامین اپنی زبان میں ادا کر سکیں، تو پھر کیا بات ہے۔ قوت بیان کی جس قدر نشو و نما ہوگی، طلبہ کے دل میں اتنی ہی خود اعتمادی پیدا ہوگی۔

انگریزی میں ڈاکٹر اے ایم لو .Prof. A. M. Low, D. Sc نے حال

ہی میں ایک کتاب لکھی ہے، جس کا عنوان مستقبل کی عجیب و غریب دنیا (Our wonderful world of tomorrow) ہے۔ اس میں ایک فصل آنے والے زمانے کی تعلیم پر ہے وہ لکھتا ہے کہ مستقبل قریب میں تعلیم کا مدعا طلبہ کو واقفیت بہم پہنچانا نہیں ہوگا، بلکہ انھیں یہ سکھایا جائیگا کہ تعلیم کیونکر حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم اُس آنے والے زمانے کو قریب لانا چاہتے ہیں، تو ہمیں طلبہ کو اپنے وطن کی زبان میں مہارت دلانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

کچھ عرصے سے بعض حلقوں میں یہ تحریک عام ہو رہی ہے کہ ہر ایک صوبے میں اپنی اپنی مروّج زبان میں تعلیم دلائی جائے۔ لیکن دُور نگر ماہرینِ تعلیم اس سے متفق نہیں۔ اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے، تو پنجاب میں پنجابی، بنگال میں بنگالی اور بمبئی میں مرہٹی زبان میں تعلیم دلانے سے تو ہندوستان کے متحد ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہیگا اور یہ علاقے ہمیشہ پراگندہ ٹکڑوں کی طرح (جن کی ہوا ایک دوسرے میں نہ جا سکے) رہینگے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ تمام ہندوستان کی درسگاہوں میں ہندوستان کی مشترکہ زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے خواہ اُس کا نام کچھ ہی رکھا جائے تاکہ جہاں پنجابی، بنگالی، مرہٹی، اور مدراسی وغیرہ لوگ اپنے اپنے ملک میں اپنی اپنی زبان بولیں، وہاں ہندوستان کے مختلف حصوں میں جا کر بآسانی مشترک زبان میں اظہارِ خیال کر سکیں لیکن اس زبان کے سیکھنے میں اسکولوں کی حدود کے اندر پوری پوری پابندی ہونی چاہیے۔

پنجاب کے ہر اسکول میں اس بات کی پابندی لازم ہے کہ کوئی طالبِ علم اسکول کے احاطے اور اثنائے تعلیم میں سوائے ہندوستانی یا اردو کے کوئی اور زبان استعمال نہ کرے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے کہ اکثر اسکولوں میں استاد اور طلبہ پنجابی سے کام نکالتے رہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب امتحان کے وقت اردو یا ہندی میں

الوں کے جواب لکھنے پڑتے ہیں، تو اُن کی زبان نہایت بُری اور اغلاط سے پُر ہوتی ہے
ہم اُس دن کا نہایت بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں، جبکہ ہمارے ملک میں پشاور
بلکہ راس کماری تک اور آسام اور بنگال سے بمبئی تک اسکولوں کی تعلیم کی وساطت سے
ـ زبانِ مشترک رائج ہو جائے اور اہلِ ملک کے لب و لہجے اور اسلوبِ بیان میں اس قدر
مانیت پیدا ہو جائے کہ جب وہ اپنے ملک کی مشترک زبان میں بات چیت کرتے ہوں تو
یز نہ ہو سکے کہ آیا وہ دکنی ہیں یا کشمیری، پنجابی ہیں یا بنگالی۔ واقعی اس جد و جہد میں جو ہندستانی
ستاد اپنی اپنی شخصیت اور وسعت کے مطابق کوشش کرینگے، خداوندِ کریم ان کی کوششوں
بارور کریگا اور اُنھیں سعادتِ دارین سے مالامال کریگا۔

ترغیب علم اور انعام

از

نذیر احمد صاحب، بی اے سکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول، ظفروال

(یہ مضمون ۱۹۲۲ء میں کانفرنس گزٹ علیگڑھ میں شائع ہو چکا ہے اور صاحبِ مضمون کی خواہش پر دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے)

اس حقیقت سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بچوں کو تعلیم دیتے وقت ایک قابل استاد کا پہلا فرض یہ ہے کہ ان کی مختلف طبائع کا خیال رکھے یعنی، اُستاد کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو اپنے شاگردوں میں سے ہر فرد کے مزاج کے مطابق بنائے۔ یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ بچے اپنے ہر فعل کے ساتھ ایک نہ ایک فوری مقصد بھی ضرور رکھتے ہیں جس کو وہ بہت جلد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ابتدائی جماعتوں میں جب اُستاد بچوں کو تعلیم دیتا ہے، تو اُن میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں، جن کو ایک دو دفعہ کا کہلایا ہوا سبق یاد رہتا ہے بعض کو پانچ چھ دفعہ کہلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض کو دس بارہ دفعہ بعض بچے ایسے ہوتے ہیں، جن کو سبق بہت جلد یاد ہو جاتا ہے، لیکن بھول بھی ویسی ہی جلد جاتے ہیں بعض کو سبق دیر میں یاد ہوتا ہے اور پھر بھولتے بھی نہیں یا بہت دیر کے بعد بھولتے ہیں پھر بعض کو یاد بھی جلد ہو جاتا ہے اور فراموش بھی نہیں ہوتا یا بہت دیر کے بعد ہوتا ہے۔ بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے ہم جماعتوں ہی سے سبق لیکر جلدی سے یاد کر لیتے ہیں، اُستاد کو سبق کہلانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بعض بہت ہی کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر تعلیمی ترقی کرتے ہیں، لیکن جب ان کا طریقہ تعلیم بدل دیا جاتا ہے، تو بہتر نتائج کا ظہور ہوتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک استاد اپنے دلچسپ طریقہ تعلیم کے ذریعے سے ہر قسم کے بچوں میں تحصیل علم کی قابلیت اور شوق بہت جلد پیدا کر کے روز افزوں

تعلیمی ترقی دکھاتا ہے۔

جب کوئی اُستاد پہلی جماعت کے بچوں کو حروف تہجی کے طریقے سے تعلیم دیتا ہے، تو ان کا فوری مقصد پورا نہیں ہوتا یا یوں کہو کہ انھیں تسکین نہیں ہوتی۔ ان کے لیے حروف بالکل اشیائے مجہول ہیں جن میں قطعاً دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو رٹ رٹ کر تھک جاتے ہیں اور ساتھ ہی بد دل بھی ہو جاتے ہیں، لیکن جب ایک قابل استاد بچوں کی تعلیم "بین وگو" یعنی 'مشاہدہ وعمل' کے طریقے سے شروع کراتا ہے، تو بچے بجوشی متوجہ ہوتے ہیں، کیونکہ اس طریقے سے ان کو وہی الفاظ اور فقرے شروع کرائے جاتے ہیں، جو وہ روزمرہ سُنتے اور بولتے ہیں۔ ان حروف کا بولنا اور سُننا اُن کے لیے اشیائے مجہول کے بجائے اشیائے معروف کا علم تھا جن کا صرف پڑھنا نامعلوم تھا۔ الغرض جب طریقۂ تعلیم بدل دیا جاتا ہے اور پہلے حروف ہجا کی تعلیم کے بجائے، جو ان کے لیے اجنبی اشیا ہیں، بین وگو کے طریقے سے الفاظ و فقرے پڑھنا سکھایا جاتا ہے، تو وہ شوق سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، کیونکہ اس میں فوری مقصد پورا ہو جاتا ہے اور وہ انھیں الفاظ و فقرات کا پڑھنا سیکھتے ہیں، جو ان کو پہلے سے معلوم ہوتے ہیں۔ تجربے میں آیا ہے کہ جو طالب علم حروفِ تہجی کے طریقے سے پڑھتے ہیں بہت کم ترقی کرتے ہیں، لیکن بین وگو کے طریقے سے اس قدر اچھے نتائج ظہور میں آئے ہیں کہ دیکھنے اور سُننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔

چونکہ "تہجی" کا طریقہ "نامعلوم" سے "نامعلوم" کی طرف لے جاتا ہے اس لیے وہ فطرت کے مطابق نہیں۔ بچوں کے لیے گویا نئے الفاظ اور فقرات کا پڑھنا "نامعلوم" ہوتا ہے جس کی بنیاد حروف کے "نامعلوم" ذخیرے پر قائم ہوتی ہے لہٰذا تعلیمی میدان میں گویا بچوں کو مجہول سے مجہول کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے، جس سے کچھ بھی ترقی نہیں ہوتی۔ اگر اس طریقے کا دوسرا پہلو دیکھا جائے، تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ اس سے ہم طلبہ کو نامعلوم حروف کے پڑھانا شروع کرانے ہیں اور پھران لفظ کا پڑھنا سکھاتے ہیں جو بحیثیت تحریری الفاظ

کہ ایسے شاذ و نادر افراد کے لیے بھی باطن میں کوئی قوت محرکہ انعام کے ہم پلہ موجود ہو۔ خلاصہ یہ کہ بچے ضرور انعام کے لالچ سے کام کرتے ہیں پس چاہیے کہ ہم بھی انعام کے لالچ سے بچوں میں حصول علم کا شوق اور عمدہ اخلاق پیدا کرنے سے گریز نہ کریں۔ انعام کے لالچ کے بغیر بچے فطرۃً کام نہیں کر سکتے، کیونکہ "کام کو کام کے لیے کرنے" کا میلان تب پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اخلاقی احساس کی کچھ تربیت ہو چکی ہو اور حالانکہ اخلاقی حس کی نشو و نما کے لیے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔ مانا کہ "کام کو کام کے لیے کرنے" کا میلان بچوں میں پیدا کرنا ہمارا ابھی سب سے پہلا فرض ہونا چاہیے جس کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا مگر اس کی تہہ میں بھی انعام کے لالچ کے ہم پلہ کوئی جذبہ مخفی ہو سکتا ہے لیکن اگر اعلیٰ سے اعلیٰ جذبہ یا قوتِ محرکہ موجود ہو تو بھی عقلمندی اسی میں ہے کہ ہم کسی اور ہم پلہ محرک قوت سے بچوں کے اخلاق کی تربیت کریں، ورنہ ان کے جوہر یا تو ضائع ہو جائیں گے یا ضلالت کے راستے کی طرف مائل ہو جائیں گے پس یہ دوسرے درجے کا محرک جو اس وقت بچوں کے لیے مشعل راہ ہوتا ہے "انعام کا لالچ ہے"۔

"انعام کے لالچ" کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سے ہر روز دعائیں کہلاتے ہیں کہ "اے پاک پروردگار ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر آپ نے انعام کیا" ظاہر ہے ہم جو عبادت کرتے ہیں اس سے فوری مقصد بہت کم پورا ہوتا ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مطلقاً نہیں ہوتا۔ ایسے بہت لوگ ہیں جو یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں کہ عبادت کرنے والے "عبادت کے لیے عبادت" کرتے ہیں لیکن ہم یہی کہتے ہیں کہ جب خدائے پاک خود فرماتے ہیں کہ ہمیں عبادتوں کا اجر ملے گا تو عبادت کرنے والے بھی ضرور انعام کی خواہش سے عبادت کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عموماً بڑے آدمی تو دور و نزدیک دونوں غرضوں سے کام کرتے ہیں لیکن بچے عموماً نزدیک ہی کی غرض سے کام کرتے ہیں۔ اس سے لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ بڑے تو "کام کو کام کی غرض سے" کرتے ہیں اور چھوٹے کسی خاص انعام کی غرض سے۔ دراصل سب غرض ہی کے بندے ہوتے ہیں اور "انعام کے لالچ" کے آدمی کا راج عالمگیر ہے۔

کم سے کم اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بچے طبعاً انعام کے لالچ سے کام کرتے ہیں اور ان میں حصولِ علم کا شوق اور عمدہ اخلاق انعام ہی کے لالچ سے پیدا ہو سکتا ہے۔

جو کام بچے بغیر انعام کے لالچ کے کرتے ہیں وہ کھیل کود ہے، جو نہ عمدہ اخلاق ہے اور نہ حصولِ علم کا شوق، گو بالواسطہ ان دونوں کے لیے مفید ہے۔

بچے کا ذہن پیدا ہوتے ہی طبعی میلان ظاہر کرتا ہے جسکی مقدار شروع میں تو بہت قلیل ہوتی ہے لیکن بعد میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک بچے کی زندگی میں سب سے پہلی طبعی رغبت چھاتی کو چوسنا ہے جسوقت اسے دودھ پلاتے ہیں وہ بہت خوش ہوتا ہے لیکن جسوقت دودھ اسکے منہ سے ہٹایا جاتا ہے تو وہ بہت رنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت صاف طور پر دودھ کو دوبارہ حاصل کرنیکا میلان بچے میں دکھائی دیتا ہے۔ جوں جوں بچے بڑھتے جاتے ہیں انکی طبعی رغبتیں بھی بڑھتی جاتی ہیں بعض رغبتوں کو ہم پسند کرتے ہیں بعض کو ناپسند۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی اور اخلاقی معیار کے مطابق ان رغبتوں کو ڈھال لیں تاکہ جو افعال بچوں سے وقوع میں آئیں وہ ایسے ہوں جن میں حصولِ علم کا شوق اور پسندیدہ اخلاق کے اعمال پائے جائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم ناپسندیدہ میلان کو پسندیدہ میلان میں تبدیل کر سکتے ہیں؟ قدرت اس معاملے میں ہماری معاون ہے یا مانع؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم بچوں کی نیک رغبتوں کو ہمیشہ نیکی کی جانب ترقی کرتے ہوئے دیکھیں؟ اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جب ہم بچوں کی ایک ناپسندیدہ رغبت کو بدل چکیں تو وہ پھر پرانا راستہ اختیار نہ کرنے پائے؟

رنج و راحت کے قانون کی مدد سے بچوں کی طبعی رغبت میں بہت کچھ تغیر ہو سکتا ہے۔ جب ایک ناپسندیدہ فعل کے ارتکاب پر ایک باپ اپنے بچے کو مناسب سزا دیتا ہے تو وہ اس غرض سے ایسا کرتا ہے کہ بچے کی ناپسندیدہ رغبت مفقود ہو جائے اور اسکے بجائے پسندیدہ رغبت اس میں پیدا ہو جائے۔ گھوڑوں کا سدھانے والا ایک گھوڑے کو ایک مشکل کرتب دکھانے کے بعد ایک کھانڈ کی ڈلی اسی لیے دیتا ہے کہ گھوڑے کو اس بات کا شوق پیدا ہو کہ ہمیشہ ایسا کام کیا جائے جس کا نتیجہ انعام ہو۔ بچپن میں ذہن تر و تازہ

سکتا ہے۔ایک ناپسندیدہ میلان انعام کے لالچ سے پسندیدہ میلان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ زمانۂ مابعد میں وہ عمل کثرتِ مشق سے پختہ عادت کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور عادت دوسری طبیعت ہوتی ہے جسکا ترک کرنا دشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا فعل مذموم ہمیشہ کے لیے فعل محمود میں تبدیل ہوجاتا ہے اور بعد میں اگر انعام کا سلسلہ بند کردیا جائے، تو بھی فعلِ محمود ہی وقوع میں آتا رہتا ہے۔

مندرجۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں میں حصولِ علم کا شوق اور پسندیدہ اخلاق انعام کے لالچ سے پیدا کرنے کی کوشش کرنا قدرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے، لیکن اس سے بھی ہم انکار نہیں کرسکتے کہ یہ معاملہ ہر طرح سے سادہ نہیں۔اس اصول کے استعمال میں بہت سمجھ کی ضرورت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک کام کی رغبت مسلسل بیکار اور معطل رہنے کے سبب سے مردہ ہوجاتی ہے اور اسکے بالمقابل میلان جو اس کے بجائے پیدا کیا گیا ہے، کثرتِ استعمال سے عادت کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انعام مناسب ہونا چاہیے اور جب تک پسندیدہ میلان اچھی طرح جاگزیں نہ ہوجائے، تب تک بری رغبتوں کی تبدیلی کے درپے رہنا چاہیے۔بعد میں نیک میلان محکم طور سے جگہ پکڑ لیں گے اور بغیر انعام کے اپنے کرشمے دکھاتے رہیں گے اور برے میلان ہمیشہ کے لیے مفقود ہوجائیں گے۔

پھر بھی بعض کا یہ خیال ہے کہ ہمارے ضبط سے اگرچہ بچوں کے افعالِ شنیعہ کچھ عرصے کے لیے رک جاتے ہیں، تاہم یہ ضروری نہیں کہ ناپسندیدہ میلان کی بیخ کنی بھی ساتھ ہی ہوجائے اور اگرچہ انعام کے لالچ سے نیک اعمالی کا اظہار بچوں میں پیدا کیا جاسکتا ہے، تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہم ان میں پسندیدہ میلان بھی پیدا کرسکیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ بری عادتیں بعض اوقات بچوں میں دوبارہ ظاہر ہوسکتی ہیں کیونکہ ان میں اس قسم کی رغبتوں کا تخم موجود ہے۔یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے۔ایک باپ اپنے بچے کی سگریٹ نوشی کی عادت چھڑانا چاہتا ہے۔وہ جب اسکو سگریٹ پیتے دیکھتا ہے تو اُسے سزا دیتا ہے۔بچہ خیال کرے کہ اگر میں سگریٹ نہ پیوں، تو میرا یہ انعام ہوگا کہ میں سزا سے بچ جاؤں گا تو وہ سگریٹ پینا

کر دیتا ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سگرٹ نوشی کا شوق قطعاً مفقود ہو گیا یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے باپ سے دور ہو کر سگرٹ پہلے سے بھی زیادہ شوق کے ساتھ پیے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی بات وجہ تسلی ہے تو صرف یہ کہ فعل کے ترک سے اس فعل کی رغبت بھی مردہ ہو جاتی ہے" ممکن ہے کہ سگرٹ پینے کی مشق کم ہو جانے سے سگرٹ پینے کا میلان بھی کم ہو جائے اور پھر اس مشق کے کچھ مدت چھٹ جانے سے بُرا میلان بالکل مفقود ہی ہو جائے۔ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جزا سزا میلان کے مطابق ہونی چاہیے۔ وہ نہ صرف یقینی ہونی چاہیے بلکہ ماحول ایسا پیدا کرنا چاہیے کہ کچھ عرصے کے لیے بچوں کو برائیوں کی جانب دوبارہ مائل ہونے کا موقع ہی نہ ملے تو انہیں شدہ شدہ راہ راست پر چلنا آسان ہو جائیگا۔ بچے پھر کبھی نہ ڈگمگا ئینگے۔ نئی نیک عادتیں ایسی پختہ ہو جائیں گی جیسی پرانی بد عادتیں تھیں طبعی میلان اور اکتسابی میلان میں بالکل کوئی تمیز نہ رہے گی۔

حسن ظن سے بہت کام نکلتے ہیں۔ یہ ہر بچے کا میلان ہوتا ہے کہ اُسے نیک کہا جائے اور جو کام وہ کرے اسکی داد دی جائے۔ جب ایک بچہ ایک نیک رغبت ظاہر کرتا ہے خواہ وہ میلان حصول علم سے متعلق ہو یا عمدہ اخلاق سے بہر صورت ہمیں چاہیے کہ ہم اس کی تعریف کریں۔ اس سے اسکا نیک میلان خاطر بہت زیادہ پختہ ہو جاتا ہے جب شروع شروع میں ہم بچے کو مائل بہ نکوئی خیال کر کے اسکے ہر حسن عمل پر مناسب طریقے سے آفرین کہتے ہیں تو وہ ہمارے حسن ظن کے مطابق کام کرنے کی کوشش کر کے ہمیشہ کیلیے پسندیدہ افعال حمیدہ بن جاتا ہے ہماری اس ترغیب سے نہایت خوشگوار نتائج نکلتے ہیں گو یا بچے ہمارے مشورے سے ہماری مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں تو انکے نیک افعال ایک بڑی حد تک آزادانہ واقع ہوتے ہیں، مگر اس حالت میں بھی جو تعریف ہماری طرف سے ہوتی ہے انعام ہی کی ایک صورت ہے لحظہ مابعد میں گو کم ہوتے ہوتے کالعدم ہو جاتی ہے مگر بچے پھر بھی نیک افعال ظاہر کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کا میلان خاطر نیکی کی جانب مستقل طور پر قائم ہو جاتا ہے۔

ایک بدعادت عمل کی کمی سے بہت بڑی حد تک رُک سکتی ہے اور آخر کو وہ وقت آپہنچتا ہے کہ رغبت بد بالکل مردہ ہوجائے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ صحبت کا اثر بہت ہوتا ہے لیکن اس اصول سے کام لینا آسان نہیں۔ اپنی سادی صورت میں یہ اصول یہ مطلب ظاہر کرتا ہے کہ اگر ہم ایک برے شخص کو ایک نیک شخص کے پاس زندگی بسر کرائیں گے تو یہ شخص نیک ہوجائیگا لیکن چونکہ اس کی ایک دوسری صورت بھی ہے جس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ایک نیک شخص ایک برے شخص کی صحبت میں رہ کر بد ہوجائے، اسلیے ضرورت ہے کہ اس بچے کو جس میں حصول علم کا شوق نہیں یا جس کا اخلاق اچھا نہیں، ایسے نیک بچے کی صحبت میں رہنے کی ہدایت کریں جس کی عادتیں مستقل طور پر نیک ہوچکی ہوں۔ پھر بھی معاملہ اس جگہ نہیں ٹھیرجاتا بلکہ ہمیں اس بات کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ بد خلق اور نالائق بچے سے اس حد تک قبیح افعال نہ سرزد ہوگئے ہوں کہ اُن سے یہ بات ثابت ہو کہ ان افعال شنیعہ کا مادہ یعنی رغبت بد مستقل طور پر جڑ پکڑ چکی ہے۔ سچ پوچھیے تو "الصحبت مؤثر" کے اصول پر حقیقی معنوں میں اس وقت کاربند ہوسکتے ہیں، جب ہم مندرجۂ بالا تدابیر سے بچے کو ایسے بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے دیں، جو اس سے زیادہ مستحکم نیک عادات رکھتے ہوں۔ جب ہم اس طرح سے اس کے لیے نیک صحبت کے اسباب پیدا کردیں گے تو گویا یہ اس کے لیے ایک لحاظ سے انعام ہوگا، کیونکہ وہ اپنے نیک اعمال سے خوشی حاصل کرکے آزادی سے خود بخود ایسے رفیقوں کی تلاش میں ہوگا، جو اُسے نیک اعمال میں مدد دیں۔ ہماری نصیحت کارگر نہیں ہوتی، اس لیے کہ ہم نصیحت لینے والوں کے حالات سے واقف نہیں ہوتے۔ پہلے ہمیں نصیحت حاصل کرنے کا میلان دوسروں میں پیدا کرنا چاہیے بعد میں ان کو نصیحت کرنی چاہیے۔

(کاپی راسٹ)

(۲) سابقہ کتابوں میں انتخاب مضامین و عبارات کے وقت جماعتوں کے ذہنی ارتقا اور ان کی علمی قابلیت کا پورا خیال نہیں رکھا گیا۔ ان کتابوں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور زبان سلیس اور آسان استعمال کی گئی ہے۔

(۳) اس امر کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ جملے چھوٹے چھوٹے ہوں تاکہ عبارت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

(۴) ہر سبق کے آخر میں مختلف مشقیں دے کر گرامر اور کمپوزیشن کی مشق کا عملی موقع اور مواد مہیا کیا گیا ہے۔

(۵) فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے بھی اسی قسم کے جملے دیے گئے ہیں، جن میں کتابی الفاظ کی ہلکی سی تبدیل شدہ صورت ترجمے میں بہت ہی ممد و معاون ہو سکتی ہے۔

(۶) فارسی میں گفتگو سکھانے کے لیے "مکالمہ" و "گفتگو" کے عنوان سے متعدد اسباق دیے گئے ہیں تاکہ اس طرح طلبہ اس طرزِ گفتگو سے قدرے واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۷) تیسری کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی شان یہ ہے کہ ہر ایک سبق اور ہر ایک کہانی کا خلاصہ اور نچوڑ عنوان کی صورت میں طلبہ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد ۲	فروری ۱۹۳۷ء	نمبر ۵

فہرستِ مضامین

۱

ایڈیٹوریل

ہمارے ملک میں تعلیم ابھی اتنی عام نہیں ہوئی، جتنا اسے ہو جانا چاہیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تعلیم کی اہمیت کا احساس بہت عام ہوگیا ہے اور اب ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہی اُن کی زندگی کا بہترین سرمایہ بن سکتی ہے۔ تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ مشکلات بھی بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ چند نہایت ہی ابتدائی مراحل ابھی تک وضاحت کے محتاج ہیں، مثلاً: یہ سوال کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے، ایک ایسا مسئلہ ہے، جو ابھی تک حل طلب ہے۔ کیا آپ فرما رہے ہیں کہ تعلیم کا مقصد روزی کمانا ہے؟ درست، لیکن کسب معاش تو تعلیمی مقاصد کا ایک اہم جزو ہے، یہ تعلیم کا واحد مقصد نہیں ہو سکتا۔ انسانی حوائج صرف پیٹ ہی سے متعلق نہیں۔ ہمارے مذہبی، جذباتی اور جمالیاتی حوائج بھی بے انتہا ضروری ہیں اور انھیں کا وجود انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔

ایک اور پہلو پیش نظر کیا جاتا ہے۔ آج ایک بڑی جماعت یہ کہہ رہی ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے، یہاں کی تعلیم کا مقصد زراعت کا فروغ ہونا چاہیے۔ یہ ارشاد بھی بجا ہے لیکن آج کی صنعتی دنیا میں اسے نفع کا سودا نہیں کہا جا سکتا اور تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا کہ نقصان ہی نقصان کا سودا کیا جائے۔

ایک تیسرا سوال ملاحظہ فرمائیے۔ تعلیم لڑکوں کے لیے ضروری ہے کسب معاش اس کا ایک اہم مقصد ہے۔ کیا لڑکیوں کے لیے بھی ایسا ہی نظامِ تعلیم معین کیا جائے، جس کا ایک اہم

۲

مقصد کسب معاش ہو؟

حدیثِ دلکش وافسانہ از افسانہ مے خیزد

مجملاً یوں سمجھیے کہ تعلیم کی نوعیت اور نصاب کی نوعیت کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ کن بات پیشِ نظر نہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ امور ایک بار فیصل ہو جانے کے بعد پھر نظرِ ثانی کے محتاج نہیں رہتے۔ ضرور رہتے ہیں۔ البتہ کام کی ابتدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی اصلیت اور نوعیت سمجھ میں آجائے۔ منزلِ مقصود کا تعین سفر کے پُرلطف اور کامیاب ہونے کا ضامن ہو سکتا ہے۔ صرف سفر اور حرکت بغیر تعینِ منزل کے مہمل سی بات ہے۔ بہرحال یہ وہ اصولی امور ہیں، جو ہر مدرس کے پیشِ نظر ہونے چاہییں لیکن مدرس کے نقطۂ نگاہ سے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے اس کے علاوہ اور چند امور بھی فوری قابلِ توجہ ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک مدرسے میں آپ ملازم ہیں۔ وہاں مقررہ نصاب کی تدریس ہوتی ہے۔ آپ کے سپرد اردو یا انگریزی، تاریخ یا جغرافیہ، ریاضی یا سائنس کی تدریس ہے۔ کیا آپ کا کام صرف اسی قدر ہے کہ مقررہ کتابیں اور مقررہ مضامین طلبہ کے ذہن نشین کر دیں؟ کیا آپ کا کام صرف اسی قدر ہے کہ طوطے کے پنجرے کو سامنے رکھ کر اس پنجرے میں مقید طوطے کو صرف یہ رٹوا دیں "مٹھو بیٹے! بنی جی بھیجو" اور جب طوطے سے بات چیت کی جائے، تو وہ بے محابا "مٹھو بیٹے! بنی جی بھیجو" کی رٹ لگا دے؟ بالفاظِ دیگر کیا آپ کا مدعا اور فرض اس قدر ہے کہ آپ کے طلبہ مقررہ نصاب کو حسبِ ضرورت زبانی یا تحریری طور پر طوطے کی طرح پیش کر دیں؟ اس کا جواب ہر شخص نفی میں دے گا اور یہ کہے گا کہ تدریس کا یہ مقصد انتہائی مذموم اور ناکارہ ہے اور اس کا اختیار کرنا چشمِ بصیرت کی کوری ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مضمون کے شریکِ نصاب ہونے کی اہمیت اور ضرورت سے کما حقہٗ طور پر واقف ہوں اور ان مضامین کی تدریس کرتے ہوئے متعلق مضمون کی اہمیت

اور ضرورت کو پیش نظر رکھیں۔ اردو کی تدریس کا صرف یہ مقصد نہیں کہ نوشت و خواند آجائے اور امتحان میں طلبہ کامیاب ہو جائیں۔ اس کا مقصد اس سے کہیں بالا اور ارفع ہے۔ ہر زبان ملت کی تہذیب اور اخلاق کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ قومی محسوسات کے اعلان کا واحد اور مکمل ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مدرس اردو کی تدریس کرتے ہوئے ان اہم باتوں کو نظر انداز کر دے تو سمجھ لیجیے کہ وہ طوطے کو صرف 'مٹھو بیٹے' رٹوا رہا ہے۔

تاریخ اور جغرافیے کی تدریس کا یہ مقصد نہیں کہ مقامات کا نام اور چند صلحناموں کی تاریخیں اور سن نوک زبان ہو جائیں۔ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو ایک برادری تصور کر کے ان کے حالات، ان کی ضروریات، ان کی مالی مشکلات سے آگاہی حاصل ہو۔ آپ کا ایک عزیز سفر سے واپس اپنے وطن پہنچتا ہے۔ آپ گھنٹوں دریافتِ حالات اور کیفیات میں لگا دیتے ہیں۔ کیا کیا گزری، کیا کیا دیکھا، کیا کیا کرتے رہے، تفصیل کے ساتھ معلوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ تاریخ اور جغرافیے کا مدرس طلبہ میں ایک ایسا شوق پیدا کر دے کہ کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی مخلوق کے حالات گزشتہ اور موجودہ معلوم کرنے میں طلبہ کو وہی مسرت اور لذت حاصل ہو جو اپنے اعزا اور احباب کے خطوط کے پڑھنے اور ان سے ملاقی ہونے پر ہوتی ہے۔

ریاضی اور سائنس، اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ کے رٹ لینے کا نام نہیں۔ انسان ابتدائے آفرینش سے اپنے سوا تمام مخلوق عالم کو فتح کرنے اور اپنی ضروریات اور مفاد میں صرف کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس کوشش کا ماحصل ہمارا ریاضی اور سائنس کا علم ہے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہمارے طلبہ اس علم کو خواہ وہ کتنا ہی ابتدائی کیوں نہ ہو اپنی زندگی میں صرف کرنے کی صلاحیت نہ

حاصل کریں۔

مختصر صورت یہ ہے کہ مدرس تدریس کے دوران میں یہ ہر لمحہ مدنظر ر
کی تدریس ہی اس کا مقصد نہیں، بلکہ اس کی کوشش طلبہ کی تعلیم ہے اور یہ ا
ہے، جب ہمارے مدرس ہر مضمون کی اہمیت اور حیثیت سے خود نہایت اچھی
ہوں اور اس وقوف کے بعد یہ کوشش کریں کہ حقیقی تعلیم وہی کہلائی جا سکتی
علوم انسانی کو حیات انسانی سے ہم آہنگ بنا دیا جائے۔

سنہ ۱۹۳۶ء

مندرجۂ ذیل مقالہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی کے پرنسپل کی وہ تقریر ہے جو سنہ ۱۹۳۶ء کے خاتمے پر دہلی سے براڈکاسٹ ہوئی تھی۔ ہم علیگ علی گڈھ سے آپ کے لیے نقل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح ہندوستان کی اُن بزرگ شخصیتوں میں سے ہیں، جنھوں نے طریقۂ تعلیم کو نہ صرف علمی و ذہنی طور پر، بلکہ عملی طریق پر بھی آسمانِ عروج پر پہنچا دیا۔

جب سامنے کوئی بڑا میدان ہو، تو اچھی طرح دیکھنے کے لیے آدمی کسی اُونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب بہت سے واقعات کو ایک ہی نظر میں سمجھنا ہو، تو پھر کسی ایسے خیال یا میلان کا پتہ چلانا ضروری ہے، جو ان سب واقعات کی یا ان میں سے بہتوں کی تشریح کر سکے اس طور پر اَن گنت واقعات کے بکھرے ہوئے موتی ایک ہی دھاگے میں پروئے جا سکتے ہیں۔ جو سنہ ۳۶ء پر جواب ختم ہو گیا ہے، نظر کیجیے تو مختلف اور بے شمار واقعات کے چھوٹے بڑے موتی بکھرے دکھائی دیتے ہیں، ایک ایک کا نام بنام ذکر کرنا مقصود بھی نہیں اور بحالتِ موجودہ ناممکن بھی ہے، اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ ان میں کچھ ربط پیدا کر دوں۔ اس طور پر قیاس ہے کہ بہت سے واقعات ایک ساتھ ذہن نشین ہو سکیں گے۔

پچھلی بڑی جنگ سے پہلے دنیا کی سطح، اس عظیم الشان تمدن کی نیو اس خیال پر تھی کہ ہر آدمی کو سوچ بچار اور کام کاج کی پوری پوری آزادی ہونی چاہیے۔ آدمی کی جبلت قدرتی ہے، اس لیے اسے ٹھیک ہی راہ دکھاتی ہے، یہ اپنی جبلت پر چلنے لگے، کوئی روک ٹوک نہ ہو، پابندیاں نہ ہوں،

تو اس کی سماجی زندگی میں آپ ہی آپ امن و آشتی صلح اور شانتی پیدا ہو جائے۔ جو بات الگ الگ ملکوں کے باشندوں کے لیے صحیح تھی وہی آپس کے ملکوں کی بابت ٹھیک سمجھی جاتی تھی۔ کوئی پابندی آپس کے تعلقات پر نہ ہو۔ یہ خیال تھا کہ وہی صورت پیدا ہو گی جو سب سے بہتر ہے۔

یہ دنیا اصل ان قوی، حوصلہ مند اور نفع طلبوں کی وقتی ہمتوں کی ذہنیت کا پرتو سیاست میں لبرل جمہوریت کی شکل میں اور معیشت میں سرمایہ داری کے روپ میں سامنے آیا۔ آج کہ یہ ختم ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے جس کا جی چاہے اس پر ہنس لے اور اس کی لاش چھپا لے جتنے ورثے سارے لگی تھی پر حیرت میں ڈالنے والی دنیا ہے اس نے ساری دھرتی کا چہرہ ایسا بدلا کہ پہچان نہ پڑتا تھا۔ اس کے ہنر بھی بڑے تھے اور عیب بھی بڑے۔ اس نے جو کامیابیاں حاصل کیں اس کا پہلے کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ہاں یہ جب ہے کہ کامیابی کا راستہ خون کی ندیوں پر سے گزرا یا آدمیوں کی ہڈیوں کے ڈھیروں پر سے۔ لیکن اب وہ دنیا تھک چکی۔ اس کے کارفرماؤں کے بازو شل ہو گئے۔ اب یہ مقابلے کی کلفتوں سے گھبراتی ہے اور مسابقت کے کاموں کی دھوپ سے بچ کر بندھی آمدنی، پائدار چاہے کمتر سہی، خوشحالی کی چھاؤں میں آرام سے بیٹھنا اور ستانا چاہتی ہے، تغیر و تبدل سے بیزار ہے، ثبات چاہتی ہے اور قرار، اسے ضرورت ہے تنظیم کی، آزادی کی جگہ پابندی کی، تیز اور تند بے قراروں کی جگہ یکسانیت کی، فرد کی جگہ جماعت کی۔ اکیلے کی جگہ سماج کے بھلے کو سامنے رکھنے کی۔ چنانچہ لبرل جمہوریت بھی ختم ہو رہی ہے اور آزاد تجارت، آزاد ہوا دے والی سرمایہ داری۔ نظام معیشت کی بھی پابندیوں کا زمانہ آیا ہے۔ چاہے چھوٹی جماعتوں کی پابندیاں ہوں چاہے بڑی جماعتوں کی، چاہے ٹرسٹ کی طرف سے ہوں، چاہے ریاست کی طرف سے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف مقابلے کی جگہ اجارہ داری کا بول بالا ہے اور ہر ملک اگر بن پڑے تو اپنی ضرورتیں آپ مہیا کرنا چاہتا ہے۔

مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کا رقبہ خاصا ہو، آبادی کافی ہو، قدرتی وسائل ہر قسم

ے موجود ہوں یا پھر سمجھوتے یا جبر سے دوسرے ملک مٹ جائیں اور ان کا الگ خود کفالتی نظام بنے
ثال کے طور پر روس کو لیجیے، اس کا رقبہ بے پایاں، وسائل قدرتی وافر، آبادی میں طبقوں کی جو
تفریق تھی، امیر، غریب، کسان زمیندار کا جو امتیاز تھا، وہ ایک انقلاب نے یک قلم مٹا دیا۔ اب وہ تمام
اپنے وسائل کو ترقی دے سکتا ہے اور بغیر کسی سے زیادہ واسطہ رکھے اپنی آبادی اور معیارِ زندگی کو بہتر
بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن چونکہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ رقبہ ہے اور آبادی اتنی ہے نہیں، اس لیے
بعض پڑوسیوں کی للچائی نظریں اس پر پڑتی ہیں جن کا ملک تنگ اور آبادی زیادہ ہے۔ وہ پھیلنا
چاہ رہے ہیں اور پھیلنے کا ایک میدان انھیں روس میں نظر آتا ہے، یعنی، ایک طرف جرمنی ہے اور
ایک طرف جاپان، روس نے جو ان کی نظر ذرا بدلی دیکھی، تو یورپ کے ملکوں سے جن سے یہ ایک مدت
سے الگ تھلگ تھا میل جول بڑھایا، اس سال فرانس سے ایک معاہدے کی تصدیق ہوئی۔ ادھر
یہ ہوا، اُدھر جرمنی نے جاپان سے ساز باز کیا، چنانچہ روسی فرانسیسی میثاق کی تصدیق اور جرمنی جاپان
کا معاہدہ اس سال کے نہایت اہم واقعات میں سے ہیں اور اہمیت میں کمتر کچھ یہ واقعہ بھی نہیں کہ
روس کی منظم اشتراکیت نے اپنے یہاں ایک خالص جمہوری پارلیمانی نظامِ حکومت قائم کر دیا تاکہ
امیر و غریب کی تفریق مٹانے کے بعد کسان اور صنعتی مزدور کی تقسیم جس میں مزدور کا پلہ بے جا طور پر بھاری
تھا وہ صورت بھی ختم ہو اور کسان دل سے نئے نظام کے ساتھ ہوں اور جاپان و جرمنی کے مقابلے میں
دل و جان سے اپنے نئے تجربے کی حمایت کریں۔

پھر بعض ملک ایسے ہیں، جو خود بھی وسائل رکھتے ہیں اور بات پکی کرنے کو آس پاس کے
کمزور ملکوں کو بھی اپنے اثر میں رکھ سکتے ہیں، جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ اس علاقے میں امسال سب سے
اہم واقعے میری نظر میں دو ہیں، ایک صدر روزولٹ کا دوبارہ انتخاب اور ایک براعظم امریکہ کی حکومتوں

کی کانفرنس بیونس آیرز میں روزولٹ کی کامیابی اس لیے اہم ہے کہ وہ بے روک ٹوک مقابلے کے خلاف سکون وقرار اور ثبات کی معیشت اور سیاست کا بہت بڑا کارکن ہے اور یہ فتح اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ نفع طلب معیشت کے سارے سنہری دیوتا، امریکہ کے سارے مالدار اور ان مالداروں کے سارے اخبار اس کے خلاف پرا باندھے تھے۔ امریکہ کے کوئی اسی فی صدی اخبار اس کے مخالف تھے، مگر باوجود خود غرض دولت کے اس نرغے کے یہ پھر چار سال کے لیے بڑی جمہوریت کا سردار منتخب ہو گیا۔ دوسرا واقعہ یعنی بیونس آیرز کی کانفرنس اس لیے اہم ہے کہ یا امریکن جمعیۃ اقوام کے وجود میں لانے کا پیش خیمہ ہے۔ براعظم امریکہ میں یوں نہیں باہر کی حکومت ریاست ہائے متحدہ کی مرضی کے بغیر دخل نہیں دے سکتی، مگر اب یہ منصوبہ ہے کہ اس براعظم کو ایسا مستحکم بنالیا جائے کہ ساری دنیا میں کچھ ہو یہ امن چین سے گزر کرتے رہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے اور بھی ہوئی کہ جرمنی، جو اپنے پھیلاؤ کے لیے کبھی روس پر نظر ڈالتی ہے کبھی انگلستان اور فرانس سے اپنی افریقی نوآبادیاں واپس چاہتی ہے کبھی بلقان اور وسطی یورپ کی ریاستوں کو ملا کر ایک معاشی (BLOCK) بلاک بنانا چاہتی ہے، اس کی نظر جنوبی امریکہ پر بھی ہے اور برازیل میں اس کا تجارتی اثر بہت بڑھ رہا ہے۔ ریاستہائے متحدہ بروقت اس کا تدارک کر کے اپنے براعظم کو اپنے ہی لیے رکھنے کا انتظام کر رہی ہیں۔

پھر اس قسم کا ایک کم و بیش خود کفالتی نظام سلطنتِ برطانیہ کا ہے، لیکن اس کے مختلف رکن ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں، اس لیے راستوں کا مسئلہ اس کے لیے بہت اہم ہے جہاں کوئی خطرہ کسی بحری راستے کے لیے ہوا اور ان کے کان کھڑے ہوئے مثلاً اس سال اسی راستے کی وجہ سے اٹلی سے ٹھن ہی گئی تھی اور اب اسی راستے کی وجہ سے حال میں اٹلی سے "بھلے مانسوں والا" سمجھوتہ ہوا ہے۔ اٹلی کی ابھرتی ہوئی طاقت کے خلاف توازن قائم رکھنے کے لیے مصر سے مدتوں کے ٹنٹے چکا دیے گئے اور اب برطانیہ اور مصر میں دو خود مختار ریاستوں کا سا مستقل معاہدہ ہے۔

فلسطین کی بے چینی رفع کرنے کے لیے فوج کا بھیجنا اور پھر جلد ہی فوج کا واپس بلا لینا اور کمیشن کا بھیجنا اور کمیشن کے بائیکاٹ کے باوجود اور اس کی رپورٹ سے پہلے ملک میں آنے والے یہودیوں کی تعداد کو کم کر دینے کا اعلان کر دینا یہ سب بحر روم کی سیاست کی کمزوریاں ہیں اس لیے کہ جہاں جبرالٹر اور مالٹا اس راستے کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں، وہاں فلسطین کے ساحل اور حیفہ کی بندرگاہ سے بھی بہت کچھ کام نکل سکتا ہے۔

ہندوستانی حکومت کے جس نئے دستور کا اعلان اس سال ہوا ہے اور جو برطانوی سلطنت کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، وہ بھی اسی لیے کہ ہندوستان رفتہ رفتہ اس سلطنت میں برابر کا رکن بن کر اس کی زندگی کے ثبات و قرار میں مدد دے اور ملک کے باثر حلقوں میں اس دستور کی جو مخالفت ہے اور کہیں چرخہ اور دیہی دستکاریوں کو زندہ کرنے، کہیں بڑی دیسی صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش ہے آبادی کے مختلف طبقوں میں تفریق مٹانے کی آرزو، جو کہیں اشتراکیت کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے اور کہیں ذات پات اور چھوت چھات کے ڈھونگ کو مٹانے کی کوشش ہے یہ بھی کیا عجیب ہے کہ اس بڑے ملک کی بے سمجھی، بے بوجھی، غیر شعوری تمنا ہو کہ یہ بھی کبھی اپنا ایک خودکفالتی نظام قائم کرے پھر چھوٹے چھوٹے کم آباد ملک ہیں، جو اکیلے زندگی کی تنظیم نہیں کر سکتے اور نہ اتنے طاقت ور ہیں نہ اتنے خود غرض کہ دوسروں کے دیس فتح کر کے اپنی زندگی کی تنظیم کرنا چاہیں۔ یہ آپس میں مل کر ایک نظم قائم کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں چنانچہ اس سال کا اہم واقعہ ہے کہ ترکی، ایران، عراق اور افغانستان میں ایک باہمی معاہدہ ہو گیا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنی صنعتی پستی کے باعث باہم مل کر بھی پوری تنظیم نہ کر سکیں، تو شاید کسی دوسرے گروہ سے بھی ملیں اور چونکہ ملنے کا امکان ہے، اس لیے سیاست کے ڈورے ان پر پڑتے رہیں گے اور یہ اپنی دانشمندی سے ان سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے جیسا کہ ترکی اس سے فائدہ اٹھا کر درۂ دانیال کی قلعہ بندی کے معاملے میں کامیاب ہوا پھر ایسے چھوٹے

ملک ہیں، جنھوں نے پچھلی مرحوم دنیا میں پر پرزے نکالے تھے ہیج۔ پہلی ان کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کہ بہ اُڑنے چہکنے کے قابل ہوئے تو وہ چمن ہی اُجڑ گیا۔ اُن کی جوانی ہے، ان میں قوت ہے اور ولولہ ہے۔ یہ کہاں رُکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اپنی دنیا آپ پیدا کریں گے، دوسرے ملکوں کو دبانے کی فکریں کر رہے ہیں، انھیں میں جاپان ہے، جس نے پہلے منچوریا کا علاقہ دبا لیا تھا، اس سال چین میں رن جوتے رہا۔ سال بھر گڑبڑ رہی۔ کبھی منچوریا، منگولیا کی سرحد پر کوئی حادثہ ہو گیا، کبھی منچوریا اور روس کی سرحد پر۔ روس سے برابر کشیدگی بڑھتی رہی۔ روس نے بیرونی منگولیہ سے معاہدہ کیا، تو جاپان نے جرمنی سے معاہدہ کرکے دنداں شکن جواب دیا۔

ہاں اس سال میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ چین والے اتنے تنگ ہو گئے کہ اب شاید جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔ ان کی مرکزی حکومت کے سردار چنگ کائی شک پر یہ الزام ہے کہ وہ بہت اعتدال پسند ہے اور جاپانیوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس جاپانی مصیبت کے ذریعے اپنے بیشتر ملک کو متحد کرنا چاہتا ہے اور اس میں بہت کچھ کامیاب بھی ہوا ہے۔ جنوبی صوبے پہلے اسی وجہ سے بگڑے تھے، انھیں اس نے دبا لیا اور ملا لیا۔ اب شمالی فوج نے بگڑ کر اس کو گرفتار کر لیا تھا تو وہاں سے بھی یہ صحیح سلامت آگیا۔

چینی کمیونسٹوں سے اس کی سخت مخالفت ہے، لیکن وہ تک اس کے ساتھ جاپان کے مقابلے کو تیار ہیں۔

کیا عجب کہ چنگ نے سن یات سن کی قبر پر جو قسم کھائی تھی کہ جب تک اہلِ چین کو متحد نہ کر لونگا دم نہ لونگا۔ وہ پوری ہو جائے اور یہ ملک جاپانی دست درازی کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو انگریز اور امریکہ والے بھی جو جاپان کے تسلط کو کسی حالت میں پسند نہیں کرتے، اس کی مدد کریں گے مگر ایسا ہو، تو جاپان غالباً چین کو چھوڑ کر جنوبی جزیروں میں امریکہ اور انگلستان سے براہِ راست ٹکر لیگا

اور کوشش کریگا کہ اپنی منظم معیشت کے لیے وہاں راہ نکالے۔

پھر یورپ کے چھوٹا سا علاقہ اور ریاستوں کی ریل پیل یہاں خود کفالتی زندگی کا نظام قائم کرنے میں ہر ایک کی ہر ایک سے ٹکر ہو جاتی ہے، اس لیے یہیں سے زیادہ جھگڑے ٹنٹے ہیں یورپ میں اٹلی اور جرمنی پھیلنے کے لیے بے تاب تھے سو اٹلی نے تو ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود حبش میں اپنے لیے جگہ نکال ہی لی اور جرمنی ابھی دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور اس کی کوششوں نے یورپ کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ روس سے اس کی ان بن کا حال کہہ ہی چکا ہوں۔ فرانس کو یا اپنی طرف سے برابر اطمینان دلاتا رہا ہے، مگر اسے توڑ کر کمزور کرتا جاتا ہے خصوصاً اسپین میں خانہ جنگی کرا کے اور بلجیم سے الگ تھلگ رہنے کا اعلان کرا کے اس نے فرانس کے دو ایسے ساتھی توڑ لیے جن کی سرحد فرانس سے ملتی ہے۔ پھر وسطی یورپ میں اقتدار چاہتا ہے۔ پہلے اسی وجہ سے اٹلی سے کھنچا ہوا تھا، مگر جب سے اٹلی کو حبش ملا، تو اب یورپ میں جھگڑے کم کر کے امن سے اپنی سلطنت کو ترقی دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہنگری، اٹلی، اسٹریا اور جرمنی میں اس سال سمجھوتہ ہو گیا ہے

پھر بلقان کی ریاستوں کا ایک اتحاد، ایک اتحاد یگوسلاویا، جس کو سلاویگا اور رومانیہ کا (Little Entente) کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ خود کفالتی نظام نہیں بنا سکتے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ کسی بڑے گروہ میں شریک ہوں۔ چنانچہ وسطی یورپ کی ایک معاشی جمعیت کا مسئلہ بار بار اُٹھتا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کی قیادت جرمن کو ملتی ہے یا اٹلی کو یا فرانس کا اثر قائم رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ ملک سمٹ کر یا مل کر دنیا میں بڑے بڑے خود کفالتی رقبے وجود میں آ رہے ہیں۔ ان کے بننے میں جہاں دقتیں ہیں، وہاں فیصلہ جبر اور جنگ سے ہوتا نظر آتا ہے اور جنگ کے بعد، جو امید پیدا ہو گئی تھی کہ دنیا کا امن سب قومیں مل کر قائم رکھیں گی، وہ ایک خواب کا ثبت ہوا اور جب

اٹلی نے دنیا کی مخالفت کے باوجود حبش کو فتح کر لیا، تو دنیا کی آنکھ کھلی اور ان کے کانوں میں اس پیام کی صدا پہنچی جو شاہ حبش نے آخری شکست سے پہلے برطانوی اخباروں کو بھیجا تھا کہ "میں بل جل کر امن قائم رکھنے کا آخری مورچہ لڑ رہا ہوں، میرے مددگار کہاں ہیں؟ اگر وہ اب بھی نہ نکلے، تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں، دل کی گہرائیوں سے بغیر کسی تلخی کے کہ مغرب فنا ہو جائیگا۔

دنیا جانتی ہے کہ وہ مغرب ہی فنا نہیں ہو رہا ہے، بلکہ وہ تمام دنیا ہی ختم ہے اور ایک نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے، مگر آدمی اب بھی صلح کی منزل تک فساد کے راستے پہنچنا چاہتا ہے اور جنگ کے آتشکدے سے امن کے پھول چننا چاہتا ہے۔ افراد میں آزاد مقابلے کا قانون غلط مانا جانے لگا، مگر قوموں اور گروہوں میں وہی وحشت کا اصول چالو ہے۔ آپ کہیں گے کہ امن کی کوششیں بھی تو ہوئی ہیں۔ جی ہوئی ہیں مگر ان کا ذکر کرتے شرم آتی ہے۔

حکومتوں نے جو کوششیں کیں وہ بھی دیکھیں اور قوموں نے جو کیں وہ بھی دیکھیں جمعیت اقوام کی جتنی ہنسائی اس سال حبش کے معاملے میں ہوئی، اس سے زیادہ اور کیا ہو گی؟

اسپین میں جنگ سے علٰحدہ رہنے کا جو معاہدہ ہوا تھا، اس کا کیا حشر ہوا؟ کس کے آدمی اس بدنصیب ملک میں نہیں لڑ رہے اور کس کا سامانِ حرب اس خوبصورت ملک کو خاکِ سیاہ نہیں بنا رہا ہے؟ خیر یہ تو حکومتوں کا معاملہ تھا، کہتے ہیں کہ ان میں روح نہیں ہوتی، مگر انسانوں میں تو روح ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں برسلز میں ساری دنیا کے امن پسندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی، اس کا ذکر سناؤں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جلسہ غیر سیاسی تھا۔ جرمنی اور اٹلی کو برا کہنے کی اجازت نہ تھی۔ اسپین کے نمائندے کو بولنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اسلحہ کی تجارت کے خلاف جو تجویز تھی، وہ تک بہت مشکل سے منظور ہو پائی اور اس کے مخالف بھی اس خالص غیر سیاسی جلسے میں موجود تھے، تو کیا انسانیت کے نصیب میں یہی دھکے رہینگے؟ ہاں اور نہیں، جب تک انصاف کا قانون شخصی

اور جماعتی زندگی کے لیے یکساں رائج نہ ہو جائیگا، یہی ہوتا رہیگا۔ جب تک انسانیت کا ضمیر نہ بدلیگا اس کا عمل کیسے بدل سکتا ہے؛ مگر اس کے ضمیر کو افراد ہی بدل سکتے ہیں مگر کب؛ زندگی کا کوہستانی دھارا تو بجلی کی طرح تیزی سے بہا جا رہا ہے' اس پر افراد بے قصد بے کس تنکوں کی طرح بہے جا رہے ہیں۔ کیا یونہیں بہتے رہینگے؛ ہاں اور نہیں۔ ہاں جب بے مقصد تنکے بہے ہوے ہی ہوتے ہیں، مگر کبھی کبھی یقین اور ارادے کی پختگی انھیں تنکوں میں وہ جادو کا کہربائی اثر پیدا کر دیتی ہے کہ اس طوفانی دھارے کا رخ تک بدل سکتے ہیں۔ پہلے بدل چکے ہیں، کیا عجب ہے کہ پھر بدل دیں اور نیا آدمی نئی دنیا پیدا کرے۔ آئیے ۳۷ء میں اسی امید کے ساتھ قدم رکھیں ۳۶ء تو ختم ہوا۔

ٹالسٹائے

ٹالسٹائے ویمر سے گوتھا (Gotha) گیا۔ وہاں بھی اسی قسم کے اور مدارس کا معائنہ کیا اور پھر برلن واپس آگیا۔ یہاں ڈیسٹروگ (Diesterury) سے جو برلن کے ٹریننگ کالج کا پرنسپل تھا ملا۔ ڈیسٹروگ پیسٹالوزی کے اصولِ تدریس ادا کی کا شدت سے پیرو تھا اور اس نے اسی اصول پر سرکاری مدارس کی تعلیم کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہر چند کہ اس نے کوئی خاص تنوع سے خود کام نہ کیا تھا مگر پیسٹالوزی کے اصول پر اس قدر عمدہ دستور کار مرتب کیا تھا کہ ٹالسٹائے کا اس سے ملنا ضروری تھا۔ مختصراً اس طرح ٹالسٹائے نے اپنے ہمعصر دستورِ تعلیم سے واقفیت حاصل کی۔

پیسٹالوزی اور فروبل کے اصول اور قوانینِ تعلیم کے متعلق ان لوگوں سے جو اس دستور سے کما حقہٗ طور پر واقف تھے اس نے اپنا علم بہم پہنچایا۔ اس نے نہ صرف کتابوں کے مطالعے سے بلکہ مخصوص مدارس کے معائنے سے اس زمانے کی تعلیم کے حالات دریافت کیے اور اس میں شک نہیں کہ اس علم نے اس کے نظریۂ تعلیم پر کافی گہرا اثر ڈالا۔ لیکن ٹالسٹائے بالطبع ایسا آدمی نہ تھا کہ ہر چیز پر آمنّا وصدّقنا کہتا۔ تنقید کیے بغیر وہ کسی شے کے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات تو اپنے پیشروؤں پر اس نے شدت سے تنقید کی۔ مثلاً اپنے مضمون "مقالۂ تعلیمی" میں نہایت ترشی کے ساتھ اس نے لکھا کہ مختلف نظریاتِ تعلیم اکثر نہایت مختلف اور متضاد اقسام کے بالکل بے بنیادی پر مبنی ہیں مثلاً: روسو، پیسٹالوزی اور فروبل کے نظریے۔ پھر اسی مضمون میں بستان الاطفال پر لکھتے ہوئے کہتا ہے "یہ نہایت ہی مہیب تخلیق ہے جو نئی تعلیم میں ہو رہی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ٹالسٹائے نے اس قدر اپنے ہمعصر وجہ

طریقۂ تعلیم کو اہمیت دی اور دوسری طرف اس طرح اس کی تضحیک کرنے پر آمادہ ہو جانے سے آخر اس کا مقصد کیا تھا؟ میں جواب میں کوشش کروں گا کہ ٹالسٹائے کی تنقید کا اصل اصول ناظرین کی خدمت میں پیش کروں۔

وہ خاص نقص جو ٹالسٹائے نے نئے طریقۂ تعلیم میں پایا وہ اس کی خشکی اور لکیر کا فقیر ہونا تھا۔ کورانہ تقلید خواہ کسی دستور اور نظام ہی کی کیوں نہ ہو اوامر کی سخت اور کرخت شان اختیار کر لیتی ہے اور ہر چند کہ ایک دستور بدل جاتا ہے، مگر اس کے عوض میں پہلے سے زیادہ مہلک نظام کا آجاتا ہے۔ پیسٹالوزی اور فروبل کے مدارس جرمنی میں شدت سے رواج پا گئے تھے اور ٹالسٹائے نے وہیں ان مدارس کی انتہائی سخت گیری اور جکڑبندیوں کو دیکھ کر ان کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا۔ اس احتجاج نے انحراف کی صورت اختیار کر لی۔ وہ یہ غور کرتے ہوئے کہ آیا یہ طریقۂ تعلیم اس کے اپنے وطن روس میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے یا نہیں، بار بار یہ کہہ اٹھتا ہے کہ روسی بچہ جرمنی بچے سے بہت مختلف ہے اور اس میں احساس نفس اور عزت معلم جرمن بچوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں کہ ٹالسٹائے کی اس تعلّی میں کس درجہ واقعیت ہے۔ یہاں جرمنی میں مروجہ طریقۂ تعلیم کو دیکھ کر ٹالسٹائے کا اس نتیجے پر پہنچنا کوئی بڑا اکتشاف نہیں۔ پیسٹالوزی کا دستور تدریس اور اکثر جرمنی مدارس میں جب ٹالسٹائے نے انھیں دیکھا شدت سے رائج تھا۔ مدارس میں پولیس کے قوانین کی طرح سختی برتی جاتی تھی۔ طلبا کو مشین سے زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی اور تعلیم و تعلم میں وہ لچک جو اس کی خصوصیت ہونی چاہیے بالکل مفقود تھی، بلکہ اس کے بدلے ایک ہمہ گیر سختی اور اصولِ تعلیم کی بے جا اور بے معنی شدید پابندی رائج تھی۔ روکاؤ (Rochow) نے ایک مکالمہ جات کا سلسلہ مابین معلم و متعلم مرتب کیا تھا لیکن بہت جلد اس سلسلے کا اصل مطلب فوت ہو گیا اور اس میں طرح طرح کی افراط و تفریط شروع ہو گئی۔

زیلٹر (Zelter) جو اپنے شاگردوں کو سرگم کے سات پردوں کے متعلق پڑھاتے ہوئے ایک سات سیڑھیوں والے زینے پر اتارتا چڑھاتا تھا۔ فوہلمان (Pfohlman) باویریا کا ایک استاد جغرافیے کا سبق دیتے ہوئے لکڑی کے تختے پر دریا پہاڑ بنا ڈالتا تھا ایک اور اُستاد حضرت عیسٰے پر مظالم کو بیان کرتے ہوئے اس کی وضاحت کسی طالب علم کو خوب مار کر کیا کرتا تھا اسی طرح اس تدریس ادراکی نے دوسری صورت یہ اختیار کی کہ ہر جگہ بال کی کھال کھینچی جانے لگی اور ہر شے کی علت، ماہیت اور اصلیت دریافت کرنے کا خبط معلمین پر اس درجہ سوار ہو گیا کہ بیشتر وہ اپنے طلبہ کے لیے ما فوق الادراک اسباق تیار کرتے۔

یہ بآسانی اب سمجھ میں آسکتا ہے کہ ٹالسٹائے کا وضاحت پسند فہم ان حالات سے کس درجہ متاثر ہوا ہوگا۔ ان طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اکثر بھڑک اٹھتا ہے اور اس درس ادراکی (Intuition، teaching) کا مضحکہ اڑانے لگتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک استاد کے اس قسم کے سبق میں بغرض معائنہ وہ موجود تھا استاد نے مچھلی کی ایک تصویر طلبہ کے آگے لٹکا دی اور ان سے سوال کیا کہ وہ دیکھ کر اس شے کے متعلق کچھ بتائیں۔ معلم کا سوال، یہ کیا ہے ؟ کے جواب میں متعلمین نے "مچھلی" کہا لیکن یہ غلط تھا استاد نے بار بار مختلف طلبہ سے سوال کیا، ہر ایک نے مختلف قسم کے لغو جوابات دیے اور جب کوئی بھی صحیح جواب نہ دے سکا، تو استاد نے کہا کہ یہ مچھلی نہیں، بلکہ مچھلی کی تصویر ہے، اب آپ خود خیال فرمائیے کہ ٹالسٹائے کو یہ طریقۂ تعلیم کس قدر مہمل اور بے معنی نہ معلوم ہوا ہوگا۔

مگر ٹالسٹائے کی تنقید اس افراط و تفریط کے علاوہ اس طریقۂ تعلیم کے بناوٹی اور ناکارہ ہونے پر بھی نکتہ چیں ہے۔ وہ ایسے طریقۂ تعلیم کو ایک خاص قسم کی سائنس سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جب انسان چلتا ہے، تو فلاں فلاں رگ اور پٹھے حرکت کرتے ہیں اور اس حرکت کی

سمیں پیچیدہ ہوتی ہیں، اس لیے چلنا سکھانے کے لیے بچے کو ان رگ پٹھوں کو استعمال میں لانا سکھانا چاہیے، مگر واقعہ یہ ہے کہ بچے بغیر ان حالات کو جانے ہوئے چلنا سیکھ لیتے ہیں اور اکثر تو تمام عمر بھی انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے چلنے کے جسمانی اسباب و علل کیا کیا ہیں ٹالسٹائے اس تجزیے پر مبنی طریقۂ تعلیم پر معترض ہے، کیونکہ یہ تجزیہ ہی اس طریقۂ تعلیم کا ابتدا سے انتہا تک ذمے دار ہے اور خود ایک مہمل نظریہ ہے۔

فروبل کی تنقید میں میں بھی ٹالسٹائے کا ہم آہنگ ہوں۔ فروبل اپنی ایک تصنیف "انسان کی تعلیم" (Education of man) میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ ہر ترقی آسان سے پیچیدہ کی طرف ہونی چاہیے۔ برخلاف اس کے اصل اور عام زندگی کو دیکھیے کہ جس میں ابتدا پیچیدہ سے ہوتی ہے اور انسانی فہم ان گتھیوں کو سلجھا کر اور پیچیدہ کے شیرازے کو منتشر کر کے آسان تک پہنچتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹالسٹائے کے فروبل پر اعتراضات کی وجہ یہی ہے، کیونکہ اسی تجزیہ کرنے کی خواہش کے زیر اثر اساتذہ اپنے شاگردوں سے مہمل سوالات کیا کرتے ہوں گے اور چونکہ طلبا اپنی کم عمری کے باعث ایسے سوال سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، انھیں سبق میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی، وہ تمام اسباق ناکام ثابت ہوتے ہیں اور وہ طریقۂ تعلیم کہ جس کی مسابقت میں یہ اسباق دیے جاتے ہیں ناکارہ ہو جاتا ہے۔

یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ٹالسٹائے اس نئے تعلیمی دریا کی ایک موج ہے کہ جس کا منبع و مخرج زندگی کی ماہیت اور اس کے مدارج کا سمجھنا، فطری بیساختگی اور بچے کی ضروریات کا جاننا ہے۔ وہ اپنے دعوے سے زیادہ پیسٹالوزی اور فروبل کا پیرو ہے، مگر عوام کے خیال سے کم۔ وہ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ یہ چشمۂ تعلیم اپنے اصلی راستے سے ہٹ گیا ہے اور اس لیے وہ پھر سرچشمے پر پہنچ کر از سر نو سفر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ پھر روسو کی طرف التفات کرتا ہے کیونکہ

اسے بھی اس فرانسیسی کی طرح اس امر کا یقین ہے کہ فطرت درحقیقت نیک ہے، اگرچہ اکثر اپنے فلسفیانہ ترنگ میں اس عقیدے کے خلاف کہہ بیٹھتا ہے، لیکن دراصل اس کا یہ عقیدہ اس درجہ راسخ ہے کہ وہ بچوں کو بالغوں کے لیے ایک نظیر اور مثال بنا کر پیش کرتا ہے اور اگر غور کیا تو یہ خیال کچھ غلط بھی نہیں۔ روسو کا عقیدہ ہے کہ انسان پیدائشی اور فطری طور پر "خیر" (Goodness) ہے اور ٹالسٹائے کا عقیدہ صرف تھوڑے سے اختلاف سے یہ ہے کہ انسان فطری طور پر "صحیح" (Healthy) ہے اور یہ موجودہ سوسائٹی ہے، جو اپنے زہریلے اثرات سے انسان کو، جو دراصل خیر (Goodness) اور صحیح (Healthy) ہے، آلودہ کر دیتی ہے۔

یہ سوال کہ کیا یہ "خیر" "صحیح" ہے یا نہیں مستقلاً خود ایک سوال ہے کہ جس پر میں اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا، مگر ہاں یہ واقعہ ہے کہ ٹالسٹائے کا یہ دعویٰ کہ ہم ابتداءً ہر بچے میں یہ دو حالتیں یعنی "خیر" اور "صحیح" ہونے کی موجود پاتے ہیں، درست ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے زہر سے آلودہ نہ ہونے دیں۔ اسی وجہ سے ہمیں طریقۂ تعلیم کے اختیار کرنے میں بہت فکر و تدبر اختیار کرنا چاہیے اور اپنے تعصبات کو بچے کے زود تاثر اور آئینہ ساں دل پر حتی الامکان نقش نہ ہونے دیں۔ اب بچے کے خیالات، تعصبات اور یقین کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کا سوال نہیں ہے، بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ اس کی "روح" غلط راستے پر نہ پڑ جائے اور اس کے خیالات، تعصبات اور یقین ایک غلط صورت نہ اختیار کر لیں۔ اگر ہم ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے اس معاملے پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے مدارس میں یہ کمی کس درجہ موجود ہے۔ جس طرح ایک ٹکسال سے نکلے ہوئے سکے ایک خاص چھاپ لیے ہوئے نکلتے ہیں، اسی طرح ہمارے بچے بھی ایک خاص قسم کا زہریلا رنگ لیے ہوئے مدرسوں سے برآمد ہوتے ہیں۔ ایک اصول، ایک نظام، ایک طریقۂ کار۔ جو وضع کرنے والوں نے اس درجہ ہندوستانی فلاح کے

ے نہیں، بلکہ اپنی بہبودی کے لیے وضع کیا ہے، کس قدر مکروہ طریقے پر ہمارے معلمین اور متعلمین
ن حالت سے مترشح ہے کہ جس میں اور عیوب کے علاوہ شخصیت کا بالکل ناپید ہونا ظاہر اور روشن ہے۔

لیکن یہ بھی خارج از مبحث بات ہے۔ میں ٹالسٹائے کی طرف پھر رجوع ہوتا ہوں
ہ ٹالسٹائے کے خیالات یہ نہ تھے کہ تعلیم نہ دی جائے، بلکہ اس کا منشا و مدعا یہ تھا کہ طریقۂ تعلیم
یں استبداد نہ ہو۔ طریقۂ تعلیم اور دستور کی پابندی کے لیے بچوں کی شخصیت نہ برباد کی جائے
۔ انھیں ایک خاص نصاب کا غلام نہ بنایا جائے، بالخصوص اس نصاب کا، جو ان کے لیے
یں بنا، بلکہ جس کے لیے وہ بنے ہیں۔ ہر چند کہ وہ پیسٹالوزی اور فروبل کے نظریۂ تعلیم کی گہما
ہمی کے زمانے میں پیدا ہوا تھا تاہم ٹالسٹائے اس دستور کے خلاف تھا، جس میں معلمین بندھے
ٹے قواعد کے پابند رہیں اور وہ فرض معلمی جو بچے کی ضروریات سمجھنے کے لیے مجبور کرتا ہے نظر
داز کر جائیں۔

مدارس کی قوتِ جاذبہ واستقامیہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

از

محمد شریف صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول بلہڑوال (امرتسر)

جماعت اوّل میں زائد المیعادی ۔ جس طرح جماعت اوّل سے زیادہ لڑکے خارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سے طالب علم جماعت اوّل میں ایک سال سے زیادہ رہ جاتے ہیں۔ اگر جماعت اوّل کا کام بخیر و خوبی ختم ہو جائے اور ایک سال کے اندر اندر تمام طلبہ جماعت دوم میں ترقی پا جائیں، تو اسکول کی قوتِ جاذبہ اور معیارِ خواندگی بہتر سے بہتر ہو جا سکتی ہے جہاں تک میں نے معلوم کیا ہے اس باب میں بھی معلمین اصحاب ایک کوتاہی کرتے ہیں، وہ یہ کہ جب انھیں اسکول کی تعداد کے قیام یا اضافے کے لیے حکام کی ہدایت ہوتی ہے اور انھیں کسی ذریعے سے یہ علم ہو جائے کہ آج کل اسکول کا معائنہ ہونے والا ہے۔ تعداد کے متعلق باز پرس ہوگی تو وہ بغیر سوچے سمجھے لڑکوں کو اسکول میں داخل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جب معائنہ ہو جائے افسر معائنہ خیریت سے واپس چلے جائیں اور اسکول کی تعداد پر اطمینان کا اظہار فرما جائیں۔ مارچ کے مہینے میں جب معائنے کا اندیشہ نہیں ہوتا ایسی مجبوری کی بھرتی خارج کر دیتے ہیں جس کا اثر اسکول کے معیارِ خواندگی پر پڑتا ہے۔

ابتدائی داخلے کی عمر ۔ اس سلسلے میں کم اور زیادہ عمر کا داخلہ بھی قابلِ ذکر امر ہے محکمے کی طرف سے اجازت ہے کہ ۵ سال کا لڑکا اسکول میں داخل کر لیا جائے لیکن مدرسین تعداد کو قائم کرنے

کے لیے جو لڑکے ملیں۔ خواہ وہ تین سال کے ہوں یا چار سال کے انھیں پانچ سال بنا کر داخل کر لیتے ہیں آپ مجھ سے متفق ہونگے کہ اگر ۵ سال کا دیہاتی بچہ اسکول میں داخل کیا جائے تو وہ بھی ایک سال میں جماعت اوّل کا کورس پورا نہیں کر سکتا۔ ہمارے دیہات کا ۶ سال کا لڑکا شہر کے پانچ سال کے بچے کے برابر فہم و دماغ نہیں رکھ سکتا اس لیے اگر داخلے کی عمر دیہات میں بجائے ۵ کے، ۶ سال رکھی جائے تو ایک اوسط درجے کے ذہن و دماغ کا طالب علم ایک سال کے اندر اندر جماعت اول کی تکمیل کر سکتا ہے اور اس طرح آئندہ جماعتوں میں بھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض مہذب ممالک میں تین تین سال کے بچے اسکول میں جاتے اور باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مجھے اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں یہ صحیح ہے لیکن ان ممالک اور ہمارے ملک کے خارج از اسکول ماحول میں تفاوتِ عظیم ہے۔ ان کا ماحول یکسر علمی ہے۔ وہاں ۹۵٪ مرد و زن تعلیم یافتہ ہیں۔ ماں پڑھی ہوئی، باپ پڑھا ہوا، بھائی بہن خواندہ اور گرد و پیش تعلیمی رنگ میں رنگین۔ اس لیے اس کی آنکھ جو دیکھیگی علمی رنگ ہوگا، کان جو آواز سنینگے علمی آواز ہوگی، دل جو محسوس کریگا وہ علم کا کیف ہوگا۔ وہاں اسکول کے داخلے سے کافی عرصہ پہلے تعلیم شروع ہو جاتی ہے اور داخلے کے پہلے کی تعلیم ہی اصل تعلیم ہے اس لیے ایک ماہر تعلیم مفکر کہتا ہے کہ بچے کی عمر کے پہلے پانچ سال مجھے دے دو۔ پھر جس طرح چاہو اُسے تعلیم دو۔ ایک جرمن ڈاکٹر کا بیان ہے کہ بچہ چھ سال کی عمر تک جس قدر علم حاصل کر لیتا ہے، وہ اس تعلیم سے کہیں بڑھ کر ہے جو گریجوایٹ اپنے دورانِ تعلیم میں سیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک کے مفکرین اپنے علمی ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا نظامِ تعلیم مرتب کر لیتے ہیں جس کی رُو سے تین سال کی عمر میں بچے کی تعلیم و تربیت کا بار والدین کے بجائے اسکول ماسٹروں پر جا پڑتا ہے لیکن اس مُلک کے حالات گرد و پیش کے ماتحت ہم کسی طرح ان ممالک کا

مقابلہ نہیں کرسکتے، جہاں تعلیم ابھی تک برائے نام ہے، جہاں کی ذہنیت یہ ہے کہ عورت پڑھ کر بدچلن ہو جاتی ہے۔

بہرحال جب تک یہاں تعلیم اور خصوصیت کے ساتھ تعلیم نسواں عام نہیں ہو جاتی بچے کے داخلے کی عمر کم از کم چھ سات سال ہونی چاہیے۔ ۵ سال کا بچہ ۶ مہینے میں اسکول میں بیٹھنا ہی سیکھتا ہے اور اس عرصے میں صرف اس کی وحشت ہی دور ہوتی ہے۔ میں ۱۹۲۲ء میں جالہ اسکول میں تھا اس وقت وہ ورنیکلر مڈل اسکول تھا۔ ۱۷ طالب علم جماعت ہشتم میں تھے جب امتحان کے دن نزدیک آئے تو میں نے ان سے پوچھا جنھوں نے امرتسر دیکھا ہو ہاتھ کھڑے کرو۔ صرف پانچ طالب علم ایسے تھے جنھوں نے ریل گاڑی دیکھی تھی جس ملک کے دیہات کے ورنیکلر مڈل کے طالب علموں کی عملی واقفیت کا یہ عالم ہو، وہاں کے پانچ سال کے بچے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تعلیم کا نصاب ایک سال کے اندر اندر پورا کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں تک حق بجانب ہے۔

ضابطۂ تعلیم کے واضعین نے اپنے بچوں اور خصوصاً شہر کے بچوں کا اندازہ لگایا ہے اگر دیہات میں بچوں کو تعلیم دینے کا تجربہ ہوتا اور ان مشکلات کا علم ہوتا جن میں ہمارا دیہاتی معلم مبتلا ہے تو ضرور اس کی ترمیم و تنسیخ پر آمادہ ہوتے۔ بہرحال یہ چونکہ میرے بس کی بات نہیں اس لیے میں آپ کو عملی طور پر بتاتا ہوں کہ سات سال کی عمر سے کم عمر کے لڑکے کبھی داخل کرنے کی جرأت نہ کیجیے خواہ آپ کی تعداد کم ہو جائے آپ کم عمر کا بچہ داخل کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تعلیم سے متنفر کر دیتے ہیں اور یہ اس پر صریح ظلم ہے اور اس کے بھاگنے پر دوسرے لڑکے بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔ جس سے جماعت اول ہی سے آپ کے کام کی بنیاد بگڑنا شروع ہو جاتی ہے۔

اب جبکہ محکمے نے داخلے کے اوقات مقرر کر دیے ہیں۔ چاہیے کہ ان اوقات کے علاوہ طالب علم اسکول میں داخلے کے لیے آئیں انھیں ذخیرہ رکھتے جائیں اور اُن کی تعلیم کا کام باقاعدہ شروع رکھیں۔ داخلے کے وقت آپ کو ہر طالب علم کی استعداد اور ذہن و دماغ کی وسعت کا حال معلوم ہو جائیگا۔ پھر آپ انھیں داخل کر کے بخوبی چلا سکتے ہیں۔ داخلے کے اوقات میں بھی اگر طالب علم آپ کے پاس آئیں تو بھی کم از کم ایک مہینہ تک اِس کا اندازہ کر کے آپ داخل کریں یونہیں بے تحاشا طالب علم کو داخل کر لینا اپنے آپ کو مشکلات میں پھنسا لینا ہے۔ اسی طرح ۱۰ سال سے زیادہ عمر کے بچے کو جماعت اوّل میں داخل کر لینا بھی معیوب ہے۔ کیونکہ اصولاً بھی ایک جماعت کے طلبہ کے قد، عمر اور قابلیت میں یکسانیت ہونا لازم ہے۔ بکریوں کے ریوڑ میں ایک اونٹ یوں بھی کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔ نیز یہ بڑی عمر کے لڑکے دوسروں کی طعن وغیرہ سے محجوب ہو کر اسکول چھوڑ جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی تعلیم سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

غیر حاضر طلبہ کی نگرانی۔ علاوہ ازیں حاضری کو بہتر بنانے کے لیے ہر روز اسکول کے تیسرے پیریڈ میں پہلے دن کے غیر حاضر طلبہ اور اس روز دیر سے آنے والوں کا جائزہ لینا بھی حاضری کو بہتر بناتا ہے۔ میرا شروع سے اس پر عمل ہے۔ اس طرح اسکول کی حاضری بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ اس عمل کو ہمیشہ جاری رکھا جائے۔ بعض مدرسین صبح حاضری کے وقت ایسی پڑتال کرتے ہیں۔ میرے تجربے میں یہ طریق عمل ناکام ہے۔ اسکول کے لڑکے بھی سیلانے ہوتے ہیں۔ وہ حاضر ہونے کے دن بھی پڑتال کا وقت ٹال دیتے ہیں۔ جماعتوں کے استادوں کو ہدایت کی جائے کہ تیسرے پیریڈ میں ان کی جماعت کا کوئی لڑکا باہر نہ جائے۔

طالب علم کا اخراج۔ مجھے یہاں طالب علم کے خارج کرنے کے متعلق بھی ایک عرض

کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ہیڈ ماسٹر کبھی کسی مدرس کو یہ اجازت نہ دے کہ وہ اپنے آپ طالب علم کا نام اسکول سے خارج کر دے بلکہ ہر روز غیر حاضر طلبہ کے متعلق پوچھتا رہے کہ ان کی غیر حاضری کا سبب کیا ہے اور پرائیویٹ طور پر مدرس کے بیان کی تصدیق کرتا رہے، جو طالب علم چار دن غیر حاضر رہے۔ اس کی ہیڈ ماسٹر خود تحقیق کرے۔

بعض مدرسین اپنی جماعت کے کمزور طلبہ کو امتحان کے نزدیک بھگا دیتے ہیں۔ تاکہ ان کے نتیجے پر برا اثر نہ پڑے۔ ماہواری داخلے اور اخراج کا نقشہ ہر جماعت میں آویزاں رہے خارج ہونے والے طالب علم کی وجہ اخراج درج ہو۔ جس معلم کی جماعت سے زیادہ طلبہ خارج ہوں اس کی تنبیہہ و سرزنش کے لیے خاص طور پر رپورٹ کی جائے۔

میرا اعتقاد اور تجربہ ہے کہ اگر جماعت اوّل سے لڑکا اچھی طرح کامیاب ہو جائے تو پھر وہ نہ اسکول چھوڑتا ہے نہ دوسری جماعتوں میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد پختہ ہوتی ہے اس لیے اس کے بھاگنے اور فیل ہونے کے امکان بہت کم ہو جاتے ہیں۔ بنا بریں ہیڈ ماسٹر کو اپنی تمام تر توجہات جماعت اوّل کی کامیابی کی طرف منعطف کر دینا لازم ہے کہ اسی پر آئندہ تعلیمی کامیابی کا انحصار ہے۔

طریقۂ تعلیم جماعت اوّل پر ایک طائرانہ نظر۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے طالب علم جماعت اوّل کے خشک طریقۂ تعلیم سے اکتا کر اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے اس جماعت کی تعلیم میں دلچسپی کے عنصر کو غالب کر دیا جائے۔ مبتدی بچوں کی تعلیم جس قدر دشوار اور مشکلات سے پر امر ہے اس کا اندازہ ہمارے ملک کے معلم اصحاب کو ہو یا نہ ہو۔ لیکن مغرب کے مفکرینِ تعلیم ہمیشہ اس کے متعلق غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور آج آپ بچوں کو پڑھانے کے جس قدر طریقے دیکھ پا رہے ہیں۔ یہ سب مغرب کی پیداوار ہے مشق

بی تک نامکمل تقلید کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکا جو طریقۂ تعلیم بچوں کے قوائے عقلیہ
رران کے مدارج نشو و نما کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ اس کا اثر بچے کی آئندہ زندگی پر بہت برا پڑتا ہے،
ہ بڑا ہو کر ایک علمی انسان تو شاید ہو سکے جس کے حافظے میں چند بادشاہوں کے سنین جلوس
رفات۔ لڑائیوں کے فریق ہائے محارب کے نام کسی ملک کی بندرگاہوں، خلیجوں، جزیروں
ردریاؤں کی فہرستیں تو محفوظ ہو سکتی ہیں لیکن وہ روزمرہ کے معاملات کو سمجھ نہیں سکتا اور
ان مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔ جو ایک عملی انسان کا خاصۂ انسانیت متصور ہے۔ غلط طریقۂ تعلیم
بچوں کی زندگی کو ناکام و نامراد بنا دیتا ہے۔ ان کی ذکاوت کو برباد کر دیتا اور ان کے قوائے
ہنیہ عقلیہ کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ صحتِ فکر، اصابت رائے، قوتِ نظم و ضبط ایسے اوصاف جو عملی
علیم کا نتیجہ ہیں، ہمارے طالب علم میں یکسر مفقود نظر آ رہے ہیں۔ جن ممالک میں بچوں کی تعلیمی
یاد صحیح طریقۂ تعلیم پر ہے، وہاں ابتدا ہی سے بچوں کے خیالات بلند ہوتے ہیں۔ میں اس سے
بہلے کہہ آیا ہوں کہ ہمارے ورنیکلر فائنل کے ۱۱۶ امیدواروں میں سے صرف ۳ نے ریل و ڈی کو
نظرِ ظاہری سے دیکھا تھا۔ میں نے اسی جماعت کو اردو کے پرچے میں سوال دیا کہ تم تعلیم حاصل
رنے کے بعد کیا کرنا چاہتے ہو۔ سب نے کسی نہ کسی ملازمت کا نام لکھ دیا۔ لیکن آج سے ۲۰
رس پہلے کی بات ہے کہ واشنگٹن کے ایک ثانوی مدرسے میں ۲۵۰ طلبہ کا امتحان ہو رہا تھا۔
رچہ سوالات کا آخری سوال (جس کا جواب دینا ہر طالب علم کو لازمی تھا) یہی تھا کہ تم تکمیل تعلیم
ے بعد کیا کرنا چاہتے ہو۔ اڑھائی سو طلبہ میں صرف چار نے لکھا کہ ہم اس لیے محکمۂ تعلیم کی ملازمت
نا چاہتے ہیں کہ اس طرح قوم کے بچوں کو صحیح راہِ عمل پر چلا سکیں اور ان کے نزدیک یہ بھی
ی خدمت تھی۔ باقی امیدواران میں سے کسی نے بھی ملازمت کا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ
اپنے لیے کسی نہ کسی قسم کی صنعت و حرفت تجویز کی اور کاروبار کو ملازمت پر ترجیح دی ان امیدوارو

میں ایک غریب لڑکی بھی امتحان دے رہی تھی اس نے لکھا کہ میں امریکہ کی پریزیڈنٹ بننا چاہتی ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ میں غریب ہوں۔ بے کس اور بے بس ہوں اور عورت کو پریزیڈنٹ بننے کا حق بھی حاصل نہیں لیکن صحیح طریقۂ تعلیم اور حقیقی معیارِ تعلیم نے اس کے ذہن و دماغ کو اتنا مہذب بنا دیا تھا کہ وہ ایک بلند ترین خواہش کی پرورش اپنے اندر کر رہی تھی۔ وہ تعلیم کے اصلی مفہوم سے آشنا تھی کہ حقیقی مدعائے تعلیم یہی ہے کہ گرے ہوئے دل و دماغ ہمیشہ کے لیے گرے ہوئے ہی نہ رہیں۔ بلکہ انھیں بھی ابھرنے، بلند ہونے اور عزت کی سب سے اونچی جگہ پر پہنچنے کا موقع مل سکے۔"

پنجاب میں تعلیم اُردو کے ابتدائی مرحلے

(گزشتہ سے پیوستہ)

از

شیخ خادم محی الدین صاحب بی اے، ایم ای ڈی، لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

بچّوں کے گیت۔ اِس قسم کے گیت اور نظمیں، جو بچوں کے حسب حال ہوں، اردو میں کم یاب ہیں۔ نانچہ اس کمی کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

جب آپ خالص بول چال کے اسباق کے مراحل طے کرکے بچوں کو پڑھنا سکھائیں، ہماری دانست میں ان کے لیے خاص قاعدے اور ریڈریں تیار کرنی چاہییں، جن میں ایسے گیت اور ں موجود ہوں۔ اِن گیتوں میں نظم کے لوازمات، یعنی بحر، قافیہ، ردیف وغیرہ کی سختی سے پابندی نہ کی لئے۔ اگر فقط الفاظ کی روانی ہی کو کسی حد تک مدنظر رکھا جائے، جو بچوں کے کانوں کو خوشگوار علوم ہو، تو ہر سمجھدار مدرس کسی ایک خیال کو سامنے رکھ کر سادہ قوافی اور مختصر سی بحر کے ذریعے گیت نظم تیار کر سکتا ہے۔ ذیل میں اردو کے ایک سادے اور آسان گیت کا نمونہ دیا جاتا ہے، اس کے طابق درسی کتب لکھنے والا یا مدرس سادہ زبان میں، بچوں کے عام خیالات کے موجب مزید بت تیار کر سکتا ہے۔ اگر بچے اسے زبانی یاد کرکے کما کراس کا ڈراما بھی کر سکیں اور پڑھاتے فت مدرس تصاویر کا استعمال بھی کرتا جائے، تو دلچسپی کا موجب ہوگا:۔

ایک لڑکا اور بلّی

لڑکا:۔ اری ننھی بلّی ادھر آ ذرا مری گود میں چین سے بیٹھ جا

ابھی دودھ تجھ کو پلاؤنگا میں — بچھونے پہ اپنے سلاؤنگا میں
ترے بال ہیں کس قدر نرم نرم — تیرا جسم ہے خوب ہی گرم گرم
یہ خُرخُر کی آواز آتی ہے کیا — میری گود یہ تجھ کو بھاتی ہے کیا

بلّی:- میاؤں میاؤں، میاؤں میاؤں — میں بھوکی ہوں دو کچھ مجھے جلد کھاؤں
ذرا جا کے اندر سے پیالہ نکالو — مزیدار اور تازہ دودھ اس میں ڈالو
لبالب پیا دودھ بلّی نے جھٹ دم — ہوئی بیٹھ کر گود میں شاد و خرّم
وہ خرخر کی آواز آنے لگی پھر — بڑی گویا باتیں سنانے لگی پھر

بچپن کی زندگی پر نظمیں:- ایسی نظموں کے تیار کرنے میں مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی تصنیف "اردو کی دوسری کتاب" میں دی ہوئی نظم "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" کو نمونے کے لیے نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ ہمارے ملک کے مایۂ ناز شاعر اقبالؔ نے بھی بچوں کے لیے چند نظمیں تصنیف فرمائی ہیں جنھیں "بانگِ درا" میں دیکھ سکتے ہو مثلاً: "ایک مکڑا اور مکھی"۔ "ایک پہاڑ اور گلہری"۔ "ایک گائے اور بکری"۔ "بچے کی دعا"۔ "ہمدردی"۔ "ماں کا خواب"۔ ہمارے ہندو شعرا لالہ تلوک چند محرومؔ اور لالہ سورج نرائن مہرؔ نے بھی اسی قبیل کی نظمیں طبع کرائی ہیں، لیکن ایسا لٹریچر بچوں کی عملی زندگی سے بے تعلق سا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ نظم خوانی اور عمل کو باہم ملایا جائے تاکہ تمثیل کے ذریعے، بچوں کے تخیل کو بیدار کیا جا سکے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بچے اپنی شرم اور جھجک دور کر سکیں گے اور مجلس میں آئندہ چل کر گفتگو اور تقریر کرنے کے اہل ہو نگے۔ قصوں اور نظموں کو ڈراما کر کے ادا کرنا چاہیے۔ ڈرامے کا نمونہ لومڑی اور کوتے کی کہانی کے متعلق پہلے دیا جا چکا ہے۔

زباندانی کے کھیل۔ ان کھیلوں کا اصل مقصد، ڈرامے اور قصہ گوئی کی مانند بچے کی دلچسپی کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔ مثال اس کی حسب ذیل ہے:-

(۱) تصحیح کا کھیل :- اس کھیل کا مقصد یہ ہے کہ بچے بعض عام اغلاط سے گریز کریں۔ جماعت میں لڑکوں سے اپنی اپنی پنسلیں قلم، دواتیں وغیرہ نکلواؤ اور سوال کرو :-

سوال۔ تمہارے پاس کیا ہے ؟

جواب۔ میرے پاس ایک پنسل ہے (یا دو پنسلیں ہیں)

سوال۔ تمہاری جیب میں کے پیسے ہیں ؟

جواب۔ میری جیب میں ایک پیسہ ہے (یا دو پیسے ہیں)

(۲) تصویر کے ذریعے کھیل :- ہر لڑکے کو مختلف تصاویر دکھائی جائیں مگر کسی تصویر کے متعلق حال بیان نہ کیا جائے۔ اس کے بعد تصویر کو چھپا کر لڑکے سے اس کا حال بیان کرایا جائے۔ دوسرے لڑکے سنیں اور جس چیز کا حال بیان کیا جائے، اسے معلوم کرنے کی کوشش کریں یعنی بوجھیں۔

(۳) خاموش حرکات کا کھیل :- یہ کھیل خاصہ دلچسپ ہے۔ چند بچے باری باری کسی پیشہ ور مثلاً بڑھئی، موچی، باورچی یا خدمتگار وغیرہ کے کام کی حرکات کی نقل اتاریں۔ دوسرے بچے بغور دیکھیں اور ان حرکات سے پیشہ ور کو معلوم کرنے کی کوششیں کریں۔ اس کھیل میں دو قسم کے مضامین کا انتخاب ہو سکتا ہے (۱) سادی حرکات، مثلاً سینا پرونا، ہتھوڑا مارنا، چٹھی رسانی کرنا، کمرہ جھاڑنا وغیرہ (۲) پیچیدہ حرکات، مثلاً کپڑے دھونا، باغبانی، چائے یا کھانے کی میز سجانا، گڑیا کو سلانا (زنانہ مدارس کے لیے) وغیرہ اس میں ڈرامے کے ساتھ ساتھ فہم و فراست، چستی، چالاکی، اور تخیل کی تربیت ہوتی ہے۔ ان حرکات کے علاوہ بعض چھوٹی اور آسان کہانیاں مثلاً لومڑی اور انگور بھی خاموش حرکات کے ذریعے واضح کی جا سکتی ہیں۔

(۴) گیت مشاہدۂ اشیا اور ان کا بیان :- گیتوں کا سرسری ذکر اس سے قبل کیا جا

چکا ہے۔ بچے کو لَے کے ساتھ فطری دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے مدرسے کی ابتدائی زندگی میں ان کے رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ مدرس کو کسی حد تک موسیقی کا ذوق اپنی ذات میں پیدا کرنا چاہیے۔ اگر وہ زندہ دل واقع ہُوا ہے، تو یہ مذاق، عام اس سے کہ اسے خوش الحانی عطا ہُوئی ہے یا نہیں، پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مدرسے کے مختلف مشاغل مثلاً کھیل کود، گنتی، قصہ گوئی وغیرہ کو گیت یا موسیقی کے ساتھ شامل کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی مدد سے اسکول کا ہر تجربہ اور مشاہدہ بچوں کو بخوبی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ گیتوں کے انتخاب میں، ان کی بوقلمونی کے اصول کو مدنظر رکھنا چاہیے فروبل صاحب کے کنڈر گارٹن کے گیت اردو میں مروج رہے ہیں، ان میں لوریوں، گانے کے کھیلوں، مختلف پیشوں کے متعلق گیت کے اضافے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ہمارے ہر دلعزیز شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنی کتاب "پھول مالا" میں بعض گیت اور نظمیں بچوں کے حسب حال لکھی ہیں مثلاً: ایک گیت موسوم بہ "دُھنیا" نہایت دلچسپ لکھا ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں

فندک فندک فندک فک ۔۔۔ دھنک دھنک دھنک دھک
تانت بجی اور نکلا راگ ۔۔۔ روئی بنی صابن کا جھاگ
کیسی چھنتی جاتی ہے ۔۔۔ بادل بنتی جاتی ہے
کتنا ڈھیر ہُوا اتّا ۔۔۔ میں اس ڈھیر پہ کودونگا
اس میں چوٹ نہ آئیگی ۔۔۔ پر روئی دب جائیگی
لے اب روئی ہو گئی صاف ۔۔۔ بھر لے تکیے اور لحاف
واہ ری دُھنکی دھنک دھک ۔۔۔ فندک فندک فک فک فک

ان اشعار میں موسیقی پائی جاتی ہے۔ کتاب ہذا میں بعض اور نظمیں، جن کو قصّے کا رنگ دیا گیا ہے، بہت دلآویز ہیں اور بچے انھیں شوق سے پڑھتے اور یاد کرتے ہیں، مثلاً "جھوٹا گواہ"

"اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد" "بی امّی کا چرخا" وغیرہ۔ ایسی مزید کتب کی ضرورت ہے۔ جن میں گیتوں کے علاوہ عام واقفیت، جغرافیے کے ابتدائی تصورات، مثلاً فاصلہ اور اطراف کا تصور اور بعض ضروری مشاہدات اور مطالعۂ قدرت پر نظمیں موجود ہوں۔ جماعت کے کمرے میں ایسی نظموں کے پڑھانے میں قدرتی طریق کو اختیار کرنا چاہیے یعنی، ان کو پڑھنے سے پیشتر سنانا چاہیے۔ گویا قوتِ باصرہ کو قوتِ سامعہ کے بعد متحرک کیا جائے۔ لٹریچر اور موسیقی کی تعلیم میں ہمیشہ آنکھ سے پہلے کان سے اپیل کرنی چاہیے۔ پہلے بچوں کو گیت سناؤ۔ اس کے بعد گیت کی لے کا تصور تالی بجا کر یا جسم کی حرکت کے ذریعے دلاؤ۔ مثلاً: ہاتھ ہلانا یا مارچ کرنا نظم کے کسی مصرعے یا اس کے جز کو دہراؤ۔ اگرچہ یہ تمام عمل موسیقی کی تعلیم کا جز ہے لیکن شاعری اور موسیقی کا باہمی تعلق الفاظ کی آوازوں کی مطابقت ہی میں تو پایا جاتا ہے۔ ہندی موسیقی خاص طور پر نظم کو ترنم کے ساتھ پڑھ کر سکھانے کے لیے نہایت موزوں واقع ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ابتدائی درجوں میں مختلف مضامین کی خشک تعلیم موسیقی کے ذریعے دلچسپ بنائی جاسکتی ہے۔ پنجاب کو اس راستے کی طرف قدم اٹھانا چاہیے جو بنگال، مہاراشٹر اور یوپی کی درسگاہوں نے اختیار کیا ہے۔ ان صوبوں کے مدارس میں موسیقی بحیثیت جداگانہ مضمون، رائج ہے اور اس کے ذریعے اسکول کے کام کو دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ جن اصحاب کو اس مضمون میں دلچسپی ہو، وہ پونہ کی جامعہ مستورات، قائم کردہ پروفیسر کروے یا سیوا سادن سوسائٹی کے زیر اثر مدارس کی سکیم موسیقی منگا کر واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔

اردو کا جو کورس مذکورۂ بالا سطور اور سابقہ مضامین میں واضح کیا گیا ہے۔ اسے درجۂ انفنٹ کے ابتدائی تین ماہ کے اندر ختم کر دینا چاہیے اور اس عرصے میں پڑھائی اور لکھائی کو بالائے طاق رکھنا چاہیے۔

اس ضمن میں اس مسئلے سے سابقہ آپڑا ہے، جسے 'بائی لنگوالزم' (دو زبانوں کا اصول) کہا گیا ہے۔ جہاں تک پنجاب کے مدارس کے ساتھ اس مسئلے کا تعلق ہے، ہمیں اس پر غور کر لینا چاہیے پنجاب کے علاوہ اور صوبوں کے متعلق بھی، جہاں گھروں کی زبان مرہٹی، گجراتی، بنگلہ وغیرہ ہے اور مدارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے، پنجاب میں بچے اپنے گھروں میں تو پنجابی بولتے ہیں، لیکن یہاں کے ہر مدرسے میں (خصوصاً ہندو یا سکھ مدارس میں) اردو بحیثیت مادری زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ اسکول کے کمرے میں، اظہار خیالات کی غرض سے، ہمارے مدرسین کو اردو کا استعمال کرنا پڑتا ہے یعنی، اردو ایک ورنیکلر کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اردو کو سبھی قوموں کے طلبہ اس لیے سمجھ لیتے ہیں کہ پنجابی اور اردو کے ذخیرۂ الفاظ اور اصوات مشترک ہیں۔ طریقۂ تعلیم کی رو سے، سکھوں اور ہندوؤں کی طرف سے، اس صوبے کی مادری زبان یعنی پنجابی کی تعلیم کا مطالبہ، اصولاً اور قومی وجوہات سے جائز سمجھا جا سکتا ہے! اس ضمن میں سکاٹ لینڈ (Scotland) کے مدارس کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جہاں دو جداگانہ زبانیں یعنی، انگریزی اور گیلک بولی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ باوجودیکہ سکاٹ لینڈ کے مدارس میں ۱۹۱۸ء سے پیشتر انگریزی کی تدریس پر زور دیا جاتا تھا۔ پھر بھی اہل سکاٹ لینڈ نے اس بات پر اصرار کیا کہ اُن کے مدارس میں گیلک زبان بولی اور پڑھائی جائے۔ اس شدید مطالبے کے جواب میں افسران تعلیم کو گیلک کی تدریس کے لیے ان علاقوں میں جہاں یہ زبان مروج تھی۔ خاطر خواہ انتظام کرنا پڑا۔ اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان اور انگلش علم ادب کے پڑھانے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ وقتی لحاظ سے مادری زبان کے پڑھانے کا نمبر کسی اور زبان کے پڑھانے سے پہلے آنا چاہیے۔ اس لیے کہ کسی قومی زبان کا حق رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مادری زبان اظہار خیالات کے اور ذرائع پر ہمیشہ فائق ہونے کا رجحان رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم پنجاب میں پنجابی کو کمرۂ جماعت

یا کھیل کے میدان سے خارج نہیں کر سکتے، لیکن اردو کے ساتھ اس کا تعلق اس قدر بعید نہیں جتنا کہ مرہٹی کا اردو سے یا انگریزی کا گیلک سے ہے۔ اردو کا پنجابی کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسا انگریزی کا کسی اور بولی مثلاً یورک شائر یا کوکنی (Cockney) زبان کے ساتھ ہے۔ چونکہ اردو کا ذخیرۂ الفاظ پنجابی کے ساتھ مشترک ہے، اس لیے پنجابی کو اردو سے پہلے پڑھانا تضیع اوقات ہوگا۔ علاوہ ازیں پنجابی لٹریچر ابھی تیار ہو رہا ہے ہاں آئندہ چل کر جب یہ لٹریچر کافی مقدار میں جمع ہو جائیگا اس وقت پنجابی کو اردو کی تعلیم کی بنیاد قرار دینے کے ممکنات پر غور کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بمبئی اور بنگال جیسے صوبوں میں جہاں بنگلہ اور مرہٹی مادری زبانیں ہیں۔ وہاں انھیں کو اردو سے پیشتر پڑھانے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ وہ اردو سے بالکل مختلف ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پنجابی اور اردو کو مناسب وقفوں پر ساتھ ساتھ پڑھایا جائے۔ تو گو اس سے بچوں کی فہم و فراست میں نقص واقع نہ ہوگا، لیکن وہ اتنی ترقی نہ کر سکیں گے جتنی ایک ہی زبان کو ایک وقت میں پڑھانے کے اصول کی پیروی کرنے سے ہو سکتی ہے۔ اس موضوع کے متعلق مختلف تجربات اس امر کے شاہد ہیں کہ بیک وقت دو مختلف زبانوں کا استعمال کرنے والے بچے ان بچوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں، جو ایک وقت میں ایک ہی زبان کی تحصیل کریں، جو بچے ابتدائی عمر میں دو مشترک زبانوں کا استعمال اس طریق پر کریں کہ ایک زبان تو کھیل کود اور میل جول کے دوران میں استعمال کریں اور دوسری حصول تعلیم میں تو ان کے ذہنی ارتقا میں کسی قسم کا ہرج واقع نہیں ہوتا، بمقابلہ ان بچوں کے جن کو اسکول میں دوسری زبان جبر و اکراہ سکھائی جائے۔ پس ابتدا میں ہمارا طریق عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک وقت میں ایک ہی زبان کو سکھائیں اور چونکہ اردو، پنجابی طالب علم کی دسترس کے قریب ہے اس لیے ہم شروع ہی سے اس کے پڑھانے میں حق بجانب ہیں، چنانچہ گذشتہ نصف صدی، بلکہ اس سے بھی

زیادہ عرصے کے کامیاب نتائج ہمارے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں پنجاب میں اردو کو ابتدا ہی سے پڑھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں بعض اور وجہات بھی پنجاب میں اردو کو پڑھانے کی ضرورت کی طرف تو۔ اتے ہیں۔ پنجاب، صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے ساتھ ملحق ہے، اردو، علم، حقائق اور سائنٹیفک بناوٹ اپنے اندر رکھتی ہے بمقابلے پنجابی کے جو گھریلو زبان ہے۔ اس کے ذریعے جذبات بخوبی ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ سر مائیکل سیڈلر فرماتے ہیں: "اگر ہمارے ورثے میں کوئی ایسی زبان آئے جسے مقابلۃً تھوڑے نفوس استعمال کرتے ہوں، تو ہمیں ایک اور زبان پر کامل عبور حاصل کرنا چاہیے، جو عام طور پر مروج ہو (جیسے کہ اردو ہے) علاوہ ازیں ذرائع آمد و رفت کی ضروریات موجودہ زمانے کی تجارتی صنعتی اور سائنٹیفک ترقیاں لسانی حدود کو توڑ کر وحدانیت لسان کی حقیقت کو واضح کرتی جاتی ہیں۔ فی زمانہ بنی نوع زیادہ تر دو بولیوں والا جانور بنتا جاتا ہے"۔

پس اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زبانی یعنی گفتگو کی تعلیم کا طریق ابتدا میں اختیار کرتے ہوئے پڑھنے اور لکھنے کو نہ تو بالکل الفنٹ جماعت سے مسترد کیا جائے اور نہ بول چال ہی کے اسباق کے ساتھ انھیں خلط ملط کیا جائے۔ ہماری تجویز فقط یہاں تک محدود ہے کہ لکھائی اور پڑھائی کو اس وقت تک ملتوی رکھا جائے، جب تک بچے گویائی نہ سیکھ لیں۔

جغرافیے کی تدریس

(گزشتہ سے پیوستہ)

از

مرزا مقبول بیگ صاحب بدخشانی، بی اے

جغرافیہ کیا ہے؟

غالباً یہ بنیادی اصول واضح ہو چکا ہے کہ ہمارے اسکولوں میں جغرافیہ کیوں پڑھایا جانا چاہیے، لیکن یہ ہم نے فرض ہی کر لیا تھا کہ ہم جانتے ہیں کہ جغرافیہ ہے کیا؛ اب ہم متذکرہ مضمون کی روشنی میں اس موضوع کو واضح کرنے کی کوشش کرینگے۔ سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ہم جغرافیے کی ان تعریفوں کا ذکر کریں، جو مختلف وقتوں میں کی جاتی رہی ہیں اور ان پر مختصر سا تبصرہ بھی کریں۔

(۱) جغرافیہ وہ علم ہے، جو ہمیں زمین کا حال بتائے"

اس تعریف کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جامع تعریف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب ہم جغرافیے کا مطالعہ کرتے ہیں، تو حقیقت میں زمین ہی کا حال ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے، لیکن جب ہم اس تعریف پر نظر ثانی کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعریف تمام جغرافیے پر حاوی نہیں۔ سیاح دنیا کے گوشے گوشے میں سفر کرتے تھے اور وہاں وہاں بھی پہنچتے تھے جہاں انسان کا گزر بہت مشکل سے ہوتا ہے، مثلاً: ٹمبکٹو، ایمیزان،

جنوبی قطب اور ماؤنٹ ایورسٹ وغیرہم۔ وہ اپنے سیاحت و سفر کے حالات بیان کرتے ہیں اور نقشے پیش کرتے ہیں کہ کن کن راہوں سے ان کا گزر ہوا۔ دریاؤں سے کس طرح پار ہوئے جنگل کیونکر طے کیے۔ پہاڑوں کی دشوار گزار چوٹیوں پر کیسے پہنچے۔ سیاح اپنے مشاہدوں کی روئداد پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مختلف مرحلوں پر کیا کیا باتیں پیش آئیں۔ اگرچہ یہ تعریف دلچسپ معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں صرف زمین کے مطالعے کا ذکر ہے۔ زمین کے رہنے والے انسانوں کے مطالعے کا ذکر نہیں۔ وہ جغرافیہ جو صرف زمین کا حال بتانے پر اکتفا کرتا ہے چاہے کتنا ہی مفید ہو، لیکن ہم اسے مکمل نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ زمین کے حصّوں کا تفصیلی ذکر اگرچہ جغرافیے کے لیے نہایت ضروری ہے، لیکن ہم اسے جغرافیہ نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کے جغرافیے کا علم ایسا علم نہیں جو ایک شہری کو کسی قسم کی مدد دے سکے۔ اس قسم کا جغرافیہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے اسکول کے سلیبس میں جگہ دی جائے

ب۔ "جغرافیہ دنیا کے موجودات کی سائنس ہے"

اس تعریف کا دائرہ یقیناً پہلی تعریف سے زیادہ وسیع ہے۔ پہلی تعریف کی رو سے جغرافیہ سائنس نہیں تھا، کیونکہ اس تعریف کی روشنی میں ہمیں اشیا کا حال تو معلوم ہو جاتا ہے، لیکن وہ اشیا کسی خاص ترتیب کے ماتحت نہیں آتیں۔ جب تمام اشیا یا تمام امور کسی خاص تقسیم یا ترتیب میں آجائیں، تو ہم کہیں گے کہ جغرافیہ سائنس ہے۔ پہلی تعریف کی رو سے ہم سمجھتے تھے کہ یہاں ایک دریا ہے، یہاں پہاڑ ہے، یہاں خاص قسم کے درخت ملتے ہیں وغیرہ، لیکن اب ہم اس تعریف کی رو سے یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں اور فلاں جگہ پر حبشی پائے جاتے ہیں۔ فلاں فلاں اور فلاں جگہ پر جنگلات ملتے ہیں۔ خاص خاص قسم کے ڈھلوان پر زمین

کی سطح بلند ہوتی ہے۔ ہم بے روک کہہ سکتے ہیں کہ استوائی خطہ جو پانچ درجہ شمال اور پانچ درجہ جنوب عرض بلد کے درمیان واقع ہے۔ وہاں کا درجۂ حرارت اسّی درجے سے زیادہ ہوگا۔ آب وہوا گرم مرطوب ہوگی۔ بارش سارا سال اور زور کی ہوگی۔ وہاں کے باشندوں کے رنگ بالعموم کالے ہونگے وہاں کی نباتات گھنی ہوگی اور درخت بہت لمبے ہونگے۔

ریگستانی علاقے کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کی آب وہوا گرم خشک ہوگی دن اور رات کے درجۂ حرارت میں تفاوت ہوگا۔ دن کو گرمی ہوگی اور رات کو سخت سردی۔ صرف وہی پودے پیدا ہوسکینگے جن کی جڑیں دور تک چلی جاتی ہیں۔

گویا اس تعریف کی رو سے دنیا کی اشیا خاص ترتیب کے ماتحت آگئیں اور اسی ترتیب کی بنا پر ہم جغرافیے کو سائنس کہتے ہیں۔ ہم جغرافیے کو اچھی طرح سے سمجھ ہی نہیں سکتے ،جب تک دنیا کے موجودات کو خاص ترتیب نہ دے لیں۔ یہ تعریف بالکل صحیح ہے اور پہلی تعریف سے زیادہ اچھی ہے، لیکن ہم اس تعریف کو بھی جغرافیے کی مکمل تعریف نہیں کہہ سکتے۔ اس تعریف کو دیکھ کر بھی ہمیں مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے انسان کو اپنی ذمے داریوں کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ان کے ادا کرنے کا طریق ہی سیکھا جاسکتا ہے۔

ج۔ "جغرافیہ ایک ایسی سائنس ہے جو آدمی اور زمین کے باہمی تعلق کو بیان کرتی ہے"۔

یا یوں سمجھیے کہ جغرافیہ ایک سائنس ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاص خاص مقام یا خاص خاص ماحول کا انسان کی ذات پر کیا اثر ہوتا ہے" اس تعریف کو ہم اور واضح کرنے کے لیے ذیل کی مثال پیش کرتے ہیں: بنگال میں انسان مجبور ہے کہ چاول ہی بوئے اور چاول ہی کھائے۔ انسان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ مقام کی خاصیت نے! ماحول نے! آب وہوا نے!

استوائی نشیب کے علاقوں میں گندم نہیں بویا جاسکتا۔ کینیڈا میں چاول اور گنگا

کے ڈیلٹے کے آس پاس روئی نہیں پیدا ہو سکتی۔ دکن کی زمین پٹ سن نہیں پیدا کر سکتی پہاڑی علاقوں پر آبادی عموماً کم ہوتی ہے، ہر خطے میں کانیں نہیں مل سکتیں۔ ساحل پر رہنے والے لوگوں کا گزارہ مچھلی کے شکار پر ہوتا ہے۔ مقامی خاصیت کی مجبوریاں، ماحول کی مجبوریاں آب و ہوا کی مجبوریاں ایسی مجبوریاں ہیں جو خود فطرت نے انسان پر عائد کر رکھی ہیں اور اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اس تعریف اور اس سے پہلی دو تعریفوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہاں اشیا کی ترتیب بھی موجود ہے اور اس ترتیب کا اصل اصول بھی موجود ہے۔

اس تعریف میں انسان کے تذکرے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اس لحاظ سے یہ تعریف باقی تمام تعریفوں سے بہتر ہے، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگرچہ اس میں دوسروں کی نسبت زیادہ صداقت موجود ہے لیکن کامل صداقت اس کے بس کی بھی نہیں اس لیے کہ اشیاء ماحول، آب و ہوا کا اثر انسانی زندگی پر دکھایا گیا ہے یہ نہیں ظاہر کیا گیا کہ انسان نے اپنے دل اور دماغ سے کام لے کر ان چیزوں پر کس حد تک قابو پایا ہے آخر اس بنی آدم نے فطرت سے اپنے منشا کے مطابق بھی تو بڑے بڑے کام لیے ہیں جنگل کاٹ کر بستیاں بسائی ہیں۔ پہاڑوں کو چیر کر سیکڑوں میل لمبے رستے بنائے ہیں۔ ریلیں نکالی ہیں۔ فضا میں پرواز کی ہے۔ آسمان کی قوتوں کو زمین والوں کے استعمال میں لایا ہے اس لیے اس اہم فروگذاشت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہیں گے یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔

د ـــ اس علم کے موجودہ ممکنات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تعریف یوں ہوگی "جغرافیہ ایک علم ہے جس کے ذریعے ہمیں انسان اور فطرت کے باہمی تعلقات کا پتہ چلتا ہے اور کائنات میں جو عمل اور ردِ عمل واقع ہو رہے ہیں ان سے بھی آگاہی ہوتی ہے"۔

اس تعریف کی روشنی میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرت کے عمل و حرکت

سے کہاں تک متاثر ہوا ہے اور خود فطرت نے انسان کو کہاں تک کام دیا ہے۔ انسان یقیناً فطرت کے منشا سے متاثر ہوتا ہے مثلاً ہمارے مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ گرم اور مرطوب خطوں میں چاول بوئے جاتے ہیں اور وہاں کے باشندوں کو اسی پر گزر اوقات کرنا پڑتی ہے۔ ساحل پر رہنے والے مچھلی سے پیٹ پالتے ہیں، لیکن یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سوچ سکتا ہے، غور کر سکتا ہے، صاحب قوت ہے، صاحب ارادہ ہے، وہ اپنے ماحول کو اپنے ارادے کے مطابق بدل لے سکتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو ہموار کر کے کھیتی باڑی کے لیے زمین تیار کی ہے اس نے دریاؤں کا پانی ندیوں کے ذریعے بہا کر ان زمینوں کو بھی سیراب کر دیا ہے جو صدیوں سے پانی کی صورت کو ترستی تھیں۔ برق کو ایک آسمانی قوت سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہی قوت کسی حد تک انسان کی دسترس میں ہے۔ انسان نے اس کو اپنے نظم و ترتیب سے بہت ہی کارآمد چیز بنا لیا ہے۔ اس سے پیشتر اس کا مفہوم زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ برق ایک آتشیں مادہ ہے جو گاہ و بیگاہ بادلوں سے گرتا ہے اور جو شے اس کی زد میں آجاتی ہے فنا و برباد کر دیتا ہے۔ اس کے مفید پہلوؤں سے کوئی بھی شناسا نہ تھا۔ دشت اور بن جن میں انسانی نفوس کا برقرار رہنا محال امر تھا۔ لہلہاتے ہوئے گلستانوں میں تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ وحشی درندوں کے بسیروں کو انسانوں کی امن گاہیں بنا دیا ہے، پہاڑوں کو چیر کر ریلیں نکالی ہیں، سڑکیں بنائی ہیں گھر آباد کیے ہیں، وسائل آمد و رفت کو وسعت دے کر ساری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ مہلک درندوں کی ہستی کو مٹا دیا گیا ہے اور صرف وہی جانور پرورش پاتے ہیں جو انسان کی اغراض کے مطابق ہوں۔

غالباً یہ تعریف ایسی ہے جو تمام جغرافیے پر حاوی ہے اس لیے ہمیں جغرافیے کا مطالعہ کرتے ہوئے جغرافیے کی یہی تعریف پیش نظر رکھنا چاہیے۔

جغرافیے کا تاریخی ارتقا۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسکولوں میں مختلف وقتوں میں جو جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا اس کی حقیقت کیا ہوتی تھی۔ قدیم وقتوں میں جو جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا اس میں دریاؤں، پہاڑوں، راسوں، خلیجوں، جزیروں وغیرہ کی تعریفیں دی ہوتی تھیں اور ان کا تھوڑا سا حال بھی بتایا جاتا تھا۔ مثلاً اگر ہندوستان کا حال لکھنا مقصود ہوتا تھا تو یہی کافی سمجھ لیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے صوبوں کے نام گن دیے جائیں۔ پہاڑوں اور پہاڑی مقاموں کا ذکر کر دیا جائے۔ پھر ہندوستان کی خلیجوں جھیلوں اور جزیروں کی تعریفیں اور نام بتا دیے جائیں۔ ہزارہا طالب علم جنھوں نے عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی ان چیزوں کو نہیں دیکھا ہوتا تھا بار بار پڑھ کر انھیں حفظ کر لیا کرتے تھے اور ان کی حیثیت بالکل بولنے والے طوطے کی سی ہوتی تھی۔ اساتذہ کو بھی یقین ہوتا تھا کہ وہ جغرافیے کی تعلیم دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ لڑکے بھی مطمئن ہوتے تھے کہ انھوں نے جغرافیہ پڑھ لیا ہے۔ یہ منزل جغرافیے کی ابتدائی منزل تھی اس کو انگریزی زبان میں ان نیومیریشن اسٹیج کہتے ہیں۔ جغرافیے کا یہ طریقہ تعلیم کتنا ہی نامکمل کیوں نہ ہو لیکن ناشکری ہوگی اگر ہم کہیں کہ یہ طریقہ تعلیم بیکار تھا۔ آخر اسی طریق نے طریق جدید کے لیے راہ صاف کی تھی۔ دنیا اصلاح و ترقی کی دنیا ہے کسی وقت کوئی بھی شے مکمل نہیں ہوتی اس میں ترمیم و تجدید کی گنجائش رہتی ہی ہے۔ ترقی کی دوسری منزل میں جغرافیے کی ہیئت کچھ بدلتی ہے۔ یہاں اب دریاؤں، پہاڑوں، خلیجوں، راسوں کے نام بھی دیے جاتے ہیں اور ان کا کچھ حال بھی اختصار کے ساتھ بتایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں دریا کس مقام سے نکلتا ہے کس علاقے میں بہتا ہے اور کہاں جا کر گرتا ہے۔ فلاں پہاڑ کہاں سے کہاں تک چلا گیا ہے۔ شہروں کی مشہور باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ آب و ہوا بھی بتائی جاتی ہے۔ اس قسم کا علم بھی نامکمل تھا اور جغرافیہ نہیں کہلا سکتا تھا۔ جغرافیے کی اس صورت کو انگریزی میں ٹوپوگرافی کہتے ہیں۔

ے کے بعد جغرافیہ کے خط و خال میں اور اضافہ ہوتا ہے اور یہ اضافہ یقیناً قابلِ قدر اضافہ ہے اور رافیائے جدید کے بہت قریب ہے۔ اس میں مختلف اشیا کے باہمی تعلق، ان کے اسباب و علل ان کے نتائج کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جغرافیہ داں اس منزل میں صرف یہی نہیں کرتے کہ اشیا کے نام گن دیں یا ان کی اہمیت بتادیں بلکہ تفصیل کے ساتھ ہمیں ان اشیا کا باہمی تعلق بتاتے ہیں مثلاً یہ کہ فلاں ہ کے لوگ محنتی ہیں۔ محنتی کیوں ہیں؟ بمبئی میں روئی بہت پیدا ہوتی ہے —— کیوں؟ بنگال ں چاول اور پٹ سن زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ ہندوستان کے لوگ زیادہ تر قنوطیت پسند (   ) ہیں۔ اس کی علت کیا ہے؟ بارش ہندوستان میں خاص ص موقعوں پر ہوتی ہے اس کے وجوہ کیا ہیں؟ یہ جغرافیے کی تیسری منزل ہے اسی کو فزیوگرافی (Physiography) کہتے ہیں۔

اس کے بعد جغرافیے کی آخری منزل آتی ہے جسے جغرافیۂ جدید یا جغرافیہ کہتے ہیں۔ س کی رو سے جغرافیہ داں ساری دنیا کو انسان کا گھر سمجھتے ہیں اور تمام موجودات کو انسان کی روریات کی چیزیں سمجھتے ہیں اور مطالعے کے لیے ان امور کو پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ انسان اسی گھر ں رہتا ہے۔ اسی میں اپنا کام کاج کرتا ہے اور یہیں رہ کر اپنی زندگی کو برقرار رکھتا ہے، تو گویا ئی بات بھی ایسی نہیں رہ جاتی جو دنیا اور انسان کے باہمی تعلقات کے ضمن میں باقی رہ گئی ہو س کے علاوہ دنیا میں جو عمل یا ردِ عمل مختلف وقتوں میں از خود ہوتے رہتے ہیں ان پر تنقیدی ظر ڈالی جاتی ہے۔

اس سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا جا چکا ہے کہ جغرافیہ اسکولوں میں کیوں پڑھانا چاہیے۔ اب ہم اس بات کی طرف توجہ دیتے ہیں کہ جغرافیے کی غرض و غایت کیا ہے۔

جغرافیے کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس دنیا کے انسانوں کو کائنات کے متعلق غور کرنا سکھا دے اور انھیں اس قابل بنا دے کہ گردوپیش کی دنیا کے سیاسی اور معاشرتی مسائل کو ٹھنڈے دل سے سوچ سکے۔

کائنات معمول کی حیثیت رکھتی ہے اور انسان عامل کی۔ انسان سے مراد اس کی حرکت عمل ہے۔ اس صورت میں ہم کائنات کی تشبیہ سنیما کی قسم کے ایک سٹیج سے دینگے جس میں انسان ایکٹنگ کر رہا ہے۔ اس میں تاریخ کا مضمون بھی شامل ہو جاتا ہے لیکن اگر اسے بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ دونوں کے منتہائے نظر علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ تاریخ صرف اس ڈرامے سے تعلق رکھتی ہے جو سٹیج پر یعنی کائنات میں کھیلا جا رہا ہے لیکن جغرافیہ اس سٹیج سے تعلق رکھتا ہے جس پر انسان اپنے علم وعمل کے ذریعے کھیل کھیل رہا ہے۔

اگر ہم اس سٹیج کی تشبیہ جاری رکھیں تو ہم کہینگے کہ یہ سٹیج بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً: آج سے پچاس سال پیشتر کی حالت موجودہ حالت سے مختلف تھی۔ اسی نسبت سے لوگوں کی ضرورتیں اور ان کی شکلیں مختلف تھیں۔ اس سٹیج میں تبدیلی تو ہوتی رہتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسکے بعض حصّے جلد جلد بدل رہے ہیں بعض آہستہ آہستہ بعض پر سرے سے جمود طاری ہے۔ گھنے جنگلات کو نیلی بار اور گنجی کی صورت اختیار کرتے ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ ہائیڈرو الیکٹرک اور لاسلکی نے جو تبدیلیاں کی ہیں وہ بھی ہم نے دیکھی ہیں لیکن یہ بھی ہمارے پیشِ نظر ہے کہ راجپوتانے کے ریگستان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بعض تبدیلیاں خود قدرت اپنے ہاتھ سے کرتی ہے بعض تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں انسان اپنے فہم وادراک کے ذریعے کرتا ہے۔ کچھ تبدیلیاں وہ خود کرتا ہے اور کچھ تبدیلیوں کے لیے جگہ تیار کر دیتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس کمی کو پورا کر دیں۔ اب آپ خود اندازہ کریں کہ ہماری سیاسی تجارتی اور معاشرتی حالت کو

وجودہ صورت اختیار کرنے میں کتنی دیر لگی ہے۔

جغرافیہ اور تصوّر:

جغرافیہ کو تخیل سے کوئی تعلق نہیں تخیل کے ذریعے سے انسانی ذہن ان اشیا کی تصویریں کھینچ دیتا ہے جن کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہمیں بھوت یا پریت کا خیال آتا ہے تو ہم تخیل کی مدد سے اس کی تصویر اپنے ذہن میں کھینچ لیتے ہیں۔ جغرافیے کا اس قسم کے تخیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق صحیح قسم کے تصور سے ہے — اور ان اشیا کے تصور سے جو دنیا میں اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔ مثلاً: ہم سائبیریا کے برفستان کا اپنے علم کی روشنی میں تصور کرسکتے ہیں۔

منطقہ حارہ کے جنگلات کا اور صحرائے اعظم افریقہ کی بے جان وسعتوں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ سمندر یا جزیرے اگر ہم نے نہیں دیکھے تو تصور کی مدد سے ہم ان کی شکلیں اپنے ذہن میں بنا سکتے ہیں۔ ساری دنیا کی سیاحت صرف گنتی کے چند انسانوں نے کی ہوگی لیکن تمام تعلیم یافتہ لوگ جانتے ہیں کہ برطانیہ کا محل وقوع کیا ہے؟ افریقہ کے لوگ کیسے ہیں؟ تو گویا جغرافیہ کا تعلق تصور سے بھی ہے اور ایسی چیزوں کے تصور سے جو دنیا میں موجود ہیں لیکن ان کا مشاہدہ کرنا بس کی بات نہیں۔ اگر ہم اپنے ہی تجربے پر اعتماد کریں تو ہمیں دنیا کے ایک گوشے کا بھی صحیح علم نہیں ہو سکتا۔

اوپر کی تفصیل سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جغرافیہ صرف اسکولوں ہی کے لیے ضروری نہیں۔ بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسانوں کو دنیا میں رہنے کے قابل بناتا ہے اور انسانی زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرتا ہے۔

ہماری آئندہ حکومت

(بسلسلۂ ماہ نومبر ۱۹۳۶ء)

از

(بشنداس صاحب ایم اے، بی ٹی، گجرات)

صوبائی حکومتِ خود اختیاری

مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ کے مطابق ہندوستانیوں کو سلف گورنمنٹ کا سبق صوبوں میں آ
سکھانا بہتر تھا۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے مطابق صوبائی اور مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیارات کے ان
قوانین بنا سکتی تھیں، لیکن ان پر عملدرآمد ہونے سے پہلے گورنر جنرل کی منظوری لازمی تھی۔ سائم
کمیشن نے اس امر کی سفارش کی کہ اب صوبوں کو مکمل طور پر خودمختار کر دیا جائے۔ چنانچہ نئے ایکٹ
کے مطابق ہندوستان کے مندرجۂ ذیل صوبے گورنروں کے ماتحت ہونگے:۔

مدارس، بمبئی، بنگال، صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ، پنجاب، بہار، صوبجات متوسط
برار[1]، آسام، شمال مغربی سرحدی صوبہ، اڑیسہ اور سندھ۔ مزید برآں شہنشاہ معظم اور اس کی کونسل
کو کسی نئے صوبے کے بنانے یا کسی صوبے کے رقبے کو کم و بیش کرنے یا اس کی حد کو تبدیل کرنے
کا حق بھی دیا گیا ہے۔

---

[1] برار کا علاقہ نومبر ۱۹۳۶ء کے عہدنامے کے مطابق چند شرائط کے ساتھ نظام حیدرآباد کو واپس مل گیا ہے۔

انتظامیہ حکومت: ۔ فیڈرل گورنمنٹ کی طرح گورنر کی مدد اور مشورے کے لیے وزرا کی ایک انتظامیہ کونسل ہوگی جس کے ممبروں کو اُس صوبے کے گورنر ہی منتخب کرینگے۔ ان وزرا کا فرض ہوگا کہ وہ گورنر کو صوبائی حکومت کے متعلق ضروری واقفیت بہم پہنچائیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گورنر کی انتظامیہ طاقت محض ان امور پر عائد ہوتی ہے، جن کے متعلق صوبائی مجالس قوانین وضع کرنے کی مجاز ہیں۔ ان کی مختصر سی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

امنِ عامہ قائم رکھنا، عدالتیں (ماسوائے فیڈرل کورٹ)، پولیس، جیل، قومی قرضہ، پراونشل سروس، پراونشل پنشن، صوبجاتی عمارتیں، جبری حصولِ زمین۔ لائبریریاں اور عجائب خانے، صوبائی مجالس کا انتخاب، صوبائی وزرا، اسپیکر اور پریزیڈنٹ وغیرہ کی تنخواہیں، لوکل گورنمنٹ یعنی میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ، صحت عامہ، ہسپتال، مذہبی مقامات کی زیارت، تعلیم، دفن، ذرائع آمدورفت، ذرائع آب رسانی، زراعت، کان کنی، ماہی گیری، جنگلی جانوروں کی حفاظت، اندرونی تجارت، منڈیاں، ساہوکارہ، سرائیں، صنعت وحرفت، تجارت، منشی اشیا کی پیداوار اور تجارت، غریبوں کی پرورش، بے روزگاری کا مسئلہ، خیراتی یا مذہبی ادارے، معاملۂ زمین اور زمین کے متعلق دیگر ٹیکس، پیشوں اور تجارت پر ٹیکس وغیرہ وغیرہ، مزید برآں ملک میں امن قائم رکھنے اور ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور گورنر جنرل کے احکام کی تعمیل کرانے کی خاص ذمے داری بھی گورنر پر عائد ہوتی ہے۔

ان بڑے صوبوں کے علاوہ مندرجۂ ذیل صوبے چیف کمشنر صاحب کے ماتحت ہونگے برٹش بلوچستان، دہلی، اجمیر مارواڑ، کورگ، جزائر انڈمان ونکوبار، پنتھ پپلوڈا۔ چیف کمشنر کا تقرر خود حضور وائسرائے کرینگے۔ بلوچستان کے متعلق یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ فیڈرل لجسلیچر کا صرف وہ قانون بلوچستان پر عائد ہوسکتا ہے، جس کے متعلق حضور وائسرائے اعلانِ خاص کرینگے۔

عدن اب ہندوستان کی حکومت کا حصہ نہیں رہے گا۔

صوبائی مجالس واضع قوانین۔ صوبجات مدارس بمبئی، بنگال، یوپی، بہار اور آسام میں دو مجالس ہونگی: لیجسلیٹو کونسل اور لیجسلیٹو اسمبلی، باقی سب صوبوں میں صرف ایک ہی مجلس واضع قوانین ہوگی اور اُس کا نام لیجسلیٹو اسمبلی ہوگا مسلم، سکھ، ہندوستانی عیسائیوں، اینگلو انڈین اور یورپین اقوام کے لیے جداگانہ انتخاب ہوگا نشستوں کی تعداد کمیونل اوارڈ مجریہ ۱۲ اگست ۱۹۳۲ء اور پونا پیکٹ مجریہ ۲۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کے مطابق مقرر کی گئی ہے۔

لیجسلیٹو کونسلوں میں ممبران کی تعداد یہ ہوگی:۔ مدراس ۵۶-۵۴، بمبئی ۳۰-۲۹، بنگال ۶۵-۶۳، یوپی ۶۰-۵۸، بہار ۳۰-۲۹، آسام ۲۱-۲۰ ہر ایک صوبے میں چند ایک نشستوں کے مقرر کرنے کا اختیار گورنر کو بھی ہوگا۔

لیجسلیٹو اسمبلیوں میں مندرجہ ذیل نشستیں ہونگی۔ مدراس ۲۱۵، بمبئی ۱۷۵، بنگال ۲۵۰، یوپی ۲۲۸، پنجاب ۱۷۵، بہار ۱۵۲، صوبجات متوسطہ ۱۱۲، آسام ۱۰۸ شمال مغربی سرحدی صوبہ ۵۰، اڑیسہ ۶۰، سندھ ۶۰۔

پنجاب میں مزید تقسیم اس طرح پر ہے:۔

عام نشستوں کی تعداد: ۴۲۔ ان میں سے ۸ نشستیں اقوام مندرجہ جدول کے لیے مخصوص ہیں۔ سکھ = ۳۱، مسلمان = ۸۴، اینگلو انڈین = ۱، یوروپین = ۱، ہندوستانی عیسائی = ۲، کامرس = ۱، زمیندار = ۵، یونیورسٹی = ۱، مزدور = ۳، عورتیں = ۴: (مسلمان ۲، سکھ ۱، عام ۱)

لیجسلیٹو اسمبلی کا انتخاب ۵ سال کے لیے ہوگا، لیکن لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں کا ایک تہائی ہر تیسرے سال علحدہ ہوتا جائیگا اور ان کے بجائے نیا انتخاب ہوگا۔ کوئی آدمی فیڈرل

اور صوبائی مجالس دونوں کا ممبر بیک وقت نہیں رہ سکتا۔ انتخاب پریزیڈنٹ اور مراحل قانون سازی میں صوبائی وفیڈرل مجالس ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ صوبائی مجالس میں کسی بل کے پاس ہونے پر گورنر کے دستخط ثبت ہونے پر وہ بل قانون بن جائیگا۔ اگر گورنر مناسب سمجھے، تو کسی بل کو وائسرائے کی منظوری کے لیے رکھ سکے گا۔ وائسرائے یا اس کو منظور کر لیں گے یا منظور کرنے سے انکار کر دینگے یا حضور شہنشاہ کی خدمت میں برائے منظوری بھیج دینگے یہ بھی یاد رہے کہ شہنشاہ، گورنر یا گورنر جنرل کی منظوری کے بعد ایک سال کے اندر اندر اس قانون کو مسترد کرنے کے مجاز ہونگے۔

حق رائے دہندگی ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے مطابق ......۳۰، اشخاص یعنی کل آبادی کے ۲ فی صدی کو رائے دینے کا حق حاصل تھا اور چونکہ یہ حق عام طور پر ان لوگوں کو تھا جن کے پاس کسی نہ کسی قسم کی کوئی جائداد ہو، اس لیے بہت تھوڑی عورتیں ووٹر تھیں ۱۹۳۲ء میں لوتھین کمیٹی کی سفارشات شائع ہوئیں اور ان کی بنا پر اب یہ فیصلہ ہوا ہے کہ دو کروڑ اسی لاکھ سے زائد مردوں اور ۶۰ لاکھ عورتوں کو حق رائے دہندگی ہوگا، یعنی ۱۴ فی صدی کے قریب اشخاص ووٹر ہونگے۔ عورتوں کے حق رائے دہندگی کو بہتر بنانے کی خاص کوشش کی گئی ہے اور ہر وہ عورت جو ذیل کی شرائط میں سے کوئی ایک شرط پوری کر دے، ووٹر ہو سکتی ہے۔

۱ - پڑھی لکھی ہو۔

۲ - برٹش انڈیا کی باقاعدہ افواج کے کسی افسر یا نان کمیشنڈ افسر یا سپاہی کی بیوی یا ماں ہو۔

۳ - کسی ایسے شخص کی بیوی ہو، جو اپنی فوجی خدمات کی وجہ سے ووٹ دینے کا حق رکھتا ہو۔

۴ - کسی ایسے شخص کی بیوی یا بیوہ ہو، جو اپنی جائداد کی بنا پر حق رائے دہندگی رکھتا ہو۔

(ان چار حالتوں میں یہ لازمی ہے کہ وہ عورت ووٹ حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ

درخواست گزارے ۔

۵ - اس کی اپنی جائداد اس قدر ہو، جس کے مطابق عام رائے دہندگی کا معیار قائم کیا گیا ہے ۔

مردوں کے لیے یہ حق حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک شرط کا پورا کرنا لازمی ہے ۔

۱ - ۶ ایکڑ آبپاش یا ۱۲ ایکڑ غیر آبپاش زمین کا مالک ہو ۔

۲ - ۲۰۰۰ روپے کی مالیت کی غیر منقولہ جائداد رکھتا ہو یا ۶۰ روپے سالانہ کرایہ ادا کرتا ہو۔ یا کم از کم ۶۰ روپے سالانہ کرائے کی حیثیت کی جائداد کا مالک ہو ۔

۳ - انکم ٹیکس ادا کرتا ہو ۔

۴ - کم از کم ۵۰ روپے میونسپل ٹیکس یا ۲ روپے حیثیت ٹیکس یا پراونشل ٹیکس وغیرہ ادا کرتا ہو ۔

۵ - ذیلدار، سفید پوش، نمبردار یا انعام دار ہو ۔

۶ - کم از کم دس روپے سالانہ کا معافی دار یا جاگیردار ہو ۔

۷ - کم از کم ۵ روپے سالانہ مالیہ ادا کرتا ہو یا اس قدر مالیے کی حیثیت کی زمین کا موروثی مالک ہو ۔

۸ - باقاعدہ افواج کا ریٹائرڈ پنشن خوار سپاہی یا افسر ہو ۔

یاد رہے ہر حالت میں ووٹر کی عمر کم از کم ۲۱ سال ہونا لازمی ہے ۔

یہ سب کچھ عرض کر چکنے کے بعد میں ایک اور بات کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں شہنشاہ ہند اور وائسرے کے درمیان سکرٹری آف اسٹیٹ کا عہدہ خاص اہمیت رکھتا ہے سب گورنر اور گورنر جنرل سکرٹری آف سٹیٹ کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ پارلیمنٹ اور کیبنٹ

کا ممبر ہوتا ہے اور اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لیے اس کو جواب دہ ہوتا ہے۔ اس کے صلاح مشورے کے لیے ایک انڈیا کونسل ہوا کرتی ہے، جس کے کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ دس ممبر ہوتے ہیں، جن میں سے نصف ایسے ہوتے ہیں، جو دس سال یا اس سے زیادہ عرصے کے لیے ہندوستان میں رہ چکے ہوتے ہیں۔ اب جائنٹ سیلیکٹ کمیٹی اور وائٹ پیپر کی سفارشات کے مطابق یہ فیصلہ ہوا ہے کہ سکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا یعنی وزیر ہند چند ایک مشیر مقرر کرلیگا، جن کی تعداد تین اور چھ کے درمیان ہوگی اور جن میں سے نصف دس سال یا زیادہ عرصے کے لیے ہندوستان میں رہ چکے ہونگے۔ اس کا نام مجلسِ مشیراں رکھا جا سکتا ہے۔ ان مشیروں کا یہ فرض ہوگا کہ سکرٹری آف اسٹیٹ کے پوچھنے پر اس کو امور متعلقہ ہندوستان پر صلاح دیں۔ ان سے صلاح لینا یا نہ لینا اور اجماعی طور پر مشورہ لینا یا انفرادی طور پر اور ان کے مشورے پر عمل کرنا یا نہ کرنا وزیر ہند کی مرضی پر منحصر ہوگا۔ گویا نئے سال سے موجودہ انڈیا کونسل کا بھی خاتمہ سمجھیے۔

زمینداروں کی مالی مشکلات کیونکر حل ہو سکتی ہیں

پنجابی زمیندار ڈنمارک کے زمینداروں کا اتباع کریں

از

دفتر اصلاح دیہات لاہور

دیہاتیوں کی اقتصادی فلاح و بہبود کے لیے جدید آلات کاشتکاری، عمدہ بیجوں اور کھادوں وغیرہ کو استعمال کرنے کا جب کبھی ذکر آتا ہے تو کسانوں کی بے مائگی اور بے سروسامانی کا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان غریبوں کے پاس اتنا سرمایہ کہاں کہ عمدہ بیل اور قیمتی آلات وغیرہ خرید کر کھیتی باڑی کے نئے طریقوں کو رائج کریں۔ ان کے پاس اگر روپیہ ہو، تو وہ کیوں قرض کی توجہ نہ ادا کریں۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی فوراً ہمارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ مسئلہ ہمیشہ پیچیدہ کا پیچیدہ ہی رہ جاتا ہے، جس کو حل کرنے کے لیے ہم کوئی عملی اقدام نہیں کرتے

دراصل زمینداروں کی ہمدردی کا جذبہ تو اب عالمگیر ہو چکا ہے، مگر اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ بیرونی مدد سے کاشتکار کے مصائب اور مشکلات کا ازالہ ہو۔ جہاں تک کسانوں سے ہمدردی کرنے اور انھیں خوشحال دیکھنے کا تعلق ہے، اس سے تو کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ داخلی و خارجی تمام ذرائع سے ان کی اصلاح معیشت کی کوشش کی جائے، مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ اس کی اصلاح بغیر کسی خارجی مدد کے ذریعے کے ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی ذات سے بد اعتمادی کی وجہ سے نہ تو زمینداروں کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہوگا اور نہ خارجی مدد کا اثر ہی دیر تک قائم رہ سکتا ہے۔ غیر ممالک کے کسانوں کی مثالیں ہمارے

سامنے موجود ہیں۔ وہ لوگ اپنی جماعتی ضروریات کا حل باہمی امداد کے ذریعے ہی کرتے ہیں اور اس امید کے منتظر نہیں رہتے کہ کوئی ان کی مدد کرے، تو وہ کسی کام کو سرانجام دیں۔

اہلِ ڈنمارک نے قیمتی آلات، عمدہ بیج اور کھادیں وغیرہ حاصل کرنے کا مندرجہ ذیل طریق پر انتظام کیا ہے جس پر اگر ہمارے زمیندار کاربند ہو جائیں، تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائیگا۔

ڈنمارک کے ہر ایک ضلع میں زمیندار کو ایسی سہولتیں بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جاتا جس کے ذریعے وہ اپنی زراعتی ضروریات یعنی، عمدہ بیج، بہترین آلات، بہترین کھاد اور مویشیوں کا عمدہ چارہ وغیرہ کم سے کم قیمت پر خرید سکے۔ ان ضروریات کو بطریق احسن پورا کرنے کے لیے بہت سی مقامی انجمنیں قائم ہوئی ہیں، جن کا الحاق اپنے ضلع کی ایک مرکزی انجمن سے ہوتا ہے اور مقامی انجمنوں کا مرکزی انجمنوں سے الحاق ہونے سے پیشتر یہ شرط طے کر لی جاتی ہے کہ وہ کم از کم پانچ سال تک اپنے ممبروں کی زراعتی ضروریات کا ذخیرہ خرید کر اپنی مقامی انجمنوں کو مہیا کرتی رہے جب کسی زمیندار کو کوئی چیز خریدنا ہوتی ہے، وہ اپنی مقامی انجمن کے پاس جا کر مطلوبہ چیز خرید لیتا ہے۔

مرکزی انجمن اپنا سرمایہ شروع شروع میں تو کسی بنک سے قرض لیتی ہے، مگر بعد ازاں اپنی مقامی انجمنوں سے ضمانت کی رقوم وصول کر کے ان میں محفوظ سرمائے کی رقوم ملا کر کسی بنک میں جمع کراتی رہتی ہے اور کافی روپیہ جمع ہو جانے پر وہ اس انجمن کا کاروباری سرمایہ بن جاتا ہے۔ شروع شروع میں جب ایسی انجمنیں قائم ہوئیں، تو ان کے پاس اپنا سرمایہ موجود نہ تھا بلکہ انھوں نے بنک سے قرض لے کر کام شروع کیا تھا، مگر اب ان کے پاس اپنا سرمایہ ہے، جو اس طرح فراہم کیا گیا کہ مقامی انجمن نے اپنے ممبران سے فی گائے دو یا تین کراؤن چندہ وصول کیا اور اس طرح جو رقم جمع ہوئی اس کو کسی بنک میں جمع کرا دیا۔ اس کے علاوہ نصف یا چوتھائی منافع کو بھی محفوظ

سرمائے کی مد میں اسی کے ساتھ ہی ہر سال جمع کرایا اور باقی منافع ممبران میں خرید کے تناسب سے تقسیم کر دیا۔ اس طریق سے انجمن کے پاس کچھ عرصے کے بعد اپنا سرمایہ جمع ہو گیا۔

سرمایہ فراہم ہو چکنے کے بعد مرکزی انجمن اپنی مقامی انجمنوں کو مال خرید کر مہیا کرتی ہے۔ اس طرح مقامی انجمنوں کے پاس جو، جئی، جوار، باجرہ، گندم، مکئی، ماش، چنے وغیرہ کے اعلےٰ بیج کے علاوہ، مختلف قسم کی کھلیوں، بنولوں اور بھوسے وغیرہ کا ذخیرہ فروخت کرنے کے لیے موجود رہتا ہے اور زمیندار اپنی ضرورت کے موقع پر وہاں سے مال خرید لیتے ہیں۔

اوسطاً ہر ایک مقامی انجمن تیس ۳۰ یا پینتیس ۳۵ ممبروں سے چلائی جاتی ہے، جن میں ڈائرکٹر، خزانچی، انتظامیہ کمیٹی کے ممبر، صدر، نائب صدر اور سیکرٹری بھی شامل ہیں، جو سب کے سب آنریری ہوتے ہیں۔ ممبر بننے کے لیے کسی شخص کو مشترکہ سرمائے کی کمپنیوں کی طرح سرمائے کا کوئی حصہ وغیرہ خریدنا نہیں پڑتا، بلکہ ہر شخص ان مقامی انجمنوں کا ایک یا دو روپے بطور فیس داخلہ ادا کر کے ممبر بن سکتا ہے اور وہ چندہ بھی انجمن کی رکنیت سے علیحدہ ہونے پر واپس کر دیا جاتا ہے۔

مرکزی انجمن کے مہیا شدہ مال کے ذخیرے میں سے مقامی انجمنیں اپنے ممبروں کو زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک مال قرض دے سکتی ہیں۔ مقامی انجمن کے ممبروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی مال خرید سکتے ہیں، مگر وہ منافع میں سے کسی حصے کے حقدار نہیں ہوتے اور نہ ان کو مال ادھار ہی دیا جاتا ہے۔ مگر ممبران کو بھی ایک ماہ تک کے لیے قرض دیا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن جب مال کی قیمت اتنی زیادہ ہو کہ ممبر ایک ماہ کے اندر یکمشت ادا نہ کر سکتا ہو تو وہ رقم دو یا تین قسطوں پر وصول کر لی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی ممبر کا اچانک جانور مر جانے یا کاشتکاری کے جدید آلات جو ذخیرے میں موجود نہ ہوں، وغیرہ خریدنے کی ضرورت پیش آنے پر مقامی انجمنیں اس کو اشیاء مرکزی انجمن کی وساطت سے خرید کر دے دیتی ہے۔

تربیت قوّتِ ارادی اور انہماکِ ذوق

(گذشتہ سے پیوستہ)

از
عبدالمجید خاں صاحب اظہر بی اے

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے اہم حصے یعنی نفسیاتِ ذوق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ گذشتہ تعلیمی بحث سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ ہمیں خصوصیت سے جن باتوں پر روشنی ڈالنا مطلوب ہے وہ تعلق ہے ذوق کا ایک طرف خواہشات و انبساط سے اور دوسری طرف افکار و سعی سے۔

اولاً ذوقِ عملی اور تظلیلی Projective یا متحرک ہے ہم دلچسپی لیتے ہیں کسی چیز میں دلچسپی لینا اس کے متعلق عملی تردد کرنا ہے، یہ ممکن ہے کہ کسی چیز کا تاثر محض ساکن و جامد ہو لیکن ذوق ہمیشہ متحرک ہوتا ہے۔ ثانیاً ذوق معروضی ہے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو مختلف مشاغل میں دلچسپی ہے۔ اور اکثر اشخاص کی مختلف دلچسپیوں مثلاً تجارتی دلچسپیوں، مقامی دلچسپیوں وغیرہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور اسی طرح ذوق یا دلچسپی کو ترددات اور معاملات سے متحد العین قرار دیا جاتا ہے۔ ذوق کا انجام تاثرات کی طرح اس کی بغاوت پر ہی نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا ہمیشہ کوئی مقصد یا منشا ہوتا ہے جس پر اس کا دارومدار ہے۔ ثالثاً ذوق موضوعی ہے یعنی داخلی طور پر قدر کا پہچاننا یا محسوس کرنا ہے۔ اس کے دونوں پہلو ہیں یعنی جذباتی یا عملی اور معروضی جہاں کہیں بھی ذوق ہوگا وہاں تاثرات بھی ضرور ہوں گے۔

مندرجۂ بالا وہ معانی ہیں جن پر عموماً لفظ ذوق کا اطلاق کیا جاتا ہے کسی عمل میں اس کی معلوم مقدر قیمت کی وجہ سے انہماک یا محویت کا خیال لفظ ذوق کی تہ میں پنہاں معلوم ہوتا ہے۔

انگریزی لفظ انٹرسٹ Interest جس کا ترجمہ ہم نے ذوق کیا ہے اس کے لغوی معنی "درمیانی" کے ہیں اور اس کا اشارہ بھی اسی طرف ہے کیونکہ ذوق شخصیت اس کے عملی نتائج اور اشیاء کے درمیانی فاصلے کو تباہ کر دیتا ہے اور اسی طرح اگر ذوق کو "عضوی اتصال" Organic Union کا آئینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اب مجھے ذوق کے مندرجۂ بالا تینوں پہلوؤں کو شرح و بسط سے بیان کرنا ہے۔

۱ - ذوق کا عملی یا متحرک پہلو۔

ذوق کا عملی یا متحرک پہلو ہمیں تہیج اور ارتجالی تقاضوں یا میلانِ عمل پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ خالص منتشر بے غرض تہیج کا کوئی وجود نہیں تہیج کی تفریق ہمیشہ کسی کم و بیش مخصوص مقاصد پر ہوتی ہے۔ تہیج کے اخراج کے مخصوص امتفاقی طریق ہیں گھاس کے دو ڈھیروں کے درمیانی گدھے والا معمہ اگرچہ بہت عام ہے لیکن اس کے بنیادی مغالطے کو بہت کم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر "خودی" جامد یا بے پروا ہو اور ہمیشہ خارجی تہیج کی انتظار کش، تو مندرجۂ بالا فرضی مثال میں بیچارہ گدھا بھوکوں مر جائیگا، کیونکہ خوراک کے دونوں منبعوں کے درمیان اس کا توازن صحیح قائم رہیگا خودی ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے ہمیشہ کسی نہ کسی فوری ضرورت میں ساعی رہتی ہے اور یہ مسلسل عمل اس کو کسی خاص طرف مائل کر دیتا ہے دوسرے الفاظ میں گدھا ہمیشہ گھاس کے ایک ڈھیر کی طرف پہلے ہی چل رہا ہوتا ہے طبعی بھینگے پن کی کوئی مقدار بھی اتنا نفسیاتی بھینگا پن نہیں پیدا کر سکتی جس سے یہ معلوم ہونے لگے کہ گھاس کے دونوں ڈھیروں سے گدھے کو برابر صحیح فاصلہ ہوتے ہیں۔

ارتجالی تہیجی عمل اس ابتدائی حالت میں ہمارے لیے فطری ذوق کی بنیاد ہے صحیح کیطرح ذوق بھی خارجی صحیح کا انتظار بجمود سے نہیں کرتا تہیج کی انتخابی یا ترجیحی خاصیت میں یہ بنیاد

ل مضمر ہے کہ کسی مقررہ وقت پر بشرطیکہ ہم نفسیاتی لحاظ سے بیدار ہوں تو ہم ہمیشہ بجائے ہروں کے ایک خاص طرف دلچسپی لیتے ہیں۔ ذوق کی عدم موجودگی یا اس کی بالکل غیر جانبدار نیم کی قید اتنی ہی بے سروپا ہے جتنی کہ درسی اخلاق کے گدھے والی کہانی۔

اکثر اوقات فرض کر لیا جاتا ہے کہ خودی اور تہیج کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ یہ ب اور بہت بڑا مغالطہ ہے۔ تہیج کو ایک ایسی قوت قرار دیا جاتا ہے جو خودی کو جس طرف چاہے ھکا دے، جیسے کہ خودی جامد اور لاپرواہ ہو اور اس بات کی منتظر کہ تہیج کا زور اسے ہلا دے حالانکہ حقیقت تہیج خودی کی تحریک یا خودی کے عمل پیرا ہونے کا نام ہے۔ اس جگہ اس نکتے کا بیان ں لیے ضروری تھا کہ تہیج اور ذوق کا تعلق ایک دوسرے سے اتنا گہرا ہے کہ اگر یہاں تہیج کو خودی ے خارج فرض کر لیا جائے تو کسی اور جگہ ذوق کے لیے یہ فرض کرنا پڑیگا کہ وہ خودی کے لیے ارجی ترغیب یا کشش ہے، حالانکہ ذوق خودی کے ان اعمال کا معروض میں انجذاب ہے، جس ی وجہ سے وہ عمل پیرا ہیں۔

ذوق کا معروضی پہلو جیسے کہ پیشتر بیان ہو چکا ہے، ہر ذوق اپنے آپ کو کسی معروض سے تعلق رکھتا ہے مصور کو اپنے برشوں رنگوں اور اصول فن میں دلچسپی ہے تاجروں کو داد وستد، سد طلب، منڈیوں کی تیزی اور کمی کے کھیل میں دلچسپی ہے۔ غرضکہ ذوق کی کوئی سی مثال کیوں ہ لی جائے، ہم دیکھتے ہیں کہ اگر اس کو اس معروض سے جس سے ذوق وابستہ ہے علٰحدہ کر دیا جائے۔ ذوق بھی غائب ہو جاتا ہے اور محض "موضوعی تاثر" (Subjective feelings) بنکر رہ جاتا ہے۔

یہاں غلطی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے معروض کے وجود کو ایک جگہ قائم فرض کر لیا جاتا ہے اور بعدۂ عمل کو بلایا جاتا ہے مثلاً مصور کو کاغذ، رنگوں، برشوں وغیرہ سے دلچسپی ہے، تو اس لیے کہ وہ اس کی تصویر بنانے کی قابلیت کو ظاہر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک پہیئے

اور ڈوری کے ٹکڑے میں بچے کے عمل کو ابھارنے کے لیے کوئی چیز نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اس کی کسی جبلت یا تہیج کو جو پہلے ہی متحرک ہے ایسا کر ایسا طریق مہیا کرے جس سے اس کی انجام دہی ہو سکے جب تک بارہ کا عدد محض ایک خارجی واقعہ ہے، بالکل غیر دلچسپ ہے مگر جب وہ کسی خواہش مثلاً: صندوق کا بنانا، کسی کے قد کی پیمائش وغیرہ کی انجام دہی کا آلہ بن جائیگا تو دلچسپ ہو جائیگا جس طرح پہیہ اور ڈوری، لٹو، گاڑی وغیرہ درجات کے اختلاف میں سائنس اور تاریخ کی طرح یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے — جو کچھ بھی انسانی ترقی یا ذہنی تحریک کا باعث ہو ضروری اور ذاتی دلچسپی رکھتا ہے۔

ذوق کا جذباتی پہلو "قدر" صرف معروضی ہی نہیں ہوتی، بلکہ "موضوعی" بھی ہوتی ہے، یعنی، پیش کردہ چیز صرف قیمتی ہی نہیں، بلکہ اس کی قدر و قیمت کا تاثر یا احساس بھی ہے تاثر کی تعریف کرنا ناممکن ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خالصتہً لازمی اور شخصی شعوریت ہے اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی "دلچسپی" ہوگی وہاں داخلی فہمیدہ قدر بھی ہوگی۔

چنانچہ نفسیات ذوق کا خلاصہ مندرجۂ ذیل ہو سکتا ہے۔

ذوق ایک شکل ہے اظہار خودی کے عمل کی ایک ہیئت ہے ترقی کی جو رجحانات نشوونما پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہو اگر ہم اس عمل کا اس کے اظہار کے لحاظ سے امتحان کریں کہ کیا کچھ ہوا ہے، تو ہم کو اس کے معروضی خدوخال ملینگے یعنی، افکار اور معروضات وغیرہ جن پر ذوق چسپاں ہے اور گرد حلقہ کیے ہے۔

صحیح ذوق کی کیفیت کے بیان میں اس امر کو تسلیم کرنا لازمی ہے کہ ذوق ایک ایسا کارفرما عمل ہے جس کے قبضے میں ذہنی کیفیات ہیں اور جس کا عکس اس کی قدر کا احساس ہے۔

ذوق کی ایسی حالتیں بھی ہیں جہاں اظہار خودی براہ راست اور فوری ہوتا ہے اور مابعد

کا خیال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ موجودہ عمل ہی شعور کے لیے مقصد وحید ہوتا ہے، اس لیے طریق کار اور مقصد میں جگہ اور وقت کے لحاظ سے کوئی رخنہ نہیں ہوتا۔ تمام کھیل اسی فوری قسم کے ہوتے ہیں اور تمام جمالیاتی شعور کم و بیش اس سے ملتا جلتا ہے۔ موجودہ اور وقتی تجربہ ہمیں مشغول رکھتا ہے اور ہم اس سے مابعد کو طلب نہیں کرتے۔ بچہ اور گیند، شوقین اور موسیقی، ان مثالوں میں پیش نظر چیز میں محویت ہوتی ہے؛

اگر ہم چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ حواس کے سامنے جو معروض ہو ذوق اس میں ہوتا ہے، لیکن اس بات کی تشریح میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سوائے عمل کے معروض کا کوئی شعوری وجود نہیں بچے کے لیے اس کا کھیل گیند ہے اور گیند کھیل ہے۔ جب تک ذوق خودی یا جمالی ہے سوائے عمل شنید کے موسیقی کا کوئی وجود نہیں، جو کچھ بھی توجہ کو مبذول کرے یا اپنی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے ذوق کو مائل کرے اکثر اسی کو معروض کہا جاتا ہے، لیکن یہ نفسیاتی ناممکنات سے ہے۔ چمکدار رنگ، خوش آہنگ آواز جن سے بچے کو دلچسپی ہے محض اس کے عضوی عمل کے مختلف پہلو ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کسی رنگ کی طرف مشغول ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی خارجی "معروض" میں محو ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی عمل کو جاری رکھ رہا ہے، جس کا نتیجہ رنگ کا وجود ہے۔ بچے کو اپنے عمل میں اس قدر محویت ہوتی ہے کہ وہ اسے جاری رکھنے کی سعی کرتا ہے۔

دوسری طرف ذوق، کی ایسی حالتیں بھی ہیں، جہاں یہ براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ یا کسی توسط سے ہوتا ہے۔ اس کو اصطلاحاً ذوق متوسل کہا گیا ہے، یعنی بہت سی اشیا جو فی نفسہ بے معنی یا نفرت انگیز ہوتی ہیں کسی دوسری چیز کے ساتھ تعلق، توسط یا رابطہ پیدا کرنے کی وجہ سے جس کا ہمیں پیشتر علم نہیں ہوتا، دلچسپ بن جاتی ہیں۔ حساب کے طالب علموں کو بعض نظریے غیر دلچسپ، خشک، بلکہ مکروہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہی نظریے جب انھیں انجینیرنگ میں

خصوصیت سے کام میں لانے پڑتے ہیں تو صد درجہ جاذب اور دلچسپ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

علم موسیقی میں سروں کی گنتی اور انگلیوں کے چلانے کے فن کو جب مقصد محض بنا کر پیش کیا جاتا ہے، تو بچے کو ان میں بالکل دلچسپی نہیں ہوتی، لیکن ان چیزوں کی قدر و قیمت او دلچسپی کا حال اس سے اس وقت پوچھیے جب وہ ان کی مدد سے اپنے پیارے گیت کی طرز نکالنے میں مشغول ہو سوال تو صرف توسط اور تعلق کا رہ جاتا ہے کہ اس میں جاذبیت اور کشش ہے یا نہیں، صغر سنی میں بچہ اشیا کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے، لیکن وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اپنے دائرۂ نگاہ کو بھی وسیع کرنا چاہتا ہے۔ واقعات، اشیا اور کاموں کو محض انھیں کے لیے نہیں دیکھتا، بلکہ ان کو ان کی اس قدر کی وجہ سے دیکھتا ہے، جو انھیں کسی کل کا جز ہونے کی وجہ سے حاصل ہے اور اگر یہ کل اس کی ذات سے متعلق ہے یا اس کی ذاتی حرکت کا ایک طریقہ ہے تو اس کے لیے اس میں دلچسپی ہوگی۔

یہاں اور صرف یہاں ہمیں چیزوں کو دلچسپ بنانے کے خیال کی حقیقت ملتی ہے۔

جب دلچسپ بنانے کے لفظی مفہوم کو لیا جاتا ہے، تو اس سے بڑھ کر اخلاق کے لیے اور کوئی متبذل چیز نہیں۔ ذوق کے مخالفین کہتے ہیں کہ پہلے موضوع کا انتخاب کر لیا جائے اور پھر استاد اس کو دلچسپ بنائے۔ اس میں دو فاش غلطیاں ہیں: اول یہ موضوع کو بغیر ذوق کے خیال کیے انتخاب کرتا ہے یا بالفاظ دیگر بچے کی ذاتی ضروریات اور حاجات کو مدنظر رکھے بغیر موضوع کو چنتا ہے اور دوسرے طریق تعلیم کو خارجی اور مصنوعی تراکیب سے توجہ مرکوز کرنے کے لیے غیر متعلقہ اشیا کے بناؤ سنگار تک محدود کر دیتا ہے۔ درحقیقت چیزوں کو دلچسپ بنانے کے اصول کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کے مضامین چنے جائیں جو بچے کی موجودہ ضرورت، طاقت اور تجربے کے مطابق ہوں اور اگر وہ اس مطابقت اور تعلق کو نہ سمجھ سکے، تو استاد اس نئی چیز کو اس طرح پیش کرے کہ بچہ اس چیز کی

ماہیت تعلق اور ضرورت کو سمجھ لے۔ دراصل بچے کو نئی چیز کا ادراک اور شعور دلانا ہی اصل چیز ہے جس کو دوست اور دشمن سب نے دلچسپ بنانا قرار دے لیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ حقیقی تعلق جس کو وجہ توجہ قرار دیا گیا ہے، کیا درجہ رکھتا ہے اگر استاد بچے سے کہے کہ "اگر تم جغرافیے کا سبق اچھی طرح نہ سنا سکو گے، تو تمہیں چھٹی کے بعد بھی اسکول میں ٹھہرنا ہوگا" تو وہ نفسیات ذوق متوسل کو کام میں لاتا ہے۔ کسی بچے کو لالچ دینا، استاد کی مہربانی کا وعدہ، دوسرے درجے میں ترقی دینا، عمدہ عہدہ حاصل کرنا، دولت کمانا وغیرہ وغیرہ یہ سب ذوق متوسل کی مثالیں ہیں اور ان کو جانچنے کا معیار حسب ذیل ہے: کوئی ذوق، کہاں تک دوسرے ذوق سے خارجی طور پر متعلق ہے اور کہاں تک اس کا بدل ہو سکتا ہے۔ یہ نئی ترغیب، یہ نیا مقصد کہاں تک اس چیز کی، جو ان کے بغیر دلچسپ ہے، تشریح اور توضیح کر سکتا ہے۔ کہاں تک اس کے تعلقات کو واضح کرتا ہے! اب سوال پھر توسل اور دارومدار کا رہ جاتا ہے اس مسئلے کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسائل اور مقاصد کا کیا تعلق ہے؛ غیر دلچسپ بے معنی یا مکروہ اشیا کو جب کسی ایسے مقصد کے لیے جو پہلے ہی خودی سے وابستہ ہے طریق کار بنا لیا جاتا ہے یا انہیں کسی ایسے طریق کار کے لیے، جو پہلے ہی اظہار خودی کا ذریعہ ہے مقصد قرار دے دیا جائے تو وہی دلچسپ بن جاتی ہیں، لیکن عموماً ایک چیز کا ذوق دوسرے سے محض سطحی وابستہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی روح رواں بن کر اس کی ہیئت شعوری کو بدل دیتا ہے۔ وہ ایک نئے نقطۂ نظر سے اس کی توضیح کر کے اس کی قیمت بڑھا دیتا ہے اور شعور میں اسی چیز کی ایک نئی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے

ایک شخص جو بیوی بچے رکھتا ہے، اس کے لیے کام کرنے کی ایک اور وجہ پیدا ہو جاتی ہے اور کام کرنے میں ایک قسم کا استقلال اور جوش، جو پہلے موجود نہیں ہوتا پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنے کام کو فی نفسہ ناپسندیدہ خیال کرتا ہے اور اس میں ایک تھکا دینے والی یک آہنگی

محسوس کرتا ہے یا اسے بیگار سمجھتا ہے اور اس کام کو محض مزد کی خاطر کرتا ہے، تو یقیناً اس کی یہ حالت پہلی حالت سے بہت مختلف ہے مقاصد اور وسائل علٰحدہ علٰحدہ رہتے ہیں، ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتے۔ مذکورۂ بالا مثال کا شخص دونوں صورتوں میں کام میں دلچسپی نہیں رکھتا، کیونکہ کام تو بذاتہٖ ایک ایسی محنت ہے، جس سے جی چرایا جائے، اس لیے وہ اس پر اپنی پوری توجہ مبذول نہیں کر سکتا اور نہ اس پر والہانہ طور پر مائل ہی ہو سکتا ہے، لیکن پہلی صورت میں اس کا ہر فعل اس کی ہر حرکت کے معنی اس کے لیے بیوی بچے ہیں۔ خارجی اور طبیعی طور پر یہ دونوں علٰحدہ ہیں، لیکن ذہنی شعور میں دونوں ایک ہیں۔ دوسری صورت میں مقاصد اور وسائل شعور میں بھی وقت اور جگہ کی طرح علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ یہ بات جس طرح اس مثال کے لیے درست ہے، اسی طرح ہر اس تعلیمی کوشش کے لیے بھی درست ہے، جہاں خارجی امور پر دلچسپی پیدا کرنے کیلیے بھروسہ کیا جاتا ہے۔

اب دوسری جانب کوئی فنی تعمیر لیجیے بیشگتراش کے پیش نظر کوئی مقصد یا معیار ہے، جسکو حاصل کرنے کیلیے اس کو بہت سے مراحل طے کرنے ہیں، جو ظاہر ہے کہ مقصد یا معیار سے متحد العین نہیں کہلا سکتے یعنی اس کے گھڑنے اور تراشنے کے افعال اور حرکات اور وہ حسین تصور جسے وہ پتھر میں ظاہر کرنا چاہتا ہے ایک نہیں، لیکن چونکہ یہ افعال اور حرکات اس مقصد اور معیار کے اظہار یا حصول کے لیے لازمی اور لابدی ہیں، اسلیے وہ مکمل شکل ان افعال اور حرکات میں منتقل ہو جاتی ہے اور اس وقت تیشے کی ضربات ہی اس کے لیے مقصد بن جاتی ہیں اور جو دلچسپی یا ذوق مقصد آخری سے وابستہ تھے درمیانی مراحل سے متعلق ہو جاتے ہیں اور دماغ کا انہماک اور محویت دونوں میں ہوتی ہے۔ یہاں اگر وسائل اور مقصد متحد العین ہوں، تو ان کا نتیجہ یعنی مجسمہ بالکل غیر فنی ہوگا نصب العین میں صحیح ذوق اور دلچسپی کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حصول کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے گئے ہیں ان میں بھی اتنا ہی ذوق اور دلچسپی ہو۔ (باقی)

(ماخوذ از ایجوکیشنل ایسیز آف ڈیوی)

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد ۲	اکتوبر ۱۹۳۶ء	نمبر ۷

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل

تعلیمی ارتقا کا یہ ایک راز ہے کہ اوّل سماج میں تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور اس کے بعد تعلیمی مقاصد اور تعلیمی نظام میں، یعنی، سماج خارجی اثرات اور اپنی نفسی ضروریات کے ماتحت بدلتا رہتا ہے اور تعلیم کے مقاصد اور دستور اس کے مطابق بدل جاتے ہیں، لیکن اگر تعلیم کے مقاصد اور دستور اس تبدیلی کے بعد یہ صلاحیت نہ رکھتے ہوں کہ سماج کی کمزوریوں پر نظر ڈال سکیں اور اپنا اساس اس طرح بدل لیں کہ سماج کی خامیاں اور نقائص دور ہو جائیں، تو سمجھ لیجیے کہ وہ مقاصد اور دستور تعلیم صرف تدریس کی حیثیت رکھینگے اور ان میں اس سے کچھ زیادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے ساتھ جب ہندوستان کا نظم و نسق درجہ بدرجہ انگریزوں کے ہاتھوں میں آنا شروع ہوا، تو کمپنی کو دفاتر اور چھوٹے چھوٹے عہدوں پر مقرر کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی ضرورت ہوئی۔ وارن ہیسٹنگز کے دورِ حکومت میں مدرستہ العالیہ کلکتہ اور سنسکرت کالج بنارس کی ابتدا اسی ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہوئی، لیکن ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وڈ نے تعلیم کو بہ نفسِ خود بھی ضروری سمجھا اور ہندوستان کے دوسرے تعلیمی دور میں، جو ۱۸۵۵ء سے شروع ہوا، صرف عُمّالِ حکومت کی تیاری ہی کو مقصدِ تعلیم قرار نہ دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء کے ہنٹر کمیشن اور ۱۹۰۲ء کے یونیورسٹی کمیشن نے بھی اس کا اعلان کیا کہ تعلیم اعلیٰ طبقے کے لیے ہی نہیں، بلکہ عوام کے لیے ہونی چاہیے اور اس کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یہ تمام ملک میں فلاح اور بہبود کی داغ بیل ڈالے۔

جنوری ۱۹۱۲ء میں جشنِ تاجپوشی کے بعد شہنشاہ ہند جارج پنجم آنجہانی نے کلکتہ یونیورسٹی کے سپاس نامے کے جواب میں فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہندوستانی گھروں میں علم کی شمع روشن ہو جائے

اور اس سے وہ اُجالا پھیلے جو جمہور کی خوشی و خرمی اور آرام و ثروت کا باعث ہوتا ہے۔

غرض بتدریج مقاصد تعلیمی میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہ سماج کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر پیش کی گئی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دستور اور نظامِ تعلیم میں کس قدر تبدیلیاں ہوئیں اور ان کا اثر کیا ہوا، ایک مستقل موضوع ہے جس پر یہاں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ، یہ اعلان ضروری ہے کہ یہ تبدیلیاں اس تیزی کے ساتھ برپا نہیں کی گئیں جس قدر ضروری تھا اور یہ تبدیلیاں تعلیم کو مذہب سے اس قدر علیحدہ اور بے تعلق سمجھتی رہیں کہ ہمارے تعلیمی دستور میں صرف اقتصادی نقطۂ نگاہ ہی زور پکڑ کر رہ گیا۔ اب اس نئے دور میں، جو جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد شروع ہوا ہے، ایک نئی تبدیلی ظہور پذیر ہو گئی ہے اور افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس سماجی تبدیلی کا اچھی طرح تجربہ نہیں کیا گیا اور اگر کچھ مدت اس سے اور بے پروائی کی گئی، تو یقینی ہے کہ سماج کے جسم پر یہ ایک انتہائی تکلیف دہ اور بدنما پھوڑا ثابت ہو جائے۔

لڑکوں کی تعلیم پر آج ہر ہندوستانی، اور اکثر بے سوچے سمجھے، اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہا ہے۔ وہ بیکاری، بیماری، بلکہ ہر سماجی کمزوری کا ذمے دار ہمارے طریقۂ تعلیم کو قرار دیتا ہے، لیکن باوجود اس کے وہ خود اسی دستورِ تعلیم کا نتیجہ ہے اور اپنے متعلقین کو بھی یہی تعلیم دینے پر آمادہ ہے لڑکیوں کی تعلیم کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس نئے دور میں لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت سے ہر شخص آگاہ ہے، اس کی ضرورت کا معترف ہے اور اکثر اس میں نقائص نکالنے پر آمادہ، لیکن ایمانداری اور توجہ سے اس مسئلے پر غور و خوض کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر شخص پکار رہا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم عام ہونا چاہیے۔ ان کے لیے مدارس کھولے جانے چاہییں۔ ہائی اسکول اور کالج ضلع ضلع اور تحصیل تحصیل میں ہونے چاہییں۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے۔ آج بھی ان مدارس کی فارغ التحصیل لڑکیاں شہروں

میں کافی نظر آتی ہیں اور اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تعلیم کے مخالف انھیں لڑکیوں کو مثال کے طور پر پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ وہ تعلیم جو ان لڑکیوں کو دی جا رہی ہے، اچھے نتائج نہیں دکھاتی، یعنی، مسئلے کی صورت اب یوں ہو جاتی ہے کہ

۱ - لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔

۲ - لیکن یہ تعلیم، جو دی جا رہی ہے، غلط قسم کی ہے۔

پہلی بات متنازعہ فیہ نہیں۔ دوسری البتہ باعثِ اختلاف ہے، اس لیے اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ آج لڑکیوں کے مدارس میں بیشتر و اکثر وہی نصابِ تعلیم رائج ہے، جو لڑکوں کے مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ سماج میں سے ایک صنف معدوم کر دی جائے۔ لڑکے اور لڑکیاں آگے بڑھ کر زندگی کے دو مختلف شعبوں کے ذمے دار ہوں گے اور اس لیے ان کی تیاری اس نوع کی ہونی چاہیے کہ اس زندگی کے سفر میں مناسب توشہ ان کے ساتھ ہو۔ غالباً اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے لڑکیوں کے مدارس میں سینے پرونے کھانے پکانے اور عام حفظانِ صحت کے اصولوں پر بھی وقت صرف کیا جاتا ہے اور یہ شامل نصاب ہیں لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ابھی تک ہم صحیح زنانہ ماحول اپنے مدارس میں پیدا نہیں کر سکے اور نہ اب تک ہمیں صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہی ہے کہ لڑکیوں کے لیے مقاصدِ تعلیمی کیا ہوں۔

اس سوال کا جواب آسان نہیں اور آج سر رشتۂ تعلیم اور عام ماہرانِ تعلیم محتاج ہیں کہ والدین، مدرسین، ہماری بہنیں اور ہمارے بھائی سماجی ضروریات کا اعلان کریں اور سر رشتۂ تعلیم اور ماہرانِ تعلیم سے مطالبہ کریں کہ ہماری لڑکیوں کی تعلیم کا طور طریق اور نصاب ایسا ایسا ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کیسے ماحول کی ضرورت ہے؟ اس کا جواب سماج سے طلب کیجیے اور سماج کے لیے یہ ممکن ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ یہ بتائے

کہ ہمارے ملک کی فلاح ہمارے گھروں کی آشودگی پر منحصر ہے اور ہمارے گھروں کی آشودگی منحصر ہے اوّلاً ہمارے مذہبی جذبات کی درستی اور پرورش پر اور ثانیاً ہمارے اقتصادی حالات کی سلامتی اور بہتری پر۔ ہندوستانی لڑکی کی اقتصادی تقسیم بظاہر صاف اور واضح ہے، یعنی، وہ بیٹی کے بعد بیوی اور ماں بن جاتی ہے، لیکن اس وقت کہ جب وہ بیٹی ہے اس کے لیے اس قسم کی تعلیم ضروری ہے کہ جب وہ بیوی اور ماں بنے، تو سماج اس پر کسی قسم کی سختی نہ کر سکے اور وہ جذباتی اور اقتصادی طور پر اسی درجہ خودمختار ہو جتنا کہ اس کا شریک زندگی مرد۔ یہ توازن مشکل ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستہ پرخطر اور ہر دم یہ احتمال رہتا ہے کہ آزادی کے بدلے غیر ذمے داری زندگی کا شعار نہ ہو جائے۔ اکبرالہ آبادی مرحوم نے اس خطرے کا اعلان اپنی زہرآمیز ہنسی میں اس طرح کیا ہے۔

۵ حامدہ چمکی نہ تھی جب علم سے بیگانہ تھی ‏ اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

یہ خطرات بجا اور احتیاط ضروری، لیکن عوام الناس ان خطروں کی حدود تک پہنچنے سے ایک گونہ مامون اور محفوظ ہیں، یعنی، اس ابتدائی تعلیم کے دوران ہیں جو ہر لڑکے اور لڑکی کا پیدائشی حق ہے اور جس کے ضروری اجزا لکھنا اور پڑھنا ہیں، ان خطرات کا زیادہ ڈر نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں عوام الناس کا جہل اور متوسط طبقے کا تعلیم یافتہ، بلکہ تعلیم زدہ ہونا ہی موجودہ بے چینی کا باعث ہے اور اگر لڑکیوں کی تعلیم کے انتظام کا بھی یہی طور رہا کہ عوام الناس کی لڑکیاں جاہل رہیں اور متوسط طبقہ تعلیم یافتہ نہیں، بلکہ تعلیم زدہ ہو گیا تو سماج بربادی کے اس بھنور میں پھنس جائیگا جس سے نکلنا مشکل کام ہوگا۔

۵

ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم

مترجمہ

احسن صاحب علوی

مندرجۂ ذیل مضمون اُس فاضلانہ، پُر مغز اور معلومات سے لبریز مقالے کا ترجمہ ہے،

جو لیڈی ہارڈنگ نے انگلستان میں سوسائٹی آو آرٹس کے جلسے میں پڑھا۔

تمہید میں محسوس کرتی ہوں کہ سوسائٹی آو آرٹس نے لڑکیوں کی تعلیمی حالت پر جس نے گزشتہ چند برس کے دوران میں قابلِ ذکر ترقی کی ہے، تبصرہ کرنے کے لیے نہایت عمدہ اور مناسب موقع کا انتخاب کیا ہے، لیکن کاش مجھے اس بات کا بھی احساس ہوتا کہ اِس تبصرے کے لیے میں ہی ایک موزوں شخص ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے مختلف صوبوں میں سائمن کمیشن کی تعلیمی کمیٹی کے دوروں کے اثنا میں تنہا اور بعض اوقات ڈاکٹر متھو لکشمی ریڈی کی معیت میں، لڑکیوں کے متعدد مدارس کا معائنہ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے، (میرے دل میں اُن مواقع کی یاد ہمیشہ تازہ رہیگی جب ہم کسی اسکول کے معائنے کے بعد اپنے گلوں میں دس دس ہار ڈالے باہر نکلتے تھے، جو ہمیں اسکول کی ہر جماعت میں پہنائے جاتے تھے)، لیکن اب اس بات کو چھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے مجھے آپ کو موجودہ حالت سے مطلع کرنے کے لیے مطبوعہ رپورٹوں اور ان نتائج پر، جو اس ملک میں ذاتی تعلقات سے اخذ ہوتے ہیں، اکتفا کرنا پڑیگا۔ ان چھ سال کے دوران میں حالات نہایت سرعت سے تبدیل ہو گئے ہیں اور بلاشبہ مشرق نے، جسے ہم اپنے بچپن میں غیر متبدل سمجھتے تھے، ثابت کر دیا ہے کہ وہ اتنی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو سکتا ہے کہ اکثر مغربی

دل ودماغ اِس کو تصوّر میں بھی نہیں لاسکتے۔

مَیں نے دو وجوہ کے باعث اِس مضمون کے آغاز میں کہا ہے کہ سوسائٹی نے اس موضوع پر تحریر میں اظہارِ خیال کرنے کے لیے عمدہ موقع کا انتخاب کیا ہے۔ اوّل یہ کہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف رپورٹیں اور تبصرے، جن میں "تعلیم پر پنجسالہ تبصرہ بابت ۳۲-۱۹۲۷ء" بھی شامل ہے، موجود ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھ کر ہم یہ معلوم کرنے کے قابل ہیں کہ جب سے سائمن کمیشن کی تعلیمی کمیٹی نے لڑکیوں کی تعلیمی ترقی کی ضرورت اور اہمیت پر اصولاً زور دیا ہے، حالات کس سمت میں تبدیل ہوئے ہیں۔ دوم یہ کہ اگر ہم موجودہ حالات کا جائزہ لینگے تو ممکن ہے میرے سامعین میں سے بعض حضرات اس نیک مقصد کے حصول میں، جو ہمیں دل سے عزیز ہے، مقامی حکومتوں پر اپنا اثر ڈال کر یا ہندوستان کی رائے عامہ کو اس کام کے لیے، جسے نئے دستورِ اساسی کی ترویج پر انجام دینا ہوگا، تیار کر کے ہماری مدد کریں۔ مجھے آج اس شام کی صحبت میں آپ کو لڑکیوں کی تعلیمی حالت سے بہ حیثیت مجموعی روشناس کرانے میں، جس کی ہر صوبے میں جُداگانہ صورت ہے، بہت سی مشکلات درپیش ہیں، کیونکہ اس مسئلے سے بہت سے دیگر پیچیدہ امور اور مالیات و اقتدار کے اہم ترین مسائل بھی متعلق ہیں۔ جہاں تک ہوسکیگا میں آپ کے سامنے حقائق پیش کرنے کی پوری کوشش کرونگی۔ ہمارے لیے یہ جاننا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ زمانۂ ماضی میں ہندوستانی والدین کا اپنی بچیوں کو مدارس بھیجنے میں تذبذب کا اظہار کرنا کس بنا پر تھا۔ آیا اس کی وجہ عناد تھی یا قدامت پسندی یا پردے کا رواج یا صغیرسنی کی شادی یا جیسا کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے، محض اسکول کے نصابِ تعلیم کی ناپسندیدگی یا اِن سب کا مجموعہ، لیکن اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ لڑکیاں تعلیم میں اپنے بھائیوں سے افسوسناک طور پر پیچھے رہ گئیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے پانچ سال سے زیادہ عمر کے ہندوستانی

لڑکوں میں ۶ء۱۵ فیصدی پڑھے لکھے تھے لیکن تعلیم یافتہ لڑکیوں کا فیصدی تناسب صرف ۲ء۹ تھا اور دس سال قبل کے اعداد و شمار میں یہ محض ۱ء۱ فیصدی کا اضافہ تھا۔ ہندوستان میں مجموعی طور پر تین فیصدی سے بھی کم لڑکیوں کا تعلیم یافتہ ہونا یقیناً اندوہ ناک ہے، لیکن اگر ہم ان اعداد و شمار کا بعض ہندوستانی ریاستوں کے اعداد و شمار کے ساتھ موازنہ کریں تو معاملہ اور بھی زیادہ اندوہناک ہو جاتا ہے۔ ریاست کوچین میں تعلیم یافتہ عورتوں کا فیصدی تناسب ۲۲ اور ٹراونکور میں ۱۶ء۸ ہے۔ مجھ سے اکثر دریافت کیا گیا ہے کہ آخر اس کا باعث کیا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ ان دونوں ریاستوں میں عیسائیوں کی تعداد کا زیادہ ہونا ہے۔ ٹراونکور میں وہ کل آبادی کا تیسرا حصہ ہیں۔ لیکن وہاں ہندو عورتوں کا تعلیمی تناسب بھی اگرچہ عیسائیوں کے برابر تو نہیں، لیکن دوسرے مقامات سے بہت زیادہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ریاستوں میں عورتیں خاص طور پر بلند مرتبے کی مالک ہیں۔ خواہ کچھ بھی وجہ ہو برطانی ہند میں (اس مضمون میں برطانی ہند سے میرا مطلب برما کے علاوہ دیگر تمام صوبجات سے ہے) تعلیمی حالت ایسی ہے کہ ہم اس پر مایوسی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سائمن کمیشن کی تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ مُظہر ہے کہ "ہندوستان میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے، کیونکہ یہ مجموعی تعلیم کی قدر و قیمت پر خاص طور سے اثر انداز ہے۔ لڑکی کو تعلیم دینا گویا ایک ماں کو تعلیم یافتہ بنانا ہے اور اسکے ذریعے سے اسکے بچوں کو۔"

اس کے بعد کمیٹی کی رپورٹ میں مندرج ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جو رقم منظور کی جاتی ہے، وہ لڑکوں کی تعلیم کی رقم کا تقریباً ساتواں حصہ ہے۔ تبصرے کے آخر میں آخری سفارشات میں سب سے پہلے یہ فقرہ درج کیا گیا ہے:-

"ہم وثوق سے اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی تعلیم کی ترقی کے مفاد کی خاطر اب وسعت کی ہر سکیم میں لڑکیوں کے تعلیمی مطالبات کو مقدم رکھا جائے۔"

رپورٹ کی نمایاں ترین خصوصیتوں میں ایک یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے روز افزوں مطالبات اور اُن کے لیے ہر قسم کے نئے مدارس کے کھولے جانے کے باوجود، مدارس میں زیر تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں تفاوت کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوتا چلا جا رہا ہے مثلاً ۲۷-۱۹۲۲ء کے عرصے میں مدارس میں لڑکوں کی تعداد میں ساڑھے بائیس لاکھ اور لڑکیوں کی تعداد میں ساڑھے چار لاکھ کا اضافہ ہُوا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد ملک میں کیسی ترقی کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔

اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ

گزشتہ سالوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق عام روش حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو گئی ہے۔ پرائمری مدارس، ہائی اسکولوں اور کالجوں میں ان کی تعداد میں بے حد ترقی دیکھنے میں آئی ہے تعلیم کا یہ بڑھتا ہُوا زور ۲۷-۱۹۲۲ء کے زمانے ہی میں نظر آ رہا تھا جس کے متعلق تازہ ترین پنجسالہ رپورٹ میں بحث کی گئی ہے اُس وقت اسکولوں میں زائد لڑکیوں کی تعداد زائد لڑکوں کی تعداد کے دو تہائی تک پہنچ گئی تھی لیکن ۱۹۳۱ء میں جو سخت مالی بدحالی کا زمانہ ہے، جب سے اعداد و شمار شائع ہونے شروع ہوئے ہیں، پہلی مرتبہ اسکولوں میں لڑکوں کی تعداد میں فی الحقیقت کمی واقع ہوئی اور لڑکیوں کی تعداد میں ایک لاکھ نفوس کا اضافہ ہو گیا اور یہ رفتار اب بھی جاری ہے اور ہر صوبجاتی رپورٹ میں اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ میں چند رپورٹوں میں سے اقتباسات پیش کرتی ہوں:-

ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبجات متحدہ لکھتے ہیں کہ "میں اِن صوبجات میں لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں نئے جذبے کو گزشتہ بیس سال کے عرصے میں محکمۂ تعلیم کی کارگزاری کا اہم ثمرہ خیال کرتا ہوں، جو اس بات کی امید دلاتا ہے کہ مستقبل میں اِن صوبجات میں یہ مسرت افزا حالات تیزی کے ساتھ مزید خوشحالی کا باعث ہوں گے"۔

بمبئی کی تازہ ترین رپورٹ میں مندرج ہے کہ "سال زیر تبصرہ میں لڑکیوں کی تعلیم نے
لڑکوں کی تعلیم کے مقابلے میں نمایاں ترقی کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عوام کو لڑکیوں
کی تعلیم کی اہمیت کا بتدریج احساس ہو رہا ہے اور قدامت پسندی اور تعصب کو آہستہ آہستہ
خیرباد کہی جا رہی ہے"

آسام کی رپورٹ میں بھی اسی قسم کے الفاظ نظر آتے ہیں: "صوبے بھر میں لڑکیوں کی تعلیم
کے متعلق زاویۂ نگاہ میں اہم تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ قدامت پسندی، رسوم و روایات اور تعصب
ہر جگہ غائب ہو رہے ہیں اور اس انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے"

پنجاب جو کسی وقت لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں پسماندہ صوبجات میں شمار ہوتا تھا۔
۳۲-۱۹۲۷ء کے پنجسالہ دور میں مدارس میں لڑکیوں کی تعداد میں ۴۳ فیصدی کا نمایاں اضافہ پیش
کرتا ہے اور اس کے بعد دو سال میں یہاں ۱۷ فیصدی کا مزید اضافہ ہوا ہے۔

پرائمری تعلیم ہر صوبے میں کم عمر لڑکیاں جوق در جوق پرائمری مدارس میں داخل ہو رہی ہیں
اور لڑکیوں کے مخصوص مدارس کے علاوہ لڑکوں کے مدارس میں بھی زیر تعلیم ہیں۔ ہندوستان
کے پرائمری مدارس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک جگہ پر تعلیم حاصل کرنے کا مسئلہ اب حقیقت
کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ امر اکثر اصحاب کو حیرت انگیز معلوم ہوگا، جیسا کہ حکومت ہند کے
ایجوکیشنل کمشنر نے ظاہر کیا ہے، ملک میں کل زیر تعلیم لڑکیوں میں سے چالیس فیصدی لڑکوں
کے اسکولوں میں داخل ہیں۔

البتہ یہ تناسب ہر صوبے میں یکساں نہیں بلکہ مختلف صوبوں کے حالات کے مطابق
ہے۔ مدراس میں اب لڑکیوں کے اسکولوں کی نسبت لڑکوں کے اسکولوں میں زیادہ لڑکیاں
تعلیم پاتی ہیں اور ۳۴-۱۹۳۳ء میں لڑکوں کے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں ہیں.....۴

کا مزید اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آسام میں لڑکوں کے اسکولوں میں لڑکیوں کے اسکولوں کی نسبت تین گنی زیادہ لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ اسی طرح صوبجات متحدہ اور بہار میں لڑکوں کے اسکولوں میں لڑکیوں کی تعداد روبہ ترقی ہے۔ بہار جیسے مفلس صوبے میں رائے عامہ میں یہ تبدیلی بے حد اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ لڑکیوں کے زیادہ تعداد میں لڑکوں کے اسکولوں میں داخل ہو جانے کی وجہ سے اُن کے لیے علٰحدہ مدارس کھولنے کا خرچ نہیں برداشت کرنا پڑتا اور لڑکیوں کی تعلیم پر جتنا کم روپیہ خرچ ہوتا ہے، اکثر مقامی حکومتیں عادتاً اتنا ہی زیادہ خوش ہوتی ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پرائمری جماعتوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی حقیقی مخلوط تعلیم کے قرینِ مصلحت ہونے پر نکتہ چینی کر رہی ہوں۔ کفایت شعاری کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اصول درست ہے، کیونکہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علٰحدہ علٰحدہ مدرسے کھولنا، جبکہ ایک ہی مدرسے سے کام نکل سکتا ہو، دانشمندی کے خلاف ہے، لیکن ہمیں یہاں اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اعداد و شمار کے علاوہ ہمارے لیے ایک اور بات کا بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ مخلوط تعلیم جس صورت میں کہ اِس وقت رائج ہے۔ یک طرفہ حیثیت رکھتی ہے اور لڑکیوں کے لیے لڑکوں کے اسکولوں میں خاص سہولتیں مہیا نہیں ہوتیں۔ انھیں صرف رعایت اور اپنے آرام کے لیے لڑکوں کے اسکولوں میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ اسکول کی زندگی میں اُنھیں کوئی واجبی حصہ نہیں ملتا۔ اِن مدارس میں اُستانیاں بالکل نہیں ہوتیں اور لڑکوں کے نصابِ تعلیم کے علاوہ لڑکیوں کے لیے کسی اور تعلیم کا انتظام نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اُن کے لیے صفائی کے انتظامات بھی علٰحدہ نہیں ہوتے۔ مدراس میں بھی صورتِ حالات کو کسی طرح اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ

ہُوا۔ خواتینِ ہند کی کانفرنس منعقدہ کراچی کے ایک اجلاس میں قرارداد منظور ہوئی تھی کہ "یہ کانفرنس ابتدائی مدارس میں مخلوط تعلیم کی حمایت کرتے ہُوئے اس بات پر زور دیتی ہے کہ مخلوط تعلیم والے مدارس میں استانیوں کی کافی تعداد ملازم رکھی جائے۔"

بعض لڑکیوں کے مدارس میں چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی زیرِ تعلیم ہیں۔ اس سلسلے میں ایجوکیشنل کمشنر نے تجویز پیش کی ہے کہ لڑکیوں کے ابتدائی اسکولوں میں لڑکوں کی شمولیت لڑکوں کے اسکولوں میں لڑکیوں کے داخلے سے بہتر ہے، کیونکہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو استانیاں مرد ٹیچروں سے زیادہ خوبی کے ساتھ تعلیم دے سکتی ہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ حالت میں اکثر صوبوں کے لیے یہ بہترین مشورہ ہے۔ اگرچہ بمبئی میں اس بات کی کوشش ہو رہی ہے۔ کہ پرائمری مدارس کے لیے ٹرینڈ اُستانیوں کو بھی ملازم رکھا جائے۔

سندھ کی تازہ ترین تعلیمی رپورٹ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں نے بھی اُن مقامات پر جہاں لڑکیوں کے لیے علٰحدہ مدارس قائم نہیں اپنی بچیوں کو لڑکوں کے ابتدائی مدارس میں داخل کرانا شروع کر دیا ہے، بلکہ ایک عرصے سے مسلم لڑکیاں لڑکوں کے مکتبوں میں جو مسلمانوں کے پرانی طرز کے قرآن کی تعلیم دینے کے اسکول ہیں، پڑھتی رہی ہیں۔

اِس ضمن میں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جو لڑکیاں لڑکوں کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتی ہیں وُہ کم عمر ہوتی ہیں چھے برس کی عمر میں مدرسے میں داخل کی جاتی ہیں۔ اُن میں سے جو پرائمری کا تمام کورس ختم کرتی ہیں، پانچ جماعتیں پڑھ کر دس گیارہ برس کی عمر میں اسکول سے علٰحدہ ہو جاتی ہیں۔

آپ کو علم ہے کہ ہندوستان میں پرائمری اسکول کیسے ہوتے ہیں؛ بہترین حالت میں، یہ ایک روشن اور ہوادار عمارت ہوتی ہے جس میں متعدد کمرے۔ ایک کھیلنے کا میدان

یا باغ ہوتا ہے اور بچے فرش پر یا برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔ بدترین صورت میں یہ ایک د
ہوتا ہے، جس میں نہ روشنی کا کوئی انتظام ہوتا ہے نہ ہوا کا۔ یہاں تعلیم کی بھی یہی حالت
جو عمارت کی۔ ایک اَن ٹرینڈ اور ناقابل اُستاد جو اکثر معمر ہوتا ہے کسی سامان کے بغ
جماعتوں کو ایک ہی وقت میں پڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔

پرائمری مدارس میں وقت کا نقصان

پس بدقسمتی سے پرائمری مدارس میں لڑکیوں کی کثرت اگ
کی روش میں تبدیلی کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے، لیک
بات کو ظاہر نہیں کرتی کہ اُن میں سے اکثر موجودہ حالات میں کوئی قابلِ ذکر تعلیمی فوائد حاصل کر
ہند میں اسکولوں میں زیرِ تعلیم لڑکیوں میں سے نصف اس وقت پہلی جماعت میں ہیں، جس میں انھیں
برس کی عمر میں داخل کیا جاتا ہے۔ اُنکی تعداد کا صرف دسواں حصہ چوتھی جماعت تک پہنچتا ہے اور چوتھا
کم اس جماعت تک پہنچ جائیں۔ اُنکے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مستقل طور پر پڑھی لکھ

لیکن اب گزشتہ چند سال سے صورتِ حالات بہتر ہو رہی ہے۔ اب
میں داخلے کی رفتار تیز ہے اور اس بات کی خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ لڑکیوں کو
جائے۔ بمبئی، آسام، پنجاب اور صوبۂ سرحد کا اس لحاظ سے اوّل نمبر ہے۔ ان صو
سے ۵۰ فیصدی طالبات چوتھی جماعت تک پہنچتی ہیں۔ مدراس میں اگرچہ لڑکیوں ک
لڑکوں کے مدارس میں زیرِ تعلیم ہے، لیکن تین جماعتوں کے بعد اُن کی تعداد کم
ہوتی ہے اور چوتھی جماعت میں صرف تیرہ فیصدی رہ جاتی ہیں۔ بنگال اور بہار
زیادہ افسوسناک ہے۔ ہندوستان میں جس قدر پرائمری مدارس قائم ہیں اُن میں
نصف صرف بنگال ہی میں ہیں، لیکن ان کے متعلق بنگال کی تعلیمی رپورٹ میں
کیا گیا ہے۔

"اگر ہم تیسری جماعت کو پڑھے لکھے ہونے کا معیار فرض کریں، تو سال بھر میں دو مدرسے صرف ایک بچے کو پڑھا لکھا بناتے ہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر لوئر پرائمری اسکول ہیں، جہاں صرف دو یا تین جماعتیں ہوتی ہیں اور ایسے تمام مدارس میں عموماً ایک ہی استاد ہوتا ہے اور اُن میں سے اکثر میں مرد ٹیچر ہیں۔ ایک مدرسے کا اوسطاً سالانہ خرچ بیاسی روپے ہے۔ یہ اعداد وشمار حیرت انگیز ہیں اور ہم اپنی تسلی کے لیے یہی کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ تمام مصارف ضائع ہو رہے تھے اس لیے مزید روپیہ خرچ نہیں کیا گیا۔ صوبے میں لڑکیوں کے تمام پرائمری مدارس باستثنائے چند عملی طور پر غیر مفید ہیں۔"

واضح طور پر اس نقصان کے حل کا یہی طریقہ ہے کہ عام جبری تعلیم کی طرف قدم اُٹھایا جائے اور اُن بچوں کو جو ایک دفعہ مدرسے میں داخل ہو جائیں مجبور کیا جائے کہ وہ پرائمری کورس پورا کرنے سے قبل اسکول نہ چھوڑیں، جیسا کہ سائمن کمشن کی تعلیمی کمیٹی نے تجویز کیا تھا اور یہی طریقہ لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیے مدراس کے اُن حلقوں میں، جہاں ابتدائی تعلیم کا قانون نافذ ہے، اختیار کیا جا رہا ہے۔

اس وقت تک برطانی ہند کے اُن چند علاقوں میں، جہاں جبری تعلیم کا نفاذ عمل میں لایا گیا ہے، (اور لڑکیوں کے لیے صرف مدراس اور بمبئی کے چند شہری حلقوں ہی میں یہ قانون نافذ ہے) نتائج بیشتر مایوس کن ہی ثابت ہوئے ہیں، کیونکہ حکام اپنے اختیارات کا استعمال کرنے میں متذبذب رہے ہیں۔

ثانوی تعلیم | جب ہم ثانوی تعلیم پر غور کرتے ہیں، تو یہاں بھی تعداد میں کمی بیشی کا وہی حال نظر آتا ہے جو پرائمری درجے میں۔ ہندوستان میں ثانوی مدارس مڈل اسکولوں اور ہائی اسکولوں میں منقسم ہیں۔ بعض مڈل اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور بعض میں نہیں، لیکن

کوئی ہائی اسکول ایسا نہیں جہاں انگریزی نہ پڑھائی جاتی ہو۔ ہائی اسکولوں میں حسبِ قاعدہ مڈل اسکولوں سے دو یا چار جماعتیں زیادہ ہوتی ہیں اور ان میں طلبہ کو میٹرکیولیشن یا ہائی اسکول فائنل امتحان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ بڑی جماعتوں میں تقریباً تمام تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے، کیونکہ اس وقت تک میٹرکیولیشن کے تمام پرچوں کے جوابات انگریزی میں دینے ضروری تھے، لیکن اب بہت سی یونیورسٹیوں نے نئے قواعد مرتب کرکے بعض پرچوں میں اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ ان کے جوابات مادری زبان میں دیے جا سکتے ہیں۔

مڈل اور ہائی دونوں مدارس میں ۱۹۳۲ء میں ۱۹۲۷ء کی نسبت لڑکیوں کی تعداد دگنی تھی اور ۱۹۳۳ء میں پنجاب اور صوبۂ سرحد کے علاوہ تمام صوبوں میں ۱۰ فیصدی کا مزید اضافہ ہوا۔ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں یہ اضافہ ۲۰ فیصدی کے قریب تھا۔ ان دو صوبوں میں طالبات کی تعداد میں زیادتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، کیونکہ ان میں بہت بڑی تعداد مسلمان لڑکیوں کی ہے۔ دوسرے صوبوں میں بہت کم مسلمان لڑکیاں ثانوی تعلیم کے درجے تک پہنچتی ہیں۔ ترقی کا ایک اور ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ چھ سال کے دوران میں یعنی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۳ء تک میٹرکیولیشن امتحان کے لیے امیدوار لڑکیوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے۔

ثانوی درجے میں لڑکیوں کی کل تعداد کے نقطۂ نظر سے بمبئی اور مدراس سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں ان صوبوں میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تعداد بیس بیس ہزار تھی اور بنگال جس کا نمبر ان کے بعد آتا ہے ابھی تک دس ہزار سے زیادہ تعداد پیش نہیں کر سکا۔ بمبئی کی تازہ ترین رپورٹ بابت ۳۴-۱۹۳۳ء کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تعداد میں دس فیصدی کا مزید اضافہ ہوا ہے۔ گویا اب اس صوبے میں پانچ لڑکوں کے مقابلے میں ایک لڑکی ثانوی مدارس میں زیرِ تعلیم ہے۔

لیکن نتیجہ کیا ہے ؟ جس قدر مدارس اِس وقت موجود ہیں اُن میں گنجائش سے زیادہ طالبات داخل ہیں۔ ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ لاہور کے ہر بڑے ہائی اسکول میں ایک ایک ہزار لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض نئے اسکول بھی کھولے گئے ہیں، لیکن روپیہ نہ ہونے کے سبب صورتِ حالات کا پوری طرح سے مقابلہ نہیں کیا جا سکا۔

صوبجات متحدہ کی تعلیمی رپورٹ مظہر ہے کہ کم از کم ایک درجن مڈل اسکول اِس بات کا پُر زور مطالبہ کر رہے ہیں کہ اُنھیں ہائی اسکول کی جماعتیں کھولنے کی اجازت دی جائے اور یہی حالت دوسرے صوبوں میں ہے۔ بمبئی، مدراس اور بنگال میں یہ حال ہے کہ لڑکیوں کے اپنے اسکول کافی نہ ہونے کے سبب اُنھیں مجبوراً لڑکوں کے ثانوی مدارس میں داخل کیا جا رہا ہے۔ بنگال کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہاں ہندوستانی لڑکیاں ثانوی تعلیم حاصل کرنے کی اس قدر زبردست خواہش رکھتی ہیں کہ لڑکوں کے بعض انگریزی ہائی اسکولوں کے منتظمین کو لڑکیوں کے لیے علٰحدہ سیکشن کھولنے پڑتے ہیں، لیکن خواتینِ ہند کی کانفرنس نے انٹر یونیورسٹی بورڈ کی رپورٹ بابت ۳۴-۱۹۳۳ء کے جو حوالہ جات دیے ہیں، اُن میں تعلیمی حکام نے ماہرین کی آرا پیش کر کے ثانوی مدارس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کی پُر زور مخالفت کی ہے۔

اگرچہ ثانوی مدارس کی عمارتیں کافی گنجائش نہیں رکھتیں، لیکن مجموعی طور پر اچھی حالت میں ہیں۔ اکثر ہائی اسکول گورنمنٹ اسکول ہیں اور بہت سے اعلیٰ اسکول مختلف مشنوں سے تعلق رکھتے ہیں اور چند ایک، جن میں بمبئی اور کلکتے کے بعض بہترین اسکول شامل ہیں، انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اِن میں سے اکثر مدارس میں بورڈوں کے لیے بھی کم و بیش اطمینان بخش انتظامات ہیں۔

اِس وقت کلکتے کے گوکھلے میموریل اسکول کی طالبات کے پُر مسرت اور اِشتیاق

آمیز چہرے میری نظروں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ اس اسکول کی بانی اس کی آنریری
مسز پی۔ کے۔ اسے ہیں جنھوں نے اپنے اسکول میں معاشری تعلیم کو تحصیل علم و فضل
رکھا ہے۔ میں اس وقت دہلی کے ماڈرن اسکول کا خیال کر رہی ہوں جس نے دکھا دیا
ہندوستان کے حالات کے مطابق تانے اور نئے طریقوں پر حقیقی مخلوط تعلیم کی بنا
جائے، تو کیا کیا مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن اکثر اسکولوں کے معائنے کے بعد وا
ہوتا ہے کہ خواہ دماغی ہو یا جسمانی زبانی تعلیم بہت زیادہ اور عملی بہت کم ہوتی ہے۔

لڑکیوں کے اسکولوں کا نصابِ تعلیم بالعموم بالکل لڑکوں کے نصاب کے نمونے
کرکے صرف سوئی کے کام کا اضافہ کیا جاتا تھا، لیکن گزشتہ چند سال سے یہ خیال
ہے کہ لڑکیوں کی ضروریات لڑکوں سے جداگانہ ہیں اس لیے انھیں خانہ داری کے
کما حقہٗ واقف کرنا ضروری ہے جن سے اُن میں سے اکثر کو زندگی میں دوچار ہونا پڑ
اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موزوں اُستاد لازم ہیں، اس لیے ٹیچروں کی ٹریننگ
امورِ خانہ داری اور حفظانِ صحت کی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے اور ممتحن اداروں کے
میں یہ چیز بھی شامل کر لی گئی ہے، بلکہ بعض یونیورسٹیوں مثلاً، بنارس اور پنجاب، نے
داری و حفظانِ صحت کو ڈگری کورس کا مضمون بنا رکھا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں ۱۹۳۹ء
اس کے بعد لڑکیاں میٹریکیولیشن امتحان میں ریاضی کے بجائے امورِ خانہ داری و حفظ
کا مضمون لے سکینگی۔

موسیقی، صنعت و حرفت، ڈرائنگ اور مصوری وغیرہ مضامین بتدریج تما
میں زیادہ مقبول بنائے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ورزش اور کھیلوں پر بھی توجہ مبذول
ہے۔ طبی معائنے کا بھی آغاز کر دیا گیا ہے۔

گرل گائیڈز کی تحریک اکثر صوبوں میں پورے طور پر قائم ہو چکی ہے اور جہاں جہاں کمپنیاں بنائی گئی ہیں اسکول کی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور مسرّت افزا بنانے کے لیے کافی کام کر رہی ہیں۔ خدمت کے اس نئے جذبے کی ترویج کی جا رہی ہے۔ اُن کی تعداد (جن میں ریاستوں کی گرل گائیڈز بھی شامل ہیں) ۱۹۳۳ء میں تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور ان میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ مدراس کی گرل گائیڈز نے بوائے سکاؤٹس کے ساتھ بعض مشترکہ مظاہروں میں حصہ لیا ہے جو ایک نیا اقدام ہے۔ بہت سے اسکولوں میں جونیئر ریڈ کراس جماعتیں شروع کی گئی ہیں اور ایک دو صوبوں میں اسکولوں کے باہمی کھیلوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم | اب ہم یونیورسٹیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ اکثر انگریز سامعین ابھی تک اس بات کو تعجب سے سنتے ہیں کہ ہندوستان میں عورتیں بھی یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور اس امر کا جاننا اُن کے لیے اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے کہ اُن کی بیشتر تعداد مردوں کے دوش بدوش انھیں کالجوں میں جہاں مرد پڑھتے ہیں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہے۔

حقیقت میں تمام یونیورسٹیوں نے اپنے کالجوں میں عورتوں کے داخلے کی اجازت دے رکھی ہے، بلکہ عورتیں یونیورسٹی کی سینٹ تک کی ممبر ہیں۔ ہر ہائینس مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال علیگڈھ یونیورسٹی کی چانسلر تھیں اور اُنھوں نے، اگرچہ وہ ایک پردہ نشیں عورت کی طرح برقع پہنے ہوئے تھیں، یونیورسٹی کنووکیشن کی صدارت فرمائی تھی۔

بمبئی یونیورسٹی میں، جہاں تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد دیگر تمام یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے، عورتوں کے لیے علٰحدہ کالج موجود ہی نہیں۔ ۳۳-۱۹۳۲ء کے سیشن میں اس کے آرٹس اور پروفیشنل کالجوں میں ۱۱۱۹ عورتیں زیرِ تعلیم تھیں اور یہ تعداد ۱۹۲۷ء کے اعداد و شمار

سے تیّن گنی ہے۔

اسی طرح صرف بنگال اور مدراس کے دو صوبوں میں (عورتوں اور مردوں کے کالجوں میں) اِس وقت اتنی عورتیں زیرِ تعلیم ہیں جتنی سائمن کمشن کی تعلیمی کمیٹی کی ر کی اشاعت کے وقت تمام ہندوستان میں تھیں۔ صوبجات متحدہ کی تعلیمی رپورٹ مز عورتیں یونیورسٹیوں پر کامیابی کے ساتھ دھاوا بول رہی ہیں۔ اِس لیے اس بات کا انتـ جا رہا ہے کہ اُن کے لیے سپیشل ہوسٹل قائم کیے جائیں۔

پنجاب میں لاہور کے کنرڈ کالج فار ومن میں نئی داخل ہونے والی طالبات تین میں سے دو کو اس عمارت میں، جسے حال ہی میں وسعت دی گئی ہے، جگہ نہ دی جا

بہار جیسے پسماندہ صوبے میں بھی، جہاں عورتوں کے لیے علٰحدہ کالج کا قیـ بہت بڑی نعمت سمجھا جائے بعض لڑکیاں جرأت سے کام لے کر مردوں کے کالجوں داخل ہو گئی ہیں۔

صوبجات متوسط میں حال ہی میں ناگپور کا سنٹرل کالج فار ومن قائم ہوا ہے ذرائع بہت محدود ہیں اور محض مس رنگا راؤ کی، جن سے یہاں لندن میں ہم مل سکے ہیں، بلند حوصلگی اور حقیقی جوش کا نتیجہ ہے۔

عورتیں نہ صرف یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں آزادانہ طور پر داخل ہو سکتی اُن کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ آپ کو میڈیکل سٹوڈنٹ عورتیں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی نظر آئینگی، اور اب کچھ عرصے سے پنجاب میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس بات کی یاد دہانی دلچسپی کا موجب ہوگی کہ ڈیم میری شارلیب نے میں تین اور طالبات کے ساتھ مدراس میں اپنا پہلا میڈیکل کورس ختم کیا تھا۔ گذشتہ سا

مدراس کے میڈیکل کالج میں نوّے عورتیں زیرِ تعلیم تھیں۔

۱۹۳۵ء کے دوران میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے عورتوں کے معاملے میں شاندار ریکارڈ پیش کیا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک عورت تاریخ کی لیکچرار مقرر ہوئی ہے اور ناگپور یونیورسٹی میں تین عورتیں ڈیپارٹمنٹوں کی انچارج مقرر کی گئی ہیں۔ لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کی میڈیکل سٹوڈنٹ عورتیں پنجاب یونیورسٹی کے فائنل امتحان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے نتائج کی فہرست میں پہلی پانچ جگہیں حاصل کر چکی ہیں۔ لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج عورتوں کا واحد سپیشل میڈیکل کالج ہے جس میں ہندوستان بھر کی مختلف اقوام کی طالبات، جن میں مسلمان طالبات کی بھی کچھ تعداد شامل ہے، زیرِ تعلیم ہیں۔

مس جانکی اماّل جو پہلے مدراس یونیورسٹی سے تعلق رکھتی تھیں اور جو کوئمبٹور میں نیشکر کی کاشت کے امپیریل اسٹیشن کے عملے کی رکن ہیں، حکومتِ ہند کی طرف سے گزشتہ ماہ اگست میں انٹرنیشنل جینیٹیکل کانگرس کی مندوب مقرر کی گئی تھیں۔

یہ حالات اطمینان بخش ہیں، لیکن گزشتہ چند سال میں یونیورسٹیوں میں عورتوں کی تعداد میں اضافے نے ایک زاویۂ نگاہ سے نئے مسائل ہمارے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ اُن صوبوں میں جو ابھی تک پسماندہ ہیں، عورتوں کے کالج کھولنے کی اشد ضرورت ہے اور اگر عورتیں مردوں کے کالجوں میں داخل ہیں، تو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اُن کے لیے علٰحدہ ہوسٹل کھولے جائیں تاکہ وہ کالج کی زندگی سے پورے طور پر فائدہ اُٹھا سکیں۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی درسگاہیں اور فنڈ

اب ہم پھر مالی مسئلے پر بحث کرتے ہیں۔ میں اپنے تبصرے کو ذرا بند کر کے آپ کی توجہ اینگلو انڈین اور یورپینوں کی تعلیمی رپورٹ کے صفحات کی طرف منعطف کراتی ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم پر تقریباً یکساں

روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور لڑکیوں کے اسکول تعداد میں لڑکوں کے اسکولوں سے بہ
ہیں۔ اب آپ ذرا برطانی ہند کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں۔ آپ دیکھینگے کہ ڈھائی لاکھ
میں سے تقریباً دو لاکھ صرف لڑکوں کے لیے اور چالیس ہزار کے قریب لڑکیوں کے لیے
اور موخرالذکر میں سے نصف بنگال کے پرائمری اسکول ہیں، جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں
پچیس کروڑ روپے کے کل خرچ میں سے صرف اس کا ساتواں حصہ لڑکیوں کی تعلیم
جاتا ہے۔ یہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے اعداد و شمار ہیں اور یہ درست ہے کہ ان میں اُن لڑکیوں کا ذ
جو لڑکوں کے اسکولوں میں پڑھتی ہیں۔ اُن پر بھی کم غور و خوض کی ضرورت نہیں۔ ہم
ان کا تذکرہ کرینگے۔

ٹیچروں کی ٹریننگ اور انتظام

میں نے لڑکیوں کی درسگاہوں کا محض ایک خاکہ آپ
پیش کیا ہے۔ ابھی اُن ٹیچروں کا ذکر کرنا باقی ہے جن پر
کی زندگی منحصر ہے۔ نیز اُس محکمے کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا گیا جو ٹیچروں پر اقتدار رکھتا
رہنمائی کرتا اور اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ جو فنڈ مہیا ہیں وہ ایسے مدارس پر ضائع
جن کا وجود و عدم برابر ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ پرائمری اسکولوں میں اس وقت نصف
اُستانیاں ٹرینڈ ہیں، لیکن اس اندازے سے مختلف صوبوں کی صورتِ حالات
ہوتی۔ تمام اُستانیوں میں سے جو ٹریننگ حاصل کر رہی ہیں نصف تو صرف مدراس
ہیں، جہاں اُن کے لیے سینٹھ ٹریننگ اسکول موجود ہیں۔ ان اسکولوں میں ٹریننگ
طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ موسیقی اور دستکاری نصابِ تعلیم کا جز ہیں اور دیہ
کے لیے خاص ٹریننگ کلاسز کھلی ہوئی ہیں۔ مدراس کے پرائمری اسکولوں میں ۳/۱
چوتھائی سے زیادہ ٹیچر ٹریننگ حاصل کر چکے ہیں۔ نیز ہم دیکھتے ہیں کہ مدراس میں عدد

کے متعلق ایک مرکزی مشاورتی کمیٹی قائم ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں ہم صوبہ بہار کی حالت دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایسے مرد اور عورتیں ٹیچر مقرر ہیں، جنھوں نے لوئر پرائمری میں بھی تعلیم حاصل نہیں کی اور بنگال جیسے بڑے صوبے میں پرائمری اسکولوں کی اُستانیوں میں سے صرف دس فیصدی ٹرینڈ ہیں اور بنگال کے ہزاروں پرائمری اسکولوں میں اُستانیاں موجود ہی نہیں، مرد ٹیچر ہی بچیوں کو پڑھاتے ہیں ہم سن چکے ہیں کہ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کی رائے میں تعلیم کا یہ تمام طریقہ تقریباً غیر مفید اور لاحاصل ہے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بنگال جیسے روشن خیال صوبے نے ایسی صورتِ حالات کو برداشت کر رکھا ہے اور مالی بدحالی کے باوجود روپیہ متواتر ضائع کیا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کے اسکولوں کے کُل مصارف میں سے تیس فیصدی سرکاری فنڈ سے ادا ہوتے ہیں۔

پنجسالہ تبصرے کا ایک اقتباس مظہر ہے کہ " ایسے صوبے میں، جہاں عورتوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے اور عورتوں کی درسگاہیں بھی تعداد میں سب سے زیادہ ہیں، ابھی تک کوئی عورت ہیڈکوارٹرز کے عملے میں برسرِ اقتدار نہیں جو اپنی تجاویز کے مطابق انتظامات کر سکے بنگال میں معائنہ کرنے والی عورتوں کی تعداد نہایت قلیل ہے یعنی، سترہ ہزار سے زیادہ لڑکیوں کے اسکولوں کے لیے صرف دو انسپکٹریسز اور بارہ اسسٹنٹ انسپکٹریسز ہیں "

اب اِن درسگاہوں کی تعداد اُنتیس ہزار تک پہنچ گئی ہے لیکن معائنہ کرنے والی عورتوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔

یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ بنگال ویمنز ایجوکیشن لیگ نے (جس کا اجلاس اُسی سال منعقد ہوا، جس سال خواتین ہند کی کانفرنس کا افتتاح عمل میں آیا) اس بات پر زور دیا ہے کہ لڑکیوں کے تمام اسکولوں میں اُستانیوں کو مقرر کرنے کا انتظام کیا جائے اور دیہات کے

مدارس کے لیے نصابِ تعلیم کو زیادہ موثر بنایا جائے، لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بنگال کی متذکرۂ صدر ومنز ایجوکیشن لیگ اُن دلیر اُستانیوں کے لیے، جو موجودہ حالات کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہیں، بیحد حوصلہ افزا ثابت ہوئی ہے، لیکن خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ کوئی "عورت محکمے میں برسرِ اقتدار نہیں، جو عورتوں کے تعلیمی معاملات میں انتظامات کرے' اور اسی لیے ہندوستان کی عورتیں اور انگلستان میں اُن کے بہی خواہ اِس وقت زور دے رہے ہیں کہ یہ بات دستور العمل میں شامل کر لی جائے کہ عورتوں کو محکمہ ہائے تعلیم وحفظانِ صحت میں نظم و نسق پر اقتدار دیا جائے۔

پنجاب میں، جہاں چند سال سے عورتوں کی تعلیم کے لیے ڈپٹی ڈائرکٹرس موجود ہیں اور جہاں محکمۂ تعلیم خاص طور پر سرگرمی اور تندہی سے کام کرتا ہے، حالات بالکل برعکس نظر آتے ہیں۔ پنجاب کی آبادی بنگال کی آبادی کے نصف سے بھی کم ہے، لیکن یہاں چار انسپکٹرسیز ہیں، جن میں سے ایک علم امورِ خانگی کے لیے مخصوص ہے اور بارہ اسسٹنٹ انسپکٹرلیسز ہیں۔ مڈل اسکولوں میں کھانے پکانے اور حفظانِ صحت کی تعلیم جبری قرار دی گئی ہے۔ پرائمری مدارس کی خرابیاں دور کر دی گئی ہیں اور دیہاتی مدارس کے کورس ازسرِ نو ترتیب دیے گئے ہیں اور عنقریب اُن عورتوں کے لیے جو پرائمری مدارس میں اُستانیاں بننے کے لیے ٹریننگ حاصل کرنا چاہینگی۔ مڈل اسکول کا پاس کرنا لازمی قرار دیا جائیگا۔

اکثر صوبوں میں اب بھی کافی اُستانیاں بہم پہنچانے کے لیے سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنا سخت ضروری ہے، ورنہ مستقبل میں لڑکیوں کی تعلیم کی توسیع میں رکاوٹ پیش آنے کا خطرہ ہے۔ ابھی تک پرائمری جماعتوں میں ٹیچر بننے کے لیے جس قدر عورتیں ٹریننگ حاصل کر رہی ہیں، ان میں سے تقریباً نصف ہندوستانی عیسائی ہیں۔ ہندوستان

ہیں لڑکیوں کی تعلیم کے ہر شعبے میں مشن ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صوبۂ بمبئی میں انیس پرائمری ٹریننگ اسکولوں میں سے تیرہ اسکول مشنری اور دیگر سوسائٹیوں کے زیرِ انتظام ہیں۔ شولاپور میں کنڈرگارٹن ٹیچروں کے لیے ایک خاص اسکول قائم ہے، جہاں جدید ترین طریقوں پر عمل درآمد ہوتا ہے اور جہاں کے اُستاد اب حکومت کی طرف سے منظور شدہ ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس اسکول کی ٹرینڈ استانیوں کی مساعی سے پرائمری اسکولوں میں وقت ضائع ہونے کا سدِ باب ہو سکیگا۔

اُستانیوں کی کمی کی مشکل کے علاوہ مدراس کو چھوڑ کر دوسرے صوبجات میں ایک اور مشکل یہ درپیش ہے کہ ٹرینڈ استانیوں کو کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں سے دور دیہات کے مدارس میں جا کر کام کریں۔ محکمۂ تعلیم پنجاب نے یہ دیکھ کر کہ دیہات کی لڑکیوں کو اُن کے دیہاتی حلقوں سے باہر کسی مرکز میں ٹریننگ اسکول میں شامل ہونے پر مجبور کرنا مشکل ہے اور شہر کی لڑکیوں کو، جنھوں نے شہروں میں ٹریننگ حاصل کی ہے، دیہات میں بھیجنا بھی آسان نہیں، مدراس کی پیروی کرتے ہوئے دیہاتی مراکز میں ٹریننگ اسکول کھولنے کا آغاز کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اگر یہ تجویز کامیاب رہی تو اس پر ہر جگہ عمل کیا جا سکیگا۔

بمبئی کی ایک تازہ ترین رپورٹ میں ایک انسپکٹرس صاحبہ لکھتی ہیں کہ میں ہر سال سُنتی ہوں کہ نوجوان استانیاں اپنے وظائف واپس کرانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ وہ شہروں میں چلی جائیں اور دیہات میں تنہا اور علٰحدہ رہنے کے خطرات سے نجات پائیں، لہٰذا میں اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کرتی ہوں کہ لیڈیز سپروائزر مقرر کرنی چاہییں جیسا کہ ستارا بورڈ نے کیا ہے۔ لیڈیز سپروائزر لڑکیوں کے اسکولوں کا معائنہ کریں اور نوجوان استانیوں کی امداد کریں تاکہ ڈسٹرکٹ بورڈ اپنی قابل اُستانیوں سے محروم نہ ہو جائے، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ بمبئی

میں حال ہی میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی ہے کہ بعض مرکزی مقامات پر چند ایک ہوسٹل؛
جہاں پرائمری اسکولوں کی استانیاں قیام کریں اور وہاں سے نواح کے مدارس میں
کے لیے آجا سکیں۔ پنجاب میں ایک اور تجویز زیرِ غور ہے کہ گاؤں میں لڑکوں کے
جس مرد کو ٹیچر مقرر کیا جائے اُس کی بیوی یا بیٹی کو اُسی گاؤں میں لڑکیوں کی اُستا
کر دیا جائے۔

اِس سلسلے میں یہ امر بھی بہت ضروری ہے کہ مدرّسی کے پیشے کا معیار بلند
زیادہ باعزت بنایا جائے تاکہ لوگوں میں استادوں اور استانیوں کی خوب قدر
اُن کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے جس کا اُنھیں اپنے معزز پیشے کی رو سے
یہ بات دیہات میں خاص طور پر مفید ثابت ہو سکتی ہے جہاں اصلاحِ دیہات سے
سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ جاننا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بمبئی کے ٹریننگ
طالب علم عورتیں مردوں کی بہ نسبت اپنا کام زیادہ شوق اور تندہی سے انجام دیتی ہیں
خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ گھر سے خوشحال ہیں اور مدرّسی کا پیشہ جبر سے نہیں،
سے اختیار کرتی ہیں۔

یہی لڑکیاں ثانوی مدارس میں اُستانیاں بنیں گی۔ مجموعی طور پر پرائمری ٹیچر
ثانوی مدارس کے لیے اُستانیاں زیادہ تعداد میں ٹریننگ حاصل کرتی ہیں، لیکن
افراط کے باوجود اگر اچھی اُستانیاں بہم نہ پہنچیں، تو پرائمری اور ثانوی دونوں درجوں
ہرج واقع ہونے کا احتمال ہے۔ صوبۂ بمبئی میں ثانوی مدارس میں تیس فیصدی اُ
مردوں کو بالخصوص سائنس اور ریاضی کی تعلیم کے لیے ملازم رکھا جاتا ہے۔

ایک دو سال پہلے تک تمام برطانی ہند میں عورتوں کے ٹریننگ کالج

جن میں سے پانچ مختلف مشنوں سے متعلق تھے۔ آخر کار ستمبر ۱۹۳۲ء میں لیڈی میکلیگن ہائی اسکول کے ساتھ ایک ٹریننگ کلاس کھول کر ایک اشد ضرورت کو پورا کیا گیا اور اس طرح اس بات کا تدارک ہو گیا جسے پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی نے پنجاب کے نظام تعلیم میں نہایت افسوسناک نقص قرار دیا تھا۔

مدراس میں ثانوی مدارس کی ۵۵ فیصدی استانیاں ٹرینڈ ہیں۔ لیڈی ولنگڈن ٹریننگ کالج مدراس میں نہایت سرگرمی سے کام ہوتا ہے۔ علم امور خانگی اور دستکاری وغیرہ پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ جسمانی تربیت کے لیے ٹیچروں کا علحدہ سیکشن کھلا ہوا ہے اور ایک شاندار ہائی اسکول اس کے ساتھ ملحق ہے جو ہائی اسکول فائنل کے امتحان کے لیے طالبات تیار کرتا ہے۔

جدید تغیرات مختلف صوبجات کے تعلیمی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں یہ ضرور خیال آتا ہے کہ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ سائمن کمیشن کی تعلیمی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق تعلیم کے ایک مرکزی مشاورتی بورڈ کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک مرتبہ پھر مختلف صوبجات کے درمیان رشتہ استوار کرنا ممکن ہو جائیگا اور ترقی یافتہ صوبے پسماندہ علاقوں پر اپنا اثر ڈال سکینگے۔ ہم بورڈ میں (جس کا پہلا اجلاس کچھ عرصہ پہلے منعقد ہوا) دو عورتوں لیڈی گرگ اور راجکماری امرت کور کی شمولیت کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔ مقدم الذکر لیڈی ارون کالج کی مینیجنگ کمیٹی کی چیئرمین ہیں۔ موصوفہ [illegible] عورتوں کی تحریک کی ایک سرکردہ رہنما۔

زندگی کے ہر پہلو میں ہندوستان مجموعۂ اضداد ہے۔ ابتدائی اور پرانے طرز کی باتوں کے ساتھ ہمیں یہاں بالکل دور حاضرہ کے مطابق اور بالکل نئی باتیں بھی دکھائی دیتی

ہیں۔ چنانچہ آبپاشی، باربرداری، زراعت، صنعت وحرفت اور طب میں مختلف طریقوں کا استعمال اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ ہم شکر سازی کے کارخانوں اور جدید ترین آلات کے ساتھ ساتھ پرانی طرز کے بیلنے بھی چلتے دیکھ رہے ہیں۔ رہٹ کے پاس برقی قوت سے چلنے والے پمپ بھی لگے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ جس سڑک پر بیل گاڑی نظر آتی ہے وہیں سے رولز رائیس کار بھی گذرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی حال تعلیم میں ہے۔ اگر میں نے جو تصویر آپ کے سامنے کھینچی ہے آپ کو مایوس کن نظر آتی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس تصویر کا روشن پہلو موجود نہیں ہے۔

میں اُس نمایاں خدمات کا جو مشنوں نے انجام دی ہیں تذکرہ کر چکی ہوں۔ اُنھوں نے اس نیک کام میں سبقت کی تھی اور اس وقت بھی متعدد کامیاب درسگاہیں بچوں کے مکاتب سے لے کر اعلیٰ درجے کے کالجوں تک اُن کے زیرِ انتظام تعلیمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں اور سوسائٹی کے ہر طبقے کے لیے، جن میں اچھوت اور جرائم پیشہ قبائل بھی شامل ہیں، تعلیم کا انتظام کر رکھا ہے۔ اُنھیں لوگوں نے دیہاتی تعلیم میں بعض نہایت مفید تجربات کیے ہیں۔ انھوں ہی نے ایک مدت قبل صنعتی، طبی اور نرسوں کے اسکول جا بجا کھولے اور ہسپتال قائم کیے تھے۔

بدقسمتی سے میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں اس ضمن میں مزید ترقیوں کا ذکر کروں اور دائیوں کی تربیت، لیڈی ہیلتھ وزیٹروں اور ساں بچے کی نگہداشت کے مرکزوں کے حالات بیان کروں۔

تاہم میں اس کام کے متعلق جو محض ہندوستانیوں کی مساعی کا ثمرہ ہے چند ایک الفاظ ضرور کہنا چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں پونا سیوا سدن کا جو ہندوستانی عورتوں کی خدمت کے لیے بہت بڑی انجمن ہے ذکر سب سے پہلے ضروری ہے۔ اس انجمن نے گزشتہ سال اپنی سلور جوبلی منائی ہے اور ابھی حال ہی میں اپنے اعزازی منتظم مسٹر جی۔ کے۔ دیودھر آنجہانی

وفات سے بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے، جنھوں نے سیوا سدن کی عمر بھر انتہائی بے غرضانہ طریق
ور نہایت خلوص کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ اس عظیم الشان ادارے اور اس کی شاخوں
ملک بھر کے لیے تیرہ سو سے زیادہ عورتیں، استانیاں، نرسیں، دائیاں، ہیلتھ وزیٹرز اور
ب اسسٹنٹ سرجن مہیا کی ہیں، جو اس وقت ہندوستان کی اطراف و جوانب میں اسی نیک
بے کے ماتحت محوِ عمل ہیں جو اُن کی اعلیٰ تربیت نے اُن کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے۔ سیوا سدن
مدارس اور ملحقہ اداروں میں ہندو بیوگان کو تعلیم و تربیت دے کر اپنی روزی آپ کمانے کے
ل بنایا جاتا ہے۔ یہ مثال سیوا سدن اور پنڈت راما بائی ہی نے پہلے قائم کی، جس کی پیروی اب
مدوستان بھر میں کی جا رہی ہے کہ ہندو بیوگان کے لیے تربیت گاہیں قائم کر دیں، جہاں رہ کر
مالی اعتبار سے آزادی حاصل کر سکتی ہیں، جو اس وقت تک بھی اُنھیں ہندوؤں کا قانونِ وراثت
ہیں دیتا۔

اسی طرح سیوا سدن نے بالغوں کی تعلیم و تربیت میں بھی پیش قدمی کی ہے اور بالغ عورتوں
ے لیے پرائمری جماعتیں کھول رکھی ہیں۔ دوسرے صوبوں میں بھی عورتوں کی انجمنیں مثلاً مہیلا
نتیاں، ناری شکشا سمتیاں اور بنگال کی سروج نلینی دت ایسوسی ایشن تعلیم کی مختلف سکیموں کو عملی
مہ پہنا رہی ہیں اور صنعتی تربیت اور گھریلو دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔

پونا میں پروفیسر کاروے کی قائم کردہ ہندوستانی عورتوں کی یونیورسٹی بھی ایک دلچسپ تجربہ
ہ، جس کے ذریعے عورتوں کی تعلیم کا نصاب اُن کی عین ضروریات کے مطابق مرتب ہوتا ہے اور
م تعلیم انگریزی کے بجائے مادری زبان میں دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ چار کالج ملحق ہیں لیکن
اروں کالجوں میں کل ۲۰۰ طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ اس یونیورسٹی کی ڈگریاں منظور شدہ نہیں ہیں اور
الباً یہی وجہ ہے کہ اسے ویسی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہیے تھی۔

آخر میں مجھے نئی دہلی کے لیڈی ارون کالج کا ذکر کرنا ہے جو تعلیمی ریسرچ، گھریلو سائنس اور ٹیچروں کی تربیت کی بہت بڑی درسگاہ ہے۔ اس کا افتتاح ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس وقت تک ریسرچ کے سلسلے میں توقع کے مطابق کوئی کام انجام پذیر نہیں ہو سکا، لیکن خانگی مضامین میں عملی تربیت کے پورے کورس کا، جو ہندوستانی حالات کے مطابق ہے، باقاعدہ انتظام ہے۔ اس درسگاہ میں چالیس سے زیادہ طالبات ہیں اور نو طالبات کا پہلا گروہ اب تھرڈ ایر کا کورس پورا کر چکا ہے اور ٹرینڈ اُستانیوں کی حیثیت سے کہیں جگہ حاصل کرنے کے قابل ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ اس کالج کی فارغ التحصیل طالبات کی ہر جگہ ضرورت محسوس کی جائیگی، کیونکہ اُنھوں نے تحقیقی طور پر عملی تربیت حاصل کی ہے جس سے امورِ خانگی کی سائنس کی اکثر اُستانیاں محروم ہیں۔ یہ طالبات مختلف اقوام اور ہندوستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

لیڈی ارون کالج خواتینِ ہند کی کانفرنس کی خواہشات کے مطابق ظہور میں آیا تھا جس نے ۱۹۲۸ء میں اپنے اجلاسِ دہلی میں فیصلہ کیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے ضابطۂ تعلیم کی اصلاح سے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے روپیہ اکٹھا کیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ خواتینِ ہند کی کانفرنس کا قیام اس لیے عمل میں آیا تھا کہ عورتوں نے لڑکیوں کی تعلیمی ترقی کی اشد ضرورت محسوس کی تھی۔ معاشری اصلاح کا کام کانفرنس نے بعد میں اپنے دستور العمل میں شامل کر لیا تھا۔ اِس وقت اس کے صوبجات اور ریاستوں میں ایک سو سے زیادہ حلقہ ہائے نیابت ہیں اور اس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی مختلف اقوام کی عورتیں ملک کے ہر حصے سے آکر شریک ہوتی ہیں۔ کانفرنس کی مندوبین کو دورِ حاضرہ کی تعلیمی ضروریات کا پورا پورا احساس ہے جیسا کہ اُن قراردادوں سے، جو ہر سال منظور کی جاتی ہیں، ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً: حال ہی میں ٹراونکور کی کانفرنس میں، اور یہ پہلا موقع ہے کہ کانفرنس کا کسی دیسی ریاست میں اجلاس منعقد ہوا ہے،

تعلیم کے متعلق جو قراردادیں منظور ہوئیں، اُن میں مشترکہ زبان کے امکان، بالغوں میں عام تعلیم کی ترویج، بچوں کی صحت اور طبی معائنے، یونیورسٹیوں میں عورتوں کے ہوسٹلوں کی ضرورت اور جبری تعلیم کی سکیموں میں لڑکیوں کی شمولیت وغیرہ امور کا تذکرہ تھا۔

خواتین کی بین الاقوامی کونسل کے اجلاس میں جو ہندوستان میں پہلی مرتبہ ماہ فروری کے آغاز میں کلکتے میں منعقد ہوا جن امور پر بحث و تمحیص ہوئی اُن میں لڑکیوں کی تعلیم کے معاملات نمایاں طریق پر شامل تھے۔

مستقبل اور مالیات کا مسئلہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اگر لڑکیوں کی تعلیم کا مستقبل روشن نظر آرہا ہے، تو یہ محض خود عورتوں کے اپنے اثر اور روز افزوں طاقت کے باعث ہے۔ اُنھوں نے عزم صمیم کر لیا ہے کہ وہ اپنے ملک کے مستقبل کو شاندار بنانے میں مردوں کی طرح حصّہ لینگی اور اس بات کا خیال رکھینگی کہ آئندہ نسلوں کے بچے اپنی اکثر ماؤں سے بہتر طریق پر زندگی بسر کرسکیں۔ عورتوں کی اس جدید تحریک کا مردوں اور عورتوں کی طرف سے دلی خیر مقدم کیا گیا ہے اور اسے ہندوستان کے مستقبل کے لیے بے حد اہم قرار دیا ہے لیکن خلوص کی صحیح آزمائش اُسی وقت ہوگی جس وقت جذبات کو عملی صورت دینے کا وقت آئیگا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر صوبے میں، ہر مرحلے پر تعلیم کی ترقی کے راستے میں سکولوں، سامان، اُستادوں اور ہوسٹلوں کی کمی اور معائنہ وغورو پرداخت کے انتظامات ناقص ہونے کی وجہ سے رکاوٹیں درپیش ہیں۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ صوبجاتی حکومتوں نے کس حد تک تعلیمی کمیٹی کی سفارشات پر عمل کیا ہے، جن کا میں اس لکچر کے آغاز میں ذکر کرچکی ہوں، یعنی، توسیع کی ہر سکیم میں لڑکیوں کے مطالبات کو مقدم سمجھا جائے۔ گذشتہ پنجسالہ تعلیمی تبصرے میں رپورٹ کی اشاعت کے بعد کے پانچ سال

علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ نہایت احتیاط کے ساتھ تجاویز مرتب کی جائیں تاکہ لڑکیوں کی تعلیم کی ساری ترقی کو اسکولوں میں لڑکیوں کی غیر معمولی زیادتی کے ساتھ مستحکم طریق پر قائم رکھا جائے اور مستقبل کے متعلق جو بڑی بڑی امیدیں باندھی گئی ہیں وہ پادر ہوا ثابت نہ ہوں۔

اِن حالات میں کیا یہ امر تعجب انگیز ہے کہ بعض اوقات ترقی پسند عورتیں موجودہ صورت حالات اور اُن لوگوں پر جو جان بوجھ کر نہیں دیکھتے مایوسی کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی عورتیں اس بات پر زور دے رہی ہیں اور ہم بھی اِس ملک میں اس بارے میں اُن کی پُر زور حمایت کرتے رہینگے کہ ضابطۂ تعلیم میں قرار دیا جائے کہ نظم و نسق کے عہدوں پر عورتوں کو بھی مقرر کیا جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید آئین حکومت میں عورتوں نے کوشش کرکے زیادہ سے زیادہ حق رائے دہی حاصل کر لیا ہے، کیونکہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد وہ اتنی طاقتور ہو جائینگی کہ ہر اُس چیز کو لے سکیں جسے وہ دلائل کے زور سے منوانے میں ناکام رہی ہیں۔

اب میں آپ کے سامنے صوبجات متحدہ کے وزیر تعلیم کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کرتی ہوں۔

"محکمۂ تعلیم نے زمانۂ ماضی میں عورتوں کی تعلیم کو کم درجے کی ذمے داری سمجھے رکھا.....

غالباً یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ صوبے میں مرد ہی بستے ہیں عورتیں آباد ہی نہیں۔ اب اِس غلط خیال کو دور کر دیا گیا ہے اور میں مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ آج حکومت کی واضح حکمت عملی یہی ہے کہ تعلیم کی تمام شاخوں میں عورتوں کی تعلیم کو ترجیح دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ عورتوں کی تعلیم سے بے پروائی کرنے میں صرف معاشرتی ہی نہیں بلکہ سیاسی خطرہ بھی پنہاں ہے نئے آئین حکومت کے ماتحت بہت سے لاکھ عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہو گا اور پچھلے انتخابات میں خاص طور

پر عورتوں کے لیے محفوظ ہونگی اور یہ امر یقینی ہے کہ وہ اس وقت تک کسی وزیر کو چین سے نہ بیٹھنے دینگی جب تک انھیں، جو کچھ وہ مانگتی ہیں، نہ دے دیا جائیگا "

خدا کرے کہ وزیر موصوف کی پیش گوئی درست ثابت ہو۔

میں صرف لڑکیوں کی تعلیم ہی کی وکالت نہیں کر رہی ہوں، جداگانہ حیثیت سے لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی سوال پیش نہیں ہوتا ہمارے سامنے قوم کی بہ حیثیت مجموعی ترقی کا سوال پیش ہے۔ اس کا ہر اُس مسئلے سے تعلق ہے، جس سے دورِ حاضر کا ہندوستان دوچار ہو رہا ہے۔ اصلاحِ دیہات کی مہم میں عورتوں کی تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حفظانِ صحت کے کام میں تعلیم کے بغیر ترقی غیر ممکن ہے، کیونکہ صفائی اور تندرستی کے سادہ اصول اُس وقت تک ذہن نشین نہیں کرائے جا سکتے جب تک بچوں کی مائیں توہمات اور علم کے درمیان تمیز نہیں کر سکتیں۔ تعلیم ہی کے ذریعے سے صغیر سنی کی شادی کے رواج کا موثر انسداد ہو سکتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ ماں کبھی یہ گوارا نہ کریگی کہ اُس کی لڑکی کی شادی بلوغت سے پہلے بچپن ہی میں کر دی جائے، نیز وہ اُسی طرح اپنی لڑکی کو اسکول میں تعلیم حاصل کرائیگی جس طرح اُس نے خود کی تھی۔

زمانہ واقعی بڑا نازک ہے۔ دورِ حاضر کی لڑکیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جوش کا طوفان امنڈ رہا ہے۔ کیا یہ جوش زمانۂ ماضی کی طرح رائگاں جائیگا؟ یا دانشمندی سے کام لے کر اس سے ایسا فائدہ اُٹھایا جائیگا کہ ملک میں نئی زندگی، نئی صحت و تندرستی اور نئی مسرت کی لہر دوڑ جائیگی؟

اِس کا فیصلہ کرنا ہندوستان کے مردوں کے اختیار میں ہے۔

۱۶۹

ہندوؤں کی پرانی تہذیب و تعلیم

از

پروفیسر گوپال داس صاحب کھنہ، ایم اے، بی ٹی

قدیم ہندو تعلیم کی غرض و غایت

قدیم ہندو تعلیم کے مقاصد تین تھے:۔

(i) علم کی تحصیل

(ii) مجلسی اور مذہبی فرائض میں مہارت۔

(iii) تربیتِ اخلاق۔

انسانی زندگی کی چہارگانہ تقسیم

ہندوؤں کی ایک اور تعلیمی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ انسان کو ضرورتِ وقت کے مطابق ہر شعبۂ زندگی کے لیے تیار کرتی تھی اور تمام عمر اس کے کام آتی تھی۔ اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انسان کی زندگی چار حصّوں میں منقسم تھی۔ پہلے حصّے کا نام برہمچریہ تھا، جو عام طور پر پچیس سال تک تھا۔ اِس عرصے میں طالب علم اپنے اُستاد سے مختلف علوم سیکھتا تھا اور اپنے تئیں خدا کے حوالے کرکے زندگی بسر کرتا تھا۔

دوسرے حصّے کا نام گرھست تھا، جس سے مُراد ۲۵ سے ۵۰ سال تک کا عرصہ تھا۔ اِس میں انسان کو اپنے فرائضِ خانہ داری سے آگاہ کیا جاتا تھا اور کاروباری زندگی کی عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ تیسرے حصّے کا نام بان پرستھ تھا جو ۵۰ سال سے ۷۵ سال تک تھا۔ اِس میں انسان کاروباری زندگی کو ترک کرکے مختلف کتبِ مقدسہ کو پڑھتا اور خدا کی یاد میں زندگی بسر کرتا تھا۔

آخری دور زندگی کو سنیاس کہتے تھے۔ اِس حصّے میں اِنسان اپنے تجربات اور علوم کی بنا پر ملک کے مختلف حصّوں میں جا کر دھرم کا پرچار کرتا اور لوگوں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کرتا تھا۔

ہندو تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ہر فرد کو سوسائٹی کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے تاکہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق سوسائٹی کی بہبودی میں حصّہ لے سکے۔ رِگ وید میں ایک منتر آتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا منشاء اصلی خدمتِ خلق ہے۔

چونکہ ہندوؤں میں دھرم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اِس لیے تعلیم میں زیادہ تر زور تربیتِ اخلاق پر دیا جاتا تھا۔ اِن کی کتبِ مقدسہ میں جگہ جگہ آتا ہے کہ تم اپنا چلن نیک رکھو خواہشاتِ نفسانی دبائے رکھو۔ حواسِ خمسہ کو قابو میں رکھو۔ یہ سبق تعلیم کے ضروری جزو تھے۔ مہابھارت میں کہا ہے کہ نیک چلنی اور نیک برتاؤ اچھی تعلیم کے پھل ہیں۔ ویاس سنگھتا میں آتا ہے کہ لڑائی میں فتح پانے سے اِنسان بہادر نہیں گِنا جاتا۔ نہ علم ہی سے اِنسان کا شمار داناؤں میں ہوتا ہے، بلکہ جس نے اپنے حواسِ خمسہ پر قابو پا لیا ہے، وہی اصل معنوں میں بہادر ہے اور جو شخص نیکی پر عمل کرتا ہے وُہی دانا ہے۔

قدیم ہندوستان میں گھریلو تعلیم و تربیت

اِس سے پہلے ہم اس بات کا ذکر کر آئے ہیں کہ قدیم ہندوؤں میں تعلیم کا اصلی منشا زمانے کے حالات کے مطابق زندگی کے ہر شعبے کے لیے اِستعداد حاصل کرنا تھا۔ اِس لیے تعلیم اصلی معنوں میں پیدائش کے ساتھ ہی، بلکہ اُس وقت سے جب کہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا تھا شروع ہو جاتی تھی۔ ویدوں میں جگہ جگہ ایسے منتر ملتے ہیں، جن میں باردار عورت کو ہدایات ہیں کہ پیدا ہونے والے بچے کی خاطر اپنی زندگی نیک اصولوں کے مطابق بسر کرے تاکہ بچے پر اُس

کے اثرات نیک پڑیں اور خاص کر والدہ کو خوش و خرم اور نیک سیرت رہنے کی ہدایت ہے تاکہ بچہ خوش خلق اور نیک پیدا ہو۔ اِس بات کے جتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دورِ حاضرہ کے علم نفسیات میں بھی اِس بات کی خاص تاکید ہے۔ آج کل ہم اِس بات کو مانتے ہیں کہ دِل پر نامعلوم طور پر جو اثرات پڑتے ہیں، وہ ہمارے اخلاق کی تربیت میں بہت زیادہ حصّہ لیتے ہیں، اِس لیے جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، اُس وقت اپنے خیالات اور عادات سے والدہ جو اثرات بچے پر ڈالتی ہے، وہ دراصل اُس کے دل پر بہت گہرا اثر کرتے ہیں اور بچے کی آئندہ زندگی کا دارومدار بہت حد تک انھیں اثرات پر ہوتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد والدین کو ہدایات ہیں کہ وہ اس کے جسم کی پُورے طور پر پرورش کریں تاکہ بچہ سڈول اور طاقتور ہو اور اس کے علاوہ والدین کی گھریلو زندگی اس طرح کی ہو کہ گھر کا اخلاقی معیار نہایت بلند ہو۔ والدین اِس بات کی کوشش کریں کہ بچے کا دل پاکیزہ رہے اور وہ جسمانی اور رُوحانی طور پر خوب ترقی کرے۔ جب بچے کا نام کرن سنسکار یعنی نام رکھنے کی رسم ادا کی جاتی تھی تو اس وقت شادیانے بجائے اور خوشیاں منائی جاتی تھیں تاکہ بچے کے اُوپر اچھے اثرات پڑیں۔ تعلیم کے لحاظ سے اِن اثرات کا بہت اُونچا درجہ ہے، کیونکہ جو عادات بچپن میں ڈالی جاتی ہیں اُن کا اثر تاحینِ حیات رہتا ہے اور بچے کی روحانی، جسمانی اور نفسانی زندگی کا دارومدار اُنھیں پر ہوتا ہے۔

تیسرے یا پانچویں سال بچے کی رسم مُونڈن ادا کی جاتی تھی۔ اِس تقریب پر اُس کے سر کے بال اتار دیے جاتے تھے۔ اِس رسم کے بعد بچپن کا دوسرا دور شروع ہوتا تھا، یعنی، اُس کے بعد بچے کے واسطے ضروری ہوتا تھا کہ وہ ایک باقاعدہ زندگی بسر کرے۔ صبح سویرے خاص وقت پر اُٹھے۔ اُٹھ کر دانت اور آنکھیں صاف کرے۔ پھر نہائے۔ ایشور کا نام لے۔ کھانا وقت پر کھائے

اور رات کو وقت پر سوتے۔ اِس زمانے میں روحانی تعلیم کی بُنیاد رکھی جاتی تھی، یعنی، فطرت کے کارہائے نمایاں سے بچے کو فطرت کے بنانے والے کی طرف مائل کیا جاتا تھا۔ شروع سے بچے کی زندگی قدرت کے اصولوں کے مطابق رکھی جاتی تھی۔ اِس کو ہر وقت موقع دیا جاتا تھا کہ قدرت کے کرشموں کو دیکھے اور اِن مشاہدات کے بعد اِس کی توجہ اس قادرِ مطلق کی طرف مائل کی جاتی تھی، جس کی طاقت سے یہ سب کرشمے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

جب بچہ ذرا بڑا ہوتا تھا، تو والدین کا فرض ہوتا تھا کہ وہ بچے کو گھر کا ایک خاص رُکن قرار دیں۔ اس کے ارد گرد اِس طرح کا ماحول موجود کیا جائے کہ بچہ نیک اثرات کو جذب کرے اور ایک دوسرے سے پیار محبت سے رہنا، مِل جُل کر کام کرنا، بڑوں کی خدمت کرنا اور ایثار کا مادہ پیدا کرنا سیکھے۔ آج کل کے ماہرینِ فنِ تعلیم بھی اِس بات پہ زور دیتے ہیں کہ اسکول آنے سے پہلے بچہ گھر سے نیک اثرات لائے تاکہ وہ اسکول کی زندگی سے پُورا پُورا فائدہ اٹھا سکے۔ سترھویں صدی میں یورپ کے مشہور ماہرِ تعلیم کمینیس نے ایک نہایت مفید کتاب لکھی تھی، جس کا عنوان تھا "ماں کے گھٹنے کا اسکول"۔ اِس بیش بہا کتاب میں اُس نے اِس بات پر بحث کی ہے کہ ہر ایک ماں اپنے بچے کی تعلیم میں کہاں تک اہم حصہ لے سکتی ہے اور بچے کے اخلاق کی تربیت میں استاد کی کس حد تک مدد کر سکتی ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی میں سوٹزرلینڈ کے ماہرِ تعلیم پسٹالاٹسی نے بھی کہا ہے کہ اگر ہمارے گھروں کا رہنا سہنا محبت پر مبنی ہو اور ہمارے اسکول اسی فضا میں تربیت کریں، تو دنیا میں جو اتنی تاریکی اور توہمات نظر آتے ہیں، خود بخود کافور ہو جائیں۔ بنا بریں ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قدیم ہندو اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ بچے کی تربیت میں گھر کی فضا کو بہت کچھ دخل ہے۔

ابتدائی تعلیم - قدیم ہندوستان میں سلسلہ تعلیم ابتدائی، ثانوی اور عالیہ صیغہ جات میں اِس

طرح منقسم نہ تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ تاہم اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بچپن ہی میں گھریلو تعلیم کے بعد بچے کو گھر کی زندگی سے علٰحدہ کر دیا جاتا تھا اور بچہ کسی اسکول یا استاد کے گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ چرک میں لکھا ہے کہ اسکول جانے کی عمر پانچواں برس ہے۔ وشنو پران میں مذکور ہے کہ ایک سے پانچ سال تک کی عمر کھیل کود کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد بچے کو لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ سکھانا چاہیے۔ ابتدائی تعلیم عموماً پانچویں سال سے آٹھویں سال تک دی جاتی تھی۔ اور اس اثنا میں بچے کے اندر اس علم کی بنیاد رکھی جاتی تھی جس کی مدد سے وہ کتب مقدسہ کا مطالعہ بخوبی کر سکے۔

گو ویدوں کے زمانے میں اس قسم کی تعلیم کا خاص علٰحدہ انتظام نہ تھا، لیکن بدھوں کے وقت اس سلسلۂ تعلیم نے ایک مکمل صورت اختیار کر لی تھی۔ اس زمانے میں ہمیں جگہ جگہ ایسے اسکول ملتے ہیں، جہاں ابتدائی تعلیم کا پورا انتظام تھا۔ گوتم بدھ کی سوانحعمری میں بھی آیا ہے۔ کہ بچپن کے زمانے میں وہ اور طلبہ کے ساتھ جز دان اور تختی ساتھ لیے اسکول جایا کرتا تھا۔ ایسی تعلیم عام طور پر بودھ وہاروں میں دی جاتی تھی اور تعلیم کا کام بودھ بھکشوؤں کے سپرد تھا، لیکن اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ کیا ویدوں کے اور کیا بدھوں کے زمانے میں ابتدائی تعلیم اور تعلیم عالیہ کے صیغہ جات اس طرح علٰحدہ علٰحدہ نہ تھے جس طرح کہ آج کل ہیں اور نہ ان کے مقاصد ہی میں دورِ حاضرہ کی طرح چنداں اختلاف تھا۔

درسگاہ۔ تعلیم عام طور پر اساتذہ کے گھروں میں دی جاتی تھی، جو اکثر برہمن ہوتے تھے اور گورو کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اکثر جنگلوں میں بستی سے دور آشرم بنا کر رہا کرتے تھے۔ عام طور پر عیالدار ہوتے تھے اور طلبہ کو ان کے بیوی بچوں کے درمیان رہنے کے اکثر موقعے ملتے تھے۔ بعض گورو سنیاسی بھی ہوتے تھے، جو دنیاوی علائق کو خیرباد کہہ کر جنگلوں میں آشرموں میں رہا کرتے تھے اور

وہاں اعلیٰ پائے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان آشرموں میں زندگی نہایت سادہ اور قدرت کے اصولوں کے مطابق ہوتی تھی۔ ویدک زمانے میں جن علما کی زندگی پاکیزہ اور ممتاز ہوتی تھی، انھیں رشیوں کے نام سے نامزد کیا جاتا تھا۔ رشی کے معنی ہیں وہ شخص جس کے اندر روحانی روشنی چمک رہی ہو۔ یہ لوگ دنیا میں رہتے ہوئے اس سے بالاتر اور اس زمانے کے علوم پر حاوی ہوتے تھے۔ اس زمانے کی تعلیم کے بارے میں اس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ اساتذہ اور طلبہ بستی سے دور جنگلوں میں رہتے تھے تاکہ شہروں کے غیر موزوں اثرات سے محفوظ رہ کر اور قدرت سے ہم آہنگ ہو کر تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر جنگلوں کو ہندوستان کی تہذیب قدیم کا گہوارہ کہیں تو بجا ہے۔

اس بات کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا ویدوں کے زمانے میں موجودہ یونیورسٹیوں کے مقابلے کے دارالعلوم تھے یا نہیں۔ ہاں، اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علٰحدہ علٰحدہ آشرموں کے علاوہ کئی ایک عالم مل کر بھی تعلیم دیتے تھے۔ ایسے عالموں کے اجتماع کو پریشد کہتے تھے۔ ان پریشدوں کا کام طلبہ کی تعلیم و تربیت اور دھرم کے مختلف اہم سوالات پر فتوے دینا تھا۔ منوؔ، گوتم، وششٹ وغیرہ عالم اپنی کتب میں ان پریشدوں کا ذکر کرتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے آریہ لوگ ایسی درسگاہوں کو نہایت تعظیم کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ رشوبت کیتو جو ایک بڑا عالم ہو گزرا ہے، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے پنچال پریشد میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان عالموں کی جماعت کو اگر ہم موجودہ یونیورسٹی سے تشبیہ دیں، تو چنداں غیر موزوں نہ ہوگا کیونکہ یورپ میں بھی تو یونیورسٹیوں کا آغاز ایسے ہی عالموں کے اجتماعوں سے ہوا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد جب ہندو تہذیب کو پورا عروج حاصل ہوا، تو یہاں صحیح معنوں میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جن میں ٹیکسلا، نالندا، شری دھانیہ کٹک، اودانتا پوری، ساکیہ اور وکرما شیل یونیورسٹیاں زیادہ ممتاز اور مشہور ہیں۔ ہم ان کا ذکر پھر کسی موقع پر کریں گے۔ (باقی) (کاپی رائٹ)

ذہانت: طرقِ پیمائش و دیگر کوائف

از
قاضی محمد اسلم صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج، لاہور

عملی اعتبار سے سب سے زیادہ کامیابی نفسیاتِ جدیدہ کو ذہانت کی تحقیق میں ہوئی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک فرد کی زندگی میں کامیابی کا دارومدار بہت کچھ اس کی قدرتی لیاقت اور ذہانت پر ہے۔ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ ذہانت کی تقسیم میں قدرت نے بہت فرق رکھا ہے اور انسانوں میں جو عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ افرادی ذہانت کے لحاظ سے آپس میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی وجہ سے عموماً ماں باپ اپنے بچوں کی ذہانت کے متعلق مبالغے سے کام لیتے ہیں، لیکن ماں باپ بھی یہ جانتے ہیں کہ بچے یکساں طور پر ذہین نہیں ہوتے، کچھ زیادہ ذہین ہوتے ہیں، کچھ کم۔ اسی طرح اساتذہ بھی کم اور زیادہ ذہین شاگردوں میں فرق کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ذہین بچے دوسرے بچوں کی بہ نسبت کتنی جلدی اپنا سبق اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ زیادہ ذہین بچے تعلیم کی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں اور کم ذہین بچے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ذہین بچے کم عمری میں بڑی عمر والوں کی سی سمجھ رکھتے ہیں، اور وہ جو ذہین نہیں، بڑی عمر میں بھی کم عمر والوں کی سی سمجھ رکھتے ہیں۔

بچوں کی ذہانت کا اندازہ کرنا پیشتر اس سے کہ وہ بڑے ہو جائیں اور پیشتر اس سے کہ بہت سا وقت اُن سے واقفیت پیدا کرنے میں صرف کر دیا جائے، ایک مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے۔ والدین تو محبت اور شوق کی وجہ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کے بچے کس درجے کے

ذہین ہیں۔ لیکن ایک اعلیٰ نظامِ تعلیم میں تمام بچوں کی ذہانت کا اندازہ کرنا سوسائٹی کی مجموعی تعلیمی اغراض کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں فرانس کا وزیر تعلیم اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ پیرس کے پبلک مدارس میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد سالانہ امتحانوں میں فیل ہو جاتی ہے اور تعلیم سے اُنھیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا، حالانکہ ان کو ویسی ہی تعلیم دی جاتی ہے جیسی دوسروں کو اور ان کی عمر بھی اُتنی ہی ہوتی ہے جتنی دوسروں کی۔ پس ضروری تھا کہ ایسے کمزور طلبہ کو دوسروں سے علیحدہ کر دیا جاتا تاکہ وہ دوسروں کی ترقی میں بھی حارج نہ ہوں اور اپنے آپ کو بھی زیادہ بوجھ کے نیچے ڈال کر خراب نہ کریں، فرانسوی وزیر تعلیم نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، مال اور وقت کے اس نقصان کو جو کم اور زیادہ استعداد کے طلبہ کو اکٹھا پڑھانے سے حکومت کو لاحق ہو رہا ہے، دور کیا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا سوائے اس کے کہ کچھ ایسے طریقے ایجاد کیے جاتے، جن سے کم استعداد طلبہ دوسرے طلبہ سے الگ کیے جا سکتے۔ عام اساتذہ کے سپرد یہ کام کرنا مناسب نہ تھا، کیونکہ سوائے اُن طلبہ کے جن کو وہ جانتے ہوں اور جانتے بھی زیادہ عرصے سے ہوں کسی کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اساتذہ کو اپنے طلبہ کے متعلق اکثر مخالف یا موافق تعصب بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اُستاد کا معیار دوسرے استاد کے معیار سے مختلف ہونا بھی باعثِ دِقت ہوتا۔ اگر اساتذہ کے بجائے انسپکٹروں سے یہ کام لیا جاتا تو وہ بھی اختلافِ معیار کی وجہ سے مفید ثابت نہ ہوتے اور بغیر معین اصولوں پر کاربند ہونے کے اس کام کو کماحقہٗ سرانجام نہ دے سکتے۔ ہر شخص پر بعض مستقل اور بعض وقتی تعصبات وارد ہوتے ہیں۔ پس ہزاروں لاکھوں طلبہ کی ذہانت کا اندازہ کرنا بغیر ایسے معین طریقوں کے ممکن نہ تھا جو شخصی تعصبات سے بالا ہوں۔

حُسنِ اتفاق سے پیرس میں اس وقت ایک زیرک ماہرِ نفسیات موجود تھا جس کا

م الفریڈ بنے (Alfred Binet.) تھا اور جس نے کئی تحقیقی مقالے لکھ کر اپنی لیاقت
بت کر رکھی تھی۔ ذہانت کا پیمانہ تجویز کرنے کا کام بنے ہی کے سپرد کیا گیا۔ اُس نے غور و خوض کے
عد، نیز مختلف عمروں کے کئی ہزار بچوں کے امتحان کے بعد ایک سکیل تیار کی، جو واقعی ذہانت
ے لیے ایک پیمانہ ثابت ہوئی۔ اُس نے مختلف قسم کے سوال مختلف عمروں کے بچوں پر آزما
زما کر فیصلہ کیا کہ کس عمر میں کس قسم کے سوال بچے حل کر سکتے ہیں۔ تین سال کی عمر سے لے کر سولہ
سال کی عمر تک کے لیے اُس نے سوال تجویز کر دیے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر کوئی بچہ اپنی عمر کے
مقررہ سوال حل کر لے تو وہ نارمل یعنی اوسط ذہانت کا مالک ہوگا، اگر وہ اپنی عمر سے بڑھ کر سوال
حل کر لے تو وہ اُسی حد تک اپنی عمر سے زیادہ ذہین ہوگا اور اگر وہ اپنی عمر کے سوال حل نہ کر سکے
اپنی عمر سے کم درجے کے سوال حل کر سکے، تو وہ اُسی حد تک اپنی عمر سے کم ذہین ہوگا۔ بنے کی
سکیل سے کم سے کم یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ ہر بچے کی دو عمریں ہوتی ہیں، ایک اصل عمر جو بچے کی
اریخ پیدائش سے شمار ہوتی ہے اور ایک استعداد کی عمر جس کا اندازہ اس کی ذہانت سے ہوتا
ہے۔ اگر اصل عمر اور عمرِ استعداد ایک ہوں، تو بچہ نارمل ہے، اگر عمرِ استعداد اصل عمر سے زیادہ
ہو، تو ذہین اور اگر کم ہو تو بچہ کند ذہن ہے۔ ہر بچے کی ذہانت کا اندازہ اس کی استعداد کی عمر
سے ہو سکتا ہے اور یہ بات الفریڈ بنے کی اپنی سکیل سے یا بعض دوسری سکیلوں سے جو بنے
کے بعد مرتب کی گئیں، آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔[1]

ہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عمرِ استعداد کسی بچے یا فرد کا درجۂ ذہانت مقرر کرنے کے
لیے ایک ناقص اصطلاح ہے۔ فرض کرو کہ دو بچے ہیں۔ ایک کی عمر چودہ سال ہے، دوسرے

---

[1] ان باتوں کی تفصیل کے لیے دیکھو کتاب انگریزی پیمائش ذہانت مصنفہ ایل۔ایم ٹرمین

(L. M. Terman)

کی دس سال، استعداد کے لحاظ سے دونوں کی عمر بارہ سال ہے، تو کیا ذہانت کے لحاظ سے بھی دونوں ایک ہی سطح پر ہیں؟ ہرگز نہیں، چودہ سال کا بچہ اپنی عمر سے کم ذہین ہے اور دس سال کا بچہ اپنی عمر سے زیادہ ذہین، اس لیے گو دونوں کی عمرِ استعداد ایک ہے، پھر بھی چونکہ دونوں کی اصل عمر میں فرق ہے اس لیے زیادہ عمر والا بچہ کم ذہین اور کم عمر والا زیادہ ذہین کہلائیگا ۔ پس کسی بچے کی ذہانت کا درجہ اُس کی عمرِ استعداد نہیں، بلکہ وہ نسبت ہے جو عمرِ استعداد کو اصل عمر سے ہے اور یہی نسبت، نسبتِ ذہانت کہلاتی ہے۔ چودہ سال والے بچے کی نسبتِ ذہانت $\frac{۱۲}{۱۴}$ یعنی ۸۵، ہے اور دس سال والے بچے کی $\frac{۱۲}{۱۰}$ یعنی ۲، ۱ ہے، کسر اعشاریہ کو اُڑانے کے لیے ہم انھیں رقوم کو سو سے ضرب دے سکتے ہیں اور اس طرح چودہ سال والے بچے کی ذہانت کا درجہ ۸۵ اور دس سال والے بچے کی ذہانت کا درجہ ۱۲۰ بن جاتا ہے اور نارمل بچوں کا درجۂ ذہانت ۱۰۰ ہے۔[1]

ذہانت کی پیمائش کی علمی بنیاد ڈالی جا چکی تھی کہ جنگِ عظیم نے ایک موقع پیدا کر دیا، جس سے نفسیات کی یہ شاخ یک لخت ترقی کر گئی۔ امریکہ جنگ میں شامل ہونے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن بعض واقعات نے اسے مجبور کیا کہ وہ بھی جنگ میں شامل ہو۔ ایک بڑی فوج بنانے کے لیے جلدی جلدی بھرتی کی گئی اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے نوجوان جمع ہو گئے، جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور تعلیم کے کئی قسم کے مدارج طے کیے ہوئے تھے۔ اُن کے حسبِ لیاقت کام اور عہدے تجویز کرنا ایک مشکل امر تھا۔ عام حالات میں ایک سپاہی کے متعلق کئی سال میں تجربہ کیا جاتا ہے اور جیسے جیسے وہ لیاقت دکھاتا ہے، اُس کا درجہ بڑھا دیا جاتا ہے، لیکن جنگ جاری تھی، اتنا وقت کہاں تھا، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ رنگروٹوں کی نسبتی استعداد معلوم

---

[1] پس درجۂ ذہانت = نسبتِ ذہانت = $\frac{\text{عمرِ استعداد}}{\text{عمرِ اصلی}} \times ۱۰۰$

کرنے کے لیے امریکی ماہرانِ نفسیات مجبور ہوئے کہ ایسے سہل طریقے ایجاد کریں، جن سے سیکڑوں ہزاروں افراد کا بیک وقت امتحان لیا جا سکے، اس طرح ان میں سے ہر ایک کا معیارِ ذہانت مقرر ہو جائے اور پھر اس کی بنا پر اس کا کام اور اس کا عہدہ تجویز ہو؛ چنانچہ اُنھوں نے متعدد قسم کے تحریری ٹسٹ مرتب کیے، جو طبع کر کے امتحان کے پرچوں کی طرح تقسیم کر دیے جاتے۔ بنے کی سکیل میں ضروری تھا کہ ہر بچے یا فرد کا علٰحدہ امتحان ہو جس میں فی کس پون گھنٹہ یا پورا گھنٹہ لگ جاتا۔ جہاں سیکڑوں بلکہ ہزاروں کو ٹسٹ کرنا ہو، وہاں ایسے طولانی طریق کام نہیں آ سکتے، اس لیے امریکہ کے تجویز کیے ہوئے تحریری ٹسٹ، جن میں زبان کے جز کو تقریباً مٹا دیا گیا تھا اور جو ایک ان پڑھ شخص بھی بشرط استعداد حل کر سکتا تھا۔ ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے اور اس کے بعد انھیں لائنوں پر ذہانت کی تشخیص کے لیے نئے سے نئے آزمائشی سوال مرتب کیے جانے لگے اور اُن کی سادگی اور سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے کالجوں، اسکولوں اور کارخانوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔

اس عملی ترقی کے ساتھ ساتھ اہلِ علم بھی میدان میں آ نکلے اور اُنھوں نے کئی قسم کی تحقیقات جاری کر دیں اور ان تحقیقات سے بہت سے دلچسپ نتائج اخذ کیے گئے، غالباً سب سے اہم نتیجہ، جو ان تحقیقات کی رُو سے نکالا گیا تھا کہ ذہانت کوئی کسبی بات نہیں، بلکہ قدرت کا عطیہ ہے۔ یہ ہر انسان کا ذاتی سرمایہ ہے، جو وہ پیدائش سے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ اُس کا ورثہ ہے، جو اُسے اپنے اجداد سے ملتا ہے۔ ذہانت کے فطری ہونے کے قائل تو اکثر لوگ ہونگے، لیکن اس کا تحقیقی ثبوت بہت کم لوگ جانتے ہونگے۔ ایک تحقیق کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ جو افراد خونی رشتے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، وہ ذہانت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ عام لڑکوں لڑکیوں کا آپس میں بہت فرق ہوتا ہے، لیکن بہنوں اور بھائیوں کا

آپس میں اتنا فرق نہیں ہوتا، پھر بہنوں اور بھائیوں میں، جو توام پیدا ہوتے ہیں، ان میں اور بھی کم فرق ہوتا ہے اور توام بچوں میں، جو بچے ایک ہی صنف کے ہوتے ہیں، یعنی، جو دونوں لڑکے یا دونوں لڑکیاں ہوں۔ وہ ذہانت کے اعتبار سے اور بھی قریب ہوتے ہیں، پھر ایک ہی صنف کے توام بچوں میں سے، جو بچے شکل و شباہت میں بھی ایک سے ہوتے ہیں، وہ ذہانت میں بھی بالکل برابر ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ دو اسکولوں کے بچوں کی ذہانت کا اندازہ کیا گیا، ایک اسکول میں عموماً ایسے بچے تعلیم پاتے تھے، جن کے والدین نے علمی لحاظ سے شہرت پا رکھی تھی۔ دوسرے اسکول میں بالعموم دکانداروں کے بچے پڑھتے تھے۔ دونوں اسکولوں میں ایک سی تعلیم دی جاتی تھی اور دونوں کا ماحول بھی ایک ہی طرح کا تھا۔ پھر بھی اُن بچوں کا معیار ذہانت بہت بلند ثابت ہوا جن کے والدین کا علمی کمال ثابت ہو چکا تھا۔

ذہانت کا موروثی ہونا بعض موقع پر ایک خطرناک استدلال کا باعث بن جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر نسل، ہر قوم اور ہر ملک کے باشندے ایک مقررہ معیار ذہانت کے مالک ہیں اور یہ معیار چونکہ ایک فطری امر ہے اور قدرت کی طرف سے مختلف قوموں کو ایک ازلی تقسیم کے ماتحت دیا گیا ہے۔ اسلیے قوموں کی قسمت بھی اٹل ہے۔ جو قومیں آج اوجِ ترقی پر ہیں، وہ ہمیشہ ایسی ہی رہینگی اور جو قومیں آج گری ہوئی ہیں وہ ہمیشہ گری ہی رہینگی۔ یہ استدلال بالکل بے معنی ہے، کیونکہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے، کہ قومیں گرتی اور بڑھتی رہتی ہیں اور تہذیب و تمدن، تجارت و حکومت، ایسی باتیں نہیں کہ ہمیشہ ایک یا چند قوموں کے قبضے میں رہیں، بلکہ یہ چکر کاٹتی رہتی ہیں، اگر آج ایک قوم معراج ترقی کو پہنچی ہوئی ہے تو کل دوسری کی بھی باری آجاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہانت کو، جو موروثی کہا گیا ہے، تو قومی معنوں میں نہیں، بلکہ انفرادی معنوں میں، ایک فرد تو واقعی اپنے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی

قوے اپنے اجداد سے ورثے میں پاتا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قومی قوے بھی اسی طرح موروثی ہوتے ہیں کہ گویا وہ ماحول سے متاثر ہی نہیں ہو سکتے اور تاریخی حالات کے ماتحت یا فوق الطاقت لیڈروں کے اثر کے ماتحت بدل ہی نہیں سکتے، نہیں، بدل سکتے ہیں۔ او تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو آج ایک اور کل دوسری ترقی کی لہر پر چڑھتی ہوتی ہے۔ قومی ترقی کے ماتحت افراد بھی انقلاب پذیر ہو جاتے ہیں۔ پس ایک رنگ میں افراد بھی اپنے ورثے سے محروم ہو سکتے ہیں، لیکن قوم کے واسطے سے، ان کے اپنے قوے بہر حال موروثی ہی ہوتے ہیں۔

ذہانت کے متعلق ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ آیا لڑکے زیادہ ذہین ہوتے ہیں یا لڑکیاں؟ یعنی صنفی اعتبار سے ذہانت میں کچھ فرق ہوتا ہے یا نہیں؟ جدید تحقیق کا فیصلہ یہی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں۔ باوجود اس کے یہ بھی آج تسلیم کیا جاتا ہے کہ لڑکوں میں ذہانت کے نشو و نما کی رفتار اور ہے اور لڑکیوں میں اور نشو و نما کے فرق کی وجہ سے ایک عارضی فرق لڑکوں اور لڑکیوں میں ضرور ظاہر ہوتا ہے اور یہ فرق لڑکیوں کے حق میں ہوتا ہے۔ اسی سے بعض لوگ غلطی کھاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا لڑکیاں، لڑکوں سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں۔ بہت سے والدین اور کثیر اساتذہ اس کی تصدیق کریں گے کہ تین سال کی عمر سے لے کر کئی سال اُدھر تک کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں۔ وہ سبق جلدی اخذ کرتی ہیں اور جلد جلد بڑھتی نظر آتی ہیں۔ چھے یا سات سال کی عمر میں یہ فرق اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ دس سال کی عمر میں لڑکے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن لڑکوں کی یہ فوقیت عارضی ہوتی ہے، کیونکہ اس عمر کے بعد لڑکیاں پھر بڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور چودہ سال کی عمر تک لڑکوں سے فائق ہی نظر آتی ہیں۔ چودہ سال کے بعد یہ فرق مٹنا شروع ہو جاتا ہے اور جلد ہی مٹ جاتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے نشو و نما میں فرق، صنفی احساس کے لحاظ سے اور بھی نمایاں ہوتا ہے اور عام

جسمانی نشو و نما کا بھی یہی حال ہے۔ لڑکیوں کا نشو و نما تیز رفتاری سے ہوتا ہے، لیکن ایک حد تک جا کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد کئی لحاظ سے، خصوصاً جسمانی لحاظ سے، مرد بڑھ جاتے ہیں اور عورتیں رہ جاتی ہیں۔ بہر حال ذہانت کے لحاظ سے جو فرق لڑکوں اور لڑکیوں میں نظر آتا ہے وہ کوئی تحقیقی فرق نہیں، بلکہ نشو و نما کی رفتار اور اس کی نوعیت کا فرق ہے۔

کیا ذہانت کا انسان کے کاروبار سے کچھ تعلق ہے؟ ضرور ہے۔ ہر پیشہ ایک خاص معیارِ ذہانت کو چاہتا ہے۔ جب ایک پیشہ ایک خاص معیارِ ذہانت کے افراد کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، تو وہ پیشہ خود اُسی معیارِ ذہانت کے قیام اور اس کے تسلسل کا موجب بن جاتا ہے۔ پہلے افراد ایک ماحول تیار کرتے ہیں اور پھر وہی ماحول افراد کو محفوظ کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ علمی پیشے والے دوسرے پیشے والوں سے عموماً زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ایک پروفیسر ایک فوٹوگرافر سے زیادہ ذہین ہوتا ہے۔ ایک فوٹوگرافر ایک قصاب سے زیادہ ذہین اور ایک قصاب ایک مزدور سے زیادہ، لیکن جہاں یہ صحیح ہے کہ ایک پیشے والے دوسرے پیشے والے سے نمایاں طور پر زیادہ یا کم ذہین ہوتے ہیں، وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ایک ہی پیشے کے افراد کا آپس میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، پس ہو سکتا ہے کہ بعض پروفیسر بعض فوٹوگرافروں سے کم ذہین ہوں، بعض فوٹوگرافر بعض قصابوں سے کم اور بعض قصاب بعض مزدوروں سے۔

ذہانت کے متعلق ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ ذہانت کا انسانی سیرت یا کیرکٹر سے کیا تعلق ہے؟ یہ تعلق کئی پہلوؤں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایک پہلو تو جرم کے لیے طبعی میلان ہے، جو بہت سے بچوں اور نوجوانوں میں پایا جاتا ہے۔ مجرمانہ میلان رکھنے والے بچے یا نوجوان زیادہ ذہین ہوتے ہیں یا کم؟ جواب ہے کہ کم۔ بعض لوگ اس پر حیران ہونگے اور کہینگے کہ جرائم بغیر اعلیٰ دماغی استعداد کے ناممکن ہیں، ہر جرم سوچ اور سمجھ چاہتا ہے اور جتنا پیچیدہ جرم ہو اس

کے لیے اُتنی ہی غور و فکر اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ واقعی جرائم کی بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ معمولی سمجھ اور عقل کا انسان حیران ہو جاتا ہے بعض چوروں اور ڈاکوؤں کو بعض اوقات بہت باریک باتیں سوجھ جاتی ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دراصل جرم کا ارتکاب انسانی میلانوں اور انسانی افکار میں ضبط اور نظم کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو بچہ یا بالغ جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے، اس کے دل میں ایک وقت میں تو نیکی بدی کا احساس ہوتا ہے لیکن دوسرے وقت مٹ جاتا ہے، ایک وقت، وہ بڑی نیکی کو بڑا اور چھوٹی کو چھوٹا سمجھتا ہے، لیکن دوسرے وقت ایسا نہیں سمجھتا یا وہ اپنے اعمال کے نتائج کو نہیں دیکھتا اور ان کی ماہیت کو نہیں پہچانتا۔ یہ نقص اس کے فہم کا عارضہ ہے اور ذہانت اور فہم میں قریب کا تعلق ہے۔ پس جرم کا ذہانت کی کمی کے ہمراہ پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، بلکہ اس کا ہمراہ نہ پایا جانا باعث تعجب ہوتا۔ بہر حال یہ ایک مشاہدے کی بات ہے کہ جو بچے یا نوجوان مختلف قسم کے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، ان میں سے اسّی فی صدی ذہانت کے اوسط معیار سے گرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں سے آٹھ فیصدی تو بالکل فاترالعقل ہوتے ہیں۔

ذہانت اور کیرکٹر کا تعلق ایک اور طرح بھی واضح کیا جاسکتا ہے: ذہین بچے شروع سے لیڈری کے مقام پر ہوتے ہیں، وہ جدت پسند ہوتے ہیں، دوسروں کی نسبت لسان ہوتے ہیں، زیادہ باتیں کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں سُست نہیں ہوتے، ایک کام سے دوسرے کام کی طرف لگنا پڑے تو فوراً جھک پڑتے ہیں اور اُن کے دماغ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ برخلاف اس کے کم ذہین بچوں میں ایک قسم کا کسل ہوتا ہے، جو انھیں ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہونے سے روکتا ہے۔

عام لوگ کسی بچے یا نوجوان کے سر کو بڑا دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ شاید ذہانت کی علامت

ہے، تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سر کی پیمائش کا ذہانت سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ چھوٹی عمر میں، جو بچے تندرست اور جسم میں موٹے تازے ہوتے ہیں، وہ عموماً زیادہ ذہین ہوتے ہیں، الا ماشاء اللہ جسمانی عوارض خصوصاً دماغی عارضے ذہانت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ذہانت کی پیمائش کے طریق اور اس کے دیگر کوائف مختصر طور پر درج کر دینے کے بعد یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذہانت ہی سب کچھ نہیں، بلکہ انسانی افراد کی کامیابی خصوصاً ان کی عملی کامیابی ذہانت کے علاوہ بعض اور خوبیوں پر بھی مبنی ہوتی ہے، جو سب انسانوں کو یکساں طور پر میسر نہیں ہوتیں۔ نپولین کے متعلق معلوم ہے کہ گو وہ ذہین تھا لیکن وہ بہت سے ایسے اہل قلم اور اہل فکر سے کم ذہین تھا جنھوں نے اس کے مقابلے میں کوئی بڑا نام حاصل نہیں کیا، انبیاء اور بانیانِ مذاہب بھی اگرچہ دانائی اور تدبیر کے پتلے ہوتے ہیں، لیکن بہت سے فلسفیوں کے مقابلے میں شاید کم ذہین ہوتے ہوں۔ پس انسانی برتری کا انحصار صرف ذہانت ہی پر نہیں، بلکہ بعض اور فطری خصائص پر بھی ہے، جن میں سے اہم ترین خصائص یہ ہیں کہ آیا جن کی استعدادوں کا ہم اندازہ کر رہے ہیں، ان میں ارادہ، استقلال، جرأت اور صبر ہے یا نہیں؛ وہ آج کا کام کل پر تو نہیں چھوڑتے؛ وہ اپنے فیصلوں میں جلدی کرتے ہیں یا نہیں؛ وہ عموماً باتوں کی تفصیل کی طرف نگاہ رکھتے ہیں یا ان کے اجمال کی طرف یا دونوں کی طرف؛ یہ باتیں ہر شخص کی افتادِ طبیعت سے تعلق رکھتی ہیں اور افتادِ طبیعت نفسیاتِ جدیدہ کا ایک اور نہایت ہی دلچسپ باب ہے۔

مٹھاس

از

خان بہادر سید مقبول شاہ صاحب بی اے، آئی ای ایس (ریٹائرڈ)

مٹھاس نہ صرف اور خوراکوں کو مزیدار بنانے کے واسطے استعمال ہوتی ہے، بلکہ یہ خود بھی ایک بڑی مقوی خوراک ہے۔ مٹھاس خواہ کسی قسم کی ہو، اس میں اتنی ہی طاقت ہوتی ہے جتنی کہ بے چربی کے گوشت میں۔ گو اس سے جسم کی ساخت اور مرمت میں کوئی مدد نہیں ملتی، لیکن اسے پروٹین پر یہ فضیلت ہے کہ یہ معمولی ضرورت سے کہیں زیادہ ہمارے جسم کے اندر ذخیرہ ہو سکتی ہے تاکہ خاص ضرورت کے وقت کام آئے، چنانچہ ذیابیطس کے مرض میں ہمارے جسم سے بیشتر یہی طاقت زائل ہوا کرتی ہے۔ مٹھاس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ کمزوری کی حالت میں یا جب ہاضمہ ٹھیک نہ ہو، تو اس سے آسانی سے غذا حاصل ہو جاتی ہے۔ مٹھاس خاص طور پر بچوں کے واسطے بہت مفید ہوتی ہے۔ خصوصاً سردی کے موسم میں جب بچے دوڑ بھاگ بہت کرتے ہوں۔ ہر قسم کا کاربن آب بھی ہضم ہو کر مٹھاس ہی کی شکل میں ہماری آنتوں میں جذب ہوتا ہے۔

مٹھاس کئی قسم کی ہوتی ہے۔ اوّل وہ مٹھاس جو گنے، چقندر اور میپل درخت کے رس سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تینوں ایک ہی قسم کی مٹھاسیں (Disaccharide) اور (Saccose) ہوتی ہیں اور ان میں غذا کا مادہ بھی برابر ہوتا ہے، لیکن چقندر کی کھانڈ ایسی صاف نہیں ہوتی جیسی گنے کی اور میپل کی مٹھاس میں اُڑنے والے تیل اور نباتی تیزاب بھی ہوتے ہیں، اس لیے اس کا ذائقہ زیادہ اچھا ہوتا ہے اور یہ مہنگی بھی بکتی ہے۔

ہمارے ملک میں سب سے زیادہ گنے کی مٹھاس استعمال ہوتی ہے اور باقی دنیا میں بھی عام طور پر اسی کا رواج ہے اِس قسم کی مٹھاس پر ہمارے منہ کے لعاب کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور معدے سے بھی گزر کر جب یہ چھوٹی آنت میں پہنچتی ہے، تو اُس وقت اُس آنت کے رسوں سے ہضم ہوتی ہے اور اگر یہاں تک پہنچنے میں دیر لگ جائے تو اُس میں تخمیر پیدا ہو جاتی ہے۔ سفید کھانڈ اور قند کارخانوں میں بہت سے کیمیائی عملوں سے صاف کر کے بنتا ہے اور اِس میں خالص کاربن آب ہوتا ہے۔ کسی قسم کے اور اجزا نہیں ہوتے نہ غذائی روحیں نہ نمکیات۔ گنے سے کھانڈ بنانے میں کئی قسم کے (Treacle, Molasses, Golden Syrup.) بھی نکالے جاتے ہیں۔ جن سے کئی قسم کے کام نکلتے ہیں۔ یہ پتلے اور لیس دار ہوتے ہیں اور چونکہ ان میں ایک تہائی کے قریب پانی ہوتا ہے۔ اِس لیے اِن میں غذا کا مادہ کھانڈ سے بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن ذائقہ اچھا ہوتا ہے۔ گڑ اور شکر بھی اِسی طرح بناتے ہیں۔ اِن سب میں اور اجزا بھی کم و بیش پائے جاتے ہیں جو سفید کھانڈ میں نہیں ہوتے۔

دوم۔ مالٹ کی مٹھاس (Maltose) یہ مٹھاس اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اناج جمتے ہیں یعنی ان کے اندر سے پودے پھوٹ نکلتے ہیں اُس وقت اناج کے دانے کا نشاستہ ایک خاص خمیر (Diastase) کے سبب سے خود بخود بدل کر مٹھاس بن جاتا ہے۔ گویا خود بخود اُس پر ہاضمے کا عمل ہو جاتا ہے۔ تازے جمے ہوئے اناج کو جب ۱۴۰ درجے فارن ہائیٹ کی حرارت سے بھنتے ہوئے نشاستے کے ساتھ ملایا جائے جس میں ۵۰ درجے کی حرارت والا پانی ملایا گیا ہو اور پھر اُس کو تیز آنچ سے ہٹا کر ہلاتے رہیں، تو چند گھنٹوں میں نشاستہ بدل کر مٹھاس بن جاتی ہے۔ چونکہ یہ مٹھاس پہلے ہی سے نیم ہضم ہو چکتی ہے، اِس لیے یہ غذا کے طور پر بہت مفید ہوتی ہے۔ اِس سے اچھے اچھے شربت اور عرق

بنتے ہیں۔

انگوری مٹھاس (Dextrose) جو انگوروں، پھلوں اور شہد میں پائی جاتی ہے، خاص کر خشک کشمکش اور سوگی میں۔ یہ مٹھاس کمزوری کی حالت میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہے، کیونکہ یہ ہاضمے کے عمل کے بغیر ہی ہماری آنتوں میں جلدی جذب ہو جاتی ہے تمام کاربن آب خوراکیں بھی ہمارے پیٹ میں ہضم ہو کر اسی حالت میں آجاتی ہیں اور پھر آنتوں میں جذب ہوتی ہیں۔ ذیابیطس میں جو مٹھاس ہمارے پیشاب میں نکلتی ہے وہ بھی یہی ہوتی ہے۔ صاف کی ہوئی انگوری مٹھاس (Purified Dextrose) انگریزی دکانوں میں بکتی ہے۔ یہ سفید میدے کی طرح ہوتی ہے اور اس میں مٹھاس بھی بہت ہوتی ہے لیکن گنے کی مٹھاس کے برابر نہیں۔ انگوری مٹھاس خاص طور پر اُس وقت زیادہ کام آتی ہے جب کوئی بڑی مشقت کرنی ہو، مثلاً: جب کوئی دوڑ دوڑنی ہو یا کشتی لڑنی ہو اور ایسے مریضوں کے واسطے جو بہت کمزوری کی حالت میں ہوں۔

پھلوں کی مٹھاس (Levulose) بہت سے پھلوں میں پائی جاتی ہے اور انگوری مٹھاس سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

دودھ کی مٹھاس (Lactose) یہ مٹھاس دودھ میں کوئی بیسواں حصہ ہوتی ہے اور طاقت میں گنے کی مٹھاس کے برابر ہوتی ہے، لیکن ویسی میٹھی نہیں ہوتی۔ اس سے بعض جراثیم کی مدد سے دودھ کا تیزاب (Lactic Acids) بنتا ہے۔ جو کسی قدر ملین اثر رکھتا ہے یہ بھی انگوری مٹھاس اور مالٹ کی مٹھاس کی طرح ایک قدرتی اور بہت مفید مٹھاس ہوتی ہے۔ یہ مٹھاس بعض آنتوں کی بیماریوں میں خاص طور پر بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔

گلوکوس (Glucose) یہ بھی ایک قدرتی مٹھاس ہوتی ہے۔ جو پودوں اور پھلوں سے

حاصل ہوتی ہے۔

شہد (Honey) یہ بھی ایک قدرتی مٹھاس ہے جس میں پھلوں کی مٹھاس اور انگوری مٹھاس مل کر کوئی ۰۷ فیصدی ہوتی ہے اور پھلوں والی مٹھاس انگوری مٹھاس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں تھوڑا سا پانی بھی ہوتا ہے اور تھوڑی سی اور قسم کی مٹھاس بھی ہوتی ہے اس کا ذائقہ اور خوشبو پھولوں کے اُڑنے والے تیلوں کے سبب سے ہوتی ہے۔ اس میں کچھ غذائی روحیں بھی ہوتی ہیں۔ (ل و ب) اور لوہے اور چونے کے نمکیات بھی اس میں تھوڑی سی لیسیتھن بھی ہوتی ہے اور اس میں فارمک ایسڈ (Formic Acid) بھی ہوتا ہے، جس سے جراثیم تلف ہو جاتے ہیں جو لوگ گوشت نہ کھاتے ہوں اُن کے لیے اس کا استعمال خاص طور پر مفید ہوتا ہے۔ اس سے آنتوں پر بھی اچھا اثر ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سفید کھانڈ کی طرح خمیر نہیں ہوتا۔ سانس کی نالی میں کچھ ورم ہو جائے تو اُس میں بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ سب عضلات کے لیے اور سب سے زیادہ دل کے لیے بڑی مفید خوراک ہے۔ اس لیے جن کا دل کمزور ہو یا جب بیماری میں دل گھٹنے لگے تو اُس وقت شہد بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔ $\frac{11}{8}$ ، $\frac{8}{144}$

بازاری شہد میں دھوکا بہت ہوتا ہے، اس لیے بہت احتیاط سے خریدنا چاہیے مصنوعی شہد عموماً گنّے کی مٹھاس کو پانی میں اُبال کر اور اُس میں تھوڑا سا شہد ملا کر بناتے ہیں۔

ایک اور قسم کی بھی مٹھاس ہوتی ہے جس کو حیوانی نشاستہ (Glycogen) کہتے ہیں یہ مٹھاس کی وہ شکل ہے جس صورت میں ہمارے کلیجے وغیرہ میں مٹھاس کا ذخیرہ رہتا ہے۔

سیکرین (Saccharine): یہ ایک بڑی تیز مٹھاس ہے۔ جو کول تار سے حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ بہت موٹے ہوں یا جن کو ذیابیطس کی بیماری ہو، اُن کو دی جاتی ہے لیکن

اس میں غذا کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔

جام (Jam) جس کا اب ہمارے ملک میں بہت رواج ہوتا جاتا ہے۔ گنے کی مٹھاس کو کسی قسم کے پھلوں کے ساتھ ملا کر ابالنے سے بنتا ہے اور اگر ٹھیک طور پر بنایا جائے تو ہضم بھی جلدی ہو جاتا ہے اور جلدی بگڑتا بھی نہیں، لیکن اس میں غذا کا مادہ مکھن سے صرف ایک تہائی ہوتا ہے اور پرانے جام میں سے پھلوں کی غذائی روحیں بھی زائل ہو جاتی ہیں۔ نیز پھلوں کے تیزاب اور مٹھاس کے ملنے سے جام کا اثر دانتوں پر بھی اچھا نہیں ہوتا۔

مٹھاس اگر اعتدال سے کھائی جائے، تو بڑی مقوی غذا ہے اور بہترین قسم کا کاربن آب ہے خصوصاً ایسے بچوں کے لیے، جو خوب دوڑتے پھرتے رہتے ہوں۔ اس میں کاربن آب سب خوراکوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسکی مدد سے مکھن، گھی، چربی اور دیگر روغنیات ہمارے اندر جل کر یعنی، آکسیجن کے ساتھ مل کر کارآمد ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے تمام عضلات پرورش پاتے ہیں، خصوصاً ہمارا دل جو ان میں سب سے ضروری عضو ہے اور جو برخلاف اور تمام عضووں کے مرتے دم تک دن رات آٹھوں پہر ہر وقت کام کرتا رہتا ہے، اس کی پرورش کے لیے مٹھاس سب سے اچھی خوراک ہے، لیکن آج کل مٹھاس اتنی عام ہو گئی ہے اور اس سے ایسی عمدہ عمدہ اور دل للچانے والی چیزیں بنتی ہیں کہ انسان خواہ مخواہ وقت بے وقت ضرورت سے بہت زیادہ کھا جاتا ہے۔ طرح طرح کی بڑی بڑی مزیدار مٹھائیاں۔ طرح طرح کے حلوے۔ طرح طرح کے کیک، بسکٹ، پیسٹریاں، مربے، جام، مارملیڈ، کمپٹ وغیرہ، چائے، کافی، شربت ان سب میں مٹھاس استعمال ہوتی ہے اور یہ چیزیں عموماً معمولی خوراک کے علاوہ استعمال ہوتی ہیں اور عام طور پر بہت کھائی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خوراک کے مختلف حصوں کی باہمی ضروری نسبت ٹھیک نہیں رہتی، خصوصاً جب کہ ہماری عام خوراک میں بھی میدے سے

کی روٹی اور سفید چمکتے ہوئے چاول زیادہ ہوں۔ اس طرح انسان بہت موٹا ہو جاتا ہے اور خون کی ترکیب بھی ٹھیک نہیں رہتی، کھار گھٹ جاتی ہے اور مختلف بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں میٹھا بہت زیادہ مقدار میں کھانے سے جسم کے اندر خمیر اور تیزاب پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے بہاں لبلبے کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور آخر کار اُس سے انسولین (Insulin) نکلنی بند ہو جاتی ہے، جس کے بغیر کوئی کاربن آب ہمارے اندر کارآمد نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ذیابیطس کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو مٹھاس آج کل ہر جگہ عام طور پر استعمال ہوتی ہے، وہ سفید کھانڈ یا قند ہے، جو ایک مصنوعی مٹھاس ہے، قدرتی نہیں اور جو مختلف کیمیائی عملوں کے بعد تیار ہوتی ہے اور جس میں سوائے خالص کاربن آب کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، یعنی نمکیات، غذائی روحیں وغیرہ سب خارج ہو چکی ہیں، اس لیے ایسی مٹھاس کا زیادہ استعمال صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور اگر اچھی طرح حل نہ ہوئی ہو تو اس سے معدے اور آنتوں کے اندر کے نہایت ملائم اور نازک استر کو بھی خراش پہنچتی ہے، لیکن اس قسم کی مٹھاس کا استعمال اب دنیا میں سب جگہ بہت بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں جہاں کہ اٹھارھویں صدی کے اخیر میں اوسطاً فی کس دو پونڈ سالانہ سے زیادہ مٹھاس خرچ نہیں ہوتی تھی اب ۹۰ پاؤنڈ سالانہ خرچ ہوتی ہے اور امریکہ میں ۱۲۰ پونڈ سالانہ۔ اسی طرح ہمارے ملک میں بھی اس کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ خصوصاً بچے ہر وقت کوئی نہ کوئی میٹھی چیز کھاتے ہی رہتے ہیں اور اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا کہ دو کھانوں کے درمیان کچھ نہ کھایا جائے۔ اس سے دانتوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے، کیونکہ دانتوں کے درمیان خوراک کے ذروں کے رہ جانے سے جو جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اُن کی مٹھاس سے خوب پرورش ہوتی ہے۔ دودھ کے ساتھ بھی زیادہ مٹھاس استعمال کرنے سے نقصان ہوتا ہے

کیونکہ اِس سے معدے کے نازک استر میں خراش پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کے بچاؤ کے لیے اُس میں سے بہت سا بلغمی لعاب نکلتا ہے اور یہ معدے کے ہاضمے کے رس کے ساتھ مل کر اُس کو کمزور کر دیتا ہے۔ اِس طرح سے دودھ کی پروٹین اور اور خوراکوں کو معدے کا رس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا اور جتنی ہاضمے میں دیر ہو جائے، اُتنا ہی زیادہ خمیر پیدا ہو جاتا ہے اور خمیر میں معدے کو نقصان پہنچتا ہے۔ سفید کھانڈ استعمال کرنے میں یہ بھی احتیاط رکھنی چاہیے کہ کھانے کے بعد کھائی جائے اور خالی معدے میں نہ کھائی جائے اور اچھی طرح حل کر کے کھائی جائے تاکہ پیٹ اور آنتوں کے استر میں خراش نہ پیدا کرے۔ مٹھاس بہت زیادہ کھانے سے ناک وغیرہ اور سانس کی نالی میں جو اندر کا نازک استر ہوتا ہے اُس کو بھی کچھ نہ کچھ نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ جو بچے بہت زیادہ مٹھاس کھاتے ہیں، اُن کو زکام، نزلہ، کھانسی، کان میں درد، آنکھ میں درد وغیرہ کی تکلیفیں بھی زیادہ رہتی ہیں۔

سب سے اچھی مٹھاس اچھے پکے ہوئے پھلوں کی ہے، کیونکہ یہ بالکل قدرتی چیز ہے اور دھوپ کے اثر سے ایسی اچھی طرح پک جاتی ہے کہ بغیر ہاضمے کے عمل کے ہمارے خون میں جذب ہو جاتی ہے، اِس لیے جو لوگ کافی پھل کھاتے ہوں اُن کو علیحدہ مٹھاس کھانے کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ سفید کھانڈ کھانے سے گڑ بہتر ہے، کیونکہ اِس سے گنے کے اور اجزا بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور دانتوں اور مسوڑوں کی بھی ورزش ہو جاتی ہے۔

استدعا

عملۂ ادارت آپ کی خدمت میں گزارش کرتا ہے کہ آپ اپنی تعلیمی اور تدریسی اور نیز ان سے متعلق سماجی دقتوں سے اسے آگاہ فرمائیں۔ ہمارے دیہاتی اور شہری مدارس میں اکثر مسائل مدرس صاحبان کے پیشِ نظر ہوتے ہیں اور اکثر ان مسائل کا تسلی بخش انتظام ممکن نہیں ہوتا، اِس لیے اگر ان دقتوں سے عملۂ ادارت کو مطلع کیا جائے، تو ممکن ہے کہ وہ ان موضوعات پر مضامین آپ کی خدمت میں پیش کر سکے۔

ہم مدرسین اور تعلیم سے وابستہ افراد کے لیے صرف اپنے اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کافی نہیں۔ درس و تدریس کر چکنے کے بعد ہمارا کام تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ مدرسے سے گھر آ جانے پر ہماری ذمّے داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ ہم لوگ بذاتِ خود ایک تعلیم گاہ ہیں اور تدریسی مشاغل کے علاوہ سماجی ضروریات بھی ہماری توجہ اور کوششوں کی محتاج ہیں۔ ہمارا واسطہ صرف طلبہ ہی سے نہیں، بلکہ ان کی صحیح تعلیم کی خاطر طلبہ کے والدین، ان کی طرزِ زندگی، ان کی شخصی ضروریات اور تکالیف غرضکہ ان کے پورے ماحول سے گہرا تعلق ہے۔

اس ضمن میں عملۂ ادارت حتی المقدور مدد کے لیے تیار ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے تعلیمی اور سماجی خیالات سے اسے آگاہ فرمائیں۔

ے کلاس بک آف میژرنگ ڈرائنگ

مصنفہ

نورالدین-نور

فرسٹ ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول لاہور- سابق لیکچرار ان ڈرائنگ ٹرل ٹریننگ کالج پرسنل اسسٹنٹ ٹو دی انسپکٹر آف ڈرائنگ اینڈ ایجوکیشنل ہینڈ ورک ب مصنف اے ہینڈ بک آف ماڈل ڈرائنگ و مؤلف "لمعات نور" وغیرہ وغیرہ +

یہ کتاب سکیل ڈرائنگ پر اپنی قسم کی پہلی اور واحد کتاب لکھی گئی ہے- جس نے مل مصنف کی سابقہ شہرت کو چار چاند لگا دئیے ہیں- اس کا طرز بیان نہایت شس عام فہم- سلیس اردو زبان میں ہے +

کتاب چار ابواب میں منقسم ہے

ب اوّل- میں سامان نقشہ کشی یعنی اوزار متعلقہ میژرنگ ڈرائنگ کی اقسام اشکال اور استعمال سے کما حقہ واقفیت کرائی گئی ہے +

ب دوم- میں پلین- ایلیویشن اور سائڈ کا تصور- ضرورت سیکشن و اقسام سکیچنگ پر بحث کی گئی ہے +

اب سوم- میں اصطلاحات متعلقہ حوالجات (References.) اور ضرورت ڈیٹیل پر روشنی ڈالی گئی ہے +

باب چہارم- میں انگریزی حروف (Prints) کی بناوٹ قسمیں اور بصورت

مونوگرام (Monogram) ان کی ملاوٹ پر خیالات ظاہر کئے گئے ہیں:-

پلیٹ - (PLate) کی تقسیم و ترتیب طریقۂ تعلیم کے اصُولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آسان سے مشکل۔ معلوم سے نامعلوم و مناسب ہدایات کے ساتھ دی گئی ہے۔ جس سے مصنّف کی اعلےٰ قابلیت اور مکمل تجربہ کا ثبوُت ملتا ہے۔ امتحانی پرچے کا سٹینڈرڈ (Standered) معلوُم کرنے کے لئے گذشتہ سال کے پرچے معہ حل بھی کتاب کے اخیر میں دئے گئے ہیں۔

واقفیت عامہ کے لئے اقسامِ ڈرائنگ کی تشریح کرتے ہوئے - سیکشن پِکٹ آئی سو میٹرک پروجیکشن۔ مشین ڈرائنگ۔ ڈیٹیل پرنٹ اور مونوگرام (Monogram) وغیرہ کا ذکر آ گیا ہے۔ جن کا انٹرنس کے کورس سے کوئی تعلق نہیں - اس لئے چند پلیٹ بطور نمونہ ان کے بھی کتاب ہذا میں رکھ دئے گئے ہیں۔ تاکہ نام و اقسام کیساتھ شکل وصُورت سے بھی واقفیت ہو جائے۔ سچ پوچھئے تو فاضل مصنّف نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ جس کو ماہرین فنون لطیفہ نے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جیسا کہ اُن کی آرا و افکار سے جو سلسلے وار رسالہ پنجاب ایجوکیشنل جنرل میں نکل رہے ہیں - ظاہر ہے۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت صرف ایک (عہ) روپیہ ہے۔

مفید اللغات اردو

یہ کتاب محکمۂ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ مدارس اور دیگر مکاتب کی ضروریات اور عام طلبہ و شائقین کی سہولیت کے لئے نہایت کوشش محنت اور عرقریزی سے تیار کرائی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہزاروں الفاظ عربی۔ فارسی۔ پنجابی۔ ہندی۔ ترکی۔ انگریزی وغیرہ زبانوں کے جلی قلم سے مع اُن کے اعرابوں کے نہایت صحت اور صفائی سے دئے گئے ہیں۔ اور ہر لفظ کے مقابلے میں اسکے معنی نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے۔ اور کپڑے کی خوبصورت سنہری جلد سے مزین ہے۔ قیمت مجلد (عا)

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز۔ لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۳)	اپریل ۱۹۳۷ء	نمبر (۱)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

ہمارے مدرسین کی زندگی اکثر بیحد ہی کم رنگ اور بے کیف ہوتی ہے۔ بالعموم ایک مدرس صبح اٹھتا ہے اور معمولات کی تکمیل کے بعد مدرسے پہنچ جاتا ہے۔ اب دس بجے سے چار بجے تک وہ مدرسے میں ہے۔ آج اتنے گھنٹے پڑھانا ہے۔ یہ مضامین پڑھانا ہیں۔ روزمرہ کی کارروائی یعنی کاپیاں دیکھنا اور دفتر سے متعلق فرائض انجام دینا ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ چار بجے تک ہے۔ چار بجے چھٹی کی گھنٹی بجی اور مزدور نے اپنا کام ختم کیا۔ گھر کی راہ لی۔ کم و بیش ہر مدرس دن کے کام کو صرف دن بھر کی محنت سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ جب صورتِ حالات یہ ہو تو کیا تعجب کا مقام ہے کہ طلبہ بھی چھٹی کی گھنٹی کو پیغامِ مسرت سمجھتے ہیں اور مدرسے سے آزاد ہونے پر وہی خوشی مناتے ہیں جو زندانی زنداں سے رہا ہو کر۔ اس سے مدعا یہ نہیں کہ ہمارے مدرسین فرض شناس نہیں یا وہ کام سے جی چراتے ہیں نہیں ہمارے مدرسین تو حقیقتاً مجاہد ہیں۔ قلیل مشاہرہ پر قانع ہیں۔ انتہا درجے کے فرض شناس ہیں محنت اور کام میں اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں۔ پھر آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ مقاصدِ تعلیم کی تکمیل میں اس درجہ کامیاب نہیں جتنا انھیں ہونا چاہیے۔

اس موضوع پر دو زاویہ نگاہ سے غور کیا جا سکتا ہے۔ اوّل۔ مدرس اور طلبہ کے تدریسی تعلقات دویم۔ مدرس اور طلبہ کے تدریسی تعلق سے قطع نظر تعلقات۔

ایک مدرس جب جماعت میں جاتا ہے تو وہ اکثر اور بیشتر اس امر سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس کے سبق کا کچھ حصہ جماعت کے چند طلبہ کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہر جماعت میں کچھ لڑکے بہت ہوشیار ہوتے ہیں اور کچھ بہت کمزور۔ اُستاد کا واسطہ بیشتر نہ بہت کمزوروں سے ہوتا ہے نہ بہت ہوشیا

ہے۔ وہ تو اپنی تمام تدریس کو متوسط درجے کے طلبہ پر منحصر کر دیتا ہے۔ ہوشیار لڑکے کبھی کبھی اپنے زعم علم کے اعلان کے لیے بول پڑتے ہیں یا مشکل سوالات کا جواب لینے کے لیے مدرس ان سے مخاطب ہوتا ہے۔ کمزور لڑکے بیچارے خائف بیٹھے رہتے ہیں تاکہ مدرس کی نگاہ کی زد سے بچے رہیں۔ ان کا اور استاد کا تعلق اکثر و بیشتر فہمائش اور زدوکوب کا ہوتا ہے ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کم و بیش پندرہ سوا لڑکے مدرس کے علم اور کام سے متمتع نہیں ہوتے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ انفرادی تدریس اب ممکن نہیں۔ سو پچاس سال پہلے تو البتہ استاد ہر متعلم فرداً فرداً سنتا تھا اور پڑھاتا تھا لیکن اس دور میں تو ہر کام مشین کے اصول پر ہوتا ہے اور جب یہی اصول مدارس میں بھی رائج ہو تو ظاہر ہے کہ اس مشکل کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکتا البتہ مندرجہ ذیل لائحہ عمل ایک بہت بڑی حد تک اس غیر اختیاری گناہ کا کفارہ ہو سکتا ہے۔

مدرس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ سے شخصی علاقہ اور واسطہ پیدا کرے۔ طالب علم کے گھر کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائے۔ اس کے سرپرست سے راہ و رسم پیدا کرے۔ اس کے طور و طریق۔ مزاج۔ چال چلن اور دماغی صلاحیتوں سے آگاہ ہو جائے۔ یہ کام مشکل ہے لیکن اس کا انعام بڑا ہے۔ مدرس کو طلبہ پر ایک جذباتی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے ماتحت ہر طالب علم بلا تکلف اپنی دقتوں اور مشکلات کو اس کے سامنے پیش کر دیتا ہے اس طرح یہ ممکن ہے کہ جماعت میں سبق دیتے ہوئے استاد کو معلوم ہو جائے کہ فلاں طالب علم کی مشکلات اس قسم کی ہوتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ چند کمزور طلبہ کی مشکلات ایک ساتھ ہی حل ہو جائیں۔ مدرس کا مقصد صرف اسباق کی تدریس نہیں۔ وہ صرف کتاب پڑھانے پر مامور نہیں۔ مدرس طلبہ کی تدریس کرتا ہے اس کا واسطہ افراد سے ہے نہ کہ صرف اسباق سے اور ہر چند کہ وہ چالیس لڑکوں کی جماعت میں فرداً فرداً ہر ایک طالب علم کو توجہ نہیں دے سکتا لیکن اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ کس طالب علم کو کیا درکار ہے۔

حیاتیات پر لکچر

از

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی، ایم-اے

لڑکوں اور لڑکیوں کو گذشتہ دو لکچر دینے کے بعد یہ سوچا گیا کہ اُن پر اِن لکچروں کی اہمیت س وقت تک واضح نہ ہوگی جب تک اُنھیں انسانی جسم کے متعلق حیاتی Bioloyical لکچر نہ دیے جائیں۔ چنانچہ لڑکوں اور لڑکیوں کو دو لکچر دیے گئے، جن کا آغاز تو ایک ہی تھا لیکن نجام ضرورت کے مطابق مختلف۔ ذیل میں وہ لکچر درج کیا جاتا ہے، جو لڑکوں کو دیا گیا۔

لکچر[1]

مجھے شبہ ہے کہ تم میں سے بہت سے لڑکوں کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ ہم کس وقت سب سے زیادہ رفتار سے بڑھتے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ہم تیرہ سال سے اُنیس سال کی عمر تک بہت بڑھتے ہیں لیکن یہ وہ وقت نہیں جبکہ ہم سب سے زیادہ رفتار سے بڑھتے ہیں۔ آؤ ہم تمھیں بتائیں ہم سب سے زیادہ رفتار سے، پیدا ہونے سے پہلے بڑھتے ہیں، کیونکہ اُس وقت ہمارا جسم چند ماہ میں کئی ہزار گنا بڑھ جاتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ اگر آج ہمارا جسم صرف دس گنا بڑھ جائے تو ہمیں اسکول کی چھت نئی بنانا پڑے۔ کیوں ایسا ہوگا یا نہیں؟ تم شاید حیران ہو رہے ہوگے کہ اِس قدر تیزی سے اِس قدر بڑھ جانا کیوں کر ممکن ہے۔ بات یہ ہے کہ جب ہم نے بڑھنا شروع کیا تھا اُس وقت ہم بہت ہی چھوٹے تھے اور یہ سب کچھ کیسے ہُوا اس کے متعلق ہم تمھیں آج بتائیں گے۔

[1] لکچر کی وضاحت کے لیے موزوں تصویریں استعمال کی گئیں اور تختۂ سیاہ پر شکلیں بنائی گئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا جسم ہزاروں کوٹھڑیوں (خلیے ـ Cells) کا بنا ہوا ہے۔ یہ کوٹھڑیاں پولیس کی کوٹھڑیوں کی طرح نہیں۔ بلکہ نہایت ہی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ صرف میرے دماغ میں ایک سو بیس کروڑ (۱۲۰۰۰۰۰۰۰۰) کوٹھڑیاں ہیں۔ اِس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ سارے جسم میں کس قدر کوٹھڑیاں ہونگی۔ اب اِن کوٹھڑیوں کا کچھ حال معلوم کرنا چاہئے لیکن میں اپنے جسم کی کوٹھڑیوں پر پہلے بحث نہیں کرونگا، کیونکہ ہمارے جسم کی مشین بہت ہی پیچیدہ ہے۔ اِس لیے پہلے نہایت ہی سادہ جانداروں کی زندگی پر غور کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی گاؤں میں جائیں اور کسی ندی سے تھوڑا سا پانی لے کر خردبین کے نیچے رکھ کر اُس کا معائنہ کریں تو بالعموم ہمیں اس پانی میں ایک نہایت ہی چھوٹی جاندار چیز نظر آئیگی جسے اُمیبا (Amoeba) کہتے ہیں یہ ایک داغ کی طرح نظر آتا ہے اور صرف ایک کوٹھڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جاندار چیزوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھا سکتا ہے۔ چونکہ اس کا منہ نہیں ہوتا، اِس لیے یہ اِن ٹکڑوں کو اپنے جسم میں جذب کر لیتا ہے ویسے ان کو کھا نہیں سکتا۔ اِس کا کوئی گلا، پھیپھڑے، معدہ، آنکھیں، ناک، کان یا دماغ نہیں ہوتا لیکن اِس کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے لیکن اپنی عمر پوری کر کے یہ مر جاتا ہے یا بعض دفعہ اِسے کوئی مچھلی کھا لیتی ہے۔ اِن حالات میں یہ ممکن تھا کہ ایک دن ندی میں کوئی بھی امیبا نہ رہتا لیکن ایسا نہیں ہوتا یہ امیبا بھی اپنی نسل بڑھاتا رہتا ہے۔

اِس ایک کوٹھڑی کے امیبا کے مرکز میں ایک چھوٹا سا دھبہ ہوتا ہے، جسے مرکز (Nucleus) کہتے ہیں۔ اِس میں کوٹھڑی کی جان ہوتی ہے اگر اسے کوٹھڑی سے نکال دیا جائے تو باقی امیبا مر جاتا ہے۔ اگر ہمیں وہ تمام تبدیلیاں نظر آئیں جو مرکز میں پیدا ہوتی ہیں تو ہم دیکھینگے کہ یہ مرکز رفتہ رفتہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک حصہ کوٹھڑی کے ایک سرے پر چلا جاتا ہے اور دوسرا حصہ دوسرے سرے پر۔ پھر ساری کوٹھڑی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے پھر

۵

یہ حصّے ٹوٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور ہر ایک حصّے میں ایک مرکز ہوتا ہے۔ اِس طرح ایک امیبا کے دو امیبا بن جاتے ہیں۔ آبادی کو بڑھانے کا یہ سب سے سادہ طریقہ ہے۔

دیگر جانداروں کی زندگی کا حال اِس قدر سادہ نہیں۔ مثلاً جب تم بڑے ہو کر مرد بن جاؤ اور یہ چاہو کہ تم اپنا بیٹا پیدا کرو تو تم کلہاڑے سے اپنا ایک حصہ علٰحدہ کر کے اُس کا بیٹا نہیں بنا سکتے۔ اِسی طرح پودے کئی ہزار کوٹھڑیوں سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کی زندگی کے متعلق تمھیں بہت کچھ معلوم ہوگا۔ آؤ ہم گندم کے بیج پر غور کریں۔ تم جانتے ہو کہ جب اِسے زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین سے غذا حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے اُس کی جڑیں نکلتی ہیں اور ہوا اور دھوپ کے لیے اُس کی کونپلیں زمین سے باہر نکلتی ہیں۔ لیکن تمھیں معلوم ہے، جب بیج اُگنے لگتا ہے تو اُس کے اندر کیا تبدیلی ہوتی ہے؟ سنو ہم تمھیں بتاتے ہیں۔ اگر ہم گندم کے بیج کو کاٹ کر دیکھیں تو اُس کے دو حصّے نظر آئیں گے۔ اِن میں سے ایک حصّے سے پودے کا بچہ بنتا ہے۔ یہی حصہ زندہ رہنے اور غذا حاصل کرنے کے لیے جڑیں اور کونپلیں اُگاتا ہے لیکن جڑیں اُگانے سے پہلے بھی اِسے غذاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ غذا بیج کے دوسرے حصّے میں محفوظ ہوتی ہے۔ جب یہ کھیت میں ڈالا جاتا ہے، تو بیج میں کھیت کی نمی مل کر غذا والے حصّے یعنی، نشاستے (Starch) کو شکر (Sugar) میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ شکر اُس حصّے کو پالتی ہے جو پودا بننے والا ہوتا ہے اور اُسے جڑیں اُگانے میں مدد دیتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد بیج والی خوراک ختم ہو جاتی ہے لیکن اِس دوران میں جڑیں اِس قدر بڑی ہو جاتی ہیں کہ وہ زمین سے غذا حاصل کر سکتی ہیں۔

مچھلیوں کا اپنی نسل بڑھانے کا طریقہ اِس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ مچھلیاں، پرندے اور جانور کئی طرح سے مردوں اور عورتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً وہ آپس میں محبت کرتے ہیں۔ شاید تمھیں گمان بھی نہ ہوگا کہ مکڑی بھی محبت کرتی ہے۔ اب اگر تمھیں گھر میں

یں مکڑی کا جالا نظر آئے، تو غور سے اُس کا مشاہدہ کرنا موسم بہار میں پرندوں کے گانے دراصل بت کی راگنیاں ہوتی ہیں۔ جانور بھی آپس میں محبت کرتے ہیں۔ اِسی طرح مچھلیاں بھی۔ مرد مچھلی ریا میں کائی کو بُن کر اپنے رہنے کے لیے مکان بناتی ہے۔ دریا کی روانی سے اِس مکان کے ٹوٹ انے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اِس لیے یہ مکان کافی مضبوط بُنا جاتا ہے۔ مرد مچھلی کے جسم میں ایک گلٹی تی ہے (گلٹیوں کے متعلق تمھیں پہلے بہت کچھ بتایا جا چکا ہے) جو ایک لیسدار لعاب بناتی ہے یہ کائی کے اوپر لگا دیا جاتا ہے اور کائی نہایت مضبوطی سے جُڑ جاتی ہے۔ اِس طرح مکان مکمل ہو جاتا ہے۔ شاید کبھی کبھی کرائے پر بھی لے لیا جاتا ہو۔ اِس کے بعد عورت مچھلی اِس مکان یا گھونسلے یں آ جاتی ہے جہاں وہ انڈے دیتی ہے جن سے بچے نکلنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن انڈے دینے کے عد وہ اُنھیں مرد مچھلی کی نگرانی میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مرد مچھلی گھونسلے میں بیٹھ جاتی ہے اور پانی ہلانے ے لیے اپنی دم ہلاتی رہتی ہے۔ پانی کے ہلنے سے انڈوں کو آکسیجن ملتی رہتی ہے جو انڈوں سے بچے نکالنے کے لیے ضروری چیز ہے۔

انڈوں سے بچے نکلتے ہی دُنیا دیکھنے کے لیے گھونسلے سے باہر آنے کی کوشش کرتے ہیں بعض شریر بچے گھونسلے کے سوراخوں سے باہر بھی نکل جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے باپ کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اُنھیں واپس لانے کے لیے اُن کے پیچھے دوڑتا ہے لیکن جس طرح ہم بچے کو اُس کا بازو پکڑ کر گھر لے آتے ہیں۔ اس طرح وہ اُنھیں گھر نہیں لا سکتا۔ وہ ایسی حرکت کرتا ہے کہ اگر ہم اُسے دیکھ سکیں تو ہم حیران رہ جائیں۔ وہ تیر کر بچوں کے نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر بہت سا پانی مُنہ میں بھر لیتا ہے۔ اِس پانی کے ساتھ بچے اُس کے مُنہ میں چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ یہ تمام پانی لا کر گھونسلے میں خالی کر دیتا ہے اور بچے مُنہ سے باہر نکال دیتا ہے۔ یہ بچے باپ کے دھیان کسی اور طرف ہونے تک وہیں رہتے ہیں اور پھر باہر نکل جاتے ہیں، پھر ایک دن ایسا آ جاتا ہے۔

جب وہ باپ کے مُنہ سے بہت بڑے ہو جاتے ہیں اور سب گھونسلے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اُس وقت باپ اُن سے مایوس ہو جاتا ہے اور اپنی دُم کو زور سے گھونسلے پر مارتا ہے اور مکان کو توڑ دیتا ہے۔

آؤ ذرا مچھلی کے انڈے پر غور کریں۔ خوردبین کے نیچے دیکھنے سے نظر آئیگا کہ ہر ایک انڈے کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے کا بچہ بنتا ہے اور دُوسرا حصہ اُس کے لیے اُس وقت تک خوراک کا کام دیتا ہے۔ جب تک وہ خُود اپنی خوراک حاصل کرنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ جب انڈے کی خوراک ختم ہو جاتی ہے اُس وقت بچہ مکمل مچھلی بن جاتا ہے اور اُس کے بدن کے تمام اعضا بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے بغیر مچھلی اپنا شکار نہیں کر سکتی۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ پودے اور مچھلیاں تقریباً ایک ہی طرح پیدا ہوتی ہیں۔ وہ بیج یا انڈے سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ تُم بیج کو بھی انڈا کہہ سکتے ہو، لیکن کسی گندم فروش سے گندم لینے کے لیے اُس سے گندم کے انڈے مانگنا کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ بہر حال اُنھیں کچھ بھی پکارا جائے، لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اُن کے دو حصے ہوتے ہیں۔

ایک کسی اور جاندار کی زندگی پر غور کریں۔ شاید تم میں سے کچھ لڑکوں نے مرغیاں رکھی ہوئی ہونگی۔ کیا تُم بتا سکتے ہو کہ انڈے میں سے بچہ کتنے دنوں کے بعد نکلتا ہے۔ ہاں اکیس دن کے بعد۔ جب تمھاری اماں پھر کبھی انڈے پکانے لگے تو تم اُس برتن میں غور سے دیکھنا جس میں انڈا توڑا جاتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ انڈے کی زردی کے باہر ایک چھوٹا سا داغ ہوتا ہے۔ یہ وہ کوٹھڑی ہوتی ہے جو کسی دن چوزہ بن جاتا ہے۔ انڈے کا باقی کا مواد وہ خوراک ہوتی ہے جو انڈے کا مکمل چوزہ بننے تک اُس کے لیے غذا کا کام دیتا ہے۔ جس وقت چوزہ انڈے کا خول توڑ کر باہر نکلتا ہے اُس وقت تک ساری خوراک ختم ہو جاتی ہے۔ اِسی لیے چوزہ خول توڑ کر باہر نکلتا ہے تاکہ

خوراک کسی اور ذریعے سے حاصل کر سکے۔

تم جانتے ہو دودھ پلانے والے جانور کون سے ہیں؟ ہاں بلیاں، کتے، بھیڑیں، گائیں، ببر چیتے وغیرہ۔ اس لحاظ سے انسان بھی دودھ پلانے والے جانداروں میں شامل ہے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے جانور کیسے پیدا ہوتے ہیں۔

آؤ ہاتھی پر غور کریں کیونکہ یہ سب سے بڑا دودھ پلانے والا جانور ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ یہ کتنا بڑا جانور ہے اور اس کی سونڈ، دانت اور کان کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ تم سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھی بھی اپنی زندگی ایک کوٹھڑی یا انڈے سے شروع کرتا ہے۔ لیکن یہ انڈا بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ تمام انڈوں کی طرح اس انڈے سے بچہ بنانے کے لیے اسے گھونسلے میں رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً جب ہم بیج بوتے ہیں تو زمین گھونسلے کا کام دیتی ہے۔ تم نے شاید یہ کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ زمین بھی گھونسلے کا کام دے سکتی ہے لیکن زمین صرف پودوں کے لیے ہی گھونسلے کا کام نہیں دیتی بلکہ کینچوے (Snails) کے لیے بھی۔ کینچوا زمین میں اپنے انڈے دیتا ہے۔ یہ لعاب کی چھوٹی چھوٹی گیندیں نظر آتی ہیں۔ انھیں سے کینچوے کے بچے نکلتے ہیں۔ ابھی تمہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مچھلی کس طرح گھونسلہ بناتی ہے۔ بہت سی بڑی مچھلیاں ریت یا پتھروں کے درمیان انڈے دیتی ہیں۔ یہ تم کو معلوم ہی ہے کہ پرندے گھونسلوں میں انڈے دیتے ہیں جو کہ مٹی، پروں اور پرانے کپڑوں سے بنائے جاتے ہیں۔

اسی طرح اُس کوٹھڑی یا انڈے کو بھی گھونسلے کی ضرورت ہے جس میں سے ہاتھی کا بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے لیکن یہ گھونسلہ اُن گھونسلوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جن کا ذکر پہلے ہوتا رہا ہے، کیونکہ یہ ہاتھی کی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسے رحم کہتے ہیں لیکن ہم اُسے گھونسلہ ہی کہیں گے کیونکہ یہ سادہ نام ہے۔ پہلے یہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے

ین جوں جوں ہاتھی کا بچہ بڑھتا جاتا ہے یہ بھی ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

آؤ اب ہم یہ معلوم کریں کہ کوٹھڑی بڑھنا کس طرح شروع کرتی ہے۔ گھونسلے کے بالکل دو چھوٹے چھوٹے کارخانے ہیں۔ جہاں یہ کوٹھڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ بعض دفعہ ان کوٹھڑیوں سے ایک کوٹھڑی کارخانے سے نکل کر گھونسلے میں آجاتی ہے۔ جہاں یہ بڑھنا شروع کر دیتی پہلے یہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جب ہم امیبا کا ذکر کر رہے تھے تو اُس وقت تمہیں بتایا گیا تھا کہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور پھر یہ حصے الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہاتھی کی کوٹھڑی کے دونوں جُڑے رہتے ہیں۔ پھر دو کے چار، چار کے آٹھ، آٹھ کے سولہ اور بڑھتے بڑھتے کئی ہزار حصے بن جاتے لیکن یہ تمام جُڑے رہتے ہیں۔ گو اُن کی شکل سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا ہاتھی بن جائے گا جوں جوں وقت گزرتا ہے۔ ان کوٹھڑیوں میں سے کچھ بڑھ کر ہڈیاں بن جاتی ہیں اور کچھ اعضائے سے دل، پھیپھڑے، جگر اور دیگر اعضا بن جاتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد لے میں ہاتھی کا ایک مکمل بچہ بن جاتا ہے۔

پھر اس بچے کو پیدا ہونا ہوتا ہے یعنی اسے گھونسلے کو چھوڑ کر باہر کی دنیا میں آنا ہوتا ہے ہ کے لیے گھونسلے کی دیواریں بچے کو دھکیلنا شروع کر دیتی ہیں اور اُسے ایک ایسی نالی میں دھکیل یں جو بچے کی ماں کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان آکر کھلتی ہے جب بچہ گھونسلے سے باہر نکل رہا ہوتا س وقت یہ نالی پھیل کر بڑی ہو جاتی ہے تاکہ بچہ اس دنیا میں آسکے۔ اس طرح بچہ پیدا ہو ہے اور اپنی زندگی شروع کر دیتا ہے۔

ہاتھی یا دیگر دودھ دینے والے جانوروں کے انڈے یا کوٹھڑی اور دوسرے انڈوں میں فرق ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب یہ انڈا بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اُس وقت اسے جمع کی ہوئی خوراک ملتی۔ بلکہ اسے خوراک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاتھی کا بچہ پیدا ہونے سے قبل دو سال

ماں کے پیٹ میں بڑھتا رہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس کے لیے خوراک جمع نہیں ہوتی تو پھر یہ زندہ کیسے رہتا ہے؟

تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے گزشتہ لکچر میں چیزوں کو ہضم کرنے کے متعلق کچھ ذکر کیا تھا یعنی جب ہم خوراک کھاتے ہیں تو وہ کس طرح ہضم ہوتی ہے اور اُس کا مفید حصہ کس طرح اُس میں سے علٰحدہ ہوکر خون میں مل جاتا ہے اور پھر سارے بدن میں خون کے ساتھ پھر کر مختلف حصوں کو کس طرح بڑھاتا ہے۔ جن ایام میں ہاتھی کی ماں اپنے پیٹ میں بچے کی پرورش کر رہی ہوتی ہے اُن دنوں میں جب غذا ہضم ہوکر خون میں ملتی ہے تو کچھ غذا گھونسلے کی دیواروں میں سے گزر کر کوٹھڑیوں کو خوراک پہنچاتی ہے اور اُنھیں بڑھنے میں مدد دیتی ہے بچے کو صرف خوراک ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اُسے آکسیجن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آکسیجن بھی اُسے خون کے ذریعے سے ملتی ہے۔ لہٰذا بچے کے پیدا ہونے سے پہلے اُس کی ماں کو بچے کے لیے خوراک کھانی پڑتی ہے اور سانس لینا پڑتا ہے۔ طاقتور بچہ پیدا کرنے کے لیے اُس کے معدے، پھیپھڑوں اور دل کو دُگنا کام کرنا پڑتا ہے۔

یہاں سے آگے اِس تقریر کا اختتام لڑکیوں کے لیے مختلف طور پر کیا گیا تھا۔ اُس کو آگے لکھا جائیگا۔

آؤ اب اپنے متعلق غور کریں۔ ہمارے متعلق بھی یہ کہانی ایسی ہی ہے بلکہ زیادہ حیران کُن والی۔ ہم سب نے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کی شکل میں زندگی شروع کی تھی۔ میں اب کافی بڑا آدمی ہوں لیکن کسی وقت میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھا۔ ایک پن کے سرے سے ذرا بڑا۔ اُس وقت سے میں اب بہت بڑھ چکا ہوں، لیکن سب سے پہلے میں نے ماں کے گھونسلے میں بڑھنا شروع کیا تھا۔ نو مہینے کے بعد میں اِس قدر بڑھ گیا تھا کہ پیدا ہونے کے قابل ہوگیا تھا۔ اِسی طرح ہم سب نے زندگی شروع کی تھی۔ خدا نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے جس سے ہزاروں سال سے زندگی ایک نسل سے

دوسری نسل میں آتی ہے جب ہم بڑے ہو رہے ہوتے ہیں اُس وقت ماں کو کافی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ وہ جب تک ہماری نگہداشت کرتی ہے ہمیں اُس سے صحت اور طاقت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ جو خوراک وہ کھاتی ہے اُس سے ہمیں غذا پہنچتی ہے، جو سانس وہ لیتی ہے اُس سے ہمیں بھی ہوا ملتی ہے۔ اگر بچے کے بڑھنے کے ایام میں ماں کی صحت اچھی نہ ہو تو اُسے اور بھی زیادہ تکلیف ہوتی ہے یعنی وہ بیمار ہو جاتی ہے یا اُسے دردِ سر شروع ہو جاتا ہے یعض دفعہ بچّے کی پیدائش سے اُس پر اِس قدر بوجھ پڑتا ہے کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اِس سے تم پر واضح ہو گیا ہو گا کہ صرف یہی حیران کرنے والی بات نہیں کہ ہم چھوٹے سے۔ داغ۔ سے اِس قدر بڑے کس طرح ہو گئے ہیں بلکہ زیادہ حیران کرنے والی بات یہ ہے کہ ہماری ماں کو ہم سے کس قدر محبت تھی کہ ہمیں زندہ رکھنے کے لیے وہ اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

کچھ لڑکے ایسے ہوتے ہیں جو پیدائش کی کہانی سُن کر مذاق اُڑاتے ہیں۔ میرا خیال ہے انھیں یہ باتیں معلوم نہیں ہوتیں جو مَیں نے تمھیں بتائی ہیں کیونکہ اپنی ماں سے اِس قدر صحت اور طاقت حاصل کرنے کے بعد اِن باتوں کا مذاق اُڑانا شرافت سے بعید ہے۔ اِس لیے میں تم کو یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ تم سے جہاں تک ہو سکے تم اپنی ماں کی خدمت کرو تاکہ اُسے معلوم ہو کہ تمھیں اُن تمام تکالیف کا احساس ہے جو اُس نے تمھارے لیے اُٹھائیں۔

صرف پیدا ہونے سے پہلے ہی نہیں، بلکہ بعد میں بھی ماں کو ہمارے لیے کس قدر مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ ہم جانوروں کی طرح نہیں۔ مثلاً زراف کا بچہ پیدا ہونے سے بیس منٹ بعد چلنے لگتا ہے۔ ہم کئی مہینے تک نہیں چل سکتے اور کئی سال تک ہمارے بہت سے کام ماں کو کرنے پڑتے ہیں۔

لہٰذا اگر کوئی لڑکا تم سے اِن چیزوں کے متعلق لغو باتیں کہے، تو تمھیں اُس طرف توجہ

مہے

نہیں کرنی چاہیے تمھیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمھاری ماں نے تمھارے لیے کیا کچھ کیا تھا میں تم سے صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی آدمی میری پیدائش یا میری ماں کے متعلق لغو باتیں سنانا چاہے تو میں تو فوراً اُس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی تھی اور اُس کی محبت کا جواب صرف یہی ہے کہ اُسے مقدس سمجھا جائے۔

جغرافیے کی تدریس

(گذشتہ سے پیوستہ)

از

مرزا مقبول بیگ بدخشانی بی۔ اے

علم طبقات اور جغرافیے کا فرق۔ طبقات کا عالم پہاڑوں کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے اور اس کی توجہ زیادہ تر پہاڑی حصوں کی تحقیق تک محدود رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف ان عریاں بلندیوں سے ہے جہاں وہ پہاڑی نمونوں کا حال معلوم کر سکے جغرافیہ دان اُن چوٹیوں کی ٹوہ میں بھی رہتا ہے لیکن اس کی توجہ زیادہ تر پہاڑوں کے نشیبوں کی طرف ہوتی ہے۔ جہاں انسان رہتے ہیں جہاں زندگی پھوٹتی ہے اور مختلف حالات میں پروان چڑھتی ہے۔

ماہر طبقات اور جغرافیہ دان دونوں ایک کوئلے کے میدان میں پہنچتے ہیں۔ دونوں کا موضوع ایک حد تک مشترک ہے لیکن ماہر طبقات کی توجہ کا تعلق کوئلے کی نمونوں سے ہے یا ان کے خصائص سے لیکن جغرافیہ دان اس کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کا اثر انسانی زندگی پر کیا ہوتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سطح زمین کی جو کیفیت ہمیں ماہر طبقات بتاتا ہے وہ جغرافیے کے لیے چنداں سودمند نہیں۔ علم طبقات اور علم جغرافیہ کے فرق کا تذکرہ ضمناً آگیا تھا اور اس کی وضاحت کے بغیر چارہ نہ تھا۔

زمین کی حالت کو تبدیل کرنے والے بیرونی کارکن۔ اس سے پہلے باب میں ہم نے مجملاً بتادیا تھا کہ زمین کی اندرونی قوتیں کس طرح زمین کی ہیئت کو بدلتی ہیں۔ اب ہم یہ بتائینگے کہ بیرونی

کارکن وہ کون سے ہیں، جو زمین کی ہیئت کو بدلتے ہیں۔ یہ کارکن حرارت، برودت، نمی خشکی، پانی اور ہوائیں اور زمین کی حرکات کی مانند تند اور شدید نہیں یہ کارکن رات دن دنیا کے تمام حصوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ زمین کی سطح کا کوئی حصہ جس پر مینہ برستا ہے یا جس کے اوپر گرم سورج چمکتا ہے یا جس کے اوپر گرم و سرد ہوائیں چلتی ہیں، تدریج کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی کو عمل فرسودگی کہتے ہیں۔

پانی کے بہاؤ کا عمل فرسودگی عمل فرسودگی میں بڑا حصہ پانی اور پانی کے بہاؤ کا ہے۔ فولاد سخت ترین دھاتوں میں ایک دھات ہے لیکن پانی کا تقاطر اسے زنگ بنا کر بہا دیتا ہے پتھر بھی بڑی سخت چیز ہے لیکن پانی کے پیہم مساس سے وہ بھی گھستا رہتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا توڑ دیجیے۔ اس کی ہیئت پر غور کیجیے، اس کی ایک سمت شکستہ نظر آتی ہے یہ اس لیے کہ پتھر توڑا گیا ہے۔ توڑنے سے اس کی دوسری سمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ سمتیں گول ہیں۔ ان کا کوئی کونہ نہیں۔ گویا بیشتر حصہ اس پتھر کا صاف ہے۔ پتھر کی اصلی ہیئت ایسی نہیں جیسی یہ صاف سمتیں ظاہر کرتی ہیں۔ بلکہ پتھر کی اصلی ہیئت تو وہ ہے جو شکستہ سمت پیش کر رہی ہے شکستہ سمت پر آپ کو دندانے نظر آئیں گے۔ زاویے اور کونے نظر آئیں گے۔ پانی کے بہاؤ سے یہ زاویے اور کونے گھستے رہتے ہیں اور پتھر کی سطح رفتہ رفتہ صاف اور گول ہو جاتی ہے۔ پانی کا اثر بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور بغیر کسی شور و شر کے۔ لیکن یہ اثر ایسا کامل ہوتا ہے کہ اشیاء کی ہیئت ہی کو تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ سرگزشت جو ہم نے بیان کی ہے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح آپ ان پہاڑی سطحوں کی ہیئت پر بھی غور کریں۔ جس پر روز ازل ہی سے یہ عمل فرسودگی ہو رہا ہے۔ مصر کی خشک آب و ہوا میں پتھر کا ایک بہت بڑا ستون پڑا تھا اسے وہاں کے لوگ مقدس خیال کرتے تھے چند سال ہوئے ستون کو نیویارک میں پہنچا دیا گیا۔ نیویارک میں بارش کافی ہوتی ہے سردی بھی شدید ہوتی ہے اور گرمی بھی سخت پڑتی

ہے اس ستون میں صرف پانچ برس کے عرصے میں اتنی بڑی تبدیلی ہوگئی کہ ۲۴۰۰ برس کے عرصے میں نہ ہو سکی تھی۔ اس کے اوپر جو الفاظ کندہ تھے گھس گھس کر مٹ گئے۔ اس کی سطح مسخ ہونا شروع ہوئی اور اس کے نیچے پتھریلے ذروں کا ڈھیر لگ گیا —— یہ بات ہر جگہ صادق آتی ہے آپ کسی کہنہ دیوار کے نیچے نظر ڈالیں آپ کو تودے نظر آئینگے جو حقیقت میں اسی دیوار کا حصہ ہیں۔

پہاڑی سطحوں میں معدنی اشیا بھی ہوتی ہیں۔ دریاؤں، تالابوں اور زمین کے پانی میں گیسیں ہوتی ہیں۔ تیزاب ہوتا ہے۔ پانی کی یہ گیسیں اور تیزاب معدنی مواد کو حل کرکے بہالے جاتے ہیں اور چٹانیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

سرد مقامات کے پہاڑوں پر بارش کا پانی اکثر شگافوں اور دراڑوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ پانی سردی کی وجہ سے جمنے لگتا ہے۔ جب یہ پانی برف کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تو بڑی ہی قوت کے ساتھ پھیلتا ہے اور یہ برف چٹانوں کو پھوڑ دیتی ہے۔

حرارت۔ ہندوستان میں گرما میں چٹانیں خشک ہو جاتی ہیں۔ لیکن مون سون کی ہواؤں کے زمانے میں ان میں کافی نمی آجاتی ہے۔ تو گویا یہ چٹانیں کبھی پھیلتی ہیں اور کبھی سکڑتی ہیں۔ اس سے یہ چٹانیں خود بخود ٹوٹنے لگتی ہیں۔ یوں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دن کے وقت گرمی ہوتی ہے اور رات کے وقت ٹھنڈ۔ اس صورت سے بھی یہ چٹانیں پھیلتی اور سکڑتی رہتی ہیں۔ دکن میں ہم دیکھتے ہیں کہ چٹانیں خود بخود پھٹتی رہتی ہیں۔ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے اوپر پڑا ہوتا ہے یا یہ سب ٹکڑے منتشر ہو جاتے ہیں —— چھوٹے بچے تو یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ بھوت پریت ان چٹانوں کو توڑتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ سب نتیجہ عمل فرسودگی کا ہے۔

ہوا۔ سطح زمین کو تبدیل کرنے میں ہوا کا بھی ہاتھ ہے۔ چلتی ہوئی تند و تیز ہوائیں سمندروں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن جب زمین کے اوپر چلتی ہیں تو ریت کے ذرے اڑا کر کسی

دوسری جگہ پر پھینک دیتی ہیں اور اس طرح سطح کی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ اگر ہم خوردبین اٹھا کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ فضا میں ہوا کے ذرّوں کا طوفان امڈ رہا ہے۔ ہوا ان ذرّوں کو تودوں کی صورت میں کہیں کی کہیں پہنچا دیتی ہے۔ بہاولپور میں آپ دیکھیں شام کے وقت ایک خاص مقام پر آپ کو ٹیلہ نظر آئیگا۔ چند گھنٹے اگر تند و تیز ہوا چل جائے تو صبح آپ اس ٹیلے کو وہاں نہیں پائینگے۔ ریت کے ذرّے ہوا کے بہاؤ میں کسی دوسری جگہ پر جا جمع ہوتے ہیں اور وہاں ٹیلہ بن جاتا ہے۔ بابل اور نینوا کے شہر بھی غالباً ریت اور مٹی میں ہی دب کر معدوم ہو گئے تھے۔

سمندر اور دریاؤں کا پانی بھی سطح زمین کی شکل بدلتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں بچوں کو باہر لے جا کر عملی درس بھی دینا چاہیے۔ دریاؤں کی روانی ہر قسم کی قید و پابندی سے آزاد ہے۔ ایک طرف کا کنارہ بنتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف کا کنارہ کٹتا جاتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلی کا مشاہدہ طلبہ خود کر سکتے ہیں۔ مختلف قسم کے پتھر، ریتلے، چکنے، چونے والے انھیں دکھانے چاہییں۔ تصویروں اور خاکوں کے ذریعے بھی بہت مدد لی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں شکلیں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

چشمہ کیوں کر بنتا ہے۔ بارش کا بہت سا پانی دراڑوں اور شگافوں کے راستے زمین کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر چکر کاٹتا رہتا ہے اور ریتلی چٹانوں میں جذب ہوتا رہتا ہے۔ ریتلی چٹان کے نیچے اگر کوئی چکنی چٹان ہو جو پانی کو جذب نہ کر سکے تو یہ پانی رک جاتا ہے۔ جب پانی کافی مقدار میں رک جائے اور اوپر سے دباؤ بدستور ہو تو یہ پانی باہر نکلنے کے لیے راستہ تلاش کرتا ہے۔ جس مقام پر چکنی اور ریتلی چٹانیں ملتی ہیں اسی مقام میں سے یہ پانی چشمے کی صورت میں بہ نکلتا ہے۔ یہ عمل خاکے کے ذریعے دکھایا جائے تو بہت مفید ہوگا۔

بعض اوقات پانی زمین کے اندر بہت گہرا چلا جاتا ہے اور چشمے کی صورت میں جو پانی نکلتا ہے وہ گرم ہوتا ہے۔ یہ گرم چشمہ کہلاتا ہے۔ گرم چشمے میں لوہے اور دیگر معدنیات کا کچھ حصہ ملا ہوتا ہے اور

اس چشمے میں غسل کرنے سے اکثر بیماریاں دور ہوسکتی ہیں۔ ایسے چشموں کا پانی دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گنگوتری کے مقام پر ایک گرم چشمہ ہے، یہ اسی سبب سے مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی دُور سے ضرورت مند اس میں نہانے کے لیے آتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے ایسے چشمے بھی ملتے ہیں جن میں گندھک کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

زمین کی اقسام۔ اندرونی اور بیرونی کارکن مل کر زمین بناتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راک ہماری موجودہ زمین کی جدامجد ہے۔ راک اور عمل فرسودگی کے بغیر زمین کا وجود نہیں بن سکتا۔ اگر عمل فرسودگی نہ ہوتا تو ہماری زمین سخت اور ویران ہوتی۔ اس پر کوئی پودا نہ ہوتا۔ اس پر کسی قسم کی زندگی پنپ نہ سکتی۔ ہم نے دیکھ لیا کہ یہ عمل فرسودگی انسانی زندگی کے لیے کس قدر کارآمد ہے۔ یہ عملِ فرسودگی ہر قسم کی راک پر ہوتا ہے۔ لیکن راک کے اندر مختلف قسم کی تِل معدنیہ ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ زمین جو ایک راک سے تیار ہوتی ہے، اس زمین سے جو کسی دوسری راک سے تیار ہوتی ہے، مختلف ہوتی ہے۔ جو زمین بھربھری چٹان سے بنتی ہے وہ اس زمین سے مختلف ہوتی ہے جو چونے والی چٹان سے تیار ہوتی ہے۔ ان کی تفصیلات میں تو جانا مشکل ہے البتہ زمین کی اقسام کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔ راک سے چار قسم کی زمین تیار ہوتی ہے۔ پتھریلی، ریتلی، چکنی اور کالی۔ کالی زمین ریت اور چکناہٹ سے مل کر بنتی ہے اور اس قسم کی زمین سب سے زیادہ زرخیز ہوتی ہے۔ اور اگر اس میں گلی سڑی نباتات کے اثرات بھی شامل ہوں تو اس کی زرخیزی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ زمینیں جو نشیب میں واقع ہوں ان زمینوں سے زیادہ اچھی ہوتی ہیں، جو بلندیوں پر ہوں۔ چونکہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ زرخیز ذرات بلندیوں سے نشیب میں آتے رہتے ہیں اور وہیں رُک جاتے ہیں۔

جب ہم سطح زمین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر پہاڑوں کی چوٹیاں نہیں ہوتیں پرانے جغرافیے میں طلبہ کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے نام یاد کرنا پڑتے تھے۔ ان کی بلندیاں ازبر کرنا ہوتی

تھیں خلیجوں، آبناؤں اور راسوں کے نام حفظ کرنا پڑتے تھے۔ لیکن عصر حاضر کے جغرافیے کو ان چیزوں سے بہت زیادہ علاقہ نہیں۔ مونٹ ایورسٹ بھی جس کی بلندی ۲۹۰۰۱ فٹ ہے بذاتہٖ کوئی خاص جغرافیائی اہمیت نہیں رکھتی۔ جب ہم سطح زمین کا مطالعہ کرتے ہیں ہمارے ذہن میں یہ چوٹیاں اور یہ بلندیاں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہم، بلندیوں کے طویل و عریض میدانوں اور نشیب کی وسیع و فراخ وادیوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس لیے مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے والوں کی جسمانی ساخت ان لوگوں سے بہت مختلف ہوتی ہے، جو نشیب کے مقامات پر مقیم ہوں۔ بلندی پر چڑھ کر رہنے والوں کے اعضاء میں زیادہ توانائی ہوتی ہے، ان کے خون میں زیادہ حدت اور زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور وہ نشیب میں رہنے والوں سے زیادہ کام کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلند مقامات کی آب و ہوا نشیب کے مقامات سے مختلف ہوتی ہے۔ درجۂ حرارت بھی مختلف ہوتا ہے۔

آب و ہوا۔ آب و ہوا کا کسی دوسری جگہ بھی مجمل طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ کسی مقام کی آب و ہوا کا انحصار درجۂ حرارت اور بارش پر ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور امور پر بھی ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی جگہ کی آب و ہوا کی اہم وجوہ یہ دو بھی ہیں۔ آب و ہوا میں ایک عنصر ایسا ہے جو بارش سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ ہوا کی رطوبت ہے۔ ہوا کی رطوبت کو ہماری آسودگی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر ہم کسی ایسے کمرے میں بیٹھے ہوں۔ جہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود ہوں تو ہم کوفت محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے۔ غالباً اس کوفت کا موجب "کاربن ڈائیکسائیڈ" نہیں، بلکہ اس کا موجب ہوا کی رطوبت ہے۔ ہجوم کی وجہ سے ہوا کی رطوبت کم ہو جاتی ہے اور ہمیں کافی مقدار میں میسر نہیں آسکتی اس لیے ہمیں کوفت ہوتی ہے۔

جس مقام پر ہوا کی رطوبت دوسرے مقامات سے مختلف ہو وہاں کے لوگوں کے عمل

حرکت بھی متعلق ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں جہاں تک حیاتِ انسان کا تعلق ہے۔ یہ رطوبت آب وہوا میں بڑا مد جزر رکھتی ہے۔ بد قسمتی ہے کہ ہم بارش اور درجۂ حرارت کی مانند رطوبت کے صحیح اعداد و شمار اور درست تناسب حاصل نہیں کر سکتے۔ جو ہمیں دوسرے مقامات کی رطوبت سے مقابلہ کرنے میں مدد دے سکیں یہ موضوع ماہرانِ طب کی توجہ کا محتاج ہے۔ یقیناً وہ اس پر زیادہ روشنی ڈال سکینگے۔

سورج کی گرمی بھی انسانوں کے جسموں اور دماغوں پر بڑا اثر رکھتی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ہواؤں کے عام رُخ کو بھی آب وہوا میں خاص دخل ہے۔ لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا ——— ہواؤں کے رخ کو آب وہوا سے بالواسطہ تعلق ضرور ہے۔

ہواؤں کا علم آب وہوا کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات ہے۔ مشرق سے آنے والی ہوا جس میں درجۂ حرارت اور رطوبت کا تناسب خاص ہو۔ نباتات اور انسانوں پر وہی اثر رکھتی ہے، جو مغرب سے آنے والی ہوا اسی قدر حرارت اور رطوبت کے تناسب کے ساتھ اثر رکھتی ہے۔ ہواؤں کا رُخ کوئی نمایاں اثر نہیں رکھتا۔ نباتات اور انسانوں پر رطوبت اور درجۂ حرارت، کا اثر ہوتا ہے نہ کہ ہواؤں کے رُخ کا۔ اِس سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ طلبہ کو ہواؤں کے حالات سے آگاہ ہی نہ کیا جائے آب وہوا کا موضوع ہی سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہواؤں کے حالات تفصیل سے نہ پڑھائے جائیں۔ مدارس میں بہت سی ایسی باتیں بھی بتانا پڑتی ہیں جو کسی خاص مقررہ مضمون کا حصّہ تو نہیں ہوتیں لیکن سوچنے کی قوت کو منظم ضرور کرتی ہیں ———

سیلِ شعور

از

سید محمد جعفری، ایم اے، ایم او ایل

یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی نہ کسی قسم کا شعور ہر وقت ہم میں جاری وساری ومصروفِ عمل ہے۔ اس شعور کے تسلسل کا ادراک عالمِ بیداری میں تو قائم رہتا ہی ہے مگر کبھی کبھی یہ ادراک خواب طاری ہونے پر بھی منقطع نہیں ہوتا۔ اس تسلسل کو آپ جو چاہیں کہہ لیں درحقیقت یہ معلومات اور احساسات تاثرات اور خواہشات، اندیشوں اور فکروں وغیرہ کا لگاتار بہاؤ ہے یا اِن تمام کیفیتوں کے پے درپے وقوع کا نام ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ احساسات وتاثرات کا مسلسل تموج اور احساسات وتاثرات کے عمل وا ثر کے دائروں کے جلد جلد تبدیل ہونے کو ہم سیلانِ شعور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی مسئلہ پر ایک اور پہلو سے بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ نفسیاتی زندگی یا ہماری حیاتِ باطنی کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حیاتِ باطنی یا نفسیاتی زندگی شعور کے اسی مسلسل بہتے ہوئے چشمے کا نام ہے جو ہر وقت رواں دواں ہے نہ رُکتا ہے نہ تھمتا ہے نہ اٹکتا ہے نہ جمتا ہے۔ چلتا ہی رہتا ہے! ابھی تک جو کچھ عرض کر چکا ہوں وہ سب علمائے نفسیات کے نزدیک ایک متحقق ومسلّمہ امر ہے لیکن یہ کہ شعور کے اس بہتے ہوئے چشمے کا منبع کہاں ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو غور طلب ہیں علم النفس کے مباحث میں شامل ہیں اور بالعموم زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔ اِن کو تشریحی مفصل یا تفسیری پہلو کہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ دیگر اعتبارات سے بھی اس مسئلے کو دیکھا جا سکتا ہے مثلاً ہم شعور کو عمل واثر کے اعتبار

سے مختلف دائروں میں تقسیم کرلیں یا ہمارا مدعا یہ ہو کہ ان تمام مختلف دائروں کی خاصیتوں کو قلمبند کرلیں یا ہم ایسا کرلیں کہ وہ مبادیات علٰحدہ علٰحدہ ہو جائیں جن کے ملنے سے یہ شعور کے دائرہ ہائے عمل واثر حادث وحاضر ہوتے ہیں یا اس بات کا کھوج لگالیں کہ شعور عمل کے یہ دائرے کن حالات کے تحت میں اور کس معمول یا دستور سے پے در پے واقع ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے سے موضوع کی تعریف وتعیین ہو جائیگی اور ہم اس کا بآسانی تجزیہ کرلینگے۔

بہتر ہوگا کہ ابتدا ہی میں آپ پر واضح ہو جائے کہ اپنے موضوع کے تشریحی یا تفسیری پہلو کو میں بالکل نظر انداز کردونگا کیونکہ درحال ہم سرے سے یہی نہیں جانتے کہ یہ پے در پے واقع ہونے والے شعوری دائرے کہاں سے آتے ہیں اور وہ ایسے کیوں ہیں۔

یہ بات ضروری ہے کہ شعوری اثر کے دائرے ہماری دماغی کیفیتوں سے منسلک ہیں اور ان کے تحت میں واقع ہوتے ہیں اور یہ بات پایۂ تحقیق تک پہنچ چکی ہے کہ ان دائروں کی مخصوص صورتیں اور حالتیں ہمارے گزشتہ تجربے اور ہماری گزشتہ تعلیم کی بنا پر متعین ہوتی ہیں لیکن اس سوال کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں ہے کہ دماغی کیفیتوں کا اثر واختیار ان کے ظہور پر کن کن اعتبارات سے عاید ہوتا ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ تعلیم کس طرح پر دماغ کو حسین ومرغوب قالب میں ڈھال دیتی ہے تو اس کا جواب بالتعمیم ہوگا یعنی "اس قدر دقیق اس قدر مغلق اس قدر عام اور غیر صریح اصطلاحوں میں ہوگا جن کا سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن اسی بات کو ہم اگر یوں کہہ دیں کہ شعور کے ان دائرہ ہائے عمل واثر کے ظاہر ہونے کا سبب وہ لطیف مخلوق ہے جس کو ہم اپنی روح کہتے ہیں اور یہ روح اپنی لطیف قوتوں کی ان عجیب وغریب شکلوں کے ذریعے سے یعنی شعور کے ان دائرہ ہائے عمل کی مدد سے ہماری دماغی حالتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تو یہی بات ہماری سمجھ میں آسانی سے آجائیگی لیکن میرے اس خیال سے آپ ضرور متفق ہونگے کہ روح

کا تذکرہ درمیان لاکر اس بات کو بیان کر دینے کے یہ معنی نہیں کہ اس مسئلہ کی پوری پوری تشریح و توضیح ہو گئی۔ حق بات یہ ہے کہ ہمیں خبر ہی نہیں ہے کہ ان مسائل کو تشریحی و تفسیری پہلوؤں سے کس طریق پر حل کیا جائے۔ بعض بعض اطراف میں کوششیں جاری ہیں علمائے نفسیات تحقیقات و تلاش میں مصروف ہیں اور ممکن ہے کہ کبھی کوئی عمدہ نتیجہ برآمد ہو جائے۔

اس کو سمجھ لینے اور تسلیم کر لینے کے بعد کہ شعور کے عمل ماشہ کے یہ دائرے مسلسل طور پر حالت تغیر میں ہیں دوسری بات جسے علمائے نفسیات نے ایک امر مسلمہ قرار دیا ہے اور جو آپ پر ضرور واضح ہو جانی چاہیے۔ یہ ہے کہ شعور کے عمل کے وہ دائرے جن میں حواسِ خمسہ کا دخل ہے۔ ہمیشہ پیچیدہ، مرکب اور مخلوط ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دائرے مختلف عناصر ترکیبی پر مشتمل ہیں۔ ہمارے جسمانی احساسات۔ گرد و پیش کی اشیا کے ہم پر تاثرات۔ معدودے کی چیزوں کے خیال۔ گذشتہ تجربوں کی یاد۔ ہماری حسرتیں اور ہماری شادمانیاں۔ ہماری خواہشیں ہماری نفرتیں۔ ہماری کلفتیں اور ہماری دیگر جذباتی کیفیتیں ہماری قوتِ ارادی کے عزائم مختلف تناسب اور مختلف ترکیبوں میں یک جا ہوں۔ تب یہ مخلوط و مرکب و پیچیدہ دائرہ ہائے شعور تعمیر ہوتے ہیں۔

چنانچہ شعور کی بعض وہ حالتیں جن میں حواسِ خمسہ کا دخل ہے کبھی تو ایسی ہوتی ہیں کہ یہ تمام متذکرۂ بالا عناصر ترکیبی ان میں بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور مصروفِ عمل ہوتے ہیں مگر چہ ان کا باہمی تناسب ہمیشہ بدلتا رہتا اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس شعور کی حالت میں سب جذبات ہی جذبات کارگر ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ایک دو اور عناصر ترکیبی بھی موجود ہوتے ہیں بعض شعور کی وہ حالتیں ہوتی ہیں جن میں صرف پرانی محفوظ یادیں ہی ہوتی ہیں لیکن ذرا غور و فکر کریں تو یہ بات کھلے گی کہ شعور کی حالتوں میں ایسی کچھ بناوٹ نظر آتی ہے کہ مرکز میں تاثرات ہوتے ہیں اور ان کے چاروں طرف خیال یا ارادے کا غلاف یا جدول ہوتا ہے یعنی ہمارے تاثرات خیال

یا ارادے میں ملفوف ہوتے ہیں بعض شعور کی وہ حالتیں ہوتی ہیں جن میں محفوظ یاد جذبات یا تاثرات کے درمیان بطور مرکز موجود ہوتی ہے یعنی محفوظ یاد کے گرد و پیش جذبات یا تاثرات کا جدول موجود ہوتا ہے۔

ہمارے شعور کے عمل و اثر کے زیادہ تر دائرے ایسے ہیں جن میں احساسات کی مرکزی حیثیت بہت نمایاں ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جب آپ کے سامنے ایک شخص تقریر کر رہا ہو تو آپ سوچتے بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں اُس کی شکل و صورت چھپی ہے اس کے قد و قامت اس کے ڈیل ڈول کا خاکہ دماغ پر مرتسم ہوتا ہے آپ کے کانوں میں اُس کی آواز داخل ہوتی ہے۔ اب آپ کے شعور کا جو اصلی دائرۂ عمل ہے، اس کی بناوٹ یوں ہے کہ تقریر کرنے والے کی شکل و صورت اُس کا ڈیل ڈول اُس کا قد و قامت اور اس کی آواز کا دماغی احساس مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور آپ کا سوچنا اور متاثر ہونا یعنی آپ کا تفکر و تاثر اس مرکز کے گرد و پیش بطور جدول موجود ہیں۔

یوں بھی ہو سکتا ہے کہ تقریر سنتے سنتے آپ کا ذہن کسی اور موضوع یا کسی اور پرانے گزشتہ تصور کی طرف متوجہ ہو گیا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ کا دھیان کہیں اور ہے اور بظاہر آپ تقریر سُن رہے ہیں اور مقرر کی آواز اُس کے رنگ و رُوپ اُس کے ڈیل و ڈول اُس کے قد و قامت کا احساس نہایت ہلکا اور دھندلا ہو گیا ہے۔ اگرچہ آپ کے لیے بالکل غائب نہیں ہُوا۔ یہ وہ کیفیت ہے جب احساس نے دائرہ شعور میں مرکزی حیثیت کو چھوڑ کر جدولی حیثیت اختیار کر لی اور اُس کی جگہ مرکز میں وہ موضوع یا وہ پرانا گزشتہ تصور قائم ہو گیا ہے۔

یہ تبدیلی بھی واقع ہو سکتی ہے کہ دورانِ تقریر میں آپ کے اپنے جسم سے متعلقہ اثرات دائرہ شعور میں جدولی حالت سے منتقل ہو کر مرکزی حالت میں آ گئے ہوں اور اس وجہ سے آپ

کا دھیان بٹ گیا ہو۔ اِس مثال کے پیش کرنے کا یہ مقصد تھا کہ یہ دونوں اصطلاحیں یعنی دائرۂ شعور میں مرکزی حیثیت اور دائرۂ شعور میں جدولی حیثیت آپ پر بخوبی واضح ہو جائیں۔ اِن کا سمجھ لینا اس لیے نہایت ضروری ہے کہ آئندہ ہمیں اِن سے اکثر واسطہ پڑیگا۔

شعور کے عمل کے دائروں میں تبدیلی و تغیر درجہ بدرجہ اور باقاعدہ ہوتا ہے۔ ایک دائرہ دوسرے دائرے میں بتدریج مدغم ہو جاتا ہے یعنی دوسرے میں جذب ہو کر غائب ہو جاتا ہے اور دوسرا پیدا اور نمایاں ہوتا جاتا ہے اور اس طرح سے شعور کے اس بہتے ہوئے چشمے میں جس کو ہم زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تمام قسم کے نئے نئے دائرہ ہائے عمل نئے نئے تناسب میں اجزائے ترکیبی لیے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ مرکزی اجزائے ترکیبی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی محض جدولی اجزائے ترکیبی میں ایک نئی ترتیبی حیثیت اور ایک نیا نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبہ تمام دائرۂ شعور بالکل اور یکایک متغیر ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ جدولی اجزائے ترکیبی کا تناسب و نظام قائم رہتا ہے لیکن دائرے کے مرکزی اجزائے ترکیبی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ الغرض اِن تبدیلیوں کے لیے کوئی قطعی اور صحیح قاعدہ مقرر نہیں جا سکتا۔ ہم صرف اِس قدر جانتے ہیں کہ جس شخص کے ذہن میں یہ دائرہ ہائے شعور حادث ہوتے ہیں۔ وہ شخص ہر ایک دائرے کو عملی طور پر ایک واحد شے تصور کرتا ہے اور چونکہ یہ دائرہ ہائے شعور ہر شخص کے ذہن میں حادث ہوتے ہیں لہٰذا ہم اُن دائرہ ہائے شعور کو جو دوسرے اشخاص کے دماغ میں بنتے ہیں اور ہمارے دماغی دائرہ ہائے شعور سے ملتے جلتے ہیں۔ اس یکسانیت اور تشبہ کی بنا پر مختلف نام دے سکتے ہیں۔ یہی شعور کے مختلف دائرہ ہائے عمل ہیں جن کے نام ہم نے یہ رکھ لیے ہیں کہ یہ جذباتی کیفیت ہے اور یہ گھبراہٹ کی حالت ہے اور یہ متاثرہ کی حالت ہے اور اس وقت ہم مصروفِ غور و خوض ہیں۔ اس وقت ہم گیان دھیان میں

اور اب ہمارے دل میں ارادے اور خواہشات پیدا ہو رہی ہیں۔

شعور کے بہتے ہوئے چشمے کے متعلق یہ تفاصیل کسی قدر مبہم اور دھندلی ہیں لیکن وثوق سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی صریح غلطی یا قیاس وگمان کو دخل نہیں ہے۔ علمائے نفسیات کا ایک معتبر گروہ اس مبہم اور دھندلے طریقِ بیان کو قبول نہیں کرتا۔ ان کا قول ہے کہ تمام پہلو صاف صاف نظر آنے چاہییں اور تجزیہ ایسا مکمل اور قطعی ہو کہ شعور کا عمل جاننا بھی واضح اور یقینی ہو جائے۔

علمائے نفسیات کے اس گروہ کے خیال کے مطابق شعور کے واقعۂ عمل ہائے خاص ابتدائی ذہنی حالتوں سے بن کر تیار ہوتے ہیں اور یہ خاص ابتدائی ذہنی حالتیں ہمارے دماغ میں پہلے سے مرتسم اور منقوش ہیں اور دماغی کیمیاوی تبدیلیوں کی بنا پر حادث ہوتی ہیں۔ بعض مفکرین مثلاً اسپنسر یا ٹین کے خیال کے بموجب یہ ذہنی حالتیں بھی قابلِ تجزیہ ہیں۔ یہ حالتیں اُن چھوٹے چھوٹے نفسیاتی اجزائے خیال سے تعمیر ہوتی ہیں جن کی وہی حیثیت ہے جو حیثیت جزوِ لایتجزی یعنی "ایٹم" کی مادّے کی تعمیر میں ہے اور اسی لیے اگر ہم ان چھوٹے چھوٹے نفسیاتی اجزا کو فکر کا یا خیال کا "ایٹم" تصور کر لیں تو بجا ہوگا کیونکہ انہی ذراتِ فکر یا "خیال کے ایٹموں" سے عمارتِ خیال تعمیر ہوتی ہے۔ انہیں سے ہماری علیحدہ ذہنی حالتیں ترکیب پاتی ہیں اور انہیں کے امتزاج سے ذہنی حالتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لاک نے سب سے پہلے اس نظریہ کا دھندلا سا تصور پیش کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر افکار اور تاثر کا مجموعہ ایک بمنزلہ ایک خشت کے ہے اور بہت سی خشتیں مل کر ایک ذہنی حالت تیار کرتی ہیں اور مختلف ذہنی حالتوں کے یکجا ہونے سے شعور کا ایک مسلسل عمل و اثر تعمیر ہوتا ہے۔ گو یہ نظریہ سیدھا سادہ اور خالی از ابہام ہے لیکن ہم اس کے متعلق زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اس نظریہ میں قیاس کو بہت دخل ہے اور علمی زاویۂ نگاہ سے صرف اتنا سمجھ لینا کافی و وافی ہے کہ شعور مثل ایک بہتے ہوئے چشمے کے ہے۔ اس بہتے ہوئے چشمے میں تموج ہوتا ہے واقعاتِ عمل و اثر پیدا ہوتے ہیں اور یہ واقعے جلد جلد تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

انگلستان میں معائنہ مدارس اور امتحانات

از

خادم محی الدین صاحب لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

نیا اور پرانا طریق معائنہ۔ ابتداً انگلستان میں انسپکٹر مدارس کے فرائض نہ صرف اساتذہ کے امتحان تک محدود تھے بلکہ ان کا ایک اہم فرض یہ بھی تھا کہ مدارس کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مالی امداد کا تعین کریں۔ مزید برآں اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ کیا یہ عطیہ باضابطہ کے قوانین کے ماتحت صرف ہو رہا ہے۔ بحالات موجودہ معائنہ مدارس کی جو اغراض ہیں یہ مالی نہ تعلیمی مثلاً کسی مضمون کے متعلق تعلیمی طریقوں اور ان کی کمزوریوں کی چھان بین کرنا ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق دریافت حال کرنا۔ آج کل مدارس میں انسپکٹر صاحبان انفرادی طور پر طلبہ کا امتحان نہیں لیتے۔ بلکہ بحیثیت مجموعی تمام اسکول یا کسی ایک جماعت کی تعلیمی حالت کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اس کام کے لیے بھی خاص قابلیت درکار ہے۔ اس لیے کہ انفرادی امتحان اور عام معائنہ جداگانہ امور نہیں ہیں۔ ہر قابل انسپکٹر اپنی عام رائے کی صحت کے لیے انفرادی پرچہ کیا کرتا ہے۔

انسپکٹر کا فرض مندرجہ ذیل پانچ امور پر مشتمل ہے :۔

۱ - طریقہ تعلیم کا جائزہ لینا اور پڑھائی کو جانچنا۔

۲ - کسی طریقہ تعلیم پر بحث کرنے کی قابلیت رکھنا۔

۳ - طلبہ کی کاپیوں کا معائنہ کر کے مدرس کی تصحیح کو دیکھنا۔

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۳۹	نور الدین جہانگیر	۲ر۳ پائی
۴۰	شہاب الدین غوری	۲ر۹ ″
۴۱	سلطان علاؤ الدین خلجی	۲ر۱۱ ″
۴۲	فیروز الدین تغلق	۳ر
۴۳	امیر تیمور	۲ر۷ ″
۴۴	پرتھوی راج	۲ر۸ ″
۴۵	محمود غزنوی	۲ر۶ ″
۴۶	مصر کی داستان	۳ر
۴۷	جاپان کی کہانی	۴ر
۴۸	چین کی کہانی	۳ر۶ ″
۴۹	مستورات چین و جاپان	۴ر
۵۰	ایران کی کہانی	۲ر
۵۱	ایشیائی روم	۲ر۷ پائی
۵۲	ٹرکی (یورپی روم)	۲ر۹ ″
۵۳	لنکا	۱ر۱۱ ″
۵۴	بصرہ و بغداد	۵ر
۵۵	یونان	۲ر
۵۶	تین سوال	۲ر۷ پائی
۵۷	امرت ورشا	۳ر۱۰ ″
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبرا داؤد بادشاہ	۲ر۶ ″
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳ر۹ ″
۶۰	″ ″ دوم ″	۴ر۵ ″
۶۱	خوفناک خواب	۲ر
۶۲	ہیرا لال	۲ر۶ ″
۶۳	دولت کی پٹاری	۲ر۱ ″
۶۴	سادھو کی چکی	۲ر
۶۵	بہادر شہزادہ	۲ر۱ پائی
۶۶	نیلا باز	۲ر۱۱ ″
۶۷	جوتی موتی	۲ر۱۰ ″
۶۸	جواہرات کا خزانہ	۲ ۷ ″
۶۹	چھوا اور سونا ہوا باتصویر	۲ر۱۰ ″
۷۰	علی بابا چالیس چور	۴ر
۷۱	علاؤ الدین و عجیب و غریب لیمپ	۴ر۲ پائی
۷۲	ملا دو پیازے کا سفر	۳ر
۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۴	نیشاپور کا سوداگر	۲ر۱۱ پائی
۷۵	پرستان کا موچی	۳ر
۷۶	سندر پیاری	۳ر
۷۷	چاندی کی کنجی	۳ر
۷۸	سلکِ جواہر نمبرا (حکمرانی کا گر)	۲ر۶ پائی
۷۹	″ ″ نمبر۲ (اوج و پستی)	۱ر۱۱ ″
۸۰	″ ″ نمبر۳ (شہید الفت)	۱ر۶ ″
۸۱	سلکِ جواہر مرد میدان	۱ر۶ ″
۸۲	″ ″ نیک و بد	۱ر۹ ″
۸۳	″ ″ عیب و ہنر	۱ر۴ ″
۸۴	″ ″ جہاں گرد	۱ر۶ ″
۸۵	″ ″ جواب باصواب	۱ر۱۰ ″
۸۶	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱ر۲ ″
۸۷	″ ″ حسن تدبیر	۱ر۶ ″
۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت	۱ر۳ پائی
۸۹	ڈرامہ غم خوار عالم	۱ر۷ پائی

جو تجربہ رکھتا ہے اور تحصیلِ علم کے متعلق ایک معیار قائم کرنے کے جو مواقع اسے ملتے ہیں ان کی بنا پر اسے ایک مشیرِ تعلیمی کہلانے کا بخوبی حق حاصل ہے۔ تاہم مدرسین کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے وہ انسپکٹر کو مندرجۂ ذیل امور کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے:۔

۱۔ طریقۂ تعلیم کی جانچ۔ انسپکٹر کو معلوم کرنا چاہیے کہ ۔

(ا) کیا مدرس جماعت میں لکچر دے رہا ہے یا سبق پڑھا رہا ہے؟ بچے سبق دلچسپی لے رہے ہیں یا نہیں؟

(ب) کیا مدرس کی توجہ تمام جماعت پر حاوی ہے یا نہیں ؛

(ج) کیا مدرس اپنی شخصیت کا اثر ایسے طریق سے جماعت پر ڈال سکتا ہے کہ ضبط میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔

(د) کیا مدرس نے اپنے اسباق کو تیار کیا ہے یا بغیر تیاری کے ہی کام چلا رہا ہے ؟

(ہ) کیا وہ اپنے مضمون کے ضروری حصوں پر طلبہ کی پوری پوری توجہ منعطف کرا رہا ہے ؟

(ص) درس کے دوران میں مدرس نے تمثیل سے کہاں تک کام لیا ہے ؟

(ش) کیا وہ اپنے طریقۂ تعلیم کی خشک راہ کو چھوڑ کر کبھی خوش مزاجی یا ظرافت سے بھی کام لیتا ہے یا نہیں ؛

(ص) کیا وہ اپنے شاگردوں کو غور کرنے کا موقع دیتا ہے یا نہیں تاکہ وہ فاقی سی وجدے سوالات کا جواب دے کر درس میں اس کے شریک کار رہیں۔

(ض) کیا بچے اپنے استاد کے ساتھ مانوس ہیں یا اسے باعثِ زحمت خیال کرتے ہیں ؛

۲۔ کتبِ درسی اور سامانِ مدرسہ۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں کسی قسم کی کمی کا باعث مدرس کی لاعلمی اور غفلت ہے یا تعلیمی مجلس کی غفلت

۳۔ کام کی اسکیم۔ کیا مدرس اپنے کام کی مجوزہ یا مقررہ اسکیم کو ایک مقصد کی حیثیت سے پیش نظر رکھتا ہے؟ وہ بچوں کی عمر کے لحاظ سے انہیں کیا پڑھانا چاہتا ہے اور کس حد تک؟

۴۔ ایک مدرسے کا دوسرے سے مقابلہ کرنا جس سے تعلیم کا یکساں معیار قائم کیا جائے۔

۵۔ ایسے سوالات کرنا جن کی نوعیت اور تسلسل ہی سے مدرس کی رہنمائی کی جا سکے یا ایسی تشریح کرنا جو مدرس کے حق میں اس امر کی مشعلِ ہدایت ثابت ہو کہ کسی مضمون کو پڑھانے کے لیے اس کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

انسپکٹری کا قومی عہدہ

انگلستان میں معائنہ مدارس کے نو حلقے ہیں۔ ہر حلقے میں پرائمری مدارس کے لیے ایک خاص انسپکٹر مقرر ہے مثلاً تشائر کے ضلع میں ثانوی اور صنعتی مدارس کے لیے ایک ایک ڈویژنل انسپکٹر بھی ہے۔ لیکن باقی آٹھ حلقوں میں ایسے انسپکٹر جداگانہ نہیں بلکہ متفقہ طور پر کام کرتے ہیں یعنی، ہر ایک حلقے کے ثانوی اور صنعتی مدارس کے لیے ایک افسر مقرر ہے۔ تمام ڈویژن کے حلقوں میں قریباً ساٹھ اضلاع ہیں۔ گویا ہر حلقے میں چھ یا سات اضلاع کی اوسط ہے۔ ہر ضلع میں ایک انسپکٹر ابتدائی مدارس کے معائنے کے لیے مقرر ہے اور اس کے ساتھ طبقۂ نسواں کی ایک انسپکٹرس بھی بطور امداد کام کرتی ہے۔ ساتھ ہی نائب اور امدادی افسرانِ معائنہ بھی شامل ہیں جن کی تعداد فی ضلع چار سے زائد نہیں۔ تعلیمی بورڈ میں چھ چیف انسپکٹر حسب ذیل شعبوں کے لیے مقرر ہیں (۱) پبلک ابتدائی مدارس (۲) ثانوی مدارس (۳) صنعتی مدارس (۴) تربیتِ اساتذہ کے مدارس (۵) طبی درسگاہیں (۶) زنانہ مدارس۔ ان کے علاوہ تعلیم کے مختلف شعبوں کے معائنے کے لیے خاص انسپکٹر تعینات ہیں مثلاً نقاشی، ورزش جسمانی، خانہ داری، حفظ ماتقدم، ابتدائی تعلیم کے معائنے کے لیے خاص انسپکٹر علاحدہ تعینات ہیں، جو دستکاری، خانگی مضامین اور

۱ - نقشہ انضباطِ اوقات کے بموجب سٹاف کو کام تفویض کرنا۔

۲ - مدارس کے سامانِ مطلوبہ کے متعلق مشورہ، بالخصوص جس مدرسے کا سٹاف سامان کے مناسب استعمال کا اہل ہو۔ اس ضمن میں یہ بتانا ضروری ہے کہ تمام معلمین کو ایک ہی درسی کتاب کے استعمال پر مجبور نہ کرنا چاہیئے۔

۳ - مدرسین کے کام کے آزمائشی سال کے متعلق رپورٹ کرنا۔

۴ - نظم و نسقِ مدرسہ، طلبہ کے جونیر (ادنیٰ) سے سینیر (اعلیٰ) مدارس میں منتقل کیے جانے کے متعلق خاص انتظام کرنا۔

۵ - ٹریننگ اسکول یا کالج میں خاص خاص معلمین کے بھجوانے کا انتظام کرنا۔

۶ - محکمہ تعمیرات اور انسپکٹر کے مشورہ کے بموجب اُن معاملات پر غور کرنا جن کا تعلق مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ہو۔ اسی کے ساتھ مدارس میں ڈرینیج، حفظانِ صحت، کمروں کو گرم رکھنے، ہوا کے گزر وغیرہ ایسے مسائل پر غور و خوض کے بعد خاطر خواہ انتظام کرنا۔

۷ - تعلیمی اسکیم کو، جو مدرسے کے حسبِ حال ہو، پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مدرسے کے اساتذہ اور ماتحت ملازمین کا انتخاب اور تقرر۔

۸ - اساتذہ کی ترقی اور تبادلہ۔

۹ - کمزور اور کند ذہن طلبہ کے لیے خاص اور علیحدہ انتظام کرنا۔

مقامی معائنۂ مدارس کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس میں بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں ایک دقت یہ ہے کہ اگر مقامی انسپکٹر صاحبان کا گروہ، جونیر اور سینیر، دو حصوں میں منقسم ہو تو معاملے میں مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ بالخصوص اس کا اثر مدرسین کے تبادلہ پر پڑتا ہے۔

مقامی انسپکٹروں کو ہر قسم کے تعلیمی کام کی دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ گو ان میں سے بعض ایک ہی قسم کے کام میں مہارت رکھتے ہوں تاہم انھیں ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ دسترس ہونی چاہیے۔ یہ دوسری مشکل ہے یعنی انھیں ایک ہی رٹ میں پڑے رہنا نہیں چاہیے مثلاً بعض انسپکٹر ہر مدرسے میں طلبہ کا فقط تحریری کام ہی دیکھتے ہیں۔ باقی امور کو نظر انداز کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مقامی انسپکٹر کو اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کے کسی رکن یا ارکان کے خیالات سے متاثر نہ ہونا چاہیے اور ہر بات کا فیصلہ عام اصول کی بنا پر کرنا چاہیے۔ اسے کسی خاص شخص کی رعایت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اسے بشرطِ ضرورت اپنی رائے کو بدل ڈالنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً مقامی افسرانِ تعلیم یا مدرسین کی انجمن کے نمائندوں کے ساتھ مل کر کانفرنس منعقد کی جائے اور ضروری امور پر بحث کر لی جائے۔ اس قسم کے اجتماع میں مختلف مسائل پر ایسے طریق سے گفتگو اور قیل و قال ہونا چاہیے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس طریق سے مقامی انسپکٹر اپنی رائے اور اندازے میں مناسب ترمیم و تنسیخ کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ ایسی کانفرنس رسمی یا غیر رسمی، دونوں طریقوں سے منعقد کی جا سکتی ہے چنانچہ کوشش کی جاتی ہے کہ مقامی اور دوسرے انسپکٹر متفقہ طرزِ عمل کی پابندی کریں اور ہو سکے تو مل کر مدارس کا معائنہ کریں۔

مدرسے کی حاضری

مدارس کی حاضری کے متعلق حسبِ ذیل امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے:۔

۱ ۔ ضابطۂ تعلیم کے قواعد کی پابندی۔

۲ ۔ دفترِ سررشتۂ تعلیم کا طرزِ عمل

۳ ۔ قانونی دستور العمل۔

حاضری کے متعلق تعلیمی بورڈ کے مجوزہ قواعد رجسٹروں کی نگہداشت کے متعلق ہیں اور وہ اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ کم از کم اور زیادہ سے زیادہ بچے کی عمر داخلہ مدرسہ کے لیے کیا ہے جس کے لیے مدرسہ گرانٹ حاصل کرنے کا حقدار ہو سکے۔ یہ عمر ۳ سال سے ۱۶ سال تک کی ہے۔ ان قواعد سے اوقات تعلیم کا بھی پتہ چلتا ہے جن کا حساب یہ ہے کہ لڑکوں یا لڑکیوں کے مدارس یا مخلوط تعلیم کے مدارس میں کم از کم دو گھنٹے تک تعلیم دی جائے اور انفنٹ اسکول میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ۔ یہ قواعد سال بھر کے خاص خاص حالات کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ مثلاً مجبوری کی بنا پر مدرسے کو انتخاب ممبری یا کسی چھوت کی بیماری کے سبب بند کر دینا پڑا ہو۔ ان قواعد کی رو سے ہر مدرسے میں رجسٹر داخل خارج، رجسٹر حاضری اور رجسٹر کوائف مدرسہ ہونے لازمی ہیں۔

مقامی افسران تعلیم، اور پبلک ابتدائی مدارس کی تعلیم کے ذمے دار ہیں۔ ان افسروں کا محکمہ ان مدارس کے قیام کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے جنھیں کسی قسم کی گرانٹ نہیں دی جاتی اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مدرسہ اس محکمے کی ہدایات کے بموجب غیر مذہبی تعلیم کو جاری رکھے۔ چنانچہ اس محکمے کے احکام متعلقہ اوقات مدرسہ، تعطیلات اور بچوں کا داخلہ کی پابندی لازمی ہے۔

حاضری طلبہ کی یادداشت رکھنے میں، مقامی افسروں کا طرزِ عمل اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ گرانٹ کی ادائگی، پیش کردہ شہادت کی بنا پر، کی جاتی ہے۔ چنانچہ مدرسہ اور دفتر محکمۂ تعلیم کے مابین ہفتہ وار، سہ ماہی اور سالانہ نقشہ جات اعداد و شمار کا سلسلہ جاری رہتا ہے محکمۂ مقامی تعلیم کی طرف سے سہ ماہی اور سالانہ نقشہ جات تعلیمی بورڈ کے پیش کیے جاتے ہیں حاضری کے رجسٹروں کی پڑتال مدرسے کے منتظم کرتے ہیں اور اگر محکمہ حاضری کا مقامی افسر دو سال میں کم از کم ایک مرتبہ اچانک معائنہ کرے تو یہ کافی سمجھا جاتا ہے۔

حاضری مدرسہ کے لازمی کرنے میں جدت کو بھی دخل دیا جا سکتا ہے۔ ایک لفنیگا

اپنے تجربے کی بنا پر یوں رقم طراز ہیں: "میں نے ایک مرتبہ چاہا کہ اسکول کی حاضری کے متعلق ایک اسکیم تیار کی جائے۔ میں نے اس معاملے میں تین امور کو مدِ نظر رکھا۔ یعنی (۱) مدرسے کا افسر۔ (۲) افسر کا حلقۂ معائنہ (۳) حاضری کے ذرائع۔ چنانچہ میں نے تمام عارضی افسروں کو برطرف کر کے ان کی جگہ مستقل سٹاف تعینات کیا۔ اس سٹاف کے افراد خاص ضلعوں کے لیے مخصوص نہیں کیے گئے، بلکہ انھیں سیلانی حیثیت سے رکھا گیا۔ اگرچہ کسی افسر کے میلانِ طبع یا اس کے تبادلے کے اخراجات کا لحاظ ضروری سمجھا گیا تھا تاہم ان افسران کے فرائض میں سب سے ضروری فرض برقرار دیا گیا تھا کہ وہ ہر مقام کے معائنہ کے دوران میں طلبہ کی حاضری کو لازمی کرنے پر زور دیں اور جس افسر کے حلقے کی حاضری خاطر خواہ ہو۔ وہی افسر اپنے کام میں دوسروں سے فائق سمجھا جائیگا۔ اس طریق سے مقابلہ کی روح پیدا کر دی گئی۔ نتیجہ خاطر خواہ ہوا۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حاضری کو کیونکر لازمی اور جبری قرار دیا جائے، بیشتر اس کے کہ والدین پر کسی قسم کی قانونی پابندی عائد کی جائے۔ چار منازل سے عبور کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلی منزل اسکول کے اوّل مدرس کی ذاتِ شریف ہے۔ جس کے اثر اور اختیار کو رد نہیں کیا جا سکتا اگرچہ یہ درست ہے کہ بڑے شہری اسکول میں اوّل مدرس ذاتی طور پر ہر کس و ناکس کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس کے رسوخ کو بہت دخل ہوتا ہے۔ تمام غیر حاضر طلبہ کے متعلق اس کو جواب دہ ٹھہرانا چاہیے۔ چنانچہ اسی نوع کی ہدایات افسر معائنہ کے نام جاری کر دی جاتی ہیں کہ وہ غیر حاضر طلبہ کے متعلق اوّل مدرس ہی سے استفسار کرے۔ اگر اس حربہ کا استعمال خاطر خواہ کیا جائے تو تجربہ شاہد ہے کہ عموماً حاضری قابلِ اطمینان ہوتی ہے۔ حاضری کے لیے اوّل مدرس کی تفتیشی فارم (نقشہ) کو جو در اصل دیہاتی مدارس کے لیے مخصوص ہے، شہری مدارس کے لیے بھی مؤثر پایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اوّل مدرس ہفتہ وار نقشے کی تیاری کا بھی جواب دہ ہے۔

جس میں غیر تسلی بخش حاضری والے طلبہ، ہفتے کی اوسط حاضری اور مدرسین کی غیر حاضری یا رخصت کا اندراج بھی کیا جاتا ہے۔

دوسری منزل کا نگران یہ افسر، اوّل مدرس کی مہیا کردہ مذکورہ بالا فہرست یا نقشے کی بنا پر غیر حاضر طلبہ کے گھروں میں جاتا ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس افسر کو بار بار گھروں میں نہ جانا پڑے۔ حسب ضرورت یہ افسر والدین کے لیے تنبیہ کی ایک مطبوعہ فارم کا استعمال کرتا ہے۔ اور اگر اس کا یہ حربہ کامیاب نہ ہو تو تیسری منزل آتی ہے۔

تیسری منزل وہ ہے جو ہر ضلعے میں مختلف صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ کسی ضلعے میں تو والدین کی ملاقاتی کمیٹی جداگانہ قائم ہے کہیں مدرسے کی انتظامیہ انجمن ہی اس کام کو اپنے ذمے لیے ہوئے ہے۔ غرض ایک ایسی جماعت جگہ جگہ قائم ہے جس کے سپرد وہی کام ہے جو افسر حاضری مدرسہ سے متعلق ہے۔ گو بعض اضلاع کے منتظم مدارس، اس کام کو پسند نہیں کرتے تاہم ایسی انجمنیں یہ کام بخوبی انجام دیتی ہیں۔ عملاً ان انجمنوں کو دست اندازی کرنے کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ان کا وجود ہی والدین کے حق میں تازیانے کا کام کرتا ہے۔ اس کام کا بیشتر حصہ افسر حاضری مدرسہ ہی انجام دیتا ہے۔ وہ والدین کو یہ نوٹس دیتا ہے کہ آپ مجلس منتظمہ کے روبرو پیش ہو کر بچے کی غیر حاضری کے لیے جواب دہ ہوں۔

چوتھی منزل پر پہنچ کر ہم ایک اور مجلس سے دوچار ہوتے ہیں جو نہ فقط افسر حاضری طلبہ کی رپورٹ پر غور و خوض کرتی ہے بلکہ ضلع کی ماتحت انجمن یا منتظمین تعلیمی کی سفارشوں کو بھی اپنے سامنے رکھتی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مقامی افسران تعلیم کی مجلس میں سے کسی دو ارکان کے ایما سے ایسے والدین کو زیر دفعہ ۴۴ ایکٹ تعلیم ۱۹۲۱ء ماخوذ کرائے جو اپنے بچوں کو مدارس میں نہیں بھیجتے۔

اس تمام کارروائی سے جو مستقل نتائج ظہور پذیر ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱ - افسر حاضری مدرسہ ہمیشہ کے لیے کسی ایک ضلع سے وابستہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے مرکزی افسر کی ہدایات کے بموجب مختلف مقامات میں عامل ہونا چاہیے۔

۲ - اوّل مدرس کی شخصیت اور مدرسے کا اثر، حاضری طلبہ میں ممد ہونے کے لیے، نہایت قوی ثابت ہونے چاہییں۔ گھروں میں افسروں کو بہت کم جانا چاہیے۔

۳ - افسر حاضری مدرسہ کے فرائض اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اس کا یہ عہدہ محض حاضری تک ہی محدود نہیں رہا۔ اس کے فرائض میں مدارس کا طبی معائنہ، صحت پر لیکچر، زراعتی لکچر، مدارس کے سامان کی فراہمی، ادائگی رقومات، دیہاتی کتب خانوں کی تنظیم، نوٹس وغیرہ کا اجرا، رجسٹر اطفال شماری کی تکمیل، گھروں کا معائنہ، کھیل کے میدانوں کی فہرست مرتب کرنا، وغیرہم شامل ہیں۔ لہٰذا اس عہدے کا کوئی اور نام رکھنے کی ضرورت ہے

(باقی)

اُردُو کا تلفظ

از

غلام جیلانی صاحب برق ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل

مصدر

عربی مصادر کے اوزان کافی تعداد میں ہیں۔ ان کی شناخت کا قاعدہ صرف یہی ہے۔
کہ اگر کسی لفظ کے اُردو میں معنے کیے جائیں اور آخر میں مصدری "نا" آجائے۔ تو وہ مصدر ہے مثلاً:
تکریم (عزت کرنا)، غُرور (اکڑنا)، تفاخُر (فخر کرنا)، اِقدام (آگے بڑھنا)، وغیرہ
اب مختلف اشکالِ مصدر پر جداگانہ بحث کی جائیگی۔

(۱) اِ فْ عَ الْ (اِفْعال) نوٹ: اقیذ کیلئے ملاحظہ ہو جیم (۱)

(قاعدہ) چار حرفی مصدر۔ پہلا اور چوتھا حرف "الف" پڑھتے وقت پہلے الف کے نیچے زیر دینگے مثلاً
اِنعام۔ اِنصاف۔ اِکرام۔ اِقدام۔ اِعلان۔ اِقرار۔ اِنکار۔ اِسلام۔ ایمان۔ اقبال (آگے بڑھنا) وغیرہ

(۲) تَ فَ عُّ لْ (تَفَعُّلْ)

قاعدہ) چار حرفی مصدر پہلا حرف "ت" تیسرا "مُشَدَّد" پڑھتے وقت پہلے پر زبر اور تیسرے پر
پیش دینگے۔ مثلاً:۔
تَدَبُّر (سوچنا)، تَفَکُّر۔ تَغَیُّر۔ تَنَفُّر (نفرت کرنا)، تَصَرُّف۔ تَسَلُّط۔ تَعَفُّن (بدبودار ہونا)،
تَلَفُّظ (بولنا)، تَبَرُّک۔ تَفَرُّق۔ تَشَتُّت (پریشان ہونا) تَقَرُّب۔ تَوَسُّل۔ تَعَلُّم (دیکھنا)۔

(۳) تَ فَ ا عُ لْ (تفاعُل)

(قاعدہ) پنج حرفی مصدر۔ پہلا حرف "تا"، تیسرا "الف" پڑھتے وقت پہلے کو زبر اور چوتھے کو پیش

مثلاً: تجاوز (حد سے بڑھنا) تواتر۔ تقاضہ۔ تعارض (ایک قول کا دوسرے سے مخالف ہونا)۔
تقابل۔ تساہل۔ تغافل۔ تکاہل (سست ہونا) تعاون۔ توازن۔ وغیرہ۔

(۴) مُ فَ ا عَ لَ ہٗ (مُفَاعَلَہ)

علامہ) شش حرفی مصدر۔ پہلا حرف "میم" تیسرا "الف"۔ چھٹا "ہ" پڑھتے وقت پہلے کو "پیش" اور چوتھے کو زیر دینگے۔ مثلاً:
مُطالعہ (نوٹ۔ یہ لفظ عموماً غلط یعنی بکسرِ لام استعمال ہوتا ہے) مُقابلہ۔ مُوازنہ۔ مُناظرہ۔
مُباحثہ۔ مُعاملہ۔ مُقاطعہ۔ مُکالمہ۔ مُحاصرہ۔ مُعانقہ (گلے ملنا) وغیرہ۔
اس شکل کے عربی مصادر کم و بیش ۵۰۰ اردو میں مستعمل ہوتے ہیں۔

(۵) تَ فْ عِ لَ ہٗ (تفعِلہ)

علامہ) پنج حرفی مصدر۔ پہلا حرف "ت" آخری "ہ"۔ پڑھتے وقت پہلے کو "زبر" اور تیسرے کو زیر دینگے۔ مثلاً:
تجرِبہ۔ تذکرہ (ذکر چھیڑنا۔ وعظ کرنا) تبصرہ۔ تکملہ۔ تفرقہ۔ تجزیہ (اجزا میں بانٹنا)۔
تحلیہ (غلطی پکڑنا) تصفیہ۔ تعزیہ (ماتم پرسی کرنا) تشریہ (پاک صاف کرنا۔ اخلاطِ فاسدہ کو دور کرنا) وغیرہ

(۶) اِ فْ تِ عَ ا لْ (اِفتِعال)

علامہ) شش حرفی مصدر۔ پہلا و پانچواں حرف "الف" پڑھتے وقت پہلے اور تیسرے کے نیچے زیر پڑھینگے (نوٹ) چونکہ ایک اردو طالب علم کے لیے "اِفتِعال" و "اِنفِعال" میں امتیاز قائم رکھنا لاحاصل ہے۔ پھر اعراب ہر دو اوزان کا ایک ہے۔ اس لیے امثلہ میں کوئی تمیز نہیں کی گئی) مثلاً: اِنتظار۔ اِعتبار۔ اِرتکاب۔ اِنقسام (تقسیم ہونا)
اِشتعال۔ اِنقلاب۔ اِنفعال (شرمسار ہونا) اِنہماک۔ اِمتحان۔ امتیاز۔ وغیرہ۔

(۷) اِس تِ فْ عَ اْل (اِسْتِفْعَال)

قاعدہ۔ ہفت حرفی مصدر۔ پہلا حرف "الف" دوسرا "س" تیسرا "ت" اور چھٹا "الف" پڑھتے وقت پہلے اور تیسرے کو زیر دینگے۔ مثلاً:

استقلال۔ استخراج (نتائج نکالنا) استنباط۔ استقبال۔ استفہام (سمجھنا) استعمال استصواب (مشورہ کرنا) استبداد (ظلم توڑنا) استحقاق۔ استحکام۔ استدلال استغراق (محو ہنا) استغفار (معافی مانگنا) استفسار۔ استسقاء (بارش کی دعا مانگنا) استمداد۔ استیلا (غالب آنا) استہزاء۔ استیصال (جڑ سے اکھیڑنا)۔

(۸) تَ فْ عِ یْ ل (تفعیل)

قاعدہ: پنج حرفی مصدر۔ پہلا حرف "ت" چوتھا "ی" پڑھتے وقت پہلے کو "زبر" اور تیسرے کو زیر دینگے۔ مثلاً:

تدبیر۔ تجویز۔ تسکین تسلیم۔ تخریب۔ ترمیم۔ تعمیر۔ ترکیب۔ تبدیل تجدید وغیرہ

(۹) فُ عُ وْ ل (فُعُول) (نوٹ: ملاحظہ ہو اسم فاعل نمبر۲ جمع نمبر۲)

(قاعدہ) اگر چار حرفی مصدر کا تیسرا حرف "و" ہو۔ تو پہلے حرف پر پیش دی جائیگی۔ مثلاً:

عُرُوج (چڑھنا) ہُبُوط (اترنا) قُبُول۔ ظُہُور۔ مُرُور۔ عُبُور۔ فُتُور۔ قُصُور۔ دُخُول خُشُوع وغیرہ (نوٹ: ان الفاظ کو بیشتر لوگ غلط بولتے ہیں)

اسم ظرف

عربی میں اسم ظرف کے مختلف اوزان اور مختلف قواعد ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں میں اس ضمن میں صرف ایک وزن کا ذکر کرونگا۔ جو اُردو میں کثیر الاستعمال ہے۔ وہ یہ ہے:۔

مَ فْ عِ لْ (مَفْعِل)

علامہ) اگر چار حرفی اسم ظرف کا پہلا حرف "میم" ہو تو پڑھتے وقت پہلے پر زبر اور تیسرے کے نیچے زیر پڑھینگے۔ مثلاً:۔

مَشرِق (نکلنے کی جگہ) مَغرِب۔ مَسجِد۔ مَحِل۔ مَنزِل مَجلِس۔ مَعدِن۔ مَسکِن (بکسرو بفتح کاف ہر دو صورتیں درست ہیں) مَطلِع (مفتوح لام بھی درست ہے)

نوٹ۔ یہ قاعدہ جامع مانع نہیں۔ اس لیے مندرجۂ ذیل اسماءِ ظروف مستثنٰی ہیں۔ ان کے تیسرے حرف پر بجائے "زیر" کے "زبر" پڑھی جائیگی۔

مَصدَر۔ مَظہَر۔ مَنظَر۔ مَخزَن۔ مَبدَأ۔ مَجمَع۔ مَقتَل۔ مَدخَل۔ مَخرَج۔ مَطلَع۔ مَرقَد۔ مَرکَز۔ مَسنَد۔ مَشغَل۔ مَشہَد۔ مَحبَس (قید خانہ)

اِسمِ آلہ (کسی ہتھیار یا اوزار کا نام)

عربی کا صرف ایک اسم آلہ عموماً اُردو میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی،

مِ فْ عَ اْ لْ (مِفعال)

علامہ) پنج حرفی اسم آلہ۔ پہلا حرف "میم"۔ چوتھا "الف" پڑھتے وقت پہلے کو "زیر" دینگے۔

مِنقار (چونچ) مِقراض (قینچی) مِسواک۔ مِفتاح۔ مِزمار (رباب) مِشکٰوۃ (چراغ) مِضراب (رباب بجانے کا آلہ) وغیرہ

قواعد مندرجۂ بالا کو اگر ایک اُردو کا طالب علم ازبر کرلے۔ تو مجھے یقین ہے کہ اُس کا فی صدی تلفظ درست ہو جائے۔ اس لیے کہ یہ اوزان ہزارہا الفاظ پر حاوی ہیں۔ اوراق گزشتہ خاصیل کو سہولت کے لیے میں ایک جدول میں ملحضاً درج کرتا ہوں۔

نمبر شمار	اصطلاح	وزن	امثلہ
۱	اسم فاعل	فاعِل	طالِب ۔ ماہِر ۔ شاعِر
۲	″	مُفعِل	مُجرِم ۔ مُخلِص ۔ مُنصِف
۳	″	مُفَعِّل	مُحرِّر ۔ مُوثِّر ۔ مُقرِّر
۴	″	مُنفَعِل	مُنقَسِم ۔ مُنتَظِم ۔ مُنتَقِم
۵	″	مُفَاعِل	مُخاطِب ۔ مُقابِل ۔ مُحافِظ
۶	″	مُتَفَعِّل	مُتَدَبِّر ۔ مُتَصَرِّف ۔ مُتَکَبِّر
۷	″	مُفتَعِل	مُمتَحِن ۔ مُشتَعِل ۔ مُضطَرِب
۸	″	فَعُول	نَفُور ۔ غَفُور ۔ ظَلُوم
۹	اسم مفعول	مُفعَّل	مُعَزَّز ۔ مُشَرَّف ۔ مُکَرَّم
۱۰	جمع	اَفعال	اَخلاق ۔ اَمثال ۔ اَعمال
۱۱	″	مُفاعِل	مَساجِد ۔ مَکاتِب ۔ مَطالِب
۱۲	″	فُعَلاء	اُمَرَاء ۔ شُعَرَاء ۔ اُدَباء
۱۳	″	فِعَال	رِیاض ۔ صِفات ۔ بِلاد
۱۴	″	فُعّال	عُشّاق ۔ خُدّام ۔ تُجّار
۱۵	″	اَفعِلا	اَتقِیا ۔ اَنبِیا ۔ اَشقِیا
۱۶	″	اَفعِلہ	اَجوبہ ۔ اَسلِحہ ۔ اَلسِنَہ
۱۷	″	فِعَل	ہِمَم ۔ حِصَص ۔ حِیَل
۱۸	″	فُعُول	قُبُور ۔ اُمُور ۔ سُطُور

نمبر شمار	اصطلاح	وزن	امثلہ
۱۹	مصدر	اِفعال	اِنعام - اِکرام - اِقدام
۲۰	〃	تَفَعُّل	تَصَرُّف - تدبُّر - تغیُّر
۲۱	〃	تفاعُل	تَواتُر - تَجاوُز - تفاخُر
۲۲	〃	مُفاعَلہ	مُقابلہ - مُطالعہ - مُباحثہ
۲۳	〃	تَفعِلہ	تَجرِبہ - تَذکِرہ - تَجزِیَہ
۲۴	〃	اِفتِعال	اِنتِظار - اِرتِکاب - اِشتِعال
۲۵	〃	اِستِفعال	اِستِقلال - اِستِقبال - اِستِفسار
۲۶	〃	تفعیل	تدبیر - تنظیم - تجویز
۲۷	〃	فُعُول	عُرُوج - قُصُور - قبُول
۲۸	اسم ظرف	مَفعِل	مَسجِد - مَجلِس - منزِل
۲۹	〃 آلہ	مِفعال	مِقراض - مِضراب - مِنقار

چار حرفی تا ہفت حرفی الفاظ کے لیے تذکرۂ بالا قواعد سپردِ قلم کرنے کے بعد میں اب یہاں تین جدول درج کرتا ہوں۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) پہلا جدول اُردو زبان کے صرف اُن سہ حرفی الفاظ پر مشتمل ہوگا کہ جن کے درمیانی حروف کہیں ساکن ہیں اور کہیں متحرک۔ میں نے اُن الفاظ کو عمداً نظر انداز کر دیا ہے جن کے تلفظ میں کوئی دقت پیش نہیں آتی یعنی، جن کا درمیانی یا آخری حرف حروفِ علت (و۔ ا۔ ی) میں سے کوئی ایک ہو۔ مثلاً: مال۔ دال۔ دُور۔ نُور۔ علی۔ ولی، گرُو، سبُو، شور۔ نعرہ، دیر، خیر، پیر۔ میر، حیا۔ بقا، وغیرہ جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

۲ - دوسرے جدول میں اُن الفاظ کو معانی تمیت درج کیا جائیگا - جو ہم شکل ہونے کے باوجود مختلف التلفظ اور مختلف المعانی ہیں۔

۳ - تیسرا جدول اُن الفاظ پر حاوی ہوگا - جو باوجود مختلف ہونے کے ہم آواز و ہم تلفظ ہیں۔

ان تینوں جداول اور گذشتہ قواعد کا مطالعہ اُردو معلم و متعلم کی تلفظی دقتوں کو بڑی حد تک دور کرے گا۔

جدول اوّل

سہ حرفی الفاظ

الف	اَحَدْ (ایک)	اُگْرْ	اُنْسْ	بُرْجْ	بِکْرْ
اَبَدْ	اَدَبْ	اُلٹْ	**ب**	بَرَسْ	بِگُلْ
اَبْرْ	اَدَقْ	اَلِفْ	بَتَرْ	بُرِشْ (کاٹ)	بِنْتْ
اِبْنْ	اِثْاثْ (میراث)	اَلَکْ	بَحَثْ	بَرَصْ	**پ**
اُبَجْ (نئی بات)	اَشْپْ	آلَمْ	بَخْتْ	بَرْگْ	پِتَرْ (اجداد)
اُتَرْ (شمال)	اِسْمْ	اُمَّتْ	بُخْلْ	بَزْمْ	پُتْرْ (بیٹا)
اُتَلْ	اَشَدْ	اَمِٹْ	بَدْر (چودھویں کا چاند)	بَشَتْ	پَچَّرْ
اَثَرْ	اَشَکْ	آمَرْ	بَدْرْ (باہر)	بَشَرْ	پَدَرْ
اُجَدْ	اَصَحْ	اَمَنْ	بَدَلْ	بُعْدْ	پَرَہ
اَجْرْ	اَصَلْ	اَنْتْ (انجام)	بَدَنْ	بَعْدْ	پِسَرْ
اَجَلْ	اَقَلْ	اِنْسْ	بَرَتْ	بُغْضْ	پَشْمْ

پَلَک
پھَبَن
پَہَر
پَھَل

ت

تَبَر
تُپَک (بندوق)
تَپَک (دھڑکن)
تَرَش
تَرَک
تُرُک
تَعَب
تَلَخ
تَلَف
تِلَک
تُنُک

ٹ

ٹَبَر
ٹَپَک
ٹَٹَر
ٹَسَک
ٹِکَٹ
ٹَکَر

ث

ثَبَت
ثِقَل
ثُلُث
ثَمَر
ثَمَن (قیمت)

ج

جَبَر
جَبَل
جُبُن
جَتَن
جَدَل
جَذَب
جَذَر (اصلاح ریاضی)
جَرَح
جَرْس
جِسْم (جسم)
جُسْم
جُرْءَہ
جَزْر (مدوجزر)
جَزْم (سکون)
جَسْت (کودنا)
جُسْت (تلاش)
جَسْر (پل)
جِسْم
جَشْن
جُفْت
جِگَت
جِگَر
جُگَل (جوڑی)
جَلْب
جِلْد
جَلْق
جَمْع
جَلْس
جَزْم
جَھْل
جِہَت
جَہْد

چ

چَپَک
چَپَل (سلیپر وغیرہ)
چَتَر
چُٹَک
چِدَر
چَرَب
چَرَخ
چَرَس
چَرَک
چَرَم
چَرَن
چَشَم
چُغَد
چِلَم
چَلَن
چَمَک
چَمَن
چِہَل (چالیس)
چُہَل (رونق)

ح

حَبْش
حَبَش
حَبَل (رسی)
حَجَر
حَجَم (Bulb)
حِدَّت
حَرَب
حَرَث (کھیتی)
حَرَز (تعویذ)
حَرَص
حَرَف
حَرَم
حَزَم (ہشیاری)
حُزْن
حَسَب (خاندان)
حَسْب (مطابق، کافی)
حَسَد
حُسْن
حَشَر
حَشَم
حَضَر
حَضَر (خانگی زندگی)
حِفْظ
حُکْم
حَکَم (ثالث)
حِکَم (جمع حکمت)
حَلَف
حَلَق
حِلْم
حَمْد
حُمْق

حَمَل	خَطَر	دَرْس	ڈ	رَزْم	رَمَق
خ	خُلْد	دَرْک	ڈَبَل	رَسَد	رَوِش
خَبَر	خَلْط (ملنا جلنا)	دِرَم	ڈَگَر	رُسُل	ز
خَبْط	خِلْط (مفرد اخلاط)	دُرَّہ (کوڑا)	ذ	رَسْم	زَجْر
خَتْم	خَلِش	دَرَّہ (پہاڑی درہ)	ذَبْح	رَسَن	زَخْم
خَجِل	خَلَف	دُزْد	ذَقَن	رُشْد (ہدایت)	زَٹَل
خَنجَر	خُلْق	دَشت	ذَنَب (گناہ)	رَشْک	زُحَل
خَرْج	خَلْق	دَشت	ر	رَصَد	زَرْد
خِرَد (عقل)	خَلَل	دَغَل (کمینہ)	رَابِط	رُطَب	زَرْع
خُرْد (چھوٹائی)	خَمْر	دَفْع	رُبْع	رَغْم	زُرَق
خِرْس	خَمْس (پانچ)	دِقَّت	رَبْط	رِفْض	زُعْم
خُرسَم	خُمْس (۱/۵)	دَلْق	رَتْق	رَفْع	زَمَن
خَرَق	خُنَک	دَلْو	رَجَب	رِفْق	س
خِسَّت	د	دُوم	رَجَز	رَمَل	سَبْت (عیسائیوں
خُسر	دَخَل	دُہَل (ڈھول)	رَجْم	رِقَّت	کا متبرک دن)
خِشْت	دَرْج	دَہَل (ڈرنا)	رِحْم (بچہ دانی)	رَقْص	سَبْز
خُشْک	دُرْج (ڈبیہ)	دَہَن	رَحْم	رَقَم	سَبَق
خَشْم	دَرْد	دِین	رَخْت	رُکْن	سَبُک
خَصْم	دُرْد (تلچھٹ)	دَین (قرض)	رِزْق	رَمْز	سُبُل (جمع سبیل)

سِپَر	سَقَر	شَرْح	شَمْس	ضَبْط	طَمَع
سِپَہ	سَقْف	شَرَر	شَمْع	ضَرْب	طَمْث
سَتْر	سُقْم	شَرْط	ص	ضَرَر	ظ
سِتْر (پردہ)	سُکْر (مستی)	شَرْع	صُبْح	ضُعْف	ظَرْف
سِتَم	سَلَف	شَرَف	صَبْر	ضِلْع	ظَفَر
سَجَع	سِلْک (دھاگہ)	شَرْق	صَدْر	ضِمْن	ظُلْم
سَجَن	سِمْت	شِرْک	صَدَف	ط	ظُہْر (سہ پہر)
سَحَر	سَمْع	شَرْم	صِدْق	طَبْع	ظَہْر (پشت)
سِحْر (جادو)	سَمَن (چنبیلی)	شِسْت	صَرْف	طَبَق	ع
سَخْت	سِمَن	شَشُم	صِغَر (چھوٹائی)	طَبْل	عَبَث
سُخَن	سَنَد	شِعْر	صَفَر (مہینہ)	طَرَب	عَبْد
سُرْخ	ش	شُغْل	صِفْر	طَرْح (بنیاد)	عَجَب
سَرْد	شِبْہ (شباہت)	شَصْت	صُلْب	طَرَح	عَجْز
سَرَک	شُبْہَہ (شک)	شَفَق	صُلْح	طَرْز	عَجَم
سُسْت	شُتُر	شُکْر	صِلَہ	طَرَف	عِدَّت
سُمَر	شَجَر	شَکَر	صِنْف (قسم)	طُرَّہ (زلف)	عَدَد
سَطْح	شَخْص	شَکْل	صَنَم	طَشْت	عَدْل
سَعْد	شِدَّت	شِکَم	صُوَر (جمع صورت)	طِفْل	عَدَم
سَفَر	شُرْب	شِکَن	ض	طَلَب	عَدُو

عذر	عقب (پیچھے)	غرہ (نیا چاند)	فضا	قدم	قلت
عرب	عقد	غلط	فضل	قدم (قدامت)	قلق
عرش	عقل	ف	فطر	قرب	قلم
عرش	عکس	فتح	فعل	قرش	قمر
عرض	علف	فحش	فقر	قرض	قمع (قلع)
عرف	علم	فجر	فقط	قرق	قمز
عرق	علم (جھنڈا)	فخر	فلز (دھات)	قرن	ک
عزل	عمر	فرح	فکر	قسط	کبت
عزم	عمق	فرخ	فلک	قسم	کبد (جگر)
عسس	عمل	فرد	فہم	قسم	کبر (بڑائی وغرور)
عسل	عنب (انگور)	فرش	ق	قشر	کبر (بڑھاپا)
عشر	عوض	فرض	قبح	قصد	کتب
عشق	غ	فرط	قبر	قصر	کتب
عصب (پٹھا)	غبن	فرع	قبض	قطب	کحل
عصر	غدر	فرق	قبل	قطر	کذب
عضو	غرب	فسخ	قتل	قطع	کرم
عطر	غرض	فسق	قدح	قفس	کرم (کیڑا)
عفت	غرق	فصد	قدر	قفل	کرم (رحم)
عفو	غرہ (مغرور)	فصل	قدس	قلب	کرن

کڑک	کہن	لخت	مثل	مسخ	مگس
کتب	گ	لذت	مثل	مسن (بوڑھا)	مگن
کتم	گبر	لطف	محب	مشت	ملث
کسل	گذر	لقب	محض	مشر (برہمن)	ملح (نمک)
کشت	گرج	لعل	محک	مشق	ملخ
کشت (کھیتی)	گرو	لعن	محل	مشک	ملک (قبضہ)
کشف	گرد	لغت	محن	مشک (کستوری)	ملک
کفر	گرم	لغز (پہیلی)	محو	مشن	ملک (بادشاہ)
کفش	گہن	لغو	مخل	مصر (شہر)	ملک (فرشتہ)
کفن	ل	لفظ	مداح	مصر (اصرار کرنیوالا)	ملن
کفو (قبیلہ وذات)	لپٹ (شعلہ)	لکڑ	مدد	مضر	ممد
کلب (کتا)	لپک	لگن	مرز	مغز	ممر (راہ)
کلب	لٹک	لمس	مرز (ملک)	مغل	منت (نذر)
کلیب	لچر	لنج	مرض	مفت	منت
کلش	لپٹ	م	مرغ	مفر (جائے فرار)	منٹ
کلک	لچھن	متر	مرگ	مقر (اقرار کرنیوالا)	منش (خو)
کمر	لحد	متن	مرد	مقر (جائے قرار)	منع
کنک	لحم (گوشت)	مٹھ	مست	مکر	مہر
کنز	لحن (آواز)	مٹک	مسلخ	مگر	مہر

مَهْر	نَزْم	نَفْر	نُمُوّ	وَصْف	هَرْج
مَهَك	نَزْع	نَفَس (سانس)	نَهْم	وَصْل	هَرْن
مُهِمّ	نَشْب	نَفْس (روح)	و	وَضْع	هَشْت
مَيِّت	نَشْع	نَفْع	وَجَب (باش)	وَطَن	هَضْم
ن	نَسْق	نَعْل	وَجْد	وَقْت	هَفْت
نَبْض	نَسْل	نَقْب	وَجَع (درد)	وَقْف	هِمَّت
نَثْر	نَصْب	نَقْد	وَجْه (منہ)	ہ	هِمَم (جمع ہمت)
نَجْم	نَصْر	نَقْش	وَرْد (گلاب کا پھول)	هَبْد	هُنَر
نَحْو	نَصْف	نَقْص	وِرْد (وظیفہ)	هَتَك	هَوَس
نَخْل	نُطْق	نَقَل	وَرَق	هِجْرَة	ی
نِذْر	نَظَر	نُقْل	وَرَم	هَجْو	يَمّ
نَذْر	نَظْم	نَمَك	وَزْن	هَدَف	يَمَن
نُزُو	النِعَم (جمع نعمت)	نَمَط	وَسَط	هَدَم (گرانا)	يُمْن (برکت)

جدولِ بالا میں تمام الفاظ کی تعداد ۶۷۲ ہے۔ جن میں سے ۴۵۵ یعنی ۶۸ فیصد عربی الفاظ ہیں اور ۲۱۷ غیر عربی۔ متقدم الذکر الفاظ عربی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ اردو لغات نے اعراب میں نہایت غیر ذمے داری سے کام لیا۔ فرہنگِ آصفیہ جیسا لغت میں بھی بعض الفاظ کا اعراب غلط دیا ہوا ہے۔ دیگر لغات کے مصنفین نے نہایت

سہل انگاری سے کام لیا۔ فرہنگ کے بغیر باقی اُردو لغات میں ایک تہائی الفاظ کا تلفظ غلط دیا ہوا ہے۔ بعض غیر عربی الفاظ کے سامنے "عربی" لکھ دیا گیا۔

میں نے جدول بالا میں دو باتوں کا نہایت احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا ہے۔ اول یہ۔ کہ کسی لفظ کا اعراب غلط نہ دیا جائے۔ دوم یہ کہ کسی غیر عربی الفاظ کو عربی نہ بنایا جائے۔

اس نقشہ میں تمام وہ سہ حرفی الفاظ آجاتے ہیں۔ جو اُردو میں استعمال ہو رہے ہیں بعض حروف کو (جن کے اعراب میں کوئی دِقت نہ تھی) عمداً نظر انداز کر دیا گیا۔

ضبط غیر از سزائے جسمانی

از

مولوی عبدالحکیم صاحب تدبیر منشی فاضل مددگار مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل

اگرچہ ہر مدرس کے لیے سزائے جسمانی کے ذریعے طلبہ میں ضبط قائم کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن ایسا ضبط در حقیقت ضبط کی تعریف میں داخل نہیں ہے اور نہ اس پر ضبط کے حقیقی معنی صادق آسکتے ہیں۔ کیونکہ سزائے جسمانی کا خوف یا ظالمانہ تشدد ایسی چیز ہے کہ اس سے رہزن کی رہزنی دور ہو جاتی ہے اور ظالم سے ظالم شخص بھی اپنے ظلم کا وتیرہ بدل دیتا ہے معصوم اور کمسن بچے اپنی شرارت سے باز آسکتے ہیں لیکن جہاں تک غور کیا گیا ہے کسی مدرس کے ظالمانہ تشدد سے عام طور پر بچوں میں بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر اس سے بغاوت کا اندیشہ پیدا ہوا ہے بعض طلبہ پر اس کا اتنا اثر ہوا ہے کہ وہ مدرسے کو خیرباد کہ گئے ہیں اور بعض شریف طالب علموں کی قوت گویائی ہمیشہ کے لیے سلب ہو گئی ہے۔

مدرسی کے فن کا کامیاب اصول یہ ہے کہ بغیر سزائے جسمانی کے ضبط قائم ہو جائے نظیری نیشاپوری کا شعر ہے۔

یک بانگ ذوق گرمیٔ ما را کفایت است   حاجت بہ تازیانہ ندارد ادیب ما

یعنی ہمارے استاد کو تازیانہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری سرگرمی کے لیے ایک ایسی آواز کافی ہے جس سے ذوق کا اظہار ہو۔ فی الحقیقت ذوق علمی کے ہوتے تازیانہ کی ضرورت نہیں ہوتی عموماً طلبہ میں جن امور سے بغیر سزائے جسمانی کے ضبط قائم ہو جاتا ہے بعض تو خود مدرس

کی ذات سے وابستہ ہیں اور بعض مدرسہ اور مدرسہ کے ماحول سے، چنانچہ ہم پہلے ان چیزوں کو بیان کرینگے جن کا تعلق خود ذاتِ مدرس سے ہے پھر اس کے بعد ایسی باتیں بیان کی جائینگی۔ جو مدرسہ اور مدرسہ کے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔

سب سے پہلے جو چیز طلبہ میں ضبط قائم کرنے کے لیے مؤثر ہے وہ مدرس کی اعلیٰ علمی لیاقت یا معیارِ قابلیت ہے۔ جس قدر کسی مدرس کی لیاقت یا قابلیت اعلیٰ ہوگی اُسی قدر طلبہ مدرس سے عقیدت رکھیں گے اور مدرس کے زیر اثر کام کرینگے۔ کیونکہ یہ ایک انسانی خاصہ ہے کہ عموماً ادنیٰ درجے کے لوگ اعلیٰ درجے کے لوگوں سے مرعوب ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً: غریب آدمی تونگروں سے، کم طاقت طاقتوروں سے، محکوم حاکموں سے، اسی طرح کم لیاقت اعلیٰ لیاقت والوں سے مرعوب ہو جانا کرتے ہیں۔ اگر کسی مدرس کی علمی لیاقت شاگردوں کی لیاقت کے مساوی ہو تو رعب وادب باقی نہیں رہتا۔ مثلاً: ایک مدرس ساتویں جماعت پاس ہو اور ساتویں کو ہی پڑھاتا ہو تو طلبہ کبھی اس کے زیر اثر نہیں رہ سکتے۔ بخلاف اس کے جہاں مدرس کی لیاقت میٹرک کی ہو اور طلبہ ہفتم جماعت کے ہوں تو ایسے طلبہ ضرور اثر لینگے اسی طرح اگر مدرس کی لیاقت میٹرک سے زیادہ ایف اے یا بی اے کی ہو تو طلبہ اور بھی زیادہ مرعوب ہونگے اور ایسا مدرس اپنی علمی لیاقت یا معیارِ قابلیت اعلیٰ ہونے کی وجہ سے بغیر سزائے جسمانی کے ضبط قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔

کسی مدرس کی علمی لیاقت کے علاوہ جو چیز ضبط قائم رکھنے میں مؤثر ہے وہ خود اس کی تعلیمی دلچسپی اور اچھا طریقہ تعلیم ہے۔ کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک مدرس علمی لیاقت تو رکھتا ہے لیکن اس کو تعلیم دینے سے دلچسپی نہیں اور اس کا طریقہ تعلیم اچھا نہیں ہے۔ اس صورت میں طلبہ اگرچہ مرعوب ہونگے لیکن انھیں تعلیم سے دلچسپی نہ ہوگی اور خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوگا بجائے ایسے مدرس سے مانوس رہنے کے متنفر ہو جائینگے۔ کیونکہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے کی مثال

ایک راہرو میں شوق سفر پیدا ہونے کی اور اچھے پائے طریقۂ تعلیم کی مثال سیدھے اور پڑے صاف راستہ کی ہے ہر ایک راہرو میں پہلے شوق سفر اور راستہ طے کرنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ پھر راہرو سیدھے راستے کو پسند کرتا ہے جس سے جلد تر منزل مقصود پر پہنچ جائے جس مدرس کو تعلیم دینے سے دلچسپی ہو وہ طلبہ میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی دلچسپی پیدا کر سکتا ہے اور اس کا اچھا طریقۂ تعلیم طلبہ کو سیدھے راستہ پر لگا دیتا ہے جس سے طلبہ بہت جلد علم کی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ بہر حال تعلیمی دلچسپی اور اچھا طریقہ، علمی لیاقت کے بعد ضبط کے کام میں نہایت مؤثر ہے۔

پھر تیسرے درجہ میں مدرس کی مستعدی اور حاضر باشی بھی ضبط پر بڑا اثر ڈالتی ہے کیونکہ اگر چہ ایک مدرس کی علمی لیاقت اچھی ہے، وہ تعلیمی دلچسپی بھی اچھی رکھتا ہے اور اس کا طریقۂ تعلیم بھی اچھا ہے۔ مگر کام میں مستعد اور حاضر باش نہیں ہے اس سے طلبہ کو خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا طلبہ تضییع اوقات سمجھ کر اپنے مدرس سے متنفر اور دوسرے مدرس کے خواہشمند ہو جائیں گے کیونکہ یہ ایک فطری خاصہ ہے کہ ہر انسان ایسے لوگوں سے متنفر ہو جایا کرتا ہے جن سے فائدہ حاصل ہونے کی توقع نہیں رہتی۔

ہم یہاں مدرس کی مستعدی کے ضمن میں یہ بتلا دینا بھی مفید سمجھتے ہیں کہ تیاری اسباق مدرس کی مستعدی کو ابھارنے والی اور بے حد ضروری ہے۔ اس سے ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ لائق لوگوں کو تیاری اسباق کی ضرورت نہیں ہوتی یا وہ بغیر اس کے کام نہیں کر سکتے بلکہ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ جب ہم کسی کام کو پہلے سے سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ وہ بغیر سوچے سمجھے کام کرنے سے اچھا ہوتا ہے اور آسانی کے ساتھ تھوڑے سے وقت میں انجام پا جاتا ہے اور دماغ پر بار بھی نہیں پڑتا جو لوگ بغیر تیاری اسباق کے تعلیم دیتے ہیں۔ انھیں وقت پر طریقۂ تعلیم کو سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ مختلف الطبائع طلبہ جن میں بعض تیز فہم اور بعض غبی ہوتے

مسائل طور پر ہم واقف ہوں اگر کوئی بات ایسی ہو جو ذہن میں نہ آئے اور طلبہ کو تشفی بخش
جواب نہ مل سکے شاید اس وقت طلبہ یہ محسوس کرنے لگینگے کہ مدرس کو ان کے سوال کا تسلی بخش
جواب یاد نہیں ہے۔ اس سے نہ صرف ضبط پر اثر پڑیگا بلکہ مدرس کی شخصیت پر بھی گہرا اثر پڑنے کی
قطعی گنجائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے پروفیسر بھی تیاری اسباق کے بغیر تعلیم نہیں دینا
چاہتے اور اس کا رواج عام ہے۔ غرض کوئی اور فائدہ نہ سہی اتنا کیا کم ہے کہ پہلے سے سبق
تیار کرنے میں وقت بچتا ہے جلد کام ہوتا ہے طبیعت میں سستی اور کاہلی نہیں آنے پاتی جب
سستی یا کاہلی آنے نہیں پائیگی تو کام پھرتی اور چالاکی سے انجام پائیگا اسی پھرتی یا چالاکی
کو ضبط کے کاموں میں بڑا دخل ہوگا اور طلبہ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ مدرس کو مضامین پر
عبور حاصل ہے اور وہ تفہیم پر حاوی ہے۔

جماعتی درجے میں مدرس کی سنجیدگی اور اس کا وقار بھی طلبہ کو مرعوب کرنے میں بڑا
اثر پیدا کرتا ہے۔ جس قدر مدرس سنجیدہ اور باوقار ہوگا طلبہ بھی اسی قدر مرعوب ہونگے اور دلچسپی
کے ساتھ تعلیمی کام انجام دینگے۔ کیونکہ اس وقت وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اگر ہم اپنے سنجیدہ
اور باوقار استاد کے سامنے ناشائستہ حرکات کر بیٹھیں جس سے وہ ناراض ہو جائے تو ہم مستحق
سزا قرار پائینگے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مدرس کے سامنے طلبہ نہایت مؤدب رہا کرتے ہیں۔
اور خاموشی سے تعلیمی کام انجام دیتے ہیں۔ یہ بات بغیر سزا کے ضبط قائم رکھنے میں بڑی معاون
ثابت ہوتی ہے۔

مذکورۃ الصدر اصولوں میں بہترین اصول مدرس کا طلبہ کے ساتھ اخلاقی برتاؤ اور
ان کے ساتھ محبت کا سلوک ہے۔ جس قدر یہ سلوک بڑھا چڑھا ہوگا۔ اسی قدر طلبہ مدرس
کے فرمانبردار اور اشارہ پر کام کرنے والے ہوں گے۔ اخلاقی برتاؤ اور محبت کے سلوک سے

بڑھ کر دنیا میں شاید ہی کوئی چیز ہوگی جو ضبط قائم رکھنے میں موثر ہو۔ علاوہ اس کے جو حکمت عملی بغیر سزائے جسمانی کے ضبط قائم کرسکتی ہے۔ وہ سوالات کے ذریعہ طریقۂ تعلیم ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوالات کے وقت دماغ میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور جب طلبہ کا رجحان جوابات سوچنے کی طرف رہتا ہے۔ تو ان کے خیالات فضولیات کی طرف مائل نہیں ہونے پاتے اور چونکہ دماغ پر جوابات کے سوچنے کا بار پڑتا ہے اس سے دماغ میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور طلبہ ہمیشہ سوچ کر جواب دینے کے عادی ہو جاتے ہیں یہ بات نہ صرف تعلیمی کاموں میں مفید اور کارآمد ہوتی ہے بلکہ اُن کی زندگی کے ہر مشکل اور پیچیدہ معاملات میں آسانی پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ مدرس کو چاہیے کہ ہر روز سبق سے پہلے چند ایسے سوالات کیا کرے جو اہم اور ضروری ہوں اور جن سے گزشتہ اسباق کے تسلسل کا پتہ چلے۔ علاوہ اس کے ہفتہ واری امتحان بھی لیا کرے جس سے فائدہ یہ ہوگا کہ مدرس کا پڑھایا ہوا سبق پائدار ہوگا اور بچوں کی غلطیوں کی اصلاح ہوگی اور ان میں سہ ماہی و ششماہی و سالانہ امتحان میں شریک ہونے کی جرأت پیدا ہو جائیگی۔

مدرسہ کے مقررہ امتحانات میں طالب علموں کا کامیاب ہونا، انعامات پانا اور ان کی تعریف و توصیف نہ صرف ان میں آئندہ کی ریس پیدا کرتی ہے بلکہ مستقل علمی ترقی کا حوصلہ روز افزوں ترقی پاتا ہے اور ناکام طالب علموں پر بھی اثر ڈالتا ہے کہ وہ بھی آئندہ امتحانات میں کامیاب طالب علموں کی طرح کامیاب ہو کر انعامات اور تعریف و توصیف کے مستحق بنیں

اب ہم یہاں چند ایسی چیزیں بیان کریں گے جن کا تعلق مدرسہ اور مدرسہ کے ماحول سے ہے اور وہ ضبط مدرسہ میں نہایت کارآمد ہیں۔

اوّلاً مدرسے کا جائے وقوع تعلیمی نقطۂ نظر سے نہایت موزوں ہو۔ جہاں آب و ہوا اچھی ہو اور مدرسے کے کمرے اتنے ہوادار ہوں کہ طالب علموں کو اس سے دماغی تفریح حاصل ہو

اور غیر صحت مند طلبہ کی صحت اچھی ہو جائے ورنہ آب و ہوا کی خرابی اور مدرسے کے کمروں کا تنگ و تاریک ہونا صحت مند طالب علموں کو بیمار بنا ڈالیگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ باضابطہ طریقہ سے حصولِ علم میں سعی نہیں کر سکتے یعنی جب اُن کا دماغ ہی ماؤف ہو رہا ہو۔ تو وہ دماغی ترقی سے محروم رہینگے اور دماغ ماؤف ہو جانے کی صورت میں ضبط کی تکمیل ناممکن ہو جائیگی۔

مدرسہ کے اچھے محل وقوع کے بعد خود مدرسہ کے اندرونی مناظر باغ، باغیچے اور بیرونی مناظر قدرت ایسے ہوں کہ طلبہ چھٹی کے بعد یہاں کی تفریح کے دلدادہ ہو جائیں اور ان کو دوسرے میل کود کے مقامات سے قطعاً دلچسپی نہ رہے۔ مدرسہ کا ٹائم ٹیبل اس مناسبت سے بنایا جائے کہ اگر ابتدائی گھنٹے میں دماغی مشکل کام دیا گیا ہو تو دوسرے گھنٹے میں آسان کام ہو جس سے دماغ پر بے جا بار نہ پڑے۔ اسی طرح جتنے تعلیمی گھنٹے ہوں بڑی حکمتِ عملی سے بدل بدل کر رکھے جائیں کہ طلبہ کا دماغ ماؤف نہ ہونے پائے بلکہ ان کو ایک قسم کی فرحت محسوس ہونے لگے بعض مدارس میں گھر پر کرنے کا کام اس کثرت سے دیا جاتا ہے کہ بچے کام سے بیزار ہو جاتے ہیں اس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ بہرحال گھر کا کام اتنا دیا جائے کہ وہ آسانی سے کر سکیں اور کام سے بیزار نہ ہوں، ورنہ کثرتِ کار سے تعلیمی دلچسپی جاتی رہنے کا قوی اندیشہ ہے۔

زائد از نصاب مصروفیتوں میں ایک چیز جو ہمارے خیال میں زیادہ مفید اور کارآمد ہے وہ یہ کہ انسان ابتدائے عمر سے آخر عمر تک تقلید کا پابند رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کمسن بچہ دوسروں کو دیکھ کر چلنا سیکھتا ہے۔ بات چیت سیکھتا ہے اس کے بعد ہر ایک کام میں بچپن سے لیکر آخر عمر تک تقلید ہی کا پابند رہتا ہے اور جن میں اختراع کی صلاحیت ہوتی ہے وہ جدت سے بھی کام کرتے ہیں۔ یہ چیز بچوں پر موقوف نہیں جوان اور بوڑھے بھی اسی زنجیر

تقلید کے اسیر ہیں یا سی تمام مدرسے کے تحت مدرسے کے مدرس گویا تقلید کے پابند بچوں کے
کام سیکھنے کا نمونہ ہیں۔ مدرس جس طرح کام کرکے دکھلائیں گے بچے بھی اسی نشان قدم
چلنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ ہر مدرسے میں انجمن علم ادب ہو۔
میں اخبار کا مطالعہ تقاریر، بحث مباحثہ ہوا کرے اور طالب علموں کو سننے کا موقع دیا جا
بلکہ خود طالب علموں کے لیے علاحدہ انجمن بنا دی جائے۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ جلدسے جا
کے کام کو وہ تقلیداً حاصل کرلیں اور وہ بھی ویسی ہی تقاریر، بحث اور مباحثہ کرنے لگیں
انھوں نے اپنے استادوں کو کرتے دیکھا ہے۔ بہرحال رئیس پیدا کرنا بہت بڑی حکمت
جس سے طلبہ بہت جلد راہ ترقی پر گامزن ہو جاتے ہیں اور ضبط تعلیم کا اصلی منشا بھی یہ
کہ وہ باضابطہ طریقے سے حصول علم میں کوشش کریں اور علم کی منزل مقصود پر پہنچ جائیں

(ماخوذ از حیدرآباد ٹیچر)

نقد و نظر

معاشیات کے ابتدائی اصول حال ہی میں جناب پریم چند صاحب بی، اے کنٹب (؟) پروفیسر اقتصادیات ڈی، بی کالج ڈیرہ اسمٰعیل خاں نے تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اس کی طباعت کی ہے۔ ضروری اور دلچسپ تصویریں بھی شامل ہیں قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے۔ کہ اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد دنیا مادیت کی طرف بڑی ہی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ انسان خود ایک مجسم مشین کی حیثیت اختیار کر لے۔ یہ مادی رو بتدریج بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ علم المعیشت کا مطالعہ بھی ضروری ہو رہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں اس مضمون کے لٹریچر کی اس قدر کمی ہے کہ وہ لوگ جو زبان انگریزی سے نابلد ہیں، زمانۂ حاضرہ کے اس نہایت ہی ضروری علم سے بے بہرہ ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہندوستانیوں کی لاعلمی سے دوسرے ملکوں کے سمجھدار لوگ خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ملک کے حالاتِ حاضرہ پر طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اقتصادیات اور سیاسیات کا آپس میں اس قدر گہرا تعلق ہو گیا ہے۔ کہ ایک کا دوسرے سے امتیاز مشکل ہے۔ حالت یہ ہے کہ جو جماعت اقتصادی طور پر بڑھی ہوئی ہے۔ اور جس جماعت کو سیاسی اقتدار حاصل ہے۔ اس کی اقتصادی حالت بھی بہت اچھی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ہیرالال (؟) جے لاسکے صاحب فرماتے ہیں۔

"جب ملک میں سیاسی توازن قائم نہیں رہتا، تو اُس کی کمی اور بیشی کے

ساتھ ساتھ ملکی مراعات بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ جس جماعت کے ہاتھ سیاسی اقتدار ہو، وہ ملک کے قانون کی اس طرح سے تشکیل کرتی ہے کہ اس سے برسرِ اقتدار جماعت کا مفاد محفوظ ہو جائے۔ انگریزی تاریخ کے چار اصلاحی قانون جو مختلف وقتوں میں پاس ہوئے۔ اس امر کے شاہد ہیں۔

یہاں کی سیاسی اور اقتصادی حالت بھی اس حقیقت سے متاثر ہے۔ پنجاب کی غیر کاشتکار جماعت کا خیال ہے کہ اتحاد پارٹی نے، جو کاشتکاروں پر مشتمل ہے، اپنے زمانۂ عروج میں اس نوع کے قوانین بنائے، جن سے کاشتکاروں کی تو اقتصادی حالت بہتر ہو گئی، لیکن غیر کاشتکار لوگوں کی حالت گر گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر آپ اقتصادیات کا مطالعہ کریں گے، تو آپ کو ضمناً سیاسی حالات کا بھی پتہ چلے گا۔

فاضل مصنف نے معاشیات کے مطالعے کو ذیل کے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ دولت کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح خرچ ہوتی ہے۔ دولت کا مبادلہ کیونکر ہوتا ہے۔ دولت پیدا کرنے والوں میں تقسیم کیونکر ہوتی ہے۔

دنیا میں مختلف قسم کے لوگ ملتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی ضرورتیں بھی مختلف ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ مصنف نے اس کو ایسے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ کہ مبتدی کو بھی اس کے سمجھنے میں دقت پیش نہیں آئیگی۔ افادہ مختتم، قانون تقلیل، قانون تکثیر حاصل، قانون نقدی اور بنک کا نظم و نسق، معاشیات کے طالب علم کے لئے مشکل مسئلے ہیں، لیکن صاحب موصوف نے سادہ اور سلیس فقروں میں بیان کر دیئے ہیں اور کوئی نکتہ ایسا نہیں چھوڑا جو اوسط درجے کے طالب علم کی سمجھ سے بالا ہو۔ طلب اور قانون طلب کا تعلق نفسیات سے بھی ہے۔ اس لئے مشکل بھی۔ پروفیسر صاحب نے اسے بہت آسان اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ طلب اور رسد کے

توازن کو خاکوں کے ذریعے سے بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے موضوع میں مزید آسانی اور دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ دولت کی پیدائش کا عمل بھی بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

جہاں کہیں کوئی مشکل مسئلہ زیر بحث تھا۔ پروفیسر صاحب نے اس پر خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ تشریح کے بعد بھی اگر آپ نے کسی بات کو مشکل جانا ہے، تو حاشیے میں بھی نوٹ بڑھا دیا ہے۔ اصطلاحوں کی علیحدہ بھی فہرست دی گئی ہے۔

صنعتی انقلاب پر، جس نے ساری دنیا کے اقتصادیات میں ہیجان بپا کر رکھا ہے، کافی توجہ نہیں کی گئی۔ سرمائے اور محنت کی کشمکش کا تذکرہ بڑا ضروری تھا۔ اشتراکیت، بالشویت اور انارکی صنعتی انقلاب ہی کے پیدا کردہ اثرات ہیں، ضروری تھا۔ کہ مجمل سی روشنی ان پر بھی ڈالی جاتی جس کے کاروبار کی طرف دنیا کے اکثر و بیشتر افراد کی توجہات لگی ہوئی ہیں۔ معاشیات کا یہ موضوع بھی توجہ طلب تھا۔ طلائی معیار اور روپے کا تناسب تناسب کی کمی بیشی کا ملک کے حالات پر اثر بین الاقوامی حیثیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالنا چاہیئے تھی۔ سنٹرل بنک کو وسطی بنک لکھا ہے۔ اسکی جگہ اگر مرکزی بنک لکھا جاتا تو یہ اور بھی صاف اور واضح تھا۔ اسکے اختیار و فرائض پر پوری پوری روشنی ڈالنا چاہیئے تھی۔ بالخصوص ان اختیارات پر جو روپوں کی تقسیم اور نوٹ بنانے کے سلسلہ میں اسے حاصل ہیں۔ زبان بعض بعض جگہ الجھی ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے۔ کہ پروفیسر صاحب دوسری اشاعت میں ان باتوں کا بھی خیال رکھیں گے۔

ہم بڑی خوشی سے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ کتاب بیحد مفید ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے ہموطنوں کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ ہم ان کی اس کوشش پر انہیں مستحق مبارکباد خیال کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے۔ کہ ان کی محنت و کوشش کی صحیح معنوں میں داد دی جائیگی کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اردو ایڈیشن

جلد (۳)	مئی ۱۹۳۷ء	نمبر (۲)

فہرستِ مضامین

۱

ایڈیٹوریل

کسی نئی جماعت میں استاد کی پہلی آمد اپنے اندر بڑی بڑی دلچسپیاں رکھتی ہے اور اگر جماعت مبتدیوں کی ہو تو دلچسپیوں میں دوگونہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ استاد اور جماعت کے دل امید و بیم کے مخلوط احساسات سے پُر ہوتے ہیں۔ استاد غریب کو یہ بات پریشان رکھتی ہے کہ لڑکے کیسے ہیں؟ ان کی دماغی حالت کیسی ہے؟ طلبہ کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ استاد سخت گیر ہے یا نرم طبیعت۔ استاد اور طلبہ کے مراسم کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایک جماعت میں مختلف قسم کے طلبہ ہوتے ہیں، ذہین بھی کند ذہن بھی۔ ہوشیار بھی اور عافیت کوش بھی۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سبق میں دلچسپی لیتے ہیں اور ایسے بھی جو استاد کی آواز کو قوت سامعہ پر بار سمجھتے ہیں اور وقت کا بہترین مصرف یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے سو کر گزار دیا جائے۔ ایسی جماعت کی رہنمائی مشکلات سے خالی نہیں اور اگر استاد اور طلبہ کے مراسم ناخوشگوار ہوں، تو بہت بڑی پریشانی کا موجب ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دونوں میں مقصد کی یک آہنگی نہیں پائی جاتی۔ استاد ایک طرف ہوتا ہے اور شاگرد دوسری طرف۔ دونوں کے مابین ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے، جب تک یہ خلیج پاٹ نہ دی جائے اور استاد اور شاگرد مقصدِ تعلیم کو حاصل کرنے کے لیے متحد نہ ہو جائیں مشکلات بدستور مشکلات رہتی ہیں۔

جو استاد فنِ تعلیم سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں ان کی تدریس ایک لفظ کے بغیر ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ان کا اولیں درس اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ جماعت میں قدم رکھتے ہیں، اگر طلبہ استاد کو دیکھ کر اس کے متعلق اچھی رائے قائم کر لیں، اسے اپنا دوست سمجھنے

لگیں اور ان کے دل میں علم حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہو جائے، تو اُستاد کا کام بڑی حد تک آسان ہو جاتا ہے اور اگر استاد کے متعلق پہلے ہی دن سے طلبہ کا یہ خیال ہو کہ یہ شخص ہمارا دشمن ہے، ہمارا بدخواہ ہے، اس کے دل میں ہمدردی کا شائبہ بھی نہیں، ہمیں اس کی آنکھ میں دھول جھونکنا ہے، فریب دینا ہے، اس کے تمام ارادوں کو ایک ایک کر کے شکست دینا ہے، تو قدرتی طور پہ اُستاد کے دل میں بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کے ان مخالفت کے احساسات کو کچل دے، ان کی انانیت کو نیچا دکھائے، ان کی نخوت کو پامال کرے۔

استاد کو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرنا چاہیے کہ مدرسے کی زندگی، طلبہ اور استاد کے مابین، نزاع اور جنگ کی زندگی نہیں، دھوکے اور فریب کی زندگی نہیں، صلح اور آشتی کی زندگی ہے، مہر و محبت کی زندگی ہے، شرکتِ عمل کی زندگی ہے۔ طلبہ کی جماعت قافلہ ہے اور استاد قافلہ سالار۔ اگر استاد اس نوع کے مراسم پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو اپنی تدریس میں پورے طور سے کامیاب ہو جائیگا۔

جماعت کی فضا کا تعلیم و تدریس پہ بڑا اثر ہوتا ہے۔ اچھی فضا سلسلۂ تدریس پہ خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے اور بُری فضا ناگوار۔ جو جماعت خوف و ہراس کی فضا میں کام کرتی ہے، اتنا اچھا کام نہیں کر سکتی، جتنا اچھا وہ جماعت، جو مہر و محبت کی فضا میں کام کرتی ہے سب سے پہلا کام اُستاد کا یہی ہے کہ وہ خوف و ہراس کے ہوّے کو دور کر دے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ پرائمری تک کے طلبہ ایسے ہی خوف کے ماحول میں تعلیم پاتے ہیں۔ نیا اسکول، نیا مضمون، نیا استاد اس خوف میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے اور سلسلۂ تدریس کی بنیاد خام رہتی ہے۔ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ بنیاد درست نہ ہو، تو عمارت بھی استوار نہیں ہوتی۔ طلبہ کا خوف جاری رہے تو ترقی کی رفتار بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکے آواز نکالتے ہوئے ڈرتے ہیں، الفاظ بولتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ فقرے بنانے

ہوتے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈر ان کی ساری حیات و حرکت پر چھایا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہتا۔ غلطیوں کے احساس سے خوف ہوتا ہے۔ اُستاد کا پہلا فرض ہے کہ اس قسم کے خوف کو ان کے دلوں سے نکال دے اور انھیں یقین دلادے کہ غلطیاں کرنا ان کے لیے شرم و ننگ کا باعث نہیں، خوف دہراس کا موجب نہیں بلکہ غلطیوں کی درستی ہی انھیں راہِ راست پر لا سکتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی طالب علم سے کام لینا مقصود ہو تو ہم اس کی عادت کے خلاف کوئی بات کہکر اس کی کام کرنے کی قوت کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ مثلاً: اگر ہم چاہیں کہ کسی لڑکے سے زیادہ مستعدی سے کام لیں تو ہم اسے کہہ دیتے ہیں "تم بہت کاہل ہو"۔ وہ طالب علم اپنی وضعداری کو قائم رکھنے کے لیے اور ہمارے خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے جلد از جلد کام ختم کرلیگا، لیکن اس کے ذہن میں کاہلی کا احساس غیر محسوس طور پر داخل ہوجائیگا اور رفتہ رفتہ قوت پکڑ لیگا۔

آپ کسی طالب علم کو سُست کہتے رہیں تو یقیناً وہ سُست ہو کے رہیگا۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور اگر آپ طلبہ سے کہیں کہ اس قدر کام تمھیں اتنے عرصے میں کرنا ہوگا، ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ دیں یہ کام تمھارے لیے بہت آسان ہے اور تم اسے بہت جلد ختم کرسکتے ہو، تو بیشتر طلبہ دلجمعی کے ساتھ کام کرتے رہینگے اور اس طرح ان کے حوصلے بھی بڑھینگے۔

اُستاد کو لڑکوں کے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ طلبہ اُستاد پر پورا پورا اعتماد رکھیں۔ ایسا نہیں کہ وہ انھیں بات بات پر مرعوب کرے۔ جگہ جگہ انھیں نا اُمید کرے۔ یہی اعتماد ایک ذریعہ ہے، جس سے طلبہ اور استاد کے درمیان کی خلیج پاٹ دی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی اُستاد صحیح طور پر طلبہ کی دستگیری کرنا چاہے، تو ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک شفیق اور ہمدرد کی صورت میں پیش کرے۔ ایسے ہمدرد کی صورت میں جو ان کی مشکلات کو اپنی

مشکلات خیال کرتا ہے اور ان کو حل کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے۔ تدریس کی کامیابی کا راز یقیناً اسی میں ہے۔

اُستاد اگر لڑکوں کے کھیل تفریح میں وقتاً فوقتاً شامل ہوتا رہے، فرض منصبی کو ادا کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ارادۃً کھیل میں حصہ لینے کی غرض سے، تو اس سے اُستاد کے کام میں اور بھی آسانیاں ہو جائینگی۔ لڑکے استاد کی سعی و جہد پر زیادہ توجہ دینگے۔

اُستاد کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ طلبہ میں تخیل کی قوت پیدا کرے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو طلبہ کی سطح پر لے آئے اور موضوعِ تعلیم پر بالکل طلبہ کی طرح نظر ڈالے۔ اگر طلبہ کو تعلیم دیتے وقت اُستاد اپنے زمانۂ طالب علمی کو پیش نظر رکھیں اور اپنی اس وقت کی مشکلات کو یاد کرسکیں، جو خود انھیں تدریس کے وقت پیش آتی تھیں، تو طلبہ کی مشکلات بڑی آسانی سے حل ہو جاسکتی ہیں۔

بچے فطرۃً نقال واقع ہوئے ہیں، وہ استاد کی ہر حرکت کو دانستہ یا نادانستہ جذب کرتے جاتے ہیں۔ گویا جماعت استاد ہی کا آئینہ ہوتی ہے، جس میں استاد کا تلفظ، استاد کا اندازِ بیان، استاد کا عمل معکوس ہوتا رہتا ہے، اس لیے اُستاد کو لازم ہے کہ طالب علموں کے سامنے اچھی سے اچھی مثال پیش کرے۔ اگر استاد انگریزی کا درس دیتا ہے تو اس کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اُس نے بی اے کی سند حاصل کرلی ہے۔ یہ سند تو عقل و فراست کی ابتدا ہے، اس لیے اُستاد کو اپنی علمی استطاعت پر مطمئن نہ ہو جانا چاہیے۔ اسے اپنی انگریزی کی مزید اصلاح کے لیے بیش از بیش سعی کرنا چاہیے اور اس سعی کے نتائج کا طالب علموں پر تجربہ کرنا چاہیے۔

اُستاد کو چاہیے کہ طلبہ کی جماعت میں بھی دلچسپی لے اور موضوعِ تعلیم میں بھی۔ اگر استاد پوری گرمجوشی کے ساتھ جماعت میں دلچسپی لے، تو کوئی لڑکا پسند نہیں کریگا کہ وقت کو سو کر کھو دے۔

۵

لیکن اگر ہم خود جماعت میں اونگھ رہے ہوں اور توقع یہ رکھیں کہ طلبہ بیدار رہیں تو یہ توقع عقل وہوش کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ لڑکے توجہ کے ساتھ سبق پڑھیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہوشمندی کے ساتھ سبق پڑھائیں۔ ہمیں یہی نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ ہم ٹریننگ کالج سے فارغ ہو چکے ہیں اس لیے ہم ہر قسم کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر کامل استاد ہو چکے ہیں۔ غالباً یہ تعلیم جو ہم نے یہاں حاصل کی ہے ہم ہمیں چھوڑ جائینگے۔ آئندہ زندگی میں واقعات مختلف ہونگے، ماحول مختلف ہوگا اور اپنے فرض سے عہدہ برا ہونے کے لیے تدبیریں بھی ہمیں مختلف اختیار کرنا ہونگی۔ دنیا کے واقعات تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔ تعلیمی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نئے نئے طریقوں کی آزمائش ہو رہی ہے ہمیں چاہیے کہ ہم بھی ان طریقوں کا تجربہ کریں۔ جماعت ہماری تجربہ گاہ ہے۔ ہمیں اس پر تعلیمی تجربات کرنا چاہییں۔ پامال راستوں پر ہی چلتے رہنا زیادہ سودمند ثابت نہیں ہو سکتا۔ ایک زیرک استاد ہمیشہ ایسے طریقوں کی ٹوہ میں رہتا ہے، جو مضمون کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنا سکیں۔ ہمیں یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ طریق نیا ہے، اس کا تجربہ کبھی نہیں کیا گیا۔ ہم میں اتنی جرأت ہونا چاہیے کہ ہم بے خوف ہو کر نیک نیتی سے اس طریق کا تجربہ کریں۔

عصر حاضر کے تعلیمی نصاب پر انگریزی پوری طرح مسلط ہے، اس لیے طلبہ اور استاد کا انگریزی کی طرف باہمی رجحان آئندہ زندگی پر بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔ طالب علم کی آئندہ علمی زندگی کی بنیاد یہیں شروع ہوتی ہے۔ اگر یہاں ایک طالب علم کو نظر آئے کہ استاد کا طلبہ کے ساتھ سلوک بہت درشت ہے، لڑکوں کا استاد کے ساتھ سلوک منتقمانہ ہے، جماعت کی فضا موافق نہیں، تو اس کی طبیعت جماعت، اسکول اور تعلیم سے گریز کرنے لگیگی اور اگر جماعت میں ہمدردی ہو، دلچسپی ہو، اور اشتراکِ عمل ہو، تو اس کو بھی ایک نئی زندگی کا احساس ہوگا اور اس کی طبیعت خود بخود مائل ہوگی۔

خیالات کی صفائی اور افکار کی درستی صرف ایک مضمون ہی کی تدریس میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ چیزیں اسی وقت ہی میسر آسکتی ہیں جب تمام مضامین کی تدریس کے وقت یہ امور پیش نظر رکھے جائیں۔ ہمارا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ طلبہ کے سوچنے کی قوت کو منظم کریں۔ ان کے خیالات اور انداز بیان کو واضح اور صاف کرنے کی سعی و جہد کریں۔

اُستاد کا یہ فرض بھی ہے کہ طلبہ میں اپنے آپ غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دے۔ اگر اُستاد ان میں سوچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی طرف توجہ نہیں دیگا اور خود انھیں سب کچھ بتاتا جائیگا، تو یہ طلبہ کے لیے بہت مضر ہوگا۔ اس سے ممکن ہے طلبہ زیادہ تعداد میں کامیاب ہو جائیں لیکن جب وہ زندگی کے کارزار میں قدم رکھینگے، تو انھیں نادم ہونا پڑیگا اور ان کی ندامت ہماری ندامت ہوگی۔

۷

اعلیٰ تعلیم اور مادری زبان

از

خواجہ غلام السیدین صاحب (پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ)

میں اس مضمون میں آپ کی توجہ ایک ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا فیصلہ اب سے سالہا سال پیشتر ہو جانا چاہیے تھا لیکن ہماری ذہنی غلامی اور بے بسی کا ایک نہایت بیّن ثبوت یہ ہے کہ آج تک نہ صرف اس مسئلے کا فیصلہ نہیں ہوا، بلکہ بہت سے تعلیمیافتہ اور معتدد حلقوں میں اس کا تذکرہ بھی ناگوار ہے اور بہت سے علمی دربارں میں اس کو ابھی تک باریابی نصیب نہیں ہوئی، یعنی، یہ مسئلہ کہ اعلیٰ تعلیم میں مادری زبان کا کیا درجہ ہونا چاہیے۔

بظاہر یہ خیال بہت ہی معقول اور ناقابل انکار معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم یا جماعت کی صحیح اور مناسب تعلیم اس کی مادری زبان ہی میں ہو سکتی ہے، لیکن سیاست عجب چیز ہے اور دستور اس سے بھی زیادہ عجیب! اور جب یہ دونوں چیزیں مل جائیں، تو دن کو رات اور رات کو دن بنا دینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں بعض سیاسی وجوہ سے انگریزی زبان کو رائج کیا گیا تھا۔ انگریزوں کو اپنے تجارتی کاروبار اور انتظامی معاملات کو چلانے کے لیے ایسے ہندوستانی عمّال کی ضرورت تھی، جو انگریزی زبان سے واقف ہوں۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی بڑھتی ہوئی حکومت میں بار پانے کے لیے انگریزی زبان سیکھنے کی خواہش تھی۔ اس قِران السّعدین کا نتیجہ یہی ہوا کہ ابتدائی مخالفت کے بعد، جس کو تعصب سے منسوب کیا گیا، انگریزی زبان نے سنہ ۱۸۲۰ء کے قریب تعلیم کی مملکت کو فتح کرنا شروع کیا اور بہت جلد اس مہم کو سر کر لیا اور بہت

سے قوم کے نیک نیت بھی خواہ گزشتہ سو برس کے ذہنی انتشار اور افلاس سے اس درجہ متاثر تھے کہ اپنے ذہنی اور علمی سرمائے کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے اور وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ ملک میں کسی جدید علمی اور تمدنی تحریک کو شروع کرنے کے لیے مغربی علوم اور مغربی تعلیم سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور قوم کے افسردہ حوصلوں میں امنگ اور سست خون میں حرکت اسی تعلق سے پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس تحریک کا استقبال کیا اور ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ مغربی تعلیم کی تائید اور قدیم تعلیم کی مخالفت کی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے اپنا مشہور نوٹ لکھ کر اس بحث کا خاتمہ کر دیا اور حکومت نے باضابطہ طریقے سے جدید مغربی تعلیم کو، جس میں ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی قرار دیا گیا تھا، اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ سر سید احمد خاں اور ان کے ہم عصروں کو اس بات کا یقیناً احساس تھا کہ ہندوستانی زبانوں اور ادب کی ترقی کا انتظام بھی ہونا چاہیے اور سر سید اور ان کے ساتھیوں نے اردو ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دیں اور اس وقت تک حکومت کے تعلیمی ریزولیوشنوں میں بھی اس ضرورت پر زور دیا جاتا تھا، چنانچہ سر چارلس ووڈ نے ۱۸۵۴ء میں اپنے تعلیمی (Despatch) مراسلے میں اس بات پر زور دیا تھا کہ دیسی زبانوں کے مطالعے کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ عوام کی تعلیم کا ذریعہ بن سکیں، لیکن ان نیک نیت حضرات نے کئی غلطیاں کیں۔ اوّل تو انھیں یہ احساس نہیں ہوا کہ مغربی علوم حاصل کرنے کے لیے یہ لازمی نہیں کہ تمام طلبہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ان علوم کو ایک غیر زبان یعنی انگریزی ہی میں پڑھیں۔ مغربی علوم ایک چیز ہیں اور انگریزی زبان دوسری چیز۔ دوسرے وہ دیسی زبانوں اور ادب کی ترقی کے خواہاں تھے، لیکن ان کے ذہن میں کبھی یہ شبہ پیدا نہیں ہوا کہ جب اعلیٰ اور ثانوی تعلیم کا رشتہ دیسی زبانوں سے توڑ دیا جائیگا تو

ان میں جدید خیالات کی یورش اور حرکت اور جدت کہاں سے پیدا ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسی نہروں کے ذریعے کھیتوں کی آبپاشی کریں، جن میں دریا کا پانی آنے ہی نہ پاتا ہو۔ جب تعلیم یافتوں کی بول چال، تحریر و تقریر، تہذیب و تمدن، کاروبار، کلب اور دفتر کی زبان دوسری ہو جائیگی تو وہ عموماً دیسی زبانوں کی خدمت اور آرائش کی طرف کیوں توجہ کرینگے اور اس کی وجہ سے نہ صرف ان کے اور ان کے ملک کی زبانوں کے درمیان، بلکہ ان کے اور ان کے غیر تعلیم یافتہ ہم وطنوں کے بیچ میں ایک خلیج کیوں نہ حائل ہو جائیگی؛ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینے کا خیال پس پشت جا پڑا۔ اسکولوں اور کالجوں کا تمام زور انگریزی پر صرف ہونے لگا۔ انگریزی تعلیم حصول ملازمت کا سیدھا اور صاف راستہ بن گئی اور لب ولہجے میں، تراش خراش میں، لباس اور وضع میں حتی کہ میل جول میں انگریزوں کی تقلید کرنا مہذب ہونے کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔ اسکولوں میں مادری زبان کو وہی درجہ حاصل تھا، جو ہندوستان کے سماج میں شودروں کو ور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کا سرے سے پتہ ہی نہ تھا۔ یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک ایک طرف تو ملازمتوں کا میدان امیدواروں پر تنگ نہیں ہو گیا اور دوسری ف سیاسی اثرات اور حالات کی ٹھیس سے ہندوستانیوں کو دوبارہ اپنی سیاسی، تمدنی اور ہنی خودی کی تلاش کی فکر پیدا ہوئی۔ ممکن ہے آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ اب اس پرانی کہانی کو ہرانے سے کیا حاصل؛ وہ باتیں بیت گئیں اور اندھی تقلید کا زمانہ ختم ہو گیا۔ میرا جواب یہ ہے کہ اب ب اس مہذب ملک میں ایسے روشن خیال لوگ موجود ہیں اور ان کی تعداد بہت کافی ہے، جو جہ طریقے اور دستور کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں اور اس ڈگر سے ہٹنے کے لیے آمادہ نہیں۔ ان میں ت سے ممتاز ماہرین تعلیم بھی شامل ہیں، کیونکہ بقول ایک مصنف کے اگر وہ مروجہ طریقے اور نظام تائید اور حمایت نہ کرتے، تو ممتاز ہی کس طرح ہو سکتے تھے۔ جس بات کی ابتدا سیاسی وجوہات

کی بنا پر ہوئی تھی وہ اب دستور اور رواج کی ٹیک پر قائم ہے اور چونکہ خود ہم لوگوں نے ایک بالکل
غلط اور مہمل اصول پر تعلیم پائی ہے اس لیے ہم میں تنقید اور آزادیِ فکر کی اتنی صلاحیت باقی
نہیں رہی کہ اس مسئلے کے متعلق غیر جانبداری کے ساتھ صحیح رائے قائم کرسکیں۔ لاہور کے ایک
پروفیسر صاحب (Chibb) نے اپنی مختصر لیکن دل چسپ، کتاب (nguage, Universities
and nationalism.) میں لکھا ہے کہ اگر کسی قوم سے اس کی زبان چھین لی جائے، تو اس
کے خیالات بھی چھن جاتے ہیں۔ چنانچہ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ایک بالکل بدیہی تعلیمی اصلاح
کو عمل میں لانے اور اس کے لیے موثر ذرائع اختیار کرنے کے بجائے ہم اپنی دماغی کاہلی کی
بدولت ان تمام مشکلات اور موانع کی فہرستیں بنایا کرتے ہیں، جو اس کے راستے میں حائل ہیں
آپ نے ان تمام مشکلات کی رام کہانی بارہا سنی ہوگی مثلاً: ہندوستان میں بیسیوں زبانیں بولی
جاتی ہیں تعلیم کس زبان میں دی جائے؛ ہندوستان کی زبانوں میں ابھی اتنی وسعت اور گنجائش
کہاں ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مضامین اور خیالات ان میں سما سکیں؛ ضروری کتابیں موجود نہیں
ہیں وہ کہاں سے آئیں گی؛ یہاں تک تو خیر محض طبعِ حیلہ تراش کی کارفرمائی تھی، لیکن ستم
یہ ہے کہ اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں مادری
زبان پر زیادہ زور دینے اور اس پر زیادہ وقت صرف کرنے سے انگریزی زبان کا معیار کم ہو جائے گا'
اور بیانیہ یہ جواب دیا جاتا ہے کہ لوگ انگریزی زبان کی مشکلات اور طلبہ کی تعلیمی مصیبت کو خواہ مخوا
بڑھا کر بیان کرتے ہیں، ورنہ دراصل یہ بات نہیں، کیونکہ بہت سے ہندوستانی انگریزی زبان کو
اس طرح لکھتے اور بولتے ہیں کہ خود انگریزوں کو رشک آتا ہے۔ ٹیگور اور سروجنی نیڈو کی شاعری
محمد علی کی پرجوش اور آتش فشاں نثر، عبداللہ یوسف علی کی برجستہ اور مرصع خطابت، گاندھی
جی کی سلیس اور شگفتہ تحریر، یہ سب انگریزی تعلیم کا طفیل ہیں۔ اگر ہندوستان کے ہر طالب علم

-کو انگریزی پڑھنے اور انگریزی کے ذریعے پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا، تو فضائے علمی میں یہ ستارے طلوع نہ ہونگے۔ لہٰذا ان کا تماشا دیکھنے اور ان کی روشنی سے آنکھیں منور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر ہندوستانی طالب علم اپنی تعلیمی زندگی کا پورا ایک تہائی حصہ ایک غیر زبان کی تحصیل میں صرف کرے۔ وقت کا یہ تخمینہ میرا نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ ان اعتراضات پر، جو بیک وقت منطق اور نفسیات دونوں کا خون کرتے ہیں، ایک مختصر سا تبصرہ کروں، لیکن اس سے پہلے ایک اصولی بات سن لیجیے اور وہ بھی میری زبان سے نہیں، بلکہ ایک معروف انگریز کی زبان سے جس پر سیاسی کج بینی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ لکھتا ہے کہ

"ایک ہی زبان ہے جس کے قبضے میں ہمارے جذبات کی کنجی ہے۔ ایک ہی زبان ہے جو یقیناً اور قدرتاً الفاظ کے لطیف اشارات اور مطالب کو ہم تک پہنچا سکتی ہے اور یہ وہ زبان ہے جس کو ہم اپنی ماں کی آغوشِ شفقت میں سیکھتے ہیں، جس میں ہم نے بچپن میں پہلے پہل دعائیں مانگی ہیں اور اپنی خوشی اور رنج کا بے ساختہ اظہار کیا ہے۔ کسی اور زبان کو تعلیم کا ذریعہ بنانے سے نہ صرف طلبہ کی محنت اور درد سری میں بے اندازہ اضافہ ہو جاتا ہے، بلکہ ذہنی آزادی بھی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے"۔

یہ تو ایک عام اصول ہوا۔ اگر آپ خاص کر ہندوستان کے متعلق ایک مقتدر تعلیمی کمیٹی کی رائے سننا چاہتے ہیں، تو سنیے۔ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی، جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، اپنی رپورٹ میں یہ الفاظ لکھتی ہے:

"طلبہ کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم کو ایک غیر زبان کے واسطے سے حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے اس پر عبور حاصل کرنے

میں طلبہ کا بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ شاید ان کی تعلیم کی پوری مدت کا ایک تہائی حصہ اس کی نذر ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ بہت سے طلبہ اس تمام کاوش کے بعد وہ مقصد حاصل بھی کر پاتے ہیں یا نہیں؛"

رپورٹ کے فاضل مصنفین نے اس حقیقت کا اظہار کرنے میں اس صنعت کلام سے کام لیا ہے جس کو انگریزی میں Art of understatement کہتے ہیں، ورنہ در اصل کسی طالب کو جس کی آنکھیں اور کان دونوں کھلے ہوئے ہوں اس بارے میں ہرگز کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ان کا روزمرہ کا تجربہ شاہد ہے کہ طلبہ کی بہت بڑی اکثریت کسی طرح اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتی اور تمام تعلیم کے دوران میں ان کی حالت ایسی رہتی ہے جیسے کوئی بہت کمزور نظر کا آدمی بغیر عینک لگائے دنیا کو دیکھ رہا ہو اور اس کو ہر چیز دھندلی نظر آتی ہو۔ نہ ان کے خیالات میں صفائی و وضاحت پیدا ہوتی ہے، نہ اظہار خیال میں روانی اور خلوص خیالات الجھے ہوئے اور مبہم رہتے ہیں اور اظہار خیال میں لکنت۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے، کیونکہ ذہنی تعلیم کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ میں سوچنے، غور و فکر کرنے، معاملات کو سمجھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے اور نفسیاتی تحقیقات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ طلبہ میں قوت فکر اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اپنی زبان پر اچھی طرح عبور حاصل نہ کریں اور مختلف علوم کو اپنی زبان میں نہ پڑھیں۔ ہمارے طلبہ کو اپنی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا پورا موقع نہیں ملتا، لہٰذا ان کی ذہنی تربیت نامکمل اور ناقص رہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ غیر زبان کو بھی کامیابی کے ساتھ حاصل نہیں کر سکتے اور دونوں طرف سے محروم رہ کر لفظی اور معنوی لحاظ سے گونگے بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ انگریزی کتابیں ضرور پڑھتے ہیں لیکن اس زبان کے پردے کی وجہ سے، جو ان کے اور دوسری علوم کے بیچ میں حائل ہوتا ہے، ان کی زیادہ تر کوشش مفہوم

کو سمجھنا اور اس کی تنقید اور تجزیہ کرنے پر نہیں، بلکہ الفاظ کو یاد کرنے پر صرف ہوتی ہے اور الفاظ کا یہ بار، اس وقت تک ایک متاعِ عزیز سمجھا جاتا ہے، جب تک امتحان کے کمرے میں بیٹھ کر اسے ممتحن کے سپرد نہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد سے بالعموم ایک خواب پریشاں کی طرح بھلا دیا جاتا ہے اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کے پاس کوئی مستقل اور دیرپا ذہنی تہذیب باقی نہیں رہتی۔ اس ذہنی کم مایگی کے علاوہ ایک اور زبردست تعلیمی نقصان اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ لیتا ہے کہ تعلیم کا روزمرہ کی زندگی سے کوئی قریبی اور ہمہ گیر تعلق نہیں، بلکہ وہ محض بعض جزوی اور نسبتاً کم اہم مقاصد مثلاً حصولِ ملازمت کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ صورت حال ہندوستان کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جب کبھی تعلیم اور مادری زبان کا رشتہ قطع ہوا ہے یہی تمام خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس پر ایک نہایت مفید بحث جنوبی افریقہ کے ایک ماہر تعلیم میل ہرب (Malherb.) نے سال گزشتہ کی ایربک آف ایجوکیشن (Year Book of Education.) میں کی ہے، جو انگریزی زبان میں تعلیم کے مسائل پر سب سے مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے اور جس کی ادارت کے فرائض انگلستان کے سابق وزیر تعلیم لارڈ پرسی نے انجام دیے ہیں۔ لہٰذا اس کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا جائے، ان پر سیاسی تعصب اور جنبہ داری کا الزام نہیں لگایا جائے گا۔

میل ہرب (Malherb.) لکھتا ہے کہ جب ۱۸۲۵ء میں Lord Charles Somerset نے یہ طے کیا کہ Cape Colony میں ذریعہ تعلیم صرف انگریزی زبان ہوگی، تو نہ صرف بیشتر طلبہ جن کی مادری زبان ولندیزی تھی، اس کا نہایت خراب اثر پڑا، بلکہ عام طور پر لوگوں میں بالخصوص ... ت کی آبادی میں یہ خیال پھیل گیا کہ تعلیم حاصل کرنا اور انگریزی سیکھنا مرادف الفاظ ہیں۔ اگرچہ ... نگریزی زبان کے سیکھنے کے خلاف نہ تھے، لیکن اس کے ذریعہ تعلیم بنائے جانے سے لوگوں

کے ذہن میں یہ خیال قائم ہو گیا کہ مدرسے کی تعلیم ایک بدیسی پودا ہے جس کا ان کی روزمرہ کی زندگی اور زبان اور ضرورتوں سے کوئی قریبی تعلق نہیں۔ بے شک اس تعلیم سے کچھ لوگوں کو ایک خاص وقار اور تشخص حاصل ہو جاتا تھا۔۔۔۔ اور بعض اعلیٰ پیشوں میں داخلہ مل جاتا تھا، لیکن یہ بات تو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی تھی کہ تعلیم ان کے سماجی اور اقتصادی ماحول کو سمجھنے اور اس کو استعمال کرنے میں بھی کوئی مدد دے سکتی ہے۔۔۔۔ لیکن جب ۱۹۱۰ء میں انگریزی اور ولندیزی دونوں زبانوں کو یونین کی دفتری زبان مان لیا گیا اور اس کے بعد افریقی زبان (Afrikans.) کو بھی (جو ولندیزی کی ایک تبدیل شدہ صورت تھی اور عام لوگوں کی بول چال کی زبان تھی) وہی درجہ مل گیا۔۔۔۔ تو طلبہ کو تحصیل علم میں بے حد سہولت اور سرعت پیدا ہو گئی۔۔۔۔ اس سے ان کو ادبی اور تخلیقی جدوجہد میں بہت مدد ملی۔ شاید اس افریقی زبان کے بہترین نثری کارنامے، تو اتنے اچھے نہیں جتنے انگریزی زبان کے، لیکن نظم کا معاملہ اس سے بالکل برعکس ہے، کیونکہ اس میں یہ زبان کسی دوسری زبان سے مقابلہ کر سکتی ہے۔۔۔۔ اب یہی زبان اسکولوں میں جہاں اس کے بولنے والے پڑھتے ہیں ذریعۂ تعلیم ہے اور بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی زیادہ تر یہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ اب اس میں نہایت روانی اور بے تکلفی سے دقیق ترین مطالب اور خیالات کا اظہار ہو سکتا ہے۔"

جب انگریزی زبان ولندیزی بولنے والوں کے لیے اس درجہ رکاوٹ اور مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ حالانکہ ان دونوں زبانوں کی نوع اور تمدنی پس منظر میں بہت زیادہ فرق نہیں، تو کوئی سمجھدار آدمی یہ کس طرح تسلیم کرلے کہ ہندوستانی طلبہ اس علم اصول اور تجربے کی بندش سے بالکل آزاد ہیں، وہ کس طرح یونان کے (Icarus.) کی تقلید میں مصنوعی پروں کو موم کے ذریعے چپاں کر کے ہوا میں اڑ سکتے ہیں، لیکن شاید آپ کہیں کہ یہ سب تسلیم لیکن وہ اعتراضات

کیا ہو ۔ جنھیں خود تم نے ابتدا میں بیان کیا تھا۔ آئیے ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں ۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں" ۔ بے شک لیکن آپ اس عطیۂ قدرت سے ہراساں کیوں ہوتے ہیں؛ یورپ میں بھی بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں بھی چند بڑے بڑے لسانی علاقے ہیں۔ ان سب علاقوں میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک اسی زبان میں ہونی چاہیے جو وہاں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ انگریزی بحیثیت ایک ثانوی زبان کے اعلیٰ تعلیم کے نصاب کا جزو رہیگی۔ مغربی علوم اور مغربی تمدن کے ساتھ ہمارا رشتہ اسی کی وساطت سے قائم رہیگا اور ایک حد تک وہ مختلف لسانی صوبوں میں تبادلۂ خیال کا ذریعہ بھی بنے گی، لیکن رفتہ رفتہ یہ حیثیت باوجود کج بین اور شکست پسند لوگوں کے شکوک کے ہندوستانی زبان کو حاصل ہو جائیگی۔ مختلف زبانوں کی یونیورسٹیوں کی یہ سکیم میرے محترم دوست سر سید راس مسعود نے بھی کئی سال ہوئے پیش کی تھی، لیکن اس کا استقبال یا تو موؤب خاموشی کے ساتھ کیا گیا یا کم ہمت مخالفین نے مشکلات گنانی شروع کر دیں، لیکن آپ یقین رکھیے کہ ہونے والی بات کو کچھ عرصے کے لیے آپ ٹال سکتے ہیں، اپنی بے اعتنائی سے بالکل مسترد نہیں کر سکتے۔

باقی اعتراضات تو اس درجہ طفلانہ اور سبک ہیں کہ ان پر بحث کرنا بھی تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے مثلاً: یہ کہ ہندوستانی زبانوں میں ابھی اتنی قوت کہاں ہے کہ وہ اعلیٰ علمی مضامین کا بار اٹھا سکیں، اول تو یہ اعتراض ہندوستانی زبانوں بالخصوص اُردو زبان اور اردو ادب سے انتہائی ناواقفیت کا ثبوت ہے، کیونکہ ان زبانوں میں اب ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کا کارنامہ اس دعوے کی دلیل ہے۔ دوسرے اگر بالفرض ان زبانوں میں اتنی وسعت نہ بھی ہوتی، تو ایسی صورت میں بھی اعتراض غلط ہوتا۔ زبان میں قوت اور روانی اور بلندی کیسے پیدا ہو گی جب تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی اعلیٰ تعلیم اور مطالعے کا انتظام

نہ کیا جائیگا اور اس کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائیگا۔ اسی طرح یہ سوال بھی فضول ہے کہ کتابیں کہاں سے آئینگی، درسی کتابیں الہامی کتابوں کی طرح آسمان سے نازل نہیں ہوتیں، بلکہ مانگ پوری کرنے کے لیے تصنیف کی جاتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم مادری زبان میں دیجیے، کتابیں کچھ عرصے میں خود بخود مہیا ہو جائینگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ضرورت پڑی، کتابیں تیار ہو گئیں۔ جنوبی افریقہ میں ضرورت ہوئی، چند سال کے اندر اندر نہ صرف کتابیں لکھی گئیں، بلکہ تعلیمی افسروں، انسپکٹروں، ہیڈ ماسٹروں اور استادوں کی ذہنیت بھی بدل گئی۔

پھر خدا کے ان نیک بندوں کو یہ فکر ہے کہ اگر اسکولوں اور کالجوں میں استاد اور شاگرد کئی گھنٹے روز غلط انگریزی نہ بولینگے، تو انگریزی کا معیار کم ہو جائیگا۔ اوّل تو کوئی ان سے پوچھے کہ انگریزی کا عام معیار کم ہو جانا زیادہ بڑی مصیبت ہے یا مادری زبان کی ناقص واقفیت اور تمام درسی مضامین تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ریاضی وغیرہ کے معیار کا کم ہونا؟ جب انگریزوں نے لاطینی کو اپنے نظامِ تعلیم کی صدر نشینی سے ہٹا کر انگریزی کو اس کا حقیقی درجہ دیا ہے تو انھیں بھی یہ اندیشہ لاحق ہو سکتا تھا کہ لاطینی کی قابلیت کا معیار کم ہو جائیگا، لیکن انھوں نے اس اندیشے سے نہ انگریزی کی پڑھائی کو کم کیا نہ اسے بند کیا۔ دوسرے، انگریزی کا عام معیار قابلیت آج کل کونسا اچھا ہے کہ اس پر زور پڑنے کے خیال سے آپ لرزہ براندام ہوتے ہیں اور اس معیار کی کمی کی وجہ یہ نہیں کہ طلبہ اس کے مطالعے میں اپنی عمر کا صرف تہائی حصہ صرف کرتے ہیں۔ دو تہائی صرف نہیں کرتے، بلکہ جیسا میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ایک غیر زبان میں تعلیم پانے کی وجہ سے ان کی ذہنی تربیت نہیں ہوتی، ان میں سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ جب وہ الجھی ہوئی اور بے ربط عبارت لکھتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے خیالات الجھے ہوئے اور بے ربط ہیں اور ان کا دماغ الجھا ہوا

اور غیر منظم ہے جس شخص کو کسی زبان پر بھی اچھا عبور نہ ہو گا۔ اس کے خیالات ضرور پیچیدہ اور مبہم ہوں گے۔ لہٰذا اگر آپ کو محض انگریزی زبان کے معیار ہی سے دلچسپی ہے، تو اس کی درستی کا بھی یہی ذریعہ ہے کہ آپ طلبہ کو مادری زبان کے ذریعے تعلیم دے کر ان کا عام تعلیمی معیار بہتر بنائیں اس کا اثر ان کی انگریزی کی قابلیت پر بھی پڑیگا، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر طالب علم کو جبراً انگریزی ادب پڑھانے سے ادبی ذوق یا قابلیت پیدا ہونی لازم ہے۔ ان میں سے بیشتر طلبہ زبان تو اچھی طرح جانتے نہیں، ادب کے کیسے لطف اندوز ہو سکتے ہیں! انگریزی ادب کا پروفیسر محاسن کلام اور فنی باریکیوں پر لکچر دیتا ہے اور اس کے شاگردانِ رشید سستے نوٹس خرید کر ان سے انگریزی شعرا اور ادیبوں کی "صفات ثبوتیہ اور سلبیہ" کو حفظ کر لیتے ہیں! اس طرح ادبی ذوق اور شغف کیسے پیدا ہو سکتا ہے؛ بے شک آپ اعلیٰ تعلیم گاہوں میں سب طلبہ کو انگریزی زبان سکھائیے۔ طریقے کو بہتر بنا کر انھیں سمجھ داری کے ساتھ انگریزی پڑھنا اور اسے صاف اور صحیح بولنا اور لکھنا سکھائیے، لیکن ادب کی تعلیم انھیں طلبہ تک محدود رکھیے جن کو اس سے خاص ذوق اور دلچسپی ہے، ورنہ آپ کی محنت کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے آگے نہ بڑھے گی۔ انسان کی عمر تھوڑی ہے اور کام بہت ہیں، اس لیے بے سوچے سمجھے خیالی چھلاووں کے پیچھے بھاگنا دانش مندی کا ثبوت نہیں۔

اس بحث میں ایک اور دلچسپ واسطہ ان درخشندہ ستاروں کا دیا جاتا ہے، جن کی انگریزی دانی ہندوستانیوں کے لیے باعثِ افتخار اور انگریزوں کے لیے باعثِ رشک ہے؛ مگر افسوس کہ میرا دل اس اپیل سے بھی نہیں پسیجتا، لیکن اس کا سبب قساوت قلب نہیں، بلکہ بعض دوسرے اسباب ہیں۔ اول تو، جن ہندوستانی ادیبوں کی انگریزی قابلیت پر ہمیں ناز ہے ان میں سے بیشتر ہندوستانی یونیورسٹیوں کے چشم و چراغ نہیں، بلکہ انگریزی یونیورسٹیوں کے

تعلیم یافتہ ہیں یا سروجنی نیڈو اور ٹیگور کی طرح تلامیذ فطرت ہیں، کسی یونیورسٹی کے رہین منت نہیں دوسرے میرے نزدیک کسی نظامِ تعلیم کی کامیابی کا یہ معیار نہیں کہ اس کا اثر چند منتخب اور غیر معمولی افراد پر کیا پڑا ہے، اس کی کارگزاری کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہیے کہ عام لوگوں کی ذہنی تربیت اور تہذیب پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ اگر آپ اس خیال سے موجودہ صورتِ حال پر نظر ڈالیں، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں یہ چند نامور ادیب ہیں، تو دوسرے میں وہ لاکھوں بدنصیب طلبہ ہیں، جن کی زبان بند اور خیالات الجھے ہوئے رہتے ہیں، کیونکہ انھوں نے دنیا کو کتابوں کی عینک لگا کر دیکھا ہے اور اس عینک کا شیشہ بھی شفاف نہیں دھندلا ہے۔ اگر دس ہزار میں سے ایک عبداللہ یوسف علی نکلتا ہے جس کا قلم انگریزی زبان پر بے ساختہ رقص کرتا ہوا اچھلا جاتا ہے، تو نو ہزار یا دس بخیر یا بو تیچھے لال کی طرح ہوتے ہیں، جن کی زبان دانی اور شانِ تحریر اربابِ بصیرت کے لیے عبرت اور بیکاروں کے لیے تفریح کا سامان ہے اور باقی ایسے ہوتے ہیں، جو میری طرح ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر لیتے ہیں اور بس۔ میرے خیال میں یہ سودا بہت مہنگا ہے۔ میں اس کو بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں کہ عام طور پر ہمارے طلبہ کے خیالات سلجھے ہوئے ہوں، ان کے اظہارِ خیال میں صداقت اور بے ساختہ پن ہو، ان کی تخلیقی قوتیں بیدار ہوں، خواہ اس کے بدلے میں قوم چند نامور انگریزی ادیبوں کی برکت سے محروم ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس قربانی کی نوبت ہی نہیں آئیگی، کیونکہ ٹیگور اور گاندھی جیسے زباں دان پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انگریزی ادب کو کونین کے تلخ گھونٹوں کی طرح سے لاکھوں بچوں کے گلے سے اتارا جائے۔ ان کا وجدانی ذوق اور غیر معمولی ادبی قابلیت خود اپنے لیے راستہ بنا لیگی۔ ان کی خاطر تمام نظامِ تعلیم کو بے اثر بنانا قوم کے لیے مضر اور ان کے لیے غیر ضروری ہے۔

۱۹۴۴ء

آخر میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، جس کو کہتے ہوئے کسی قدر تامل بھی ہوتا ہے لیکن سچائی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو بیان کر دیا جائے۔ ایک دفعہ ایک علمی مجلس میں اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے خیال کی تائید میں بعض دلیلیں پیش کیں، جن کا کوئی تشفی بخش جواب مجھے نہیں ملا۔ آخر میں ایک صاحب نے، جو میرے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتے تھے، یہ دلیل قاطع پیش کی کہ تم اس بات کو نہیں سمجھتے یہ ایک تعلیمی مسئلہ نہیں، سیاسی مسئلہ ہے۔ اس الہامی ارشاد کی تہ میں دو خیال معلوم ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ شاید نظام تعلیم میں انگریزی زبان کو موجودہ حیثیت کی مخالفت انگریزی حکومت کی مخالفت سمجھی جائے۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں اور نہ میں اس تفسیر سے خائف ہوں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شاید مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جاپان کی توہین سمجھا جائے، تو آپ اس کو سن کر کیا کر سکتے ہیں؟ دوسرا زیادہ اہم اندیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں شاید ہندی کا پلہ اردو سے بھاری ہو جائے۔ لہذا ہمارے لیے انگریزی زبان کے ساتھ وابستہ رہنا ہی بہتر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال نافہمی اور تنگ نظری پر مبنی ہے اور ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ کیا یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اپنی اور ہندوستان کی تمام دوسری جماعتوں کی تعلیم کو اس خیال سے مسخ اور بے روح رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں کسی دوسری زبان یا زبانوں کو ملک میں برتری حاصل نہ ہو جائے؟ شاید آپ نے اس بڑھیا کا قصہ سنا ہوگا، جو یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کمر سیدھی ہو جائے، بلکہ یہ آرزو رکھتی تھی کہ دوسروں کی کمر بھی اس کی طرح کبڑی ہو جائے؟ کیا ہماری ذہنیت اس کبڑی بڑھیا کی سی ہو گئی ہے؟ اگر آپ کو اپنی زبان سے واقعاً محبت ہے اور آپ خلوص سے چاہتے ہیں کہ اسے ملک میں وہ درجہ حاصل ہو جس کی وہ مستحق ہے، تو اس کی خدمت پر کمر بستہ ہو جائیے اور اس کی خدمت کی بہترین صورت یہی

ہے کہ آپ جرأت کے ساتھ اپنی تعلیمی پالیسی پر نظرِ ثانی کریں، اردو کو اپنے اسکولوں اور کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں جہاں کہیں وہ بولی جاتی ہے، وہی درجہ دیں، جو دوسرے اہم مضامین کو حاصل ہے اور اسے نیچے سے اوپر تک ذریعہ تعلیم بنائیں۔ اس طرح اردو زبان میں وسعت پیدا ہوگی، اردو ادب مالا مال ہوگا۔ تعلیم یافتہ طبقے کو اس کی طرف زیادہ توجہ ہوگی، مختلف علوم و فنون کی کتابیں اس میں تصنیف اور ترجمہ ہوں گی۔ جدید خیالات اور جدید اسالیبِ بیان اس میں راہ پائینگے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے تخلیقی سوتے، جو ایک بے روح اور خلافِ فطرت طریقہ تعلیم کی وجہ سے خشک ہو گئے ہیں، دوبارہ رواں ہو جائینگے اور پھر کوئی مخالف قوت یا تعصب اس کی حق تلفی نہ کرسکیگا۔ برخلاف اس کے اگر آپ دوسری ہندوستانی زبانوں سے ڈرینگے، خوف زدہ اور بدحواس بچوں کی طرح ایک غیر زبان کا دامن پکڑینگے، اپنی زبان کو حقیر سمجھینگے، تو میں آپ کو ایسے وقت کی بشارت دیتا ہوں، جب پچھتانے سے کچھ نہ ہوگا، کیونکہ چڑیاں کھیت کو چگ گئی ہونگی!

۲۱

جاپان کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد صاحب ڈار، ایم اے، بی ٹی

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری تعلیم بالکل ناقص ہے اور ہر سال یونیورسٹیوں کے کنووکیشن کے موقعوں پر اس کے متعلق خیال آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت چونکہ ہر صوبہ تعلیم کے معاملے میں آزاد ہو رہا ہے اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے نظامِ تعلیم پر نظر ڈالی جائے اور اس سے کچھ فائدہ مند سبق حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں جاپان کے نظام کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اس مضمون کا مقصد جاپان کے موجودہ نظامِ تعلیم پر غور کرنا ہے اس لیے ہمیں جاپان کی پرانی تاریخ بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں جس کے لیے مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جن کے باعث جاپان نے موجودہ تعلیم کی طرف رجوع کیا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم جاپان کے پچھلے دور کا مختصراً مطالعہ کریں۔

موجودہ ترقی سے پہلے دوسرے تمام ملکوں کی طرح جاپان میں نظامِ جاگیرداری پورے زوروں پر تھا لیکن اس میں تھوڑا سا اختلاف تھا۔ یہاں بادشاہ براہِ راست حکومت نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کا نائب جاگیردار رئیس یہ کام سرانجام دیتا تھا اور ۱۵۷۳ء سے لے کر ۱۸۶۳ء تک ایک ہی خاندان کے جاگیردار نسلاً بعد نسلٍ (جن کو شوگن (Shogun) کہتے تھے) حکومت کرتے

رہے۔ بادشاہ کا وجود حکومت کے معاملات میں بالکل نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اس کے باوجود کبھی شوگنوں نے اپنی بے پناہ طاقت کے زمانے میں بھی بادشاہ کی ذات پر حملہ کرنے یا تختِ شاہی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ چونکہ بادشاہ کی ذات جاپانیوں کے نقطۂ نگاہ سے اتنی مقدس تھی (اور اب بھی ہے) کہ اس پر خفیف سا حملہ کرنا بدترین گناہ شمار کیا جاتا تھا۔ جس کو جاپانی من حیث القوم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔

یہ نظام پوری دو صدیوں تک ملک پر مسلط رہا اور اس عہد کی چند خصوصیات قابلِ ذکر ہیں، جن سے موجودہ دور کی ترقیوں اور جاپانی قوم کی سیرت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

سب سے زیادہ اہم واقعہ جس نے جاپان کی زندگی پر اثر ڈالا، شوگنوں کی دیگر ممالک سے قطع تعلق کی حکمت عملی تھی۔ انھوں نے جاپانیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ غیر ممالک سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے اور نہ کوئی جاپانی اپنا ملک چھوڑ کر کہیں جائے۔ لیکن ۱۵۴۲ء میں پرتگیزی سوداگر وہاں وارد ہوئے اور ان کے بعد ولندیزی وغیرہ۔ ان کا تعلق بالکل تجارتی تھا، لیکن جب بعد میں فرقۂ یسوعی نے آکر مسیحی تبلیغ کا آغاز کیا تو فسادات شروع ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے تبلیغ قانوناً بند کر دی اور تبدیل مذہب پر موت کی سزا مقرر کر دی اور پرتگیزوں اور دیگر اجنبیوں کا آنا بند کر دیا۔ صرف چینی اور ولندیزی سوداگروں کو اجازت تھی۔ چونکہ یہ خالصۃً تجارتی آدمی تھے اور مذہب کے پرچار سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے، لیکن باوجود اس قطع تعلق کے جاپان نے اس عہد میں کافی ترقی کی اور اس دور کے سب سے اہم کارنامے تعلیم اور صنعت کی وہ مضبوط بنیادیں قائم کرنا تھا، جن کی وجہ سے بعد میں جاپانی قوم نے خوب دل کھول کر دنیا کا مقابلہ کیا۔ تعلیم کے معاملے میں سب سے زیادہ کام، فوجیوں (سمورائین)، کی تربیت تھی، جو اس طور پر کی گئی کہ جب اس دور کے اختتام پر مغربی اقوام کا اثر غالب ہونے لگا تو فوجیوں نے تمام مغربی علوم و فنون سیکھ کر اپنے ملک کو

مغربی استعمار سے محفوظ رکھنے میں مدد دی۔

یہ تعلیم بالکل چینی طرز کی تھی اور اخلاق پر بہت زور دیا جاتا تھا تاکہ لوگ اپنی دنیاوی زندگی خوش گوار بنا سکیں۔ اس تعلیم میں چینی زبان، ادب اور اخلاق کا بڑا حصہ شامل ہوتا تھا۔ ایسی تعلیم کا مقصد جیسا کہ ظاہر ہے محض فوجی تربیت نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ ان میں وہ تمام صفات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، جن کے بغیر ایک فوجی کی زندگی نامکمل سمجھی جاتی ہے یعنی جسمانی اور روحانی مشکلات کا بے روک ٹوک مقابلہ، سردی اور گرمی کی شدت سے بے پروائی وغیرہ۔ ہر ایک جاگیردار نے اپنے علاقے میں مختلف مدرسے قائم کیے تھے اور کہیں کہیں ہمیں خانگی مدارس کا بھی پتہ چلتا ہے۔

لیکن اٹھارویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مغربی علوم کی طرف لوگوں کا میلان شروع ہوا اور ولندیزوں کی مدد سے بعض مغربی کتابیں خصوصاً جغرافیہ، طب اور حرب، میں آنی شروع ہوئیں اور ان میں سے بالخصوص فن حرب کی بعض کتابوں کا ترجمہ چینی میں کیا گیا۔ ان کے مطالعے سے اگرچہ چند سمورائیں مستفید ہوئے لیکن انھوں نے سمجھ لیا کہ مغربی دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اُن کی حکومت کا زیادہ دیر تک محفوظ رہنا ممکن نہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں ایک علمی انقلابی تحریک کا آغاز ہوا اور اس کا اثر علم ادب، فنون، مذہب اور سیاست سب میں نمودار ہوا۔ چینی زبان، ادب اور تاریخ کی جگہ جاپانی زبان، ادب اور تاریخ نے لے لی اور سیاسی تفتیش نے یہ چیز واضح کر دی کہ شوگنوں نے درحقیقت شاہی اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اس تحریک کا اثر خاصی مدت تک صرف خواص تک محدود رہا لیکن آہستہ آہستہ عوام میں بھی اس کا اثر نمودار ہونے لگا۔

اس کے بعد چند باتیں عام لوگوں (یعنی کسان، حرفت پیشہ اور سوداگر) کی تعلیم کے

متعلق عرض کرنی ہیں جس کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آؤں گا۔

اگرچہ سلطنت یا جاگیرداروں کی طرف سے عوام کے لیے قطعاً مدرسے نہیں تھے، پھر بھی مختلف مقامات میں لوگوں نے ذاتی طور پر اسکول کھول رکھے تھے، جہاں ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس تعلیم میں بھی اخلاق کو خاص اہمیت دی جاتی تھی اور تعلیم کا واحد مقصد لوگوں کی اخلاقی اصلاح تھا اور قومی اور مذہبی روایات کو اچھی طرح بچوں کے ذہن نشین کرا دیا جاتا تھا فیس بالکل معمولی تھی اس لیے ہر کہ و مہ تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ صرف اٹھارویں صدی کے نصف سے یہ تعلیم عام ہونی شروع ہوئی، لیکن جونہیں مغربی ممالک کی ہوس ملک گیری اور سرمایہ اندوزی کی توجہ اس طرف ہوئی، شوگنوں نے محسوس کر لیا کہ انھیں مغربیوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اس لیے حکومت نے مغربی علوم حاصل کرنے کے لیے ایک دارالعلوم کھول دیا، جہاں مختلف مغربی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں اور کچھ جاپانیوں کو مختلف ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا۔

لیکن آزادی کی جو تحریک شروع ہو چکی تھی، اُس نے آخری شوگن کو مجبور کیا کہ اپنے تمام اختیارات جو دو صدی سے اُن کے خاندان میں چلے آرہے تھے، بادشاہ کے سپرد کردے یہ واقعہ ۱۸۶۷ء کا ہے۔ اس کے بعد تعلیم کا موجودہ دور شروع ہوتا ہے جس کو ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی بحث ہمارے مضمون سے خارج ہے، اس لیے ہماری بحث مندرجہ ذیل طریقے پر ہوگی۔

(۱) ابتدائی تعلیم اور مدارس ابتدائی۔

(۲) ثانوی تعلیم اور مدارس وسطانیہ و اعلیٰ۔

(۳) تربیت اساتذہ اور مدارس معلمی معمولی و اعلیٰ۔

(۴) تعلیم نسواں اور زنانہ مدارس اعلیٰ۔

(۵) صنعتی تعلیم اور مدارس صنعت و حرفت۔

جاپان میں لازمی ہے کہ جب کوئی بچہ چھ برس کا ہو جائے، تو وہ کسی مقامی اسکول میں داخل ہو جائے۔ چھ برس سے کم عمر کے بچوں کو اسکول میں داخل نہیں کیا جاتا۔ بعض جسمانی یا دماغی کمزوریوں یا غربت کے باعث چند بچوں کو اس قانون سے تھوڑی دیر یا ہمیشہ کے لیے نجات مل جاتی ہے۔ جتنی کہ وہ لڑکے جو دوسروں کی ملازمت میں ہوتے ہیں، ان کو اسکول میں بھیجنا ان کے مالکوں پر فرض ہے۔ بعض حالتوں میں بچوں کو گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے اجازت مل جاتی ہے، لیکن ان کی ترقی کا اندازہ کرنے کے لیے بلدیے کی طرف سے امتحان ہوتا ہے اور اگر نتیجہ تسلی بخش نہ ہو، تو اجازت نامہ منسوخ کر دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خانگی مدارس جن میں ایسے لڑکے داخل ہو سکتے ہیں بہت کم ہیں۔

جبری تعلیم کے نافذ کرنے کا طریقہ بہت وسیع اور نتیجہ خیز ہے جس کی پیروی ہندوستان میں بھی مفید ہو سکتی ہے۔ سال کے اختتام پر (دسمبر کے آخری ایام میں) صدر بلدیہ یا وہ اپنے علاقے کے ایسے بچوں کی ایک فہرست تیار کرواتا ہے، جو یکم اپریل آئندہ سال مدرسوں میں داخل ہونے کے قابل ہونے والے ہیں (یعنی ان کی عمر چھ سال کی ہو گی) اس کے بعد والدین متعلقہ کو اس امر کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور اگر اس علاقے میں ایک سے زیادہ مدارس ہوں تو یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بچے کو کون سے مدرسے میں داخل ہونا ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے مدرسے کے صدر معلموں کو بھی اطلاع مل جاتی ہے کہ آئندہ سال کتنے اور کون سے نئے بچے داخل ہونے والے ہیں۔ اگر کوئی بچہ تاریخ مقررہ سے سات دن بعد تک داخل نہ ہو، تو اس کی اطلاع صدر بلدیہ کو بھجوا دی جاتی ہے جس پر صدر خود اس کے والدین یا محافظین کے نام

حکم نافذ کرتا ہے اور اگر کوئی بچہ داخل ہونے کے بعد مسلسل سات دن تک غیر حاضر رہے تو بھی یہی عمل کیا جاتا ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوتاہی ہو، تو پھر حاکم صوبہ کو اطلاع دی جاتی ہے جو پوری کارروائی کرنے کے بعد بچے کو مدرسے میں داخل ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں تعلیمی سن رکھنے والے بچوں کی اوسط جو مدرسوں میں پڑھتے ہیں، ۹۵ سے لے کر ۱۰۰ فی صدی تک ہے جب جبری تعلیم کا یہ حال ہو، تو ضروری ہے کہ ہر شہر اور گاؤں میں، اپنی اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مدرسے بنائے جائیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے ہر قصبے اور گاؤں میں اسکول کھولے گئے ہیں اور بعض حالتوں میں یعنی مالی کمزوری کی وجہ سے دو مختلف گاؤں مل کر ایک مدرسہ قائم کر لیتے ہیں اور چونکہ تعلیم لازمی ہے، اس لیے فیس بالعموم نہیں ہوتی، لیکن بعض استثنائی حالتوں میں، جہاں فیس کے بغیر تعلیم کا جاری رہنا محال ہوتا ہے (چونکہ جاپان سرمائے کے لحاظ سے بہت امیر ہے) معمولی سی فیس لی جاتی ہے۔

شاہی اعلان کے مطابق ابتدائی تعلیم کا مقصد بچوں کو اخلاق اور مدنیت کے ابتدائی اصولوں اور ان علوم و فنون سے، جن کی روزمرّہ کی زندگی میں اشد ضرورت ہوتی ہے، روشناس کرانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی جسمانی دیکھ بھال بھی اس مقصد کا ایک جزوِ اہم ہے۔

ابتدائی تعلیم دو حصوں میں منقسم ہے: معمولی ابتدائی اور اعلیٰ ابتدائی۔ پہلی قسم کی تعلیم کا زمانہ چھ سال کا ہوتا ہے اور دوسرے کا عام طور پر دو سال اور بہت کم حالتوں میں تین سال۔ اس دوران میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ایک ہی مدرسے میں تعلیم پاتے ہیں۔ معمولی ابتدائی مدارس میں مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے ہیں: اخلاق، جاپانی زبان، حساب، ورزش، ڈرائنگ، گانا، دستی کام، زراعت اور لڑکیوں کے لیے سینا پرونا اور اعلیٰ مدارس میں ان کے علاوہ جاپانی تاریخ، جغرافیہ، سائنس زیادہ کیا جاتا ہے۔ ان مضامین کے نصاب کی تفصیل سے وہاں کی

تعلیم کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) **اخلاق**۔ دوسری درسی کتب کی طرح، اخلاق کی کتابیں محکمۂ تعلیم کی زیر نگرانی تیار ہوتی ہیں اور دو مختلف قسم کی ہوتی ہیں، ایک بچوں کے لیے اور ایک اساتذہ کے لیے اور ہر سال کے لیے مختلف نصاب ہوتا ہے۔ اساتذہ کی کتاب میں یہ چیزیں ہوتی ہیں: ہر سبق کا مقصد، اس سبق کی تشریح اور خلاصہ، جو جماعت کے سامنے پیش کرنا ہے، وہ نکات جن کی طرف طلبہ کو خاص توجہ دلانی مقصود ہوتی ہے اور آخر میں وہ سوالات جو سبق کے اختتام پر لڑکوں سے پوچھنے ہیں۔

بچوں کی پہلے سال کی کتاب میں مندرجۂ ذیل پر بحث ہوتی ہے: مدرسہ، استاد، وقت کی پابندی، جماعت کا کمرہ، کھیل کا میدان، ماں باپ، جسم اور حقوق العباد پر آسان سی بحث۔ یہ تمام باتیں چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ دوسرے سال یہی باتیں زیادہ وسعت کے ساتھ کہانیوں کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں اور مضمون عموماً یہ ہوتے ہیں: بچے اور والدین، شہنشاہ جاپان، قومی جھنڈا، بھائی بہن وغیرہ۔ اسی طرح ہر جماعت میں سلسلے وار مختلف مضامین پر بحث ہوتی ہے اور ان کے سمجھانے کے لیے جاپانی تاریخ کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جن سے بچوں میں اچھا قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

طریقۂ تعلیم کے متعلق میں دو عنوان لیتا ہوں۔ پہلا عنوان "ماں باپ" ہے جو دوسری جماعت میں شامل ہے۔ اس عنوان کا مقصد یوں درج ہے: بچوں کو اس چیز کا احساس کرایا جائے کہ ان کی ساری زندگی اور آسائش ماں باپ کی محبت اور احسان پر منحصر ہے۔

"دیکھو یہ ایک بیمار بچے کی تصویر ہے۔ اس کے سرہانے باپ بیٹھا ہوا ہے اور ماں اسے دوا پلا رہی ہے۔ دیکھو، بچہ کتنے دن سے بیمار ہے اور والدین کو نہ دن کو چین نصیب ہے اور نہ رات کو آنکھ جھپکانے کی مہلت دیکھو تمہارے بھی ماں باپ ہیں جو تمہارے ساتھ ایسی ہی محبت

کا سلوک کرتے ہیں۔ یہ تمہارے کپڑے تمہارے والدین ہی نے تمھیں دیے ہیں اور تمہارا کھانا اور پینا؛ وہی تم کو پڑھنے کے لیے مدرسے بھیجتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کسی چڑیا کے بچے کو گھونسلے سے گرا ہوا دیکھا ہے جس کو کوئی کھلانے والا نہیں ہوتا، اگر خدانخواستہ تمہارے ماں باپ نہ ہوتے تو تمھاری بھی یہی حالت ہوتی۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ تم اپنے ماں باپ کا احسان کبھی نہ بھولو" وغیرہ وغیرہ۔

سبق کے بعد سوالات کا نمونہ ملاحظہ ہو:

(۱) جب تم بیمار تھے، تو تمہارے والدین نے کس طرح تمہاری تیمارداری کی؟

(۲) جب تم تندرست ہو، تو وہ کس طرح تمہاری دیکھ بھال کرتے ہیں؟

(۳) جب چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر پڑے، تو کیوں اس پر رحم کھانا چاہیے؟

(۴) تمہاری خوشی اور راحت کن کے باعث ہے؟

دوسری مثال میں چوتھے سال کے نصاب سے دونگا، جس میں جاپانی سلطنت، حب وطن، محنت، شجاعت، ہمدردی، تعلیم، آدمی اور عورت کے فرائض وغیرہ مضامین سے بحث ہوتی ہے اور ہر ایک کو کہانیوں سے واضح کیا جاتا ہے۔ "مرد اور عورت کے فرائض" پر استاد کو یوں بحث کرنے کی ہدایت کی گئی ہے (اس سے ضمناً آپ کو عورت کے متعلق جاپانی نقطۂ نگاہ کی بھی توضیح ہو جائیگی)

"بچو! تمہارے باپ مختلف کاموں میں مشغول ہیں اور تمہاری مائیں بڑے بوڑھوں اور بچوں کی نگہداشت اور گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ چنانچہ ماں اور باپ کے فرائض مختلف ہیں۔ آدمی بڑا ہو کر گھر کا مالک بنتا ہے اور عورت گھر کے کاروبار کی ذمے دار اور دونوں ایک دوسرے کے مددگار، دونوں کو برابر اخلاق اصول پر کاربند رہنا چاہیے، لیکن آدمی تنومند اور سخت کام کرنے کے لیے

بنائے گئے ہیں اور اس کے بالمقابل عورت، نرم مزاج اور کمزور پیدا کی گئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت کو حقیر سمجھا جائے نہیں، بلکہ دونوں کے فرائض مختلف اور ایک جیسی اہمیت رکھتے ہیں۔۔۔۔"

(ب) **حساب** کی تعلیم کا مقصد اخلاق کی طرح بالکل عملی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ طالبعلم اس سے اپنی روزمرہ کی زندگی میں فائدہ اٹھا سکیں معمولی ابتدائی مدارس میں ہندسے، پہلے چار ابتدائی قاعدے، کسور اعشاریہ اور ان کی سادہ جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم، پھر جاپانی اوزان اور سکوں کے پیمانے اور ان کے بعد کسور عام۔ اس ترتیب میں یہ بات قابل غور ہے کہ کسور عام سے بہت پہلے، کسور اعشاریہ سکھائے جاتے ہیں۔ جاپانی ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ بچوں کو ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور علاوہ اس کے ان کے اوزان اور دیگر پیمانے، نظام اعشاریہ پر مبنی ہیں۔ اس لیے روزمرہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تبدیلی روا رکھی گئی ہے۔

اعلیٰ ابتدائی مدارس میں مندرجہ بالا قواعد کے علاوہ، میٹرک سسٹم، مشہور غیر ملکی پیمانے، کسور اعشاریہ اور کسور عام کا تعلق، ذو اضعاف اقل، عاد اعظم، فیصدی، تناسب، تناسب معکوس وغیرہ۔

(ج) **جاپانی تاریخ**۔ تاریخ کا اہم مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ بچوں کے دلوں میں قومی روح پیدا کی جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ تاریخ کی تعلیم میں اخلاقی نقطۂ نگاہ پر پورا زور دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے محکمۂ تعلیم نے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور تمام ملک میں ایک ہی کتابیں رائج ہیں۔ تاریخ پانچویں سال سے شروع ہوتی ہے اور زیادہ طور پر مشہور افراد کی زندگی بیان کرتے ہوئے، تاریخی واقعات بتائے جاتے ہیں یا اگر یہ ممکن نہ ہو، تو پھر صرف مشہور واقعات کی تفصیل بیان کر دی جاتی ہے۔

(۵) **دستی کام**۔ اس پر بہت زور دیا جاتا ہے اور بچے کاغذ، مٹی، گھاس، لکڑی اور بانس کی مختلف چیزیں بناتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی قوتِ غور کو ترقی ہو اور جو کچھ انھوں نے سائنس، ڈرائنگ اور حساب میں سیکھا ہے، اس کو عملی جامہ پہنانا سیکھیں سب سے زیادہ زور "خوبصورتی" اور "محنت کی قدر" پر دیا جاتا ہے۔

عام مضمونوں کے علاوہ بعض ابتدائی مدارس میں، مقامی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد مندرجۂ ذیل نقشے میں مختلف مضمون اور ان کے لیے ہفتے میں جتنے گھنٹے مقرر ہوتے ہیں، درج کرتا ہوں جس سے معاملہ واضح ہو جائیگا۔

نقشہ نمبر (۱)

مضامین	مدارس ابتدائی معمولی						مدارس اعلیٰ	
	سال اوّل	سال دوم	سال سوم	سال چہارم	سال پنجم	سال ششم	سال اوّل	سال دوم
اخلاق	(۲) مبادیات	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً
جاپانی زبان	(۱۰) لہجہ اور تلفظ، سادے فقرے پڑھنا اور لکھنا، بول چال	(۴) عام مستعمل چینی حروف ایضاً	(۴) ایضاً	(۴) ایضاً	(۱۰) ایضاً	(۱۰) ایضاً	(۸) چینی حروف اور عام فہم روزمرہ کے فقرے	(۸) ایضاً
حساب	(۵) گنتا، زبانی جمع تفریق، ضرب، تقسیم، ۲۰ سے کم اعداد	(۶) ایضاً سو اعداد تک	(۶) عام جمع تفریق ضرب تقسیم	(۴) کسور اعشاریہ اور ان کی جمع تفریق	(۴) کسور اعشاریہ ضرب اور تقسیم	(۴) کسور اور فیصدی	(۴) کسور، تناسب، فیصدی	(۴) تناسب اور تجارتی حساب کتاب
جاپانی تاریخ اور جغرافیہ	~~~	~~~	~~~	~~~	(۲) ابتدائی تاریخ اور جغرافیہ	(۳) پہنچے کیساتھ کوریا، مانچوکیو اور دوسرے غیر ملکوں کا جغرافیہ	(۳) جاپانی تاریخ اور غیر ملکی جغرافیہ	(۲) ایضاً

مضامین	مدارس ابتدائی معمولی						مدارس اعلیٰ	
	سال اوّل	سال دوم	سال سوم	سال چہارم	سال پنجم	سال ششم	سال اوّل	سال دوم
سائنس	—	—	—	—	(۲) پودے جانور دھاتیں اور قدرتی مناظر	(۲) دسی اور انسانی جسم کی ساخت	(۲) پودے جانور معدنیات قدرتی مناظر، عناصر اور مرکبات معمولی مشینوں کے اصول انسانی جسم کی ساخت اصول حفظانِ صحت	(۲) ایضاً
ڈرائنگ	(۱) سادہ اشیاء	(۱) ایضاً	(۱) ایضاً	(۱) ایضاً	(۲) لڑکوں کیلیے ایضاً (۱) لڑکیوں کیلیے ایضاً	(۲) لڑکوں کیلیے ایضاً (۱) لڑکیوں کیلیے ایضاً	(۲) لڑکوں کیلیے (۱) لڑکیوں کیلیے } مختلف اشیاء	(۲) لڑکوں کیلیے (۱) لڑکیوں کیلیے جیومیٹری، ڈرائنگ
دستی کام	(۱) معمولی کام	(۱) ایضاً	(۱) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	(۲) ایضاً	لڑکوں کیلیے (۲) لڑکیوں کیلیے (۱) معمولی کام	ایضاً
زراعت وغیرہ	—	—	—	—	—	—	(۲) ابتدائی اصول ماہی گیری اور سمندری اشیاء کا علم	(۲) ایضاً
انگریزی	—	—	—	—	—	—	(۲) لکھنا پڑھنا اور بول چال۔	(۲) ایضاً

نوٹ:- خطوط وحدانی میں جو ہندسے درج ہیں وہ گھنٹے ہیں جو فی ہفتہ ہر مضمون کیلیے مقرر ہیں۔

۳۲

فروبل اور حیاتیات

از

عبدالمجید خاں صاحب بی اے

"ترقی ہی صرف انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ وصف حیوانات تو کیا خدا کو بھی میسّر نہیں، کیونکہ حیوان جو کچھ ہیں وہی رہینگے اور خالق بھی، لیکن انسان جو کچھ ہے، اس سے بہت زیادہ ہونے کی امید رکھتا ہے۔"

"ایک وسیع ہوادار کمرہ۔ ایک کونے میں ریت کا ڈھیر۔ دوسرے میں نہانے کا ٹب۔ رسی کی بنی ہوئی سیڑھی، جھولا۔ دیوار کے نچلے حصّے کے ساتھ ساتھ سبز یا سیاہ تختہ۔ چھوٹی چھوٹی بھدی سی گاڑیاں اور ٹرالیاں۔ صندوق، جن سے گھر، دکان یا کشتیاں وغیرہ بنائی جاسکتی ہیں۔ کھانا پکانے کے لیے ایک سادہ سا سٹوو۔ ہر قسم کی گڑیاں۔ لکڑی کے جانور۔ لکڑی کے گملوں میں پودے"

مندرجۂ بالا مس ہاسکنز ابراہال (Miss Hoskyus Abrahall.) کے ایک ایڈریس سے جو اس نے چند سال ہوئے پڑھا تھا، اسلیے لیا گیا ہے کہ اُس نے بچوں کے صحیح ماحول کے تصور کے اسی منبع کی طرف رجوع کیا ہے، جس سے فروبل (Froebel.) نے اپنے خیالات لیے اور جس کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتا ہے: "صرف زندگی ہی صحیح منبع ہے"۔ مس ہاسکنز کے مضامین حیاتیاتی (Biologist) نقطۂ نظر سے لکھے ہوتے ہیں۔

آج کل بعض حلقوں میں بستان الاطفال (Kindergarten.) کو دقیانوسی کہا جاتا ہے اور اس بات پر خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے کہ اس کی بنیادیں سائنٹیفک اصولوں کے مطابق

نہیں۔اُس ڈاکٹر میریا مانٹسوری Dr. Maria Montessori کے خیالات کی نشرو اشاعت کے ذمے دار جس نے تربیت الاطفال کے مسئلے کو طبی نقطۂ نظر سے حل کرنا چاہا ہے۔ بہت حد تک یہی خیالات ہیں، لیکن نہ تو انگلینڈ میں فروبل کے متبعین تذکرۂ بالا حضرات سے ہمنوا ہیں اور نہ امریکہ ہی میں اور اس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً: عوام نے جن چیزوں کو نیا مان لیا ہے، ان میں سے اکثر چیزیں متبعین فروبل کے لیے روزمرہ کے واقعات ہیں۔ عوام میں بڑے بڑے سائنسدان، تعلیمی مسائل کے ماہرین اور وہ حضرات بھی شامل ہیں، جنھوں نے بستان الاطفال کے معنی دریافت کرنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ ان روزمرہ کے واقعات میں جذبۂ خدمت خلق کی تربیت کا خیال، موزوں سامانِ آرائش۔ چھوٹی چھوٹی کرسیاں اور چیزیں جنھیں بچے آسانی سے ادھر ادھر اٹھا کر رکھ سکیں مختلف چیزیں رکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی الماریاں بھی شامل ہیں اور یہ بہت آزادی اور "ضبط نفس" Self Control. کی طرف رہنما ہیں۔

متبعین فروبل (Froebel. کے لیے یہ بات بھی سنگِ راہ ہے کہ جہاں ڈاکٹر مانٹیسوری (Dr. Montessori.) نے لفظاً آزادی کی حمایت کی ہے، وہاں اپنے "تعلیمی سامان" (Didactic epparatus) پر زور دے کر جس کا منشا حواس کی تمیز اور فہمید کی رسمی تربیت ہے بچے کے قدرتی اعمال کو محدود اور مقید کر دیا ہے۔ یہ "تعلیمی سامان" سیگوئن (Saguin. جو سامان ناقص اور کمزور دماغ بچوں کے لیے تجویز کیا تھا، اسی کی توسیع کر کے مناسب حال بنا لیا گیا اور یہ محض تکلف ہے کیونکہ بچہ اس کو اپنی حسب مرضی استعمال نہیں کر سکتا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مانٹیسوری (Dr. Motessori.) نے یہ کہیں نہیں بتلایا کہ اس نے "کھیل" کا بھی مطالعہ کیا ہے یا یہ کہ وہ بچے کے "افعال بازی" Play activities یا "قدرتی اعمال" کو (Natural activities) جن پر بستان الاطفال کی بنیاد ہے کوئی

خاص اہمیت دیتی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کو پہلے پہل اُن بچوں کا مطالعہ کرنا پڑا، جو دماغی طور پر ناقص اور کمزور تھے اور ان میں کسی کام کو شروع کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔

ان "افعال بازی" میں بچے کی نقل اتارنے کی عادت اور بہانہ سازی (Pretence.) کو بھی شامل کرنا لازمی ہے۔ مگر ڈاکٹر مانٹیسوری Dr. Montessori اس چیز کو سمجھنے سے بالکل عاری تھیں۔ جیسا کہ ان کے اس مضمون سے جو انھوں نے "تخیل" (Imagination) پر لکھا ہے واضح ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ نسبتہً غریب آدمیوں کے بچے ہی چھڑیوں کو گھوڑے سمجھ کر ان پر سوار ہوتے ہیں یا کرسیوں کے تانگے بناتے ہیں" ان کے نزدیک "یہ تخیل" کا ثبوت نہیں بلکہ "ایسی خواہش کا ثبوت ہے جو پوری نہیں ہوتی" اور یہ کہ امرا کے بچے جنھیں گھوڑے اور گاڑیاں میسر ہیں "ان بچوں کی خوشی کو دیکھ کر جو ساکن کرسیوں پر چڑھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ موٹر کار میں سیر کر رہے ہیں، حیران ہونگے" تقلیدی کھیل (Imitative play) کو غربت یا امارت سے کوئی غرض نہیں، بلکہ جیسے فروبل نے بہت پہلے کہا تھا، وہ نتیجہ ہے تقلیدی تہیج (Imitative impulse) کا جو ہر ملک، ہر زمانے اور ہر طبقے کے بچے کو تقلید پر اکساتا ہے تاکہ وہ اپنے گردو پیش کی ہر چیز اور ہر شخص کو جنھیں وہ دیکھتا ہے، سمجھ سکے۔

ڈاکٹر مانٹیسوری (Dr. Motessori.) کے کام نے بچوں کے مدارس کے لیے تحریک آزادی میں بہت مدد کی ہے۔ آزادی سے مراد دانشمندانہ رہنمائی یا استاد کے اختیارات سے آزاد ہونا نہیں، بلکہ ٹائم ٹیبل کی سختی، رسمی اسباق اور جبری پابندیوں سے آزاد ہونا مطلوب ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جماعتی آزادی کے علاوہ شخصی آزادی بھی مراد ہے۔ عمدہ بستان الاطفال تو ٹائم ٹیبل کو پہلے ہی خیرباد کہہ چکے ہیں، کیونکہ ان کی جماعتیں اتنی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں کہ ہر فرد کے مناسب حال مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ فروبل ہمیشہ اس بات پر زور دیتا رہا کہ بچے کا اپنی زندگی

کے دونوں مخالف پہلوؤں یعنی فیصلہ کرنے اور رہنمائی کرنے والے شخصی پہلو اور محکوم یا تحت پہلو سے واقفیت بہم پہنچانا لازمی ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دے رہا کہ بچے کے تمدنی شعور (Social Consciousness.) کی نشو و نما بہت جلد ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ ہی توسیع شخصیت (Expansion of individuality.) بھی، لیکن ان دونوں کا اکٹھا کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے استادانِ بستان الاطفال ڈاکٹر مانٹیسوری کے طریق انفرادی تعلیم کو استعمال کرکے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لیے تیار ہیں کہ فروبل (Froebel.) کو ۱۸۴۰ء میں بچے کی ضروریات کے متعلق جتنا گہرا اور وسیع علم تھا، ڈوٹوریسا (Dotteressa.) کو آج بھی حاصل نہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم فروبل کے نظریوں کا ایک ماہر حیاتیات (Biologist.) کے اخذ کردہ نتائج سے موازنہ کرینگے، کیونکہ حیاتیات (Biology.) علم طب کے خلاف زندگی کا مطالعہ عام حالات کے، ماتحت کرتی ہے، اس لیے اس کا زاویۂ نگاہ زیادہ وسیع اور صحیح ہوگا۔

جس ایڈریس کا کچھ حصہ اس مضمون کے شروع میں نقل کیا گیا ہے، اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کے مسائل کو کسی ماہر حیاتیات (Biologist) کے سپرد کرنا چاہیے "مگر یہ لازمی ہے کہ وہ ان تمام خیالات سے، جو مروجہ طریقوں کی بنا پر قائم ہیں، خالی الذہن ہو۔ خوراک، روشنی، ہوا اور نیند جیسے بنیادی اصولوں کے بعد جن مسائل کو اسے حل کرنا ہے، وہ نشو و نما کے مختلف مدارج ہیں۔ پھر ان مدارج کے مناسب افعال اور ان افعال کو اکسانے کے لیے ضروری "مہیج" (Stimulus.)۔ اس کے دماغ میں ہر وقت یہ خیال موجود ہونا چاہیے کہ کسی بڑھتی ہوئی مخلوق کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دینا ایک خطرناک کام ہے" اور اس کے پیش نظر یہ مقولہ ہونا چاہیے "جب شک ہو تو ہٹ جاؤ"۔

بچے کے قدرتی افعال کا پتہ لگانے کے لیے حیاتیاتی معلم (.Biologist Educator) مندرجۂ ذیل پر بھروسہ کرتا ہے۔ اوّل بچے کا مطالعہ۔ دوم نظامِ عصبی کا علم۔ سوم نسل کے گزشتہ حالات کا علم۔ ان سے وہ ایک نہایت صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے "اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا محفوظ ترین طریق کھیل ہے" اور کھیل کی تعریف یوں کی ہے "بچے کے عمل کا قدرتی اظہار۔ فعلیاتی (.Physiological) نشو و نما کے لحاظ سے باترتیب، لیکن ناظم ٹیل کی سختی سے آزاد"

یہ بتا دینا آسان ہے کہ اگرچہ فروبل (Froebel) ڈاروِن (.Darwin) سے پہلے گزر چکا تھا تاہم اس کا تعلق بہت سے ایسے سائنسدانوں کے ساتھ رہا جو ارتقا کے نظریوں پر کام کر رہے تھے۔ کراس (.Krause) کا، جو عضویاتی نمو .Organic development کے خیال کو علم معاشرت کے تمام شعبوں پر چسپاں کرتا تھا، فروبل پر بہت گہرا اثر تھا۔ چونکہ ۱۸۲۶ء میں فروبل خود ہی وہ "حیاتیاتی معلم" تھا، جو اپنے وقت کے طریقوں کے خیالات سے آزاد تھا۔ اپنے ایک شاگرد سے کہتا ہے "اپنے کام کو صحیح نام سے پکارو اور اس طرح اس نئی روح کی جو تم نے جاری کی ہے اصلی حالت واضح کر دو"

لیکن فروبل ایک ماہر حیاتیات سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ وہ ایک فلسفی تھا اور (.Idealist) اگرچہ بعض اوقات انہیں الفاظ کو اس کے لیے بطور طعن و تشنیع استعمال کیا گیا ہے۔

فروبل کے "انسانی تربیت" کے خیالات کے عقب میں ہمیں اس کا تصور انسانیت ملتا ہے اور جب تک ہم تعلیمی نظریوں کے لحاظ سے حیاتیات کی اہمیت کو ذرہ بھر کم کیے بغیر حیاتیات کا بنظرِ تعمق مطالعہ نہ کریں گے۔ ہمارے لیے اس بات کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہو جائیگا کہ فروبل نے "بیساختہ کھیل" .Spontaneous play پر کیوں اس قدر زور دیا ہے۔ جس طرح

ماہر حیاتیات کھیل کی تعریف "بچے کے اعمال کا قدرتی اظہار" کرتا ہے، اسی طرح فروبل .Froebel کہتا ہے کہ "سب سے پہلے کھیل ہی قدرتی زندگی ہوتا ہے" لیکن فروبل کے لیے بیساختہ کھیل "کی قدر و قیمت" اس کی بے ساختگی میں مضمر ہے، کیونکہ ماحول کا بیساختہ جواب ہی اظہار خودی ہے اور اس اظہار خودی سے صحیح انانیت اور شعورِ خودی پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہمیں فروبل کو سمجھنا ہے، تو ہمیں "خودی کیا ہے" کے سوال کے جواب سے، جو اس نے کراسی (.Krause) اور دیگر لوگوں سے حاصل کیا، اپنا مطالعہ شروع کرنا چاہیے۔

"تعلیم و تربیت کس طرح ہونی چاہیے" اس سوال پر پہنچنے سے پہلے فروبل نے صرف مقصد تعلیم و تربیت کا غائر مطالعہ کرنا ہی لازمی نہیں سمجھا، بلکہ اُس نے مقصد حیات انسانی اور باقی تمام چیزوں کا مقصد حیات، یہاں تک کہ کسی جز کا کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں کے سوال کو حل کرنا لازمی اور اہم قرار دیا ہے۔ اس طرح ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں، جسے وہ "ہر چیز کی بنیاد" کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا خلاصہ مندرجۂ ذیل ہے۔

صاف نظر آرہا ہے کہ عالم ایک عظیم الشان کل ہے۔ جس کے پُرزے ہر وقت ایک خاص نظام اور قانون کے ماتحت کسی مہتم بالشان مقصد کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ہوا جنبش میں ہے۔ زمین نباتات اُگا رہی ہے۔ درخت جھوم رہے ہیں۔ دریا بہہ رہے ہیں۔ پہاڑ آتش فشاں ہیں۔ یہ دیکھ کر انسان کو خود بخود خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی پرزور ہاتھ ہے، جو ان تمام پرزوں کو چلا رہا ہے۔

دست پنہاں و قلم بیں خط گزار　　اسپ در جولان و ناپیدا سوار
پس یقیں در عقل ہر داننده است　　اینکه با جنبیده جنباننده است
تن بجاں جنبد نمی بینی تو جاں　　لیک از جنبیدن تن جاں بداں

اسی زبردست قوت کے اسمائے حسنیٰ کو الحی القیوم۔ الظاہر والباطن۔ العزیز الجبار۔

الخالق۔ الباریٔ المصور کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

برگسان کی طرح فروبل کا بھی یہی خیال ہے کہ ہر شے کے پیچھے کوئی نہ کوئی قوت کار فرما نظر آتی ہے اور بجز اس مادے کے تصور کے جو اس قوت کا مظہر ہے ہم براہ راست اس قوت کی فہمید سے قاصر ہیں اور اسی طرح ہمارے ذہن میں کسی مادے کا تصور اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک ہم اس قوت کا تصور نہ کریں۔ قوت کا اظہار ہر طریق سے ہوتا رہتا ہے۔ فطرت اور موجوداتِ عالم کا ذرہ ذرہ اس شاہدِ ہرجائی کا مظہر ہے۔ لیکن انسان، جو خلاصۂ موجودات اور اشرف المخلوقات ہے، اس میں یہ ازلی قوت اس لیے سرگرم عمل ہوئی کہ اس کو اس بات کا علم اور احساس ہو جائے کہ وہ قوتِ مطلق کے جمال و جلال کا سب سے بڑا آئینہ دار ہے اور جس قدر وہ اپنی مادی زندگی میں روحانی ترقی حاصل کرتا ہے، اُسی قدر علی الترتیب کے ساتھ ساتھ اُسے اپنی ترقی کا شعور بھی حاصل ہوتا ہے، مگر با این ہمہ انسان کا جو ارضی مخلوقات کا بہترین نوع ہے۔ روحانی شاہراہ ترقی پر پہلا قدم ہے اور اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شعور کے تمام نزمنازل طے کرتا ہوا ان نامعلوم بلندیوں پر پہنچ جائے جن کی وسعت و حدود کا تعین ساکنینِ ملاءِ اعلیٰ بھی نہ کر سکیں۔

شعورِ خودی انسان کا ہی خاصہ ہے۔ دیگر حیوانات اس سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ احساس ناکامی شعور کو مستلزم ہے۔ اسفل حیوانات کی جبلت (Instincts.) معین ہوتی ہے، اس لیے انھیں ناکامی نہیں ہوتی، یعنی، دوسرے الفاظ میں وہ کچھ سیکھ نہیں سکتے۔ برعکس اس کے انسان بہت کچھ کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اس کی جبلت نسبتہً غیر معین ہوتی ہے، اسے بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کوشش اور ناکامی کا نتیجہ اس کا وہ علم ہے، جو اسے اپنی ذات کی حدود اور اپنی طاقتوں کے متعلق یا اپنی ذات کے متعلق حاصل ہوتا ہے۔

فروبل کے خیال کے مطابق "تعلیم و تربیت کا مقصد بنی نوع انسان کی باقاعدہ ترقی ہے"

اور اگرچہ اس کے زمانے میں فعلیاتی علم Physiological knowledge مفقود تھا، تاہم اس نے ترقی کے ذرائع دریافت کرنے میں وہ ماہر حیاتیات کا نمونہ ہے، یعنی "اوّل اپنی گزشتہ زندگی کا مطالعہ دوم بچوں کا فرداً فرداً نیز جب وہ مل کر کام کر رہے ہوں اُس وقت اُن کا مطالعہ اور ان دونوں حالتوں کا موازنہ۔ سوم نسلی تاریخ اور نسلی ارتقا کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ۔"

فروبل بچوں کی زندگی کے مطالعے کا بہت بڑا حامی ہے۔ وہ اپنی ایک عم زاد کو خط لکھتا ہے جس میں اس امر کی استدعا کی ہے کہ "ہر بچے کے متعلق علٰحدہ علٰحدہ اہم واقعات کو حیطۂ تحریر میں لائیں" اور اس کے ساتھ ہی یہ اضافہ کرتا ہے "میرے نزدیک بچوں کی فطرت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ ان واقعات کی اشاعت ہو اور نہایت لازمی ہے کہ ہم اپنے مشاہدات کا وقتاً فوقتاً موازنہ اور مقابلہ کرتے رہیں تاکہ جن حالات کا ہم مطالعہ کریں، آہستہ آہستہ ان کی وجوہات اور بنا قرار دے سکیں اور اس طرح ان کے لیے قوانین اور اصول وضع کر سکیں۔" وہ اس امر پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے کہ اس کے اپنے زمانے میں بھی "مدرسے میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے بچے کی نشو و نما، اس کا مشاہدہ اور رہنمائی" اس معیار کے مطابق نہیں، "جس معیار تک علم و فن ترقی کر چکا ہے"۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ جس امر کا بیڑا اس نے اٹھایا ہے "اس کا ایک قابلِ لحاظ حصہ ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھنا ہے، جس میں ایسے اساتذہ تیار کیے جائیں جو بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال ان کی زندگی کے مطالعے کی بنا پر کر سکیں۔"

شخصی ترقی کے مدارج کا تذکرہ کرتے ہوئے فروبل (Froebel) لکھتا ہے کہ "انسانی ترقی میں سوائے اصول ترتیب اور تواتر (Order of Succession.) کے اور کوئی اصول اہم نہیں اور اس اصول میں وہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، جو سب سے پہلے واقع ہو۔" اس نقطۂ نظر سے بچپن کا زمانہ نہایت ہی اہم اور وقیع ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ مختلف

مدارج کی مکمل اصلاح اور ترقی ان کے ماقبل مدارج کی انفرادی اور مجموعی مکمل اصلاح اور ترقی پر منحصر ہے۔"

اس لیے والدین کا فرض ہے کہ وہ "بچے کی زندگی کا نہایت گہرا مطالعہ کریں تاکہ انھیں پتہ چل سکے کہ اُسے موجودہ دور ارتقا میں، کن چیزوں کی ضرورت ہے" اور پھر "ماحول پر ایک گہری نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کیا کچھ پیش کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ — اور طبعی (Normal.) ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تمام امکانات کو کام میں لائیں۔ جو کچھ نقصان دہ ہو اس کو چھوڑ دیں اور اگر وہ بچے کے لیے وہ چیز مہیا نہیں کر سکتے، جو اس کی فطرت چاہتی ہے اور اس کے برعکس وہ چیز مہیا کی جاتی ہے، جو اس کی فطرت کے خلاف ہے تو کم از کم" اس کے نقائص کو مان لیں ،،

فروبل لکھتا ہے کہ "اگر والدین بچے کو وہ چیز دیتے ہیں، جس کی اسے ضرورت نہیں، تو وہ بچے کے اس بھروسے کو، جو اسے ان کی سمجھ اور ہمدردی پر ہے، ضائع کر دیتے ہیں" استاد کا کام "بچے کو ایسے ماحول اور متعلقات سے متعارف کرانا ہے، جو ہر طرح ان کے مناسب حال ہوں اور جن میں نقصان کا احتمال نہایت ہی کم ہو اور جب تک اسے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ بچے کی صحیح نشوونما رک چکی ہے، ہرگز مزاحمت یا مداخلت نہ کرے، بلکہ محض محافظت کرتا رہے"

یہ عجیب بات ہے کہ فروبل نے بچوں کے عیوب کے نظریے میں موجودہ نفسیاتی تجزیے کے نتائج کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان کی وجوہات " انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں کے نشوونما کا نظر انداز ہو جانا یا انسان کی باترتیب ترقی میں بے جا مداخلت اور سختی کے سبب سے بعض اوصاف کا مسخ ہو جانا، کسی عمدہ وصف کا غلط سمجھا جانا یا اس کی غلط راہنمائی ہونا اور دبا دیا جانا، تمام نقائص کی بنیاد ہے۔" اس لیے بدی کا بھی واحد علاج یہی ہے کہ جو کچھ دب چکا ہو، اس کو ڈھونڈا جائے اور صحیح راہنمائی سے اس کی نشوونما اور تعمیر کی جائے۔ باقی آئندہ

اپنی مدد آپ کرنے میں زمینداروں کی امداد

از

ڈاکٹر اے ایم دولا ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) لکچرار گورنمنٹ کالج لدھیانہ

ذیل میں ہم، وہ رپورٹ نہایت شکریہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جو ہمیں ڈاکٹر اے ایم، دولا، ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) لکچرار گورنمنٹ کالج لدھیانہ نے اصلاح دیہات کلب لدھیانہ کالج کے اُس قابل تقلید اور بے مثال کارنامے کے متعلق ارسال فرمائی ہے، جو کلب اپنی مدد آپ کرنے میں زمینداروں کی رہنمائی کے لیے معرض عمل میں لایا ہے۔ فی الحقیقت کلب کا یہ اقدام قابلِ ستائش ہے اور امید ہے کہ اس مقصد کی اور انجمنیں بھی اس مثال سے درس عمل حاصل کرینگی۔ (ادارہ)

اب ایک سال ختم ہونے کو آیا ہے جبکہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے دیہات سدھار کلب نے اصلاحِ دیہات کا ایک جامع پروگرام شروع کیا۔ کلب نے راچورے نامی گاؤں میں ایک مفید کام کرنا شروع کیا۔ بہت سے دیہات کو مدد دینے کے بجائے ہم نے اپنی تمام توجہ صرف ایک ہی گاؤں پر مبذول کر دی۔ راچورہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جس میں فقط چالیس گھروں کی آبادی ہے، جو زیادہ تر اچھوت مسلمان ہیں اور دس بارہ کے قریب مذہبی سکھوں کے خاندان بود و باش رکھتے ہیں، جو زیادہ تر کھیتوں پر محنت مزدوری کر کے اپنا گزارہ کرتے ہیں۔

میں شروع ہی میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ہم استادوں اور طالب علموں نے اپنا کام فرصت کے اوقات میں کیا اور گاؤں میں جا کر ہر ہفتے دو یا تین دفعہ شام کو پانچ بجے سے ۶،

بجے تک کام کرتے تھے۔ وہ آدمی جنھیں پنجابی گاؤں کا تجربہ ہے، جانتے ہیں کہ یہ آدمی کس قدر لکیر کے فقیر اور شکی مزاج ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہم کو شروع شروع میں گورنمنٹ کا کارندہ یا ایجنٹ سمجھا۔ ہماری گاؤں کے کنوئیں کو صاف کرنے کی کوشش غلط سمجھی گئی۔ ایک دیہاتی نے، تو یہاں تک کہا کہ یہ سب کوششیں اس واسطے ہو رہی ہیں کہ گاؤں کا لگان بڑھا دیا جائے ایک بوڑھا آدمی بولا کہ آج، تو تم ہمارے گاؤں کو صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہو، کل تم ہماری مسجد پر قبضہ کرو گے۔ آپ کا شکریہ۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ سُن کر ہم کسی قدر پست ہمت ہو گئے، لیکن اُن کو یقین دلانے اور اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے بڑی کوشش اور تدبیر کی ضرورت تھی۔ لیکچر عملی تجربات کے ساتھ ذیل کے مضامین پر دیے گئے مثلاً صحت اور صفائی، زراعت کے جدید طریقے، بیجوں کا انتخاب، فصلوں کی تبدیلی، بیج بونے کے نئے ترقی یافتہ طریقے اور کھڑی فصل کی بیماریوں کو روکنے اور دور کرنے کے قاعدے۔ اس کام کا انتظام ہمارے محترم دوست لالہ ایشرداس مہرہ نے کیا، جو کالج میں ایگریکلچر پڑھاتے ہیں۔ ان کی تجویز پر ہم نے دو نمونے کے کھاد کے گڑھے ۶×۱۰×۱۸ فٹ جون کے مہینے میں کھودے۔

جونہیں کہ بارش شروع ہوئی، زمینداروں نے اس کام کو خود شروع کر دیا اور اپنی بکھری ہوئی کھاد کو جمع کرنے کے لیے سولہ گڑھے کھودے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کھاد کے ڈھیر جو پہلے زمینداروں کے دروازے کے نزدیک جمع ہوتے تھے اب وہ آبادی سے پچاس گز کے فاصلہ پر منتقل کیے گئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ اب گاؤں کے گرد گندگی کا نشان مطلقاً نہیں پایا جاتا اور اس نے اب ایک صاف گاؤں کی شکل اختیار کر لی ہے اور دیہاتی اب حقیقت میں اپنے گاؤں کو صاف رکھنا فخر سمجھتے ہیں۔

ہم نے گندے پانی کے لیے دو پکی نالیاں بنائیں۔ ایک تو گاؤں کے کنوئیں سے

پھولوں کی کیاریوں تک جو کہ ہم نے گرد و نواح کو خوبصورت بنانے کے لیے تیار کیں اور دوسری نالی کا پانی پاکھر کے درخت تک پہنچا دیا جہاں پھول پتیاں لگی ہوئی تھیں۔

پھولوں کی کیاریوں کے نزدیک ایک بڑا گہرا گڑھا ۱۰ × ۵۰ × ۹۵ فٹ کا تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی اینٹیں، گلے سڑے جوتے، چیتھڑے، کوڑا کرکٹ اور پرانے ٹین کے ٹکڑے گاؤں کے لوگ پھینک دیا کرتے تھے۔ تمام جگہ کو صاف کرایا گیا اور اس کو ایک کھلے چبوترہ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا، جہاں بچے دن کے وقت کھیلتے ہیں۔ اور اہلِ دہ گاہے گاہے، جب کبھی اُن کو فرصت ہوتی ہے، اپنا ڈرامہ یا نقلوں وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔

اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اہل دہ کے پاس تفریح کے لیے کوئی جگہ ہو۔ اس لیے اہلِ دہ اور کالج کے ایڈلٹ اسکول کے ممبران کی مدد سے ہم نے ایک کھیلنے کی گراؤنڈ تیار کر لی ہے، جہاں دس سے پندرہ برس کی عمر کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہیں کالج کی طرف سے دو پرانے فٹ بال انکو دے دیے گئے ہیں۔ نیز ہفتے میں دو دفعہ دہ دیہاتی کھیل مثلاً کبڈی۔ گلی ڈنڈا لکو ٹلے کی مار وغیرہ کھیلتے ہیں۔

پندرہ اور بیس سال سے زیادہ عمر کے آدمیوں نے محسوس کیا کہ انھیں بھی ورزش کی ضرورت ہے، اس واسطے انھوں نے اپنی تجویز سے ایک اکھاڑہ کھودا جو ہفتے میں دو تین دفعہ استعمال ہوتا ہے۔

کالج کے بند ہونے سے ذرا قبل دو دفعہ بارش ہوئی، چنانچہ ہمیں مناسب مقام پر نئے پودے لگانے کا موقع مل گیا، جن میں سے تین پیپل، تین پاکھر اور تین نیم کے پودے تھے۔ اہلِ دہ نے پودوں کو گرمی کے موسم میں پانی دینے کی خود ذمے واری لی مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت خوشی ہوتی ہے کہ وہ پودے اچھی طرح بڑھ رہے ہیں۔ ہم نے ایک خاص ہفتہ،

جو اپنی نوعیت کا اپنا ہی ہفتہ تھا۔ ۲۱ جون سے ۲۸ جون تک منایا اس کا نام صفائی کا ہفتہ رکھا گیا۔ اس ہفتے میں ہمارے کالج کے طلبا اور مدرسین نے اپنی اپنی باری دے کر گاؤں کے کنوؤں میں سے ساٹھ یا ستر ٹوکرے ریت کے نکالے نیز اس کنوؤں میں سے مینڈک اور کچھوے اور دیگر قسم کے حشرات الارض برآمد ہوئے۔ گاؤں والوں کو خوردبین کے ذریعے سے پانی میں کیڑے دکھائے گئے۔ اُن جراثیم کو دیکھ کر ایک بوڑھا آدمی بول اُٹھا "بلّے بلّے میں وی آکھاں میرے ڈھڈ وچ پیڑ کیوں ہندی اے" کئی ایک گلے کے امراض بھی اس پانی ہی کی وجہ سے مبتلا تھے۔ ہم نے دونوں کنوؤں میں لال دوا ڈال دی اور اسکے بعد کوئی شکایت پانی کی نہیں رہی۔

کالج کے مدرسین نے جادو کی لال ٹین کے ذریعے سے دو لیکچروں کا بندوبست کیا جو بڑی پسندیدگی سے دیکھے گئے۔ ہفتے میں ایک دن کھیلوں کے لیے مخصوص کیا گیا اور کالج کے طلبہ اور دیہاتیوں کے درمیان رسہ کشی کا مقابلہ ہوا۔ تین کھنچائیوں میں سے دو دفعہ گاؤں والے جیت گئے۔ اس کے بعد اپنے دیہاتی بھائیوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کے لیے مٹھائی اور شربت وغیرہ تقسیم کیا گیا۔

پروگرام میں اہلِ دہ کو ہفتے کی خبریں سنانے کے لیے ایک دن مخصوص کیا گیا۔ میری اہلیہ نے اخبار سٹیٹس مین کی پندرہ یا بیس دلچسپ تصویریں جو کوئٹے کے زلزلے کے متعلق اور کچھ تصویریں سابق جلالت مآب شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے متعلق تھیں خاکی کاغذ پر چسپاں کرکے لوگوں کے لیے بھیج دیں۔ چونکہ میز نہ مل سکیں لہذا یہ سب تصویریں چارپائیوں پر بچھا دی گئیں۔ کالج کے مدرسین میں سے ایک نے اپنی خدمات ان تصویروں کی تشریح اور دنیا کی مشہور مشہور خبروں کے بتانے کے لیے پیش کیں۔ ایک بوڑھے آدمی چودھری مولا بخش

نے جلالت مآب شہنشاہ کی تصویر دیکھ کر ایک نہایت معصومانہ انداز میں کہا۔ "اوتے میرے جیہا اے" اس سے معلوم ہو جائیگا کہ تصویروں کی نمائش نہ صرف دلچسپ تھی بلکہ تعلیم سے خالی نہ تھی۔

لوگوں کی عام شکایت تھی کہ برسات کے موسم میں پانی گھروں کی دیواروں میں رس کر بنیادوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ چنانچہ عارضی طریقے پر ہم نے تجویز کی کہ دس بارہ گاڑیاں کوئلے کی راکھ کی ڈھلان پر بچھادیں اور بعد میں چھڑکاؤ کر دیا گیا تا کہ راکھ جم جاتے۔ وہ جگہ پہلے کی نسبت بہتر دکھائی دینے لگی۔ اہل دہ نے ہمت سے بیس روپے جمع کر کے اینٹوں کا فرش خود لگا لیا جو تقریباً ۴۰ فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا تھا۔ تعطیلات کے بعد جب ہم گاؤں دیکھنے کے لیے گئے، تو اپنے کام میں اس قدر اضافہ دیکھ کر ہماری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ گاؤں کے اوسط گھروں میں ایک بڑا نقص تازہ ہوا کی آمدورفت کی کمی ہے۔ ہم نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ فی خاندان چار چار آنے جمع کریں اور باقی رقم کالج کے طلبہ اور مدرسین نے آپس میں جمع کی۔ اس طریقے سے ہر ایک گھر میں ایک روشندان کھلوا دیا گیا اور ایک مہینے کے عرصے میں گاؤں کے لوگوں نے چھتیس روشندان لگوا لیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیرت انگیز طریقے سے ہر گھر کے اندر روشنی کا اضافہ ہو گیا۔

گزشتہ نومبر میں یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ عورتیں اور لڑکیاں بھی گاؤں کی مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ چنانچہ ایک نئی تجویز پیش کی گئی اور مکانوں کی لپائی اور صفائی کا عورتوں میں مقابلہ شروع کیا گیا۔ بہترین گھر کے لیے انعامات تجویز کیے گئے۔ ہر ایک عورت نے گھر کی محرابوں پر عمدہ عمدہ نقش و نگار بنائے۔ عورتوں نے اس کام کو بڑی سرگرمی اور جانفشانی سے کیا۔ پندرہ دن کے اندر تمام گاؤں کی شکل خوبصورت اور رنگین ہو گئی۔ تولیے، صابن،

لنگھیاں، موباف، آئینے، تاگے کے ریل اور سوئیاں، چادریں، لال ٹینیں اور رومال وغیرہ انعام کے طور پر مقابلے میں حصہ لینے والے ہر گھر میں تقسیم کیے گئے۔ یہ تمام اشیا پرنسپل ہاروے صاحب اور کالج اسٹاف کے چندے کے ذریعے سے دستیاب ہوئیں۔ تقریباً ہر ایک گھر کو کچھ نہ کچھ انعام ملا اور ہر ایک کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

ہمارے ضلع کے تعلیمی ہفتے کے دوران میں ہمارے راجپورے کے دوست کسان درزی پاہل چلانے کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے آئے اور انھوں نے اپنی ہنرمندی کا عمدہ ثبوت دیا۔ راجپورے میں صرف چھ لڑکے ہیں، جو سات اور آٹھ سال کی عمر کے ہیں اور شہری میونسپل پرائمری اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ بالغوں میں سے مہینے پہلے کوئی بھی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ ہم نے گزشتہ دسمبر میں بالغوں کا مدرسہ شروع کیا اور ایک سند یافتہ آدمی کی خدمات جو ساتھ کے گاؤں میں رہتا ہے چار روپے ماہوار پر حاصل کیں۔ اٹھارہ مرد مدرسے میں داخل ہوئے۔ سب سے بڑے طالب علم کی عمر چھپن سال کی ہے اور وہ اپنی جماعت کا مونیٹر ہے۔ آج چار مہینے کے بعد بہت سے طالب علم قاعدہ پڑھ سکتے ہیں اور اُردو زبان میں ہندسے لکھنا سیکھ گئے ہیں۔ اور سو تک شمار کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اہل راجپورہ نے گاؤں میں پنچایت بھی قائم کر لی ہے تاکہ آپس کے سوشل اہمیت کے جھگڑوں کا فیصلہ خود کر لیا کریں۔ پنچایت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو مقدمے ضلع کی عدالتوں سے واپس لے لیے گئے۔ پنچایت بیاہ شادی کے موقع پر فضول اخراجات کے بند کرنے میں بڑی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔

گاؤں کے لوگ اب ہم کو اعتبار کی نظر سے دیکھتے اور اپنی تکلیفات خوشی سے آکر بیان کرتے ہیں تاکہ ہم ان کے حل کرنے میں جہاں تک ممکن ہو ان کی مدد کر سکیں۔ مجھے اس

موقع پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس سے ثابت ہو جائیگا کہ اب گاؤں والوں نے ہم پر مکمل اعتبار کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی دقتوں کی خاطر بھی ہمارے پاس آتے اور مشورہ کرتے ہیں۔ ایک دن ایک شخص عبداللہ نامی ہمارے پاس آیا۔ اور اس نے شکایت کی کہ سیہہ نے اس کے کھیت میں شلغم اور شکر قند کی فصل تباہ کر دی گاؤں کے آدمیوں نے مل کر مجبوری اور لاچاری ظاہر کی اور جو کچھ ان سے ہو سکتا تھا انھوں نے کیا لیکن وہ اس کو بند نہ کر سکے۔ میں نے ضلع کے افسروں سے مشورہ کیا لیکن کوئی مدد کے قابل نہ تھا۔ آخر کار میں نے اپنے ایک دوست امریکن مشنری مسٹر ندرز سے اس بات کا ذکر کیا جو غالباً ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ میرے ہمراہ گاؤں کو گئے اور سوراخوں کو ملاحظہ کیا جہاں سیہہ رہتی تھیں۔ انھوں نے زمینداروں کو مشورہ دیا کہ بڑے بڑے گڑھے چار یا پانچ فٹ گہرے سیہوں کے سوراخوں کے نزدیک کھودیں اور رات کو تاک میں بیٹھیں اور انتظار کریں چنانچہ گاؤں والوں نے ایسا ہی کیا۔ رات کو ۱۱ بجے کے بعد تین سیہیں باہر نکلیں اور ان گہرے گڑھوں میں گر پڑیں۔ گاؤں والوں نے فوراً لاٹھیوں سے ان کو مار ڈالا۔ اس طرح سے اپنے دشمنوں سے نجات حاصل کی جو ان کے لیے اس قدر مضرت رساں تھیں۔

یہ امر باعث خوشی ہے کہ ان غریب اور عاجز دیہاتیوں میں قدر شناسی کا اس قدر جذبہ ہے کہ وہ ہر اس بات کے کرنے کو تیار ہیں، جو ان کے لیے مفید ہے۔ شروع ہی شروع میں ہمیں بعض دفعہ تحصیلدار اور میڈیکل آفیسر آف ہیلتھ کی مدد لینی پڑی لیکن اب دیہاتی ہماری ہر ایک اپیل کو خوشی سے سنتے ہیں اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی رغبت سے ہر ایک کام کو کرتے ہیں۔ وہ یہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ تمام باتیں ان کی بہتری کے لیے ہیں۔ باوجود ان انتہائی شکستہ چینیوں کے جو دل کو بٹھانے والی ہیں۔

ہمارا کام نہایت ہی روانی اور کامیابی کے ساتھ ترقی پاتا رہا۔

گزشتہ نومبر میں لالہ لچھمن داس بی اے، بی ایس سی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول نارمل سائنس ایسٹرن سرکل پنجاب نے بلا اطلاع معائنہ کیا۔ میں اس رپورٹ میں سے جو راجپورے کے متعلق ہے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں۔ لالہ لچھمن داس صاحب فرماتے ہیں:۔

"میں ڈاکٹر اے ایم ووڈلا اور لالہ ایشر داس مہرہ کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ایک بڑے اہم کام کے دیکھنے کا مجھے موقع دیا جو ہمسایہ گاؤں راجپورے میں پرنسپل اے سی سی ہاروے کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں صحت مندانہ خوشی اور مستعدی کی عام فضا کے جو راجپورے میں پائی گئی بہت متاثر ہوا۔ ہری جن یا اچھوتوں کے مکانات بھی سوشل خدمت کی شاندار روح کے ساتھ زیر نگرانی لائے گئے ہیں۔ میں نے آبادی کے نزدیک کوئی کھاد کا ڈھیر دیکھا، نہ کسی قسم کی گندگی پائی۔ مناسب جگہوں پر گڑھے کھود دیے گئے ہیں، جہاں تمام کوڑا کرکٹ اور گوبر وغیرہ ڈال دیا جاتا ہے۔ گاؤں کے کنویں صاف رکھے گئے ہیں اور اُن کے ارد گرد پھولوں کی کیاریاں بنا کر جگہ کو خوبصورت بنا دیا گیا ہے اور جوں جوں گاؤں کا سرمایہ اجازت دیتا ہے۔ نیچے مقامات اور گڑھے بھرے جا رہے ہیں اور گلیاں پختہ کی جا رہی ہیں۔

جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ عورتیں ان اصلاحات کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں اور انھوں نے مکانوں کی صفائی اور پانی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور وہ مکانوں کے محاذوں کو سجانے کے مقابلے میں بڑا حصہ لیتی ہیں۔ ایک تفریح کی کلب شروع کر دی گئی ہے اور دیہات کے کھیل منظم کیے گئے ہیں۔

پرنسپل اے سی سی ہاروے اور ان کا اسٹاف اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد

کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششیں صرف چھ ماہ کے کام کے بعد اس قدر مفید ثابت ہو رہی ہیں"
ہم یہ دعوے نہیں کرتے کہ ہم نے راجپورے کو ایک نمونے کا گاؤں بنا دیا ہے لیکن
ہم نے ان غریب لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی مدد کرنے کے سبق دینے
میں کوشش ضرور کی ہے۔

روح ب

از

خان بہادر سید مقبول شاہ صاحب، بی اے، آئی ای ایس (ریٹائرڈ)

ب اوّل Vitamine (B).

ب اوّل، روح ب کی سب سے بڑی شاخ ہے۔ یہ ہمارے جسم کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسی پروٹین اور پروٹین کی طرح بچوں کے جسم کے بڑھنے کے لیے اور مرمت کے لیے اور بڑوں کے جسم کی مرمت کے لیئے اس کا ہونا ضروری ہے۔ ب اوّل کے بہت دنوں تک کم ملنے سے بیری بیری کی بیماری ہو جاتی ہے، جو محض چاول کھانے والے لوگوں میں عام ہوتی ہے۔ اس بیماری کی بڑی علامتیں ہاضمے اعصاب اور دل کی تکلیفیں ہیں۔ پہلے ہاضمے کی تکلیف شروع ہوتی ہے۔ اور اگر غفلت کی جائے، تو خوراک کی نالی سے زہر جذب ہو کر جسم میں اثر کرتا ہے۔ اور آخیر میں ٹانگیں رہ جاتی ہیں۔ اس بیماری کی دو قسمیں ہیں، تر بیری بیری اور خشک بیری بیری۔ تر بیری بیری میں پیٹ اور ٹانگیں سوج جاتی ہیں۔ اور خشک بیری بیری میں فالج ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اعصاب کے بگڑ جانے سے سوئیاں سی چبھتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ٹانگیں اور پیر گویا سو جاتے ہیں اور بیٹھ کر اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد چلنے پھرنے میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور اخیر میں ٹانگیں بالکل رہ جاتی ہیں بعض دفعہ زبان رہ جاتی ہے۔ جب نبض تیز ہو جائے، سانس پھولنے لگے۔ اور دل دھڑکنے لگے، تو سمجھو کہ اس کا دل پر اثر ہو گیا ہے۔ اگر وقت پر علاج نہ

کیا جائے، تو یہ بیماری مُہلک ثابت ہوگی۔ اِس کے علاج کے لیے اصلی خمیر کا ست یا گیہوں کے دانے کا تخم سب سے بہتر ہیں، لیکن روح تب والی اور خوراکوں سے بھی فائدہ ہوجاتا ہے۔

شیرخوار بچوں کو اگر یہ بیماری ہوجائے، تو اُن کی ماں کو چاولوں کے چھلکے کا ست یا اصلی خمیر کھلانے سے آرام ہوجاتا ہے، جب شیرخوار بچوں میں یہ بیماری ہوجاتی ہے، تو بعض دفعہ تشنج ہوجاتا ہے۔ اور چند ہی گھنٹوں میں دِل کی حرکت بند ہوجاتی ہے اور بچہ مرجاتا ہے۔ پہلی علامتیں اس بیماری کی یہ ہوتی ہیں کہ رگ پٹھے کمزور ہوجاتے ہیں، ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے۔ اور بچہ روز بروز دُبلا ہوتا جاتا ہے، لیکن بخار وغیرہ کوئی ظاہری علامت نہیں ہوتی اور روح تب والی خوراک دینے سے آرام ہوجاتا ہے۔ اگر ب اول کی کمی بہت دنوں تک جاری رہے، تو اس سے ہمارے دل اور خوراک کی نالی کو اتنا نقصان پہنچ جائے گا۔ کہ پھر اسکا علاج نہیں ہوسکے گا۔ جن لوگوں کی خوراک میں یہ کافی نہ ہو، اُن کو سخت قبض رہتا ہے، ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے اور دیگر بیماریاں بھی ہوجاتی ہیں، جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

مہذب قوموں میں قبض کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اور اِسکی وجہ یہ ہے کہ اُن کی خوراک میں رُوح تب کافی نہیں ہوتی یعنی، وہ زیادہ تر میدے کی روٹی، کیک، بسکٹ وغیرہ اور سفید چمکتے ہوئے چاول اور گوشت کھاتے ہیں۔ جن کو روح تب والی معمولی خوراک نہیں حاصل ہوتی وہ اگر مارمائٹ، جو اصلی خمیر سے بنتا ہے۔ یا بی میکس، جو گیہوں کے دانے کے اندر کے بیج سے حاصل ہوتا ہے، استعمال کرتے رہیں، تو بیماری سے محفوظ رہیں گے، اگر اُنکی خوراک میں کوئی چالیس فیصدی سالم اناج کی روٹی ہو، تو کافی ہوگی۔ اگر خوراک میں محض سفید سفید اناج، شکر، اور معمولی گوشت اور روغنیات ہی ہوں، تو مارمائٹ یا بی میکس روز کھانے سے بیماری نہیں ہونے پائے گی۔ خمیر میں اور دھانوں کے چھلکے میں ب اول، ب سوم، ب چہارم اور ب پنجم چاروں مد ملیں

پائی جاتی ہیں۔ اس روح سے روغنیات کے ہضم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے جن بچوں کو مچھلی کا تیل پلایا جاتا ہو، ان کی خوراک میں اس روح کا ہونا لازمی ہے۔ یاد رہے کہ ب اول زیادہ حرارت سے ضائع ہو جاتی ہے۔

ب دوم Vitamine B or C.

اس روح کو زیادہ حرارت سے کچھ بہت نقصان نہیں پہنچتا۔ ب اول کی طرح یہ بھی پانی میں حل ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں یکجا ہوتی ہیں، لیکن ب دوم گوشت میں اور اندرونی اعضاء میں پائی جاتی ہے اور ب اول نہیں پائی جاتی۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے حیوانی پروٹین کارآمد ہو جاتی ہے۔ ب دوم کے خوراک میں نہ ہونے سے ایک قسم کی بیماری ہو جاتی ہے جس کو پلاگرا کہتے ہیں۔ جس میں ہاضمے کی تکلیف ہو جاتی ہے اور بدن پر ایک خاص قسم کے داغ پڑ جاتے ہیں اور دماغی بیماری شروع ہو جاتی ہے، کیونکہ اناجوں کی پروٹین میں اور اناجوں میں سے خاص کر مکئی کی پروٹین میں سارے ضروری اجزاء نہیں پائے جاتے۔ اس سے بچنے کے لیے کوئی چھٹانک بھر گوشت یا کسی اور حیوانی پروٹین کا روز کھانا ضروری ہے۔ اگر حیوانی پروٹین کافی کھائی جائے، تو ب دوم کافی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ سب سے زیادہ سکھائے ہوئے اصلی خمیر میں پائی جاتی ہے، جگر میں اور ہر قسم کے گوشت میں اور انڈے کی سفیدی میں بھی بہت ہوتی ہے اور اور خوراکوں میں بھی پائی جاتی ہے، جن کا روح ب میں ذکر آچکا ہے، یعنی، پالک وغیرہ ۔

خلاصہ مطلب

ب دوم اصلی خمیر، جگر، انڈے کی سفیدی اور بے چربی کے گوشت

میں پائی جاتی ہے۔

ب دوم کے خوراک میں کم ہونے سے پلاگرا کی خطرناک دماغی بیماری ہو جاتی ہے۔ یہ زیادہ تر اُن لوگوں میں ہوتی ہے، جن کا گذارہ محض مکئی پر ہو، کیونکہ مکئی کی پروٹین بالکل ناقص ہوتی ہے

رُوح ج Vitamine (C).

اس رُوح کا اثر ہمارے خون، شریانوں اور وریدوں پر ہوتا ہے۔ روح ج خون کو متعدی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے، اسکی بدولت خون صاف رہتا ہے، اس کی ترکیب ٹھیک رہتی ہے۔ اور خون رگوں سے پھٹ کر نکل نہیں جاتا۔ اس سے دُوسری روحوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، خصوصًا ہڈیاں اور دانت بنانے میں۔ اس سے معدہ اور آنتیں بھی صاف رہتی ہیں اور اس سے ہمارے اندر جراثیم دخل نہیں پا سکتے۔ اس کے چند ہی مہینوں تک ہماری خوراک میں نہ ہونے سے ایک قسم کی خارش (Scurvy.) ہو جاتی ہے، جو ایک سخت بیماری ہے۔ یہ صرف جلد کی بیماری نہیں ہے، بلکہ سارے جسم کی بیماری ہے، جس میں جلد کے اندر ہی اندر گوشت اور اندرونی اعضا میں سے خون پھٹ نکلتا ہے۔ اور دِل اور دُوسرے عضلات کمزور ہو جاتے ہیں۔ دانت ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ چہرے کا رنگ مٹیالا سا ہو جاتا ہے۔ جوڑوں میں درد ہوتا ہے۔ طاقت کم ہو جاتی ہے۔ بھوک گھٹ جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ دم پھولتا ہے۔ انسان سست اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وزن نہیں بڑھتا، بلکہ گھٹ جاتا ہے۔ دِل دھڑکنے لگتا ہے۔ ٹخنے پھول جاتے ہیں۔ ٹانگوں کو ہلانے جُلانے سے درد ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر رگوں کی جلد کمزور ہو جاتی ہے۔ مثلًا، نکسیر شروع ہو جاتی ہے اور جسم پر ارغوانی سے داغ پڑ جاتے ہیں جیسے بدن چھل گیا ہو پھر خون کے اندر ہی اندر پھٹ نکلنے سے ہاتھ پاؤں سوج جاتے ہیں۔

سانس سے بُو آتی ہے۔ مسوڑے پھُول جاتے ہیں اور اُن سے خُون بہنے لگتا ہے۔ دانت ہل جاتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ہڈیاں بھی خود بخود ہی ٹوٹ جاتی ہیں۔ اگر وقت پر اس بیماری کا علاج نہ کیا جائے، تو مُہلک ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ بہت دنوں تک چائے، ڈبل روٹی اور ٹینوں میں بند کی ہوئی خوراکیں استعمال کرتے رہتے ہیں یا اور ایسی چیزیں، جن میں رُوح ج نہ پائی جائے۔ یا جن بچوں کو ٹینوں میں بند کی ہوئی خوراکیں کھلادی جاتی ہیں اور تازہ تازہ دُودھ اور پھلوں کا رس نہیں دیا جاتا، اُن میں یہ علامتیں جلد ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جب یہ بیماری بچوں کو ہوتی ہے، تو اُس کو انگریزی میں بارلوز ڈیزیز (Barlous Disease.) کہتے ہیں۔ بچے بلانے جلانے سے بہت روتے ہیں، کیونکہ اُن کے جسم میں بہت درد ہوتا ہے۔ اِس کی خاص علامت یہ ہے، کہ مسوڑے پھُول جاتے ہیں اور اُن سے خُون بہتا ہے، دانت ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ اِس بیماری سے بچنے کے لیے ایک چھٹانک نیبو کا یا سنگترے کا یا گریپ فروٹ کا تازہ تازہ رس روز پینا کافی ہے۔ یا ٹماٹو یا اننّاس کا رس تقریباً دو چھٹانک یا کچی پالک یا پانی کا ساگ کوئی ایک چھٹانک یا گوبھی کے سبز پتے کوئی دو چھٹانک روز کھانے چاہییں یا سبز مٹر یا انگریزی شلغم کا رس کوئی دو چھٹانک یا کچا کھیرا کوئی چار چھٹانک۔ رُوح ج حاصل کرنے کے لیے سب سے بہتر سنگترے لیموں اور ٹماٹو کا رس ہے۔ ان کے مقابلے میں سیب اور کیلا ناقص خوراک ہیں اور انگور سب سے ردی۔ کچا ساگ بھی بہت مفید ہے۔ تازی پیاز میں بھی رُوح ج بہت پائی جاتی ہے۔ سبزیوں کو صرف پندرہ بیس منٹ تک پکانے سے یہ رُوح ضائع نہیں ہوتی۔ کچے دُودھ میں بھی یہ روح کچھ پائی جاتی ہے، خصوصاً لسّی میں اور دُودھ کو اُبالنے سے یا پاسچرائز (Pasteurize.) کرنے سے یہ رُوح بہت کچھ ضائع ہو جاتی ہے۔ جن کی خوراک محض دُودھ ہی ہو انکو لیموں سنگترے یا اور تازے سے تازے پھلوں کا رس ضرور پینا چاہیئے حرارت

سے اس روح کو سب روحوں سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے، خصوصاً اگر ہوا سے محفوظ نہ رکھا جائے۔ ساگ وغیرہ کے سوکھ جانے اور باسی ہو جانے سے بھی یہ ضائع ہو جاتی ہے۔ روح ج والی خوراکوں کو تھوڑی دیر تیز آنچ پر پکانے سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا، جتنا کہ بہت دیر تک میٹھی آنچ پر پکانے سے، کیونکہ اس دوسری حالت میں ہوا کا اثر روح ج پر زیادہ ہوتا ہے۔ سبزیوں کو اگر سٹیو (Stew.) کیا جائے، یعنی، بند برتن میں میٹھی آنچ پر تھوڑے سے پانی میں آہستہ آہستہ پکایا جائے، تو روح ج بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کھانا دوبارہ گرم کیا جائے تو اُسکی روح ج بھی مر جاتی ہے۔ بعض لوگ سبزیوں کو پکاتے وقت اُن میں سوڈا ڈال دیتے ہیں تاکہ اُن کا سبز رنگ قائم رہے۔ اس سے اُن کی روح ج بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر سبزیوں کو صرف بیس منٹ پکایا جائے، تو اس سے نہ اُن کی رنگت ضائع ہوتی ہے اور نہ روح ج۔ سنگترے اور ٹماٹو میں چونکہ کھٹاس ہوتی ہے، اس لیے اُن کی روح ج جلدی ضائع نہیں ہوتی، لیکن جام بنانے میں ضائع ہو جاتی ہے، کیونکہ دیر تک آگ پر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح مارملیڈ بنانے سے سنگترے کی روح ج بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ تازے تازے آلوؤں میں نئی نئی تازی تازی گاجروں میں، تازے تازے سیبوں میں روح ج زیادہ ہوتی ہے جو بہت دنوں تک ذخیرے میں پڑے رہتے ہوں۔ ٹینوں میں جمائے ہوئے دودھ میں یہ روح برائے نام ہوتی ہے۔ اور کھوئے اور ربادے میں بالکل نہیں ہوتی۔ خشک میووں اور مغزیات میں روح ج نہیں ہوتی اور نہ بیجوں میں ہوتی ہے، یعنی، اناج وغیرہ میں لیکن اگر سوکھے ہوئے ثابت چنے یا ثابت دال یا سوکھی ہوئی ثابت مٹر کو چوبیس گھنٹے پانی میں بھگو کر پھر کسی معمولی گرم جگہ ہوا میں تر کپڑے کے نیچے بچھا دیا جائے، تو تین چار دن میں پھوٹ کر ان سے پودے نکلنے لگیں گے۔ اگر اُن کو صرف ایک دو منٹ تک پکایا جائے، تو

مزید ار بھی بہت ہوتے ہیں اور اُن میں روحِ حیات بھی بہت ہوتی ہے، بلکہ بہتر تو یہ ہے، کہ کچے ہی کھائے جائیں۔ سوکھی ثابت مٹر میں نیز گھنٹے پانی میں بھگونے سے ہی روحِ حیات آجاتی ہے جو گائیں بھینسیں کھیتوں میں سبز چارہ چرتی ہوں، اُن کے دودھ میں اُن مویشیوں سے بہت زیادہ روحِ حیات پائی جاتی ہے، جو سوکھا چارا کھاتی ہوں اور اگر دودھ کو صرف کوئی تین منٹ تک اُبالا جائے تو یہ ضائع نہیں ہوتی۔

روحِ حیات ذیل کی چیزوں میں درجہ وار ملتی ہے۔

درجہ اوّل گوبھی اور پالک کے تازے تازے سبز پتے، لیموں سنگترے اور ٹماٹو کا رس، انگریزی شلغموں کا رس اور تازی جمی ہوئی مٹر یا دالیں۔

درجہ دوم تازی تازی نئی نئی نرم نرم کچی گاجریں اور سب تازے تازے ساگ اور ڈنٹھل، تازے کچے آلو، تازہ پکے فراش بین، تازی شکرقند، سبزیوں کا رس، سنگترے کا چھلکا، آڑو اور اناناس کا رس، چیڑ کی کونپلوں کا خیسا ندہ۔ ان کے علاوہ اور چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن بہت بڑی مقدار کھانی پڑتی ہے۔

روحِ حیات گوشت اور انڈے، خشک دالوں، مٹر، ہر قسم کی مٹھاس، اصلی خمیر، ہر قسم کے روغنیات، سکھائے ہوئے پھلوں، سکھائی ہوئی سبزیوں، مغزیات اور تمام قسم کی اُن خوراکوں میں، جو ٹینوں میں بند آتی ہیں، نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے۔

ساگ اور ترکاریوں کے استعمال میں تازی تازی نرم نرم کچی سبزیاں بھی کھانی چاہییں مثلاً: ٹماٹو سلاد وغیرہ، جو بہت زود ہضم ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لوگ کچی سبزیاں ہضم نہیں کرسکتے اور ان کے کھانے سے اُن کے پیٹ میں ریح پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی نرم نرم پتیاں خوب چبا کر کھانی چاہییں، لیکن بچوں کو صرف سبزیوں اور پھلوں کا رس پلانا چاہیئے۔

خلاصہ مطلب

روح ج لیموں، سنگترے، گریپ فروٹ، ٹماٹر کے رس، سبز سبز ساگ مثلاً پالک اور تازے تازے جمے ہوئے اناجوں میں بہت پائی جاتی ہے۔

روح ج خون اور خون کی رگوں کے واسطے مفید ہے۔ اور جسم کی پرورش اور نشوونما میں اور روحوں کی مددگار ہوتی ہے۔ اس سے خون صاف رہتا ہے اور اسکی ترکیب ٹھیک رہتی ہے۔ اگر یہ ہماری خوراک میں بہت دنوں تک نہ ہو، تو رنگ مٹیالا ہو جاتا ہے، مسوڑے سوج جاتے ہیں اور اُن میں سے خون نکلتا ہے، دانت خراب ہو جاتے ہیں، سانس سے بُو آتی ہے، جلد کے نیچے رگوں میں سے خون پھٹ کر نکلتا ہے۔ اور اُس سے اخیر میں ایک قسم کی خارش کی سخت بیماری سکروے (Sourvy.) ہو جاتی ہے۔

روح د Vitamins D

یہ روح عام طور پر روح ا کے ساتھ ملی ہوئی پائی جاتی ہے، لیکن ہماری خوراکوں میں ایسی عام نہیں ہوتی، جیسی دُوسری روحیں اور یہ حرارت سے جلدی ضائع نہیں ہوتی۔ سب سے زیادہ اچھی قسم کے مچھلی کے تیل میں پائی جاتی ہے، خصوصاً ہیلی بٹ (Halibut.) اور کوڈ (Cod.) مچھلی کے تیل میں۔ نباتات میں سب سے زیادہ پالک میں اور ہر تازے تازے سبز سبز ساگ میں پائی جاتی ہے۔ چربی والی مچھلیوں کے گوشت میں بھی بہت ہوتی ہے مثلاً ہیرنگ (Herring.) سارڈائن (Sardine.) اور میکریل (Mackerel.) انڈے کی زردی میں بھی کافی ہوتی ہے۔ اور مچھلیوں پرندوں اور چرندوں کے جگر میں بھی، دُودھ گھی اور اور مکھن میں بھی کچھ ہوتی ہے، بشرطیکہ دُودھ دینے والے جانور دھوپ میں چراگاہوں میں

چرتے پھرتے ہوں۔ ایک قسم کے دُودھ میں جو ولایت سے بند ڈبوں میں آکر بکتا ہے اور جس کو دھوپ والا گلیکسو (Sunshine Glaxo.) کہتے ہیں روح د بہت ہوتی ہے۔ تیلوں میں نہیں ہوتی مگو ناریل کے تیل اور مونگ پھلی کے تیل میں تھوڑی سی ہوتی ہے۔ اگر ہم بھی دھوپ کھائیں بشرطیکہ مطلع صاف ہو اور دھوپ بھی اتنی تیز نہ ہو کہ جسم کو نقصان پہنچائے اور سر کو دھوپ سے بچا رکھیں، تو ہمارے جسم میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ اگر تیل یا گھی کو یا کھانے کی اور چیزوں کو دھوپ میں جبکہ مطلع بالکل صاف ہو رکھا جائے، تو اس میں بہت جلد اس کا اثر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اگر اس تیل کی بدن پر مالش کریں تو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

اصلی خمیر کھانے سے بھی یہ روح ہم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اصلی خمیر میں رُوح ب کی سب شاخیں پائی جاتی ہیں، اِس لیے بیکنگ پاؤڈر (Baking Powder.) استعمال کرنے کے بجائے، جس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے، خمیری روٹیاں بنانے میں اصلی خمیر (Yeast.) استعمال کرنا چاہیے۔ اگر گائے بھینس کو بھی سکھایا ہوا اور دھوپ کھایا ہوا خمیر جو بڑی بڑی انگریزی دکانوں پر ملتا ہے دیا جائے، تو اس سے ان میں روح د بہت بڑھ جاتی ہے۔

روح د کا بڑا فائدہ یہ ہے، کہ یہ بچوں کو ایک سخت بیماری سے محفوظ رکھتی ہے جس کو انگریزی میں رکٹس (Rickets.) کہتے ہیں، جس میں ہڈیاں نرم اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہماری ہڈیاں اور دانت کیلسیم (Calcium.) اور فاسفورس (Phosphorus.) نمکیات سے بنتے ہیں جبکہ وہ ہمارے جسم میں کافی اور ٹھیک ٹھیک نسبت سے ہوں، لیکن یہ نمکیات ہمارے اندر بالکل بیکار رہتے ہیں جب تک کہ روح د موجود نہ ہو جو ان کو کارآمد بنادے۔

رکٹس (Rickets.) کی بیماری سے بچوں کے دانت خراب ہو جاتے ہیں، ہڈیاں نرم اور کمزور ہو جاتی ہیں اور جب وہ چلنے پھرنے لگتے ہیں، تو ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، لیکن یہ صرف ہڈیوں ہی کی بیماری نہیں ہے، بلکہ سارے جسم پر اس کا اثر ہوتا ہے، عضلے پٹھے ڈھیلے اور نرم ہو جاتے ہیں، جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں، نظامِ اعصاب بگڑ جاتا ہے، اکثر تشنج بھی ہو جاتا ہے، طاقت کم ہو جاتی ہے، اور نمونیہ جیسی بیماریاں آسانی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے بچے چڑچڑے اور بے چین ہوتے ہیں، اُن کو نیند کافی نہیں آتی، اُن کے پیٹ کے پٹھے بھی ڈھیلے ہو جاتے ہیں، قبض رہتا ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے اور ایسے بچوں کو زکام اور پھیپھڑے کی بیماریاں جلد ہو جاتی ہیں اور جو بچ بھی رہیں وہ ہمیشہ کے لیے پست قد اور کمزور رہتے ہیں اور ہڈیوں کا نقص اِن میں ساری عمر تک باقی رہتا ہے۔ اُن کے دانت بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ جن کو بچپن میں یہ بیماری تھوڑی سی بھی ہو گئی ہو وہ بڑے ہو کر فوج میں بھرتی ہونے کے لائق نہیں رہتے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ حاملہ عورتیں روح د والی خوراک کھاتی رہیں اور دھوپ بھی کھایا کریں اور کبھی کبھی دھوپ کھاتے ہوئے تیل کی مالش بھی کرتی رہیں تاکہ اُن کے بچوں میں یہ بیماری نہ ہو۔ بچپن کے بعد بھی بعض شخصوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے، یعنی، ہڈیاں نرم ہو جاتی ہیں (Ostemalica.) یہ بیماری اکثر ایسی جوان عورتوں کو ہوتی ہے، جو پردے میں رہتی ہوں، انھیں کافی دھوپ میسر نہ ہوتی ہو اور تپ دق کی بیماری ہو جائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں چونکہ دھوپ کافی ہوتی ہے بچے عموماً دھوپ میں ہی پھرتے رہتے ہیں اور ہماری خوراک میں بھی روح د قدرتاً زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہمارے ملک میں یہ بیماری امریکہ اور یورپ کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ بچوں کو مکانوں کے اندر ہی بند رکھا جائے اور صرف صبح و شام جب دھوپ نہیں ہوتی نکالا جائے بعض ملکوں میں یہ بیماری پردہ والی

میں زیادہ ہوتی ہے اور گرمیوں میں کم کیونکہ سردیوں میں دھوپ کم میسر آتی ہے۔ سورج کی روشنی میں ایک خاص قسم کی کرنیں ہوتی ہیں، جو دکھائی نہیں دیتیں اُن کو بنفشی سے اوپر والی شعاعیں (Ultra violet Rays.) کہتے ہیں یہ وہ شعاعیں ہیں، جو قوسِ قزح میں بنفشی رنگ کی کرنوں کے اوپر کی طرف ہوتی ہیں یہ شعاعیں معمولی شیشے سے نہیں گذر سکتیں البتہ ایک خاص قسم کا شیشہ ہوتا ہے جس کو وائٹا گلاس (Vita glass.) کہتے ہیں، اُس میں سے گذر سکتی ہیں، بشرطیکہ مطلع صاف ہو اس لیے اگر کوئی یہ چاہے کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے شیشے کی کھڑکی سے دھوپ کھا کر یہ شعاعیں حاصل کرے، تو اُس کو کھڑکی میں وائٹا گلاس لگانا چاہیے۔ اگر ہوا میں گرد یا دھواں ہو، تو اُس میں یہ جذب ہو جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے بڑے بڑے شہروں میں گرد اور دھوئیں کا ایک شامیانہ شہر کے اوپر تن جاتا ہے، جس میں سے یہ شعاعیں گذر نہیں سکتیں۔ جہاں مطلع صاف ہو اُس وقت یہ دھوپ میں موجود ہوتی ہیں، خصوصاً اونچے اونچے پہاڑوں پر اور سمندر کے کنارے۔ دھوپ میں کھڑے ہو کر بدن میں تیل کی مالش کرنا بھی بہت اچھا ہوتا ہے، کیونکہ کھلی ہوا اور مالش سے خون کی حرکت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور روح د سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ ایک خاص قسم کا لمپ بھی ہوتا ہے، جس سے اس قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے، جو ہمارے اندر روح د، پیدا کر دیتی ہے، اس لیے جو لوگ دھوپ سے روح د، حاصل نہیں کر سکتے، وہ اس لمپ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری جلد کے نیچے جو چربی ہوتی ہے، اُس میں ایک مادہ (Ergosteral.) ہوتا ہے اس میں ان کرنوں کے اثر سے روح د، پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز اب دوا کے طور پر بھی دکانوں سے مل جاتی ہے۔ اس کو کھا کر اگر دھوپ میں بیٹھا جائے، تو ہمارے اندر روح د، پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز مچھلی کے تیل میں بھی ہوتی ہے اور اصلی خمیر میں بھی۔

بچوں کو دُودھ میں زیادہ مٹھاس ڈال کر پلانا بھی اچھا نہیں ہوتا، کیونکہ اِس سے دُودھ کی روح بؔ اور روح دؔ میں کمی ہو جاتی ہے۔ جو بچے نشاستہ اور کھانڈ والی خوراک زیادہ کھاتے ہوں اور روح ب اور روح د والی غذا کم کھاتے ہوں اُن کو رکٹس (Rickets.) کی بیماری ہو جاتی ہے۔ ایسے بچوں کو تازہ دودھ جس سے بالائی نہ اتاری گئی ہو اور شکر وغیرہ نہ ڈالی گئی ہو پلانا چاہیئے، کیونکہ زیادہ نشاستہ اور مٹھاس کھانے سے اُن کو یہ تکلیف ہوتی ہے۔ دُودھ سے ضروری نمکیات بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور روح دؔ بھی۔ اس بیماری سے بچنے کے لیے سبز ترکاری اور انڈے اور چربی والی مچھلی کا استعمال ضروری ہے اور اگر دھوپ اچھی طرح میسر نہ ہو تو خاص لیمپ سے کرنیں حاصل کرنی چاہییں۔ جس طرح روح بؔ کا خوراک میں ایک مستقل نسبت سے ہونا ضروری ہے، اُسی طرح روح دؔ بھی ہونی چاہیے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جو لوگ (Eskimos.) منطقہ باردہ میں رہتے ہیں جہاں دھوپ برائے نام ہوتی ہے، اُن کے بچوں کو یہ بیماری کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے، کہ وہ مچھلیوں وغیرہ کی چربی اور تیل کا بہت استعمال کرتے ہیں۔

سلسلۂ پرشین ریڈرز

مولوی محمد شفیع صاحب ایم۔ اے فیلو پنجاب یونیورسٹی ہیڈ ماسٹر

اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب بموجب چٹھی ۱۵۸۸ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء

فارسی کی پہلی کتاب	قیمت	۳	آنے	۱ پائی
فارسی کی دوسری کتاب	"	۳	"	۱۰ "
فارسی کی تیسری کتاب		۴		

موجودہ کتابوں میں گرامر کے ماتحت زبان کے سکھلانے کی نمایاں کوشش نہیں کی گئی۔ طلبہ کے زبان و گرامر کی علیحدگی سے نقصان اٹھا رہے تھے۔ ہم نے اس کی تلافی کی مناسب کوشش کی ہے۔

سابقہ کتابوں میں انتخاب مضامین و عبارات کے وقت جماعتوں کے ذہنی ارتقا اور ان کی علمی قابلیت کا پورا خیال نہیں رکھا گیا۔ ان کتابوں میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور زبان بلیس آسان استعمال کی گئی ہے۔ اس امر کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ جملے چھوٹے چھوٹے ہوں، تاکہ عبارت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

ہر سبق کے آخر میں مختلف مشقیں دے کر گرامر اور کمپوزیشن کی مشق کا عملی موقع اور مواد مہیا کیا گیا ہے۔

فارسی میں ترجمہ کرنے کے لئے اسی قسم کے جملے دیئے گئے ہیں جن میں کتابی الفاظ کی ملکی سی تبدیل شدہ صورت ترجمے میں بہت ہی ممد و معاون ہو سکتی ہے۔

فارسی میں گفتگو سکھانے کیلئے "مکالمہ و گفتگو" کے عنوان سے اسباق دیئے گئے ہیں، تاکہ اس طرح طلبہ اس طرزِ گفتگو سے قدرے واقفیت حاصل کر سکیں۔

تیسری کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی شان یہ ہے کہ ہر ایک سبق اور ہر ایک کہانی کا خلاصہ اور نتیجہ عنوان کی صورت میں طلبہ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز۔ لاہور

اشتہار

بچوں کیلئے چند مفید اور دلچسپ کتابیں

نام کتاب یا سلسلہ	قیمت	نام مصنف یا ایڈیٹر
عام معلومات کی پہلی کتاب	۶ر	پروفیسر برونے ناہن
عام معلومات کی دوسری کتاب	۶ر	″
پیارے رام کی پیاری باتیں	۶ر	
کرشن ″ ″ ″	۶ر	یدمعنشر
لو اور کش	۶ر	
حکایاتِ اسلام	۴ر	مولوی عبدالماجد
ناموران سائنس	۴ر	بی۔اے
باغبان	۸ر	رابندرناتھ ٹیگور
خوانِ حکمت :-		
درجہ اول۔ایک ہزار چوٹیاں	۱-۶ پائی	
حق بہ حق دار	۳ر	
آخری نیکی	۲-۳ پائی	
تین سوال	۲ر	مولوی عبدالحمید
میاں شفقت	۲ر	ایم۔اے
درجہ دوم۔دھوپ چھاؤں	۲ر	و
شیر کا شکار	۲ر	مرحوم خان صاحب
سچا جاتری	۳ر	مولوی محمد امین
درجہ سوم۔سچا احسان	۳ر	بی۔اے
کامیابی کا زینہ	۲-۶ پائی	
درجہ چہارم۔شکنتلا	۲ر	
زہر کا پیالہ	۱-۶ پائی	
سادو کے مردم خود	۸ر	ترجمہ پنڈت بیلنشر پرشاد فدائی

نام کتاب یا سلسلہ	قیمت	نام مصنف یا ایڈیٹر
تندرستی کی پہلی کتاب	۲ر	
تسخیرِ قدرت	۴ر	پروفیسر عبدالقادر
حکایاتِ پنجاب	۸ر	ایم۔اے
سلسلۂ مطالعۂ قدرت		
پرندے اور مچھلیاں	۴ر	
درس شفقت	۵ر	سی ایچ
درندوں کا بیان	۷ر	ڈانلڈ صاحب
اردو پڑھنے کے چارٹ		مرحوم جے۔اے
۴ تختوں کا سیٹ رولر	۴ روپے	رچی صاحب ایم۔اے
پر لگے ہوئے		
حکایاتِ ہند حصہ اول	۳ر	ای مارسڈن
″ ″ حصہ دوم	۷-۶ پائی	بی۔اے
انوکھی دنیا حصہ اول	۸ر	منشی لال گروال
″ ″ ″ دوم	۱۰ر	ایم۔اے
″ ″ ″ سوم	۱ روپیہ	
″ ″ ″ چہارم	۱ روپیہ	بی۔ریڈی
سلسلۂ تاریخ ہند		
ا۔ املاکِ ہند	۶ر	
ب۔ اقوام ہند	۶ر	جیمز گینز
ج۔ افسانۂ ہند	۶ر	
د۔	۶ر	

کتب ہذا تمام کتب فروشوں سے مل سکتی ہیں۔یا براہ راست ذیل کے پتہ سے منگوا سکتے ہیں۔

میکمیلن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس۔ لندن۔

اشتہار

درسی کتب کا اتحادی سلسلہ

مصنّفہ

سید اولاد حسین صاحب شاداںؔ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور

و

ماسٹر اودھو رام صاحب منشی فاضل

منظور کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی

اُردُو کا قاعدہ حِصّہ اوّل " " قیمت ۶ پائی

اُردُو کا قاعدہ مکمل " " " ۱/ ۵ "

اُردُو کی دوسری کتاب " " " ۲/ ۱ "

اُردُو کی تیسری کتاب " " " ۲/ ۸ "

اُردُو کی چوتھی کتاب " " " ۸/ ۵ "

یہ کتب حال ہی میں پرائمری کی دوسری تیسری اور چوتھی جماعت کے لئے بطور ٹیکسٹ بک کمیٹی منظور ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں قابل مصنفین نے جدید طریقۂ تعلیم کے مطابق بہت محنت اور کوشش سے مُرتب کی ہیں۔ زبان خصوصیت کے ساتھ سلیس اور شُستہ ہے۔ طرزِ بیان نہایت دلکش ہے۔ مضامین بچوں کی دلچسپی اور مذاق کو ملحوظ رکھکر لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلۂ کتب کو رنگین اور سادی تصاویر سے بھی مزیّن کیا گیا ہے۔ مہربانوں سے توقع ہے کہ وہ اس سلسلۂ کتب کو اپنے سکولوں میں رائج کرکے ہماری حوصلہ افزائی کریں گے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز۔ لاہور

در

نیدا و

تک کیا
کوشش
مضا
تصا
رائج
را

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۳) | جولائی ۱۹۳۷ء | نمبر (۴)

فہرستِ مضامین

اشتہار

نو ترمیم

آئینِ شہریت مع قوانینِ صحت

جسے حال ہی میں محکمہ تعلیم نے بذریعہ سرکلر نمبر $\frac{4909}{14.4.37}$ تمام مڈل کی جماعتوں کے لیے منظور فرمایا ہے۔

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان مڈل سکولز و لوئر مڈل مدارس پر واضح ہو کہ سال گزشتہ اس مضمون کے متعلق جو کتب محکمہ نے منظور کی تھیں وہ سب ایک سال کے لیے تھیں اور ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کے بعد وہ سب نامنظور ہو گئی ہیں۔ اس لیے اب سال گزشتہ کی منظوری پر کوئی کتاب رائج نہیں ہو سکتی +

یہ کتاب جس کی منظوری محکمہ نے ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو دی ہے شہریت و حفظِ صحت کی اس سکیم کے عین مطابق ہے، جو محکمہ تعلیم نے مڈل کلاسز کے لیے منظور فرمائی ہے۔ اس کتاب میں اس مضمون کے ہر موضوع پر مفصل واقفیت دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور جدید اصلاحات کے متعلق تمام ضروری امور بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسے قابل اور تجربہ کار مصنفین نے اردو اور انگریزی کی ان تمام کتب کو مطالعہ کر کے لکھا ہے، جو اب تک چھپ چکی ہیں +

کتاب کی زبان سلیس، دلچسپ اور مؤثر ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہترین ہے +

نوٹ:- اگر کوئی شخص آپ کو کسی ایسی کتاب کے رائج کرنے کے متعلق کہے، جس پر ۱۹۳۷ء کے سرکلر نمبر کا جواز نہیں ہے، تو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ رائج نہ ہو، کیونکہ وہ منظور شدہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس منظور شدہ کتاب کو رائج فرمائیں گے، تو ہم بہت شکر گزار ہونگے +

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

۱

ایڈیٹوریل

ماہ جون کے ابتدا میں وزیرِ تعلیمات نے کسی موقع پر اعلان فرمایا کہ وزارتِ تعلیم مستقبل قریب میں ابتدائی تعلیم کے نظام میں چند تبدیلیاں برپا کرے گی، جس کا مقصد یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم کو جبریہ طور پر جس قدر وسعت ممکن ہو، جلد از جلد دی جا سکے۔ ابتدائی تعلیم کے ترویج کے سلسلے میں یہ اعلان قابلِ توجہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت چار جماعتوں کے بدلے پانچ جماعت تک قرار دی جائیگی۔ تاکہ دیہاتی آبادی کا وہ حصہ، جو چار سال مدارس میں تعلیم پانے کے بعد اکثر پھر نوشت و خواند بھول کر ناخواندہ کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے، مستقلاً خواندہ رہے۔ اسی اعلان میں لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اب وزارتِ تعلیم کی خواہش ہے اور سررشتۂ تعلیم کی یہ کوشش ہوگی کہ لڑکیوں کی تعلیم کا رواج دیہاتی علاقوں میں بھی عام کر دیا جائے اور ایسے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے جائیں کہ لڑکیوں کی تعلیم وسیع پیمانے پر رواج پا جائے۔

مذکورۂ بالا دونوں مسائل اپنی اہمیت کی بنا پر توجہ اور کوشش کے مستحق ہیں اور آج کوئی بھی ان کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ان دونوں موضوعات پر مفصل بحث چند صفحات میں نہیں کی جا سکتی۔ درحقیقت اس کے لیے ایک رسالے کے افتتاحیے کے بدلے مکمل اور ضخیم کتاب درکار ہے۔ ہم اس افتتاحیہ میں صرف ابتدائی تعلیم کے اس حصے پر کہ ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال کے عوض پانچ سال کر دی جائے کچھ سطور پیش کرتے ہیں

ایک سال کی زیادتی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ غالباً اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو بچے پانچ

سال ہا اس میں زیرِ تعلیم رہیں گے، وہ ہمیشہ کے لیے خواندہ ہو جائیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چار سال کی تدریس مستقل طور پر خواندہ بنا دینے کے لیے ناکافی ہے؟ مختلف ممالک میں بہت کاوش اور جستجو سے تحقیق کی جا چکی ہے اور کم و بیش ہر ملک میں یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ چار سال کی طویل مدّت ایک بچے کو مستقلاً خواندہ بنانے کے لیے بہت کافی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس چار سال کی مدّت کے لیے ایسا واضح اور معین نصاب بنایا جائے اور اس حزم و احتیاط سے درس و تدریس ہو کہ نقوش مکمل اور غیر فانی بن جائیں، اس لیے قبل اس کے کہ کوئی ایسا نظام برپا کیا جائے، جس کی رو سے مدّتِ تعلیم چار سال کے بدلے پانچ سال مقرر ہو جائے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صوبے کے ابتدائی تعلیم کے نصاب اور ذرائع اور اسالیبِ تدریس کا بغور مطالعہ کیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ اس موجودہ نظام ہی سے ہماری مشکل آسان ہو جائے۔

گشتی کتب خانے ہر متمدن ملک میں ایک ضروری اور نہایت مفید ذریعۂ تعلیم ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ کتب خانے عموماً خاص ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر مہیا کیے جاتے ہیں، لیکن ہمارے صوبے میں گشتی کتب خانوں کو بقدرِ ضرورت رواج نہیں دیا گیا اور یہ افسوسناک امر ہے کہ آج ہم کوئی سو کتابیں ایسی نہیں پیش کر سکتے، جن کا مقصد خواندگی کو مستقل بنانا اور عام زندگی کی مشکلات کو حل کرنا ہو۔ وزارتِ تعلیم سے ہم نہایت ادب کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ مدّتِ تعلیم کو پانچ سال کرنے سے قبل ایسے چند امور کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائے۔ اسی سلسلے میں ہم یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم پر خاص توجہ کی جائے اور مضامین کی بھرمار کے بدلے نوشت و خواند اور روزمرّہ کے حساب کی تدریس کو مقصدِ اوّلی قرار دیا جائے۔ ہمارا اس سے یہ مطلب نہیں کہ حفظانِ صحت، ابتدائی جغرافیہ وغیرہ سے بالکل قطع نظر کر لی جائے۔

ہماری گزارش تو صرف اس قدر ہے کہ ان مضامین کی تدریسی حیثیت کو بدل کر انھیں عملی نقطۂ نگاہ سے سکھایا جائے۔ صفائی کی اہمیت، اچھی اور صاف ہوا کی ضرورتیں بچوں کی زندگی میں عملی طور سے شریک کر دی جائیں تاکہ بچے مدرسے سے نکل کر نوشت و خواند اور ابتدائی حساب کے علاوہ اپنی زندگی میں اپنے افلاس کے باوجود ایک ایسا طریقہ روزمرہ لے کر نکلے، جو اس کی صحتِ جسمانی کے لیے مفید ثابت ہو۔

اِسی ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم کی کمزوری کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اُسے صوبہ جاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں ایک ایک صوبے کا رقبہ اور اُس کی جغرافی حالت اس قدر گوناگوں ہے کہ کوئی ایک ہمہ گیر نظام مفید نہیں ہو سکتا۔ نظامِ تعلیم میں کسی تبدیلی کو برپا کرنے سے پہلے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ضلع ضلع کی ایک جانچ کریں۔ ہر ضلع کی خصوصیات بلحاظ آبادی، پیداوار اور جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے ہمارے پیشِ نظر ہوں اور پھر ہر علاقے کو اُس کی خصوصیات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مناسب نصاب اور نظامِ تدریس مہیا کر دیں۔

ایک ہی نسخہ ہر مرض کی دوا نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک ہی قسم کی تعلیم کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔

جاپان کا نظام تعلیم

از

بشیر احمد صاحب اڈار، ایم اے، بی ٹی

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۶)

اساتذہ کی تربیت ایک قوم کے لیے بہت اہم سوال ہے۔ ہندوستان میں اس مقصد کے لیے مختلف درجے مقرر ہیں، لیکن عام طور پر تعلیم کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ انتظام ابھی تک بہت ناقص ہے۔ جیسے کہ بعد میں ظاہر ہوگا، مدرسۂ وسطانیہ کے اساتذہ کی تربیت کا زمانہ جاپان میں چار یا پانچ سال ہے اور ہمارے ہاں بمشکل ایک سال۔ اس سے آپ نتیجے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جاپانی مدارس ابتدائی کے لیے علیحدہ مدارس معلمی مقرر ہیں جو دوسرے مدارس کی طرح حکومت مرکزی کے خرچ سے نہیں چلتے، بلکہ ہر ایک صوبائی حکومت ان کے انتظام کی ذمے وار ہے۔ ہر ایک صوبے میں کم از کم ایک مدرسۂ معلمی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک مدرسۂ ابتدائی، جہاں مدارس معلمی کے طالب علم عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

یہ تربیت دو مختلف باقاعدہ خواندگیوں پر مشتمل ہے:۔

(۱) پہلی خواندگی کی مدت لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے چار سال ہے اور اس کے ساتھ ایک سال کی تیاری کی خواندگی ہوتی ہے۔ تیاری کی خواندگی میں داخلے کی شرائط یہ ہیں کہ اچھی صحت

اور اچھے اخلاق والا ہو اور اس نے اعلیٰ ابتدائی تعلیم کے دو سال پورے کیے ہوں اور پہلی خواندگی میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تیاری کی خواندگی ختم کر چکا ہو۔

(۲) دوسری باقاعدہ خواندگی کی مدت ایک سال ہے اور اس میں وہ طلبہ داخل ہو سکتے ہیں، جنھوں نے مدرسۂ وسطانیہ کی تعلیم ختم کر لی ہو اور وہ لڑکیاں داخل ہو سکتی ہیں، جنھوں نے مدارس اعلیٰ (یعنی وسطانیہ) کی خواندگی ختم کر لی ہو۔ اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدارس ابتدائی کے اساتذہ کی تربیت کا کل زمانہ چھے سال ہے اور اس میں داخلے کے لیے ضروری ہے کہ مدارس وسطانیہ کا سند یافتہ ہو۔ اس سے پہلے آپ مدارس وسطانیہ کا معیار ملاحظہ کر چکے ہیں، جو ہمارے ہائی کلاسوں سے بہت زیادہ ہے اور سترہ سال کی عمر میں ختم ہوتا ہے۔

پہلی اور دوسری باقاعدہ خواندگی کے مضامین حسب ذیل ہیں: اخلاق، علم تعلیم، جاپانی زبان اور چینی ادبیات، تاریخ جغرافیہ، حساب، سائنس، قانون اور اقتصادیات، ڈرائنگ، دستکاری، جمناسٹک اور انگریزی بطور اختیاری زبان۔ لڑکیوں کے لیے تقریباً یہی مضامین ہیں۔ صرف قانون اور اقتصادیات حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے بدلے خانہ داری، سینا اور گانا زیادہ کر دیا گیا ہے۔

علم تعلیم کی تفصیل یوں ہے: علم نفسیات اور منطق کے ابتدائی اصول، اصول تعلیم، طریقۂ تعلیم، موجودہ تاریخ تعلیم، تعلیمی قوانین، بندوبست مدارس وغیرہ۔ پڑھانے کی مشق ملحقہ ابتدائی مدارس میں کرائی جاتی ہے اور مدارس معلمی کے اساتذہ اور ابتدائی مدارس کے معلمین طلبہ کے سبق کی نگرانی کرتے ہیں اور بعض دفعہ نمونے کے طور پر خود بھی پڑھاتے ہیں۔

مدارس معلمی کے تمام طلبہ کو ملحقہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنا پڑتا ہے اور چونکہ ابھی تک اساتذہ کی تعداد ضرورت سے بہت کم ہے، اس لیے ابھی تک ان کو تعلیم کے لیے وظائف ملتے ہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد طلبہ کو صوبائی اسناد مل جاتی ہیں، جن کی رو سے اس صوبے میں انھیں معلمی کا کام

کچھ عرصے کے لیے کرنا لازمی ہے۔

اِن مدارس معلمی (ادنیٰ درجہ)، مدارس وسطانیہ اور لڑکیوں کے اعلیٰ مدارس کے مدرسین کی تربیت کے لیے اعلیٰ مدارس معلمی ہیں جن کو حکومت مرکزی نے خود قائم کیا ہے اور ان کا تمام انتظام خود حکومت کے ماتحت ہے۔

مردوں کے اعلیٰ مدارس معلمی کے تین درجے ہیں: (۱) تیاری کا کورس جس کی مدت ایک سال ہے۔ (۲) باقاعدہ کورس جس میں کئی مختلف شعبے ہوتے ہیں اور اس کی مدت تین سال ہے۔ اور (۳) بعدِ تحصیل خواندگی (Post- graduate.) جس کی مدت ایک یا دو سال ہے۔

۱۔ تیاری کی خواندگی میں حسبِ ذیل مضامین شامل ہیں: اخلاق، جاپانی زبان، چینی ادب، انگریزی، حساب، منطق، ڈرائنگ، گانا اور جمناسٹک اور ان میں وہ لڑکے داخل ہو سکتے ہیں، جنھوں نے معمولی مدارس معلمی یا مدارس وسطانیہ کی اسناد حاصل کی ہوں۔ جیسے کہ مضمونوں کی فہرست سے ظاہر ہے۔ اس میں تقریباً وہی چیزیں دہرائی جاتی ہیں، جو طلبہ مدارس معلمی (معمولی) یا مدارس وسطانیہ میں پڑھ چکے ہیں۔

۲۔ باقاعدہ کورس پانچ مختلف شعبوں میں منقسم ہے۔ مثلاً شعبۂ ادبیات (یعنی جاپانی زبان اور چینی ادب)، شعبۂ انگریزی زبان، شعبۂ تاریخ و جغرافیہ، شعبۂ حساب و سائنس (کیمیا اور طبیعیات اور حساب)، شعبۂ علوم طبیعیہ۔ لڑکوں کو اجازت ہوتی ہے کہ ان شعبوں میں سے کوئی ایک اختیار کریں۔ اس باقاعدہ خواندگی کی تشریح کے لیے مَیں ذیل میں صرف دو شعبوں کی تفصیل درج کرتا ہوں۔

(۱) شعبۂ ادبیات (یعنی جاپانی زبان اور چینی ادبیات)

مضامین	کیفیت
علم الاخلاق	عملی اخلاق، قومی اخلاق، تاریخ علم الاخلاق مغرب و مشرق، تاریخ اخلاقیات۔

مضامین	کیفیت
علم تعلیم یا فنِ معلمی	فنِ معلمی، تاریخ تعلیم، طریقۂ تعلیم، مدرسے کی حفظانِ صحت، تعلیمی قوانین اور احکام
تاریخ	قومی تاریخ، مشرقی و مغربی ممالک کی تاریخ
نفسیات، منطق و فلسفہ	فلسفے کے ابتدائی مسائل
جاپانی زبان اور چینی ادبیات	پڑھنا، صرف و نحو، انشاپردازی، بلاغت، صحت تلفظ، تاریخ ادبیات، قومی لسانیات کا خاکہ
انگریزی	پڑھنا، صرف و نحو، انشا اور تقریر، تاریخ ادبیات
قانون و معاشیات	قانون کا خاکہ، دستور جاپان، انتظامی قانون، بین الاقوامی قانون، معاشیات اور مالیات کے عام اصول
عضویات	خاکہ
لسانیات	
جسمانی تربیت	ورزشیں، قواعد وغیرہ

اور ان کے علاوہ جرمن زبان بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے ہوتی ہے۔

(ب) شعبۂ سائنس اور حساب

اس شعبے میں علم الاخلاق، علم تعلیم، انگریزی جاپانی زبان، نفسیات، منطق و فلسفہ اور جسمانی تربیت کے علاوہ (جن کا پہلے شعبے میں ذکر ہو چکا ہے) مندرجۂ ذیل مضامین خصوصی ہوتے ہیں:۔

مضامین	کیفیت
حساب	ریاضی، جبر و مقابلہ، علم مثلث، ہندسہ، طریقۂ تعلیم حساب، عملی ریاضیات، بہی کھاتہ

مضامین	کیفیت
علم ہیئت و شہابیات	
طبیعیات	حرکت، مادے کے خواص، آواز، حرارت، بصریات، برقیات، مقناطیسیات۔
کیمیا	نظری اور طبعی، نامیاتی اور غیر نامیاتی
نباتات	اصول تقسیم نباتات، عملی نباتات، نباتی عضویات، نباتات پر ماحول کا اثر۔
معدنیات اور علم طبقات الارض	
جغرافیہ	عام اصول، جغرافیۂ جاپان، ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ اور اوقیانوسی جزائر۔
نقشہ کشی	نقل کرنا، دستی تصویر کشی، آبی رنگ سے تصویر کشی وغیرہ۔

ان کے علاوہ جرمن زبان پہلے شعبے کی طرح اختیاری مضمون ہے۔

مندرجۂ بالا تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ کئی مضمون سب شعبوں میں مشترک ہیں اور ہر شعبے میں ان خاص مضامین پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اگرچہ محکمۂ تعلیم کی تصریحات ہیں کہ کسی شعبے میں بھی عام مشترک مضامین سے کوتاہی نہ برتی جائے۔

۳۔ خواندگی بعدِ تحصیل (Post-graduate course.)

اس خواندگی میں طالب علم باقاعدہ خواندگی کے ایک یا زیادہ مضامین لے سکتا ہے اور اختتام پر اُس کو اس مضمون پر ایک رسالہ یا کتاب تحریر کرنی پڑتی ہے۔

زنانہ اعلیٰ مدارس معلمی دو مختلف خواندگیوں پر مشتمل ہیں (۱) باقاعدہ خواندگی، جس کی مدت چار سال ہے اور تین شعبوں میں منقسم ہے۔ شعبۂ ادبی، شعبۂ سائنس، دستی کام کا شعبہ اور خانہ داری۔ ۲) خواندگی بعد تحصیل، جس کی مدت ایک یا دو سال ہوتی ہے اور شرائط وغیرہ بالکل مردوں کے مدارس

کی طرح ہیں۔

اِن مدارس میں ہر وہ عورت داخل ہو سکتی ہے، جو کسی زنانہ مدرسۂ معلمی (معمولی) یا زنانہ مدارس اعلیٰ (یعنی وسطانیہ) کی سند یافتہ ہو۔ اُس کی عمر سترہ سے کم اور بائیس سے زیادہ نہ ہونی چاہیے اور داخلے کے لیے باقاعدہ امتحان ہوتا ہے۔

باقاعدہ خواندگی کے پہلے دو شعبوں کا حال تقریباً مردوں کا سا ہے، اس لیے یہاں ان کی تفصیل نظر انداز کرتا ہوں۔ صرف دستی کام اور خانہ داری کے شعبے کی تفصیل ہدیۂ ناظرین ہے:۔

مضامین	کیفیت
اخلاقیات	تعلیم کے متعلق فرمان شہنشاہی کی تصریح، عملی اخلاق، علم الاخلاق کا خاکہ، تاریخ اخلاقِ مشرق و مغرب، قومی اخلاق کی بعض خصوصیات، عورتوں کے منصبی فرائض، آداب و اخلاق۔ جاپان کے قانون اور معاشیات کا خاکہ
معلمی یا علم تعلیم	نفسیات، منطق، تاریخ تعلیم، معلمی، طریقۂ تعلیم، بچوں کا پالنا، تعلیمی قوانین اور احکام، مدرسے کا حفظانِ صحت وغیرہ۔
سائنس	نباتات، حیوانیات، معدنیات، طبیعیات، کیمیا، عضویات، حفظانِ صحت
جاپانی زبان	
سینا	
دستی کام اور تصویر کشی	زردوزی، ہر قسم کے بٹوے بنانا، تصویر کشی، نقشے اور نمونے تیار کرنے، رنگین تصویر کشی، جالی کاڑھنا، مصنوعی پھول بنانا، کاغذ، بانس، مٹی، لکڑی، اور دھات کے مختلف کام، رنگنا اور بننا وغیرہ۔
انگریزی	

مضامین	کیفیت
موسیقی	
جمناسٹک	فوجی قواعد اور کھیل وغیرہ

ان زنانہ مدارس معلمی کے ساتھ زنانہ مدارس اعلیٰ (یعنی وسطانیہ) اور مدارس ابتدائی ملحق ہوتے ہیں، جہاں عورتوں کو معلمی کی عملی تربیت دی جاتی ہے اور مردوں کی طرح ان کو بھی وظائف ملتے ہیں اور محکمۂ تعلیم کے زیرِ نگرانی قائم ہیں۔

(۷)

جاپان کا وہ حیرت انگیز پُرامن انقلاب، جس نے اُس کو موجودہ زمانے کا ایک عظیم الشان ملک بنا دیا، درحقیقت اس کی صنعتی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ عام تعلیم کا رواج تو ہندوستان میں بھی پورے سو سال سے رائج ہے، لیکن اس کا نتیجہ سوائے بے روزگاری کے اور کچھ نہ نکلا۔ اس کے برعکس جاپان نے اس سے نصف عرصے میں تعلیم کو منظم کیا اور ترقی کی چوٹی تک جا پہنچا۔ کوئی شک نہیں کہ اُس کے علاوہ دیگر وجوہات بھی تھیں، جو اندر ہی اندر کام کرتی رہیں، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اگر جاپان صنعتی تعلیم میں پیچھے رہ جاتا یا کوتاہی کرتا تو اُس کی حالت یقیناً ایسی نہ ہوتی، جیسی کہ اب ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستانی صنعت کافی ترقی کر چکی تھی۔ اگر اس وقت عام تعلیم کے ساتھ صنعتی تعلیم بھی اچھے پیمانے پر چلا دی جاتی، تو ہندوستان کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔

موجودہ دور کا آغاز جاپان میں ۱۸۶۸ء سے ہوتا ہے اور اس کے سات سال بعد محکمۂ تعمیرات کے ماتحت پہلا صنعتی ادارہ کھولا گیا اور ۱۸۸۶ء تک بہت عمدہ طریقے پر کام کرتا رہا۔ اس مدرسے میں تقریباً سارا عملہ انگریزی تھا، جن کو جاپانیوں کی صنعتی تعلیم کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس ادارے کا مقصد یہ تھا کہ محکمۂ تعمیرات کے لیے انجنیر مہیا کیے جا سکیں۔ پھر ۱۸۷۲ء میں ایک زراعتی

کالج کا آغاز کیا گیا اور ۱۸۷۶ء میں ٹوکیو میں بھی ایک زراعتی مدرسہ بنا۔ ۱۸۷۷ء میں ایک مدرسہ جنگلات کا، بعد میں ان دونوں کو ملا کر ٹوکیو کے شاہی جامعہ کا زراعتی کالج بنا دیا۔ سب سے پہلا خانگی تجارتی مدرسہ ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا اور ترقی کرتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں ٹوکیو کا جامعۂ تجارت بن گیا۔ ۱۸۸۱ء میں کاریگروں کے لیے محکمۂ تعلیم نے ایک مدرسہ کھولا اور یہ بھی دیگر مدارس کی طرح بہت شاندار کام کر رہا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی صنعت و حرفت جدید طریقوں سے سکھائی جاتی ہے۔ اس مدرسے کا نام اب ٹوکیو کا اعلیٰ مدرسۂ صنعت و حرفت ہے۔ آج کل اس کے نصاب میں رنگنا، کاتنا، بننا، کوزہ گری، عملی کیمیا، برقی کیمیا، میکنیکل انجینئرنگ، معماری اور دیگر بہت سی چیزیں شامل ہیں۔

اس مختصر سی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جاپان نے صرف دس برس (۱۸۷۱ء۔ ۱۸۸۱ء) کے عرصے میں بے شمار صنعتی مدارس اور کالج قائم کر لیے اور ان کے تعلیم یافتہ آج تک تمام جاپان کی صنعت و حرفت اور تجارت کے فتنے دار ہیں اور یہ اُنھیں صنعتی مدارس کی وجہ سے ہے کہ آج جاپان صنعت و حرفت اور تجارت میں دوسرے بڑے بڑے ملکوں کا مقابلہ کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

جاپان میں صنعتی تعلیم کے چار درجے ہیں:۔

(۱) خاص صنعتی کالج، جن میں وہ لڑکے داخل ہو سکتے ہیں، جنھوں نے مدارس وسطانیہ کی سند حاصل کی ہو اور لڑکیوں کے لیے مدرسۂ اعلیٰ (یعنی وسطانیہ) کی سند لازمی ہے۔

(۲) صنعتی مدارس درجۂ ا، جن میں وہ لڑکے داخل ہو سکتے ہیں، جنھوں نے اعلیٰ ابتدائی تعلیم کے دو سال کی خواندگی ختم کر لی ہو اور عمر چودہ سال سے زیادہ نہ ہو۔

(۳) صنعتی مدارس درجۂ ب جن میں معمولی ابتدائی مدارس کے سند یافتہ داخل ہو سکتے ہیں اور جن کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ ہو۔

(۴) صنعتی مدارس ضمنی (Supplementary)

صنعتی مدارس درجہ الف کی تعلیم کی مدت پانچ یا چھ سال ہے اور ان کا درجہ مدارس وسطانیہ کے ہم پلہ ہے۔ ان مدارس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو زراعت، ماہی پروری، بھری پیلوان، تجارت، میکینیکل انجینئرنگ اور جہازرانی سکھائی جائے۔ یہ سب یومیہ مدارس ہیں۔ درجہ ب کی تعلیمی مدت تین سال ہے اور ان کی تعلیم محض ابتدائی صنعتی تعلیم ہے اور اس دوران میں عام مضامین کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی، لیکن اس صنعتی تعلیم کے نظام میں سب سے زیادہ اہم ضمنی مدارس ہیں، جہاں صنعتی تعلیم کے ساتھ ساتھ عام تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یہ مدارس دراصل ان لوگوں کے لیے قائم کیے گئے ہیں، جو مدرسۂ ابتدائی معمولی یا اعلیٰ ختم کرنے کے بعد مدارس وسطانیہ میں داخل نہیں ہونا چاہتے اور اپنی روزی کمانے کے لیے کوئی صنعت سیکھنا پسند کرتے ہیں اور عموماً ایسے اشخاص بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، جو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے پیشوں میں لگ چکے ہوں، چونکہ ایسے اشخاص کی عام تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوتی، اس لیے صنعتی مضامین کے ساتھ ساتھ عام مضامین کی بھی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ ایک باعزت شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکیں اور چونکہ اس کے بیشتر طلبہ کاروباری ہوتے ہیں، اس لیے یہ مدارس رات کو کھلتے ہیں۔

ہمارا مضمون ختم ہو چکا ہے اور ہم نے مختصراً جاپان کی تعلیم کی مختلف اشکال ناظرین کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

جاپانی تعلیم کے کل چار درجے ہیں:-

(۱) درجۂ ابتدائی اور بعد ابتدائی جس میں کل آٹھ سال لگتے ہیں۔ چھ سال ابتدائی معمولی اور دو سال ابتدائی اعلیٰ، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مختلف اعلیٰ مدارس میں داخل

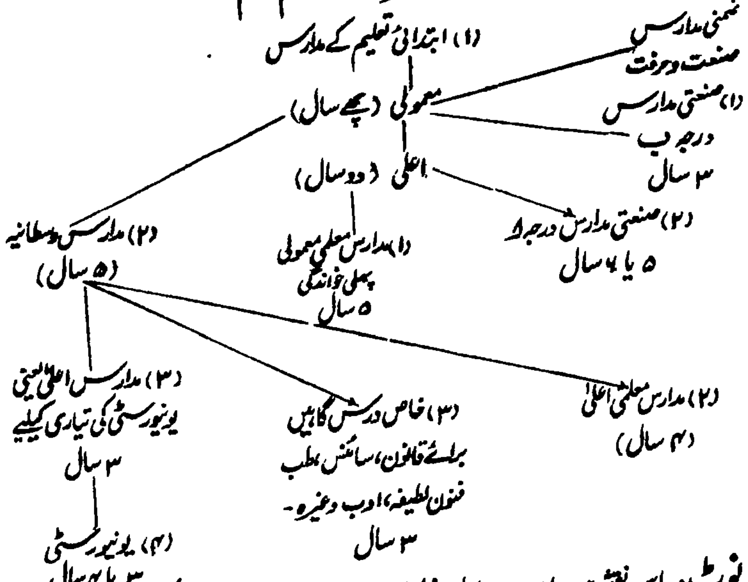
ہونے کے لیے عام طور پر ابتدائی معمولی تعلیم کافی سمجھی گئی ہے۔ مثلاً مدارس وسطانیہ میں داخل ہونے کے لیے بھی چھ سال کی تعلیم کافی سمجھی گئی ہے۔ البتہ مدارس معلمی کے لیے ابتدائی اعلیٰ تعلیم کا ہونا لازمی ہے۔

(۲) درجۂ ثانوی۔ جس میں لڑکوں کے مدارس وسطانیہ، لڑکیوں کے مدارس اعلیٰ، مدارس صنعت و حرفت اور مدارس معلمی شامل ہیں۔

(۳) درجۂ بعد ثانوی۔ اس میں ایسے مدارس اور کالج شامل ہیں، جن میں سے اکثر کا ذکر اوپر نہیں کیا گیا۔ ہندوستان سے بالکل برعکس جاپان کے مدارس کے طلبہ یونیورسٹی میں بلا روک ٹوک نہیں جا سکتے۔ ہر درجے پر انھیں کئی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لیے مدارس کا ایک اعلیٰ سلسلہ موسوم بہ مدارسِ اعلیٰ قائم کیا گیا ہے، جن کی مدت تعلیم تین سال ہے۔ ان مدارس کا واحد مقصد یہ ہے کہ اُن لڑکوں کو جنھیں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنی ہو، اُن کو اس تعلیم اعلیٰ کے لئے تیار کیا جائے۔
ان مدارس کے علاوہ اس درجے میں وہ کالج بھی شامل ہیں، جو خاص طور پر مختلف کاموں کی تربیت دیتے ہیں۔ مثلاً قانون، ہائے۔ سائنس، ادب، فنون لطیفہ وغیرہ اور انھیں مدارس میں غیر ملکی زبانوں کی درسگاہیں بھی شامل ہیں۔ ان درسگاہوں کی تعلیم یونیورسٹی تعلیم سے کم درجہ رکھتی ہے اور ان کا معیار بھی ویسے کم ہے اور ان طلبہ کے لیے قائم کیے گئے ہیں، جو یونیورسٹی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، لیکن ان مضامین میں کچھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) یونیورسٹی۔ یہ ہماری بحث سے خارج ہے :۔

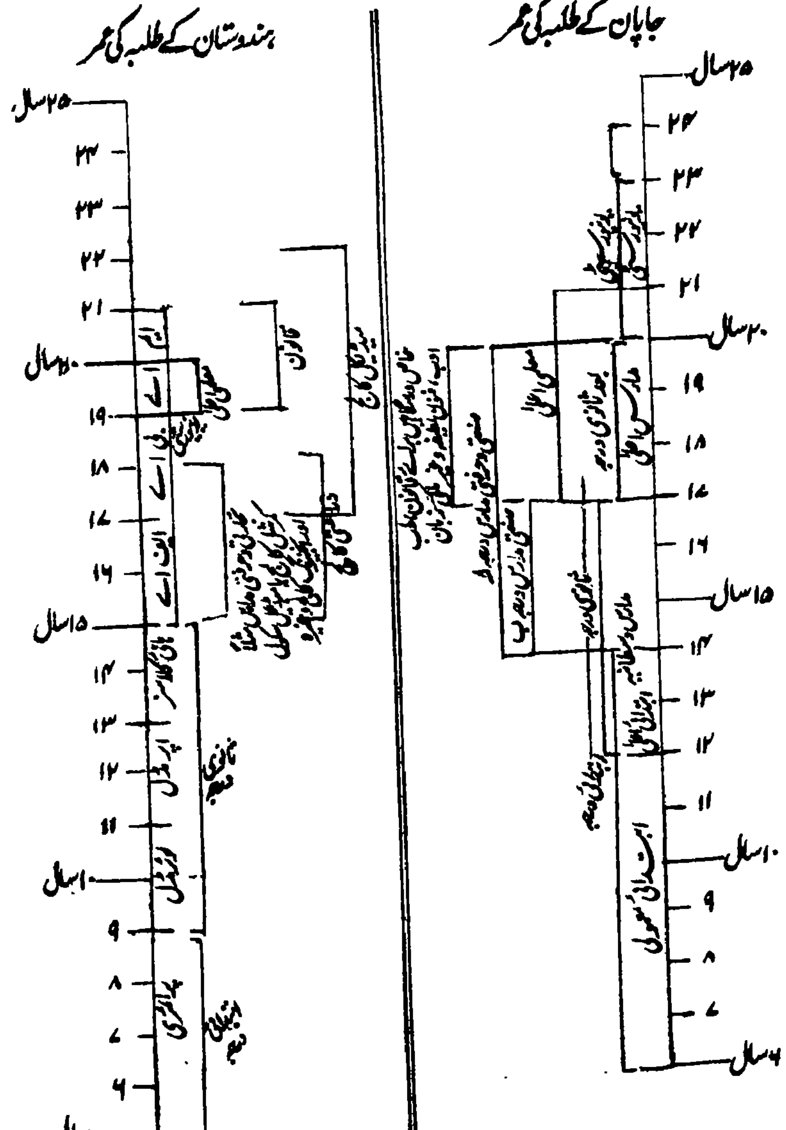
نقشہ (نمبر ۴) تقسیم تعلیم



نوٹ:۔ اس نقشے میں مدارس سے پہلے جو خطوط وحدانی میں اعداد ۱، ۲، ۳ اور ۴ دکھلائے گئے ہیں ان سے مراد مختلف درجے ہیں، جن کی توضیح اوپر ہو چکی ہے۔

اس نقشے سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے ۱۷ یا ۱۸ سال کی ضرورت ہے
ر چونکہ ابتدائی مدارس میں بچے ۶ سال کی عمر میں داخل ہو سکتے ہیں، اس لیے جب یونیورسٹی کی تعلیم ختم
رتے ہیں، تو اُن کی عمر ۲۳ یا ۲۴ سال ہوتی ہے۔ ابتدائی مدرسوں میں معلم بننے کے لیے ۱۳ سال کی
ت درکار ہے اور مدارس وسطانیہ کے معلموں کی تربیت کے لیے ۱۵ سال۔ یعنی ۱۹ سال کی عمر میں
ندائی مدارس کی معلمی اور ۲۱ سال کی عمر میں مدارس وسطانیہ کی معلمی کی سند ملتی ہے۔ اگر ہم ان کا مقابلہ
ندوستان کی تعلیم سے کریں، تو عجیب فرق نظر آتا ہے یعنی ہندوستان میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے
لیے صرف ۱۶ سال درکار ہیں اور مدارس ثانوی کی معلمی کے لیے صرف ۱۵ سال۔ اس کا فرق
کے نقشے سے واضح ہو جائیگا :-

نقشہ نمبر (۵) ہندوستان اور جاپان کی مختلف درجوں کی تعلیمی عمر کا مقابلہ



نوٹ (۱) جاپان کے یونیورسٹی کے درجوں میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں :-
قانون، طب، انجنیرنگ، علم ادب، سائنس اور زراعت۔ اُن کی تکمیل بعض حالات میں تیئیسویں سال ہوتی ہے اور بعض حالات میں چوبیسویں سال، علم وادب اور سائنس کی بھی اکیسویں سال اور زراعت کی اٹھارویں سال۔

نوٹ (۲) جاپان میں لازمی تعلیم عام آدمیوں کے لیے چودہ سال تک جاتی ہے اور مفت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن پڑھوں کی تعداد صفر فیصدی ہے۔ ہندستان میں مفت لازمی تعلیم ۹ سال تک ہے اور اس کے بعد کوئی بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے پڑھے لکھوں کی تعداد ۱۴ فیصدی ہے۔

قدیم ہندوستان کی یونیورسٹیاں

از

گوپال داس صاحب کھنہ، لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

قدیم ہندوستان میں تعلیم کے موضوع پر جو ہم نے ایک سلسلۂ مضامین جاری کر رکھا ہے اُس کا یہ آخری مضمون ہے۔ اس میں ہم قدیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا ذکر کریں گے۔

کشمیر اور بدریکا آشرم کی یونیورسٹیاں۔ تاریخ سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے آریہ لوگوں کی تہذیب کا مرکز پنجاب تھا، اس لیے سب سے پرانی یونیورسٹیاں اسی صوبے میں پائی جاتی تھیں۔ ان سب میں کشمیر اور بدریکا آشرم کی یونیورسٹیاں معرکے کی درسگاہیں تھیں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ زمانۂ قدیم کے ہندوؤں نے اپنی تعلیم گاہیں عام طور پر آبادی سے دُور جگہوں میں قائم کر رکھی تھیں، جہاں طلبہ پوری یکسوئی سے حصولِ تعلیم میں وقت گزار سکتے تھے۔ اس لیے پُرانے زمانے کی یونیورسٹیاں تقریباً سب کی سب شہروں سے دُور کھلے میدانوں میں یا پہاڑوں کی وادیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص دارالعلوم مشہور شہروں کے مرکز بنے، لیکن شروع شروع میں تعلیم گاہیں آبادی سے دُور ہی بنائی گئیں۔ چونکہ پُرانے ہندوؤں میں تعلیم عالیہ کا رواج عام تھا، اس لئے اغلب ہے کہ اس قسم کی تعلیم کے لیے مختلف جگہوں میں دارالعلوم ہوں، جن کا ہمیں آج کل پتہ نہیں ملتا، لیکن پرانی کتب اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر اور بدریکا آشرم میں جو ہمالیہ پہاڑ کی شمال مغربی وادیوں میں واقع ہیں، تعلیم عالیہ کا اچھا انتظام تھا۔ یہاں رشی ویدوں، ویدسنگھتا، برہمن، اپنشد اور ویدسوتروں پر ادب کے

مختلف پہلوؤں یعنی شعر و شاعری، تاریخ، ڈرامہ، سائنس، گرئیمر، فلسفہ، طلب، قانون وغیرہ مختلف مضامین پر تعلیم دیا کرتے تھے۔ کشمیر میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ آج تک جب یگیوپویت کی رسم ادا کی جاتی ہے، تو اُس کے دوران میں طالب علم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ میں حصول تعلیم کے لیے کشمیر جانا چاہتا ہوں۔ تب اُس کی ہمشیرہ اُس کے دامن کو پکڑ کر اُسے اس ارادے سے روکنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ دیکھو کشمیر کا سفر کتنا لمبا ہے اور راستے میں کئی قسم کی مشکلات آئینگی۔ تم ایسا قصد نہ کرو۔ بعد میں جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھائی اپنے ارادے پر قائم ہے، تو روکنے کے بجائے اسے آشیرباد دیتی ہے کہ جاؤ خدا کرے تم اپنے کام میں پورے اُترو۔ اس رسم سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کشمیر نے اشاعتِ تعلیم میں ایک ممتاز درجہ حاصل کر رکھا تھا اور ملک کے مختلف حصّوں سے طلبہ وہاں تعلیم کی خاطر جایا کرتے تھے۔

ٹیکسلا کی یونیورسٹی۔ چھٹی صدی قبل از مسیح میں ہندوستان میں سب سے مشہور یونیورسٹی ٹیکسلا یا تکھشاشیل کی یونیورسٹی تھی۔ اگر اُسے اُس زمانے کی ہندو تہذیب کا مرکز کہیں تو نہایت موزوں ہوگا۔ کہتے ہیں کہ یہاں سولہ قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے اور اُن کے علاوہ بیسیوں اقسام کے ہنر مثلاً مصوری، نقاشی، سنگ تراشی وغیرہ بھی سکھائے جاتے تھے۔ سنسکرت گریمر کے مشہور عالم پانِنی اور بادشاہ چندرگپت کے وزیر چانکیہ نے بھی اسی دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس یونیورسٹی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جہاں عام ہندو تعلیم گاہوں میں تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی، یہاں ہر ایک طالب علم کو باقاعدہ فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ تعلیم ایک بڑے اعلیٰ پیمانے پر دی جاتی تھی، جس کو حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے طلبہ آتے تھے، اس لیے اس کے اخراجات کی بہم رسانی کے لیے شہر کے لوگوں کی مالی امداد کافی نہ ہوتی تھی۔

بلکہ طلبہ سے بھی فیس لی جاتی تھی۔

اس یونیورسٹی میں دیگر علوم و فنون کے علاوہ علم طب پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ مشہور شاہی طبیب جیوکا میرجس نے مگدھ کے بادشاہ بمبی سار کو موت کے چنگل سے چھڑایا اور مہاتما بدھ کا بھی علاج کیا، اسی دارالعلوم کا طالب علم تھا۔ یہاں اس نے رشی ایترئی سے اس علم میں دسترس حاصل کی تھی۔ جیوکا کی تعلیم کے حالات سے اس زمانے کے امتحانات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ سات سال تک یونیورسٹی میں علم طب سیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کا امتحان لیا گیا۔ ٹیکسلا کے چاروں طرف پندرہ میل کے قطر کے اندر جتنے پودے، بیلیں، گھاس، پھل پھول اور جڑیں وغیرہ تھیں، اُن کی طبی خصوصیات پر ایک مکمل رپورٹ تیار کرنی تھی۔ جیوکا نے ان سب اشیا کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور چار دن کے بعد اپنے ممتحن کے آگے اپنی معلومات پیش کیں۔

ٹیکسلا کی یونیورسٹی سیکڑوں سال تک مشہور رہی۔ تیسری صدی قبل از مسیح میں اشوک اعظم کے زمانے میں بھی اس کا سورج نصف النہار پر تھا۔ لیکن چونکہ یونیورسٹی میں فیس کافی ادا کرنی پڑتی تھی، اس لیے عام طور پر امیروں کے لڑکے، اونچ گھروں کے برہمن اور ویش طلبہ ہی یہاں تعلیم پاتے تھے۔ کچھ سال ہوئے ٹیکسلا کا شہر جو مدت سے زمین کے نیچے دب چکا تھا، دوبارہ کھودا گیا، جہاں اس زمانے کی اور اشیا بھی برآمد ہوئی ہیں، وہاں اس مشہور یونیورسٹی کی عمارات بھی کھود کر نکالی گئی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے ہندو طلبہ کن حالات میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ تعلیمی عمارات تقریباً سب کی سب شہر سے پرے ٹیکسلا کے ارد گرد کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھیں اور طلبہ اور اساتذہ کے رہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے کمروں کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسروں اور طلبہ سب کو یونیورسٹی کی اپنی عمارات میں رہنا پڑتا تھا اور رہائش کا انتظام بھی اس طرح پر تھا کہ طلبہ کو حصولِ تعلیم میں ہر طرح کی سہولت میسر ہو۔ کوئی بھی رہائشی کمرہ ایسا نظر

نہیں آتا، جس میں آج کل کے بورڈنگ ہوسوں کی ڈارمیٹریوں کی طرح بہت سے طلبہ اکٹھے رکھے جاتے ہوں۔ کمروں کی پیمائش سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان میں اساتذہ رہتے تھے، تو ہر ایک کمرا ایک اُستاد کے لیے اور اگر وُہ طلبہ کے لیے معین تھا، تو اُس میں دو یا تین طلبہ سے زیادہ ہرگز نہ رکھے جاتے تھے۔

شری دھانیہ کٹک کی یونیورسٹی۔ یہ یونیورسٹی سدھ ناگر جُونا کے وقت میں مشہور ہُوئی اور یہ شہر دھریہ میں، جس کا موجودہ نام امراؤتی ہے، واقع تھی۔ شروع شروع میں یہ دارالعلوم برہمن تہذیب کا مرکز تھا، لیکن بعد میں بُدھ دھرم کے زیرِ اثر آکر اس کے اصولوں کی اشاعت کرنے لگا۔ یونیورسٹی کی عمارت بہت شاندار تھی، جس کی تعمیر پر لاکھوں روپے صرف کیے گئے اور نہایت ہنرور ہندو اور بُدھ معماروں نے مل کر اُسے تعمیر کیا۔

نالندہ کی یونیورسٹی۔ مؤرخ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ گو بہت قدیم زمانے میں بھی ہندوستان میں دارالعلوم پائے جاتے تھے، لیکن اُن کو اصل فروغ بُدھ مت کے زمانے میں ہُوا۔ مہاتما بُدھ نے مذہب میں جو ایک نئی روح پیدا کی، وُہ تبلیغ کی رُوح تھی۔ ان سے پہلے مذہب کا تعلق زیادہ تر انفرادی جدوجہد سے تھا، یعنی ہر شخص کا فرض تھا کہ وُہ اندرونی کھوج کرے اور اپنی روح کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسباب ڈھونڈے، لیکن بُدھ نے اس بات پر زور دیا کہ مذہب کی اشاعت کے لیے انفرادی جدوجہد کے علاوہ اس قسم کی متحدہ کوشش بھی ہونی چاہیے، جس سے مذہب کے اصول ملک کے ہر فرد بشر تک پہنچ سکیں۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ تعلیم گاہیں قائم کی جائیں اور ان میں بُدھ مشنری پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ بدھ کے پیروؤں نے جگہ جگہ وہار قائم کیے، جہاں بُدھ دھرم کی تعلیم شروع ہوئی۔ اگر ان وہاروں کو بدھ یونیورسٹیوں کا مرکز کہا جائے، تو بیجا نہ ہوگا۔ شروع شروع میں بدھ بھکشو درختوں کے نیچے بیٹھ کر اپنے شاگردوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہاں معمولی

جھونپڑیاں اور بعد میں پکّی اینٹوں یا پتھروں کی عمارات بن گئیں اور علوم وفنون کی تعلیم میں بھی اضافہ ہوگیا حتیٰ کہ وقت پاکر ان میں سے بعض مشہور یونیورسٹیاں بن گئیں۔ نالندہ کی یونیورسٹی کا آغاز بھی اسی طرح ہوا۔ پہلے پہل یہاں بدھ بھکشوؤں نے ایک "وِہار" قائم کیا، جو عروج پاتے پاتے اتنا مشہور دارالعلوم ہوگیا کہ ایشیا کے مختلف ممالک سے وہاں طلبہ آکر تعلیم پانے لگے۔ یہ یونیورسٹی مگدھ (موجودہ بہار) میں واقع تھی۔ اس کو عام طور پر دھرم گنج کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جب اس کا سورج نصف النہار پر تھا اور اس میں دس ہزار کے قریب طلبہ تعلیم پاتے تھے، اُس وقت دنیا جہالت کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ نالندہ کی یونیورسٹی پہلی صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس کی عالیشان تعمیر میں چار بادشاہوں یعنی شکرادتیہ، بُدھ گپتا، تتھاگت گپتا اور بلادتیہ نے نمایاں حصّہ لیا اور عمارات بھی کیا تھیں، ہندو اور بُدھ زمانے کے فنِ تعمیر کے اعلیٰ ترین نمونے۔ ساتویں صدی عیسوی میں یہاں چینی سیاح ہیونگ سانگ پہنچا۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس یونیورسٹی کا رقبہ ہندوستان کیا، ایشیا بھر میں ممتاز تھا۔ عمارات کے درمیانی حصّے میں کالج تھا۔ اس کے چاروں طرف آٹھ بڑے بڑے ہال کمرے تھے۔ مختلف مشاہدات کے لیے کئی ایک رصدگاہیں تھیں۔ اس یونیورسٹی کی سب سے قابلِ دید عمارات تین تھیں، جن کے نام رتن ساگر۔ رتن وُدھی اور رتن رنجکو تھے۔ اِن میں سے رتن وُدھی میں اس وقت کی سب سے مشہور لائبریری قائم تھی۔ جس وقت ہیونگ سانگ نالندہ پہنچا، اُس وقت یونیورسٹی کے سب سے اعلیٰ افسر کا نام شلابھدا تھا۔

نصابِ تعلیم۔ نالندہ میں مذہبی اور دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم کا انتظام تھا اور جہاں تک مذہبی تعلیم کا تعلق تھا، بُدھ دھرم کے اصولوں کے علاوہ ہندو دھرم اور ویدوں کا مطالعہ بھی کیا جاتا تھا۔ مندرجہ ذیل مضامین پڑھانے کا خاص انتظام تھا یعنی سنسکرت اور پالی زبان، صرف و نحو،

فلسفہ، علم طب، میٹافزکس یا علم ہیئت اور منطق۔ ان میں سے سب سے زیادہ زور منطق پر دیا جاتا تھا، کیونکہ بُدھ دھرم کے پیغام کو دُور دُور تک پہنچانے کے واسطے ضروری تھا کہ بھکشو اپنے مذہب سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور اس کے علاوہ زبردست منطقی بھی ہو تاکہ اپنے نقطۂ نگاہ کو دوسروں پر بخوبی واضح کر سکے۔

نظامِ تعلیم۔ چونکہ یونیورسٹی کا مقصد بُدھ مذہب کے بھکشو پیدا کرنا تھا، اس لیے عام طور پر طلبہ کا چناؤ انھیں اشخاص میں سے ہوتا تھا، جو اس مذہب کے پھیلانے کا ذمّہ لیں۔ چین، تبت، وسطی ایشیا، بخارا اور کوریا سے بھکشو طلبہ اس یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لیے آتے تھے۔ سب طلبہ کی تعلیم، کھانے اور رہائش کا انتظام بالکل مفت ہوا کرتا تھا۔

یونیورسٹی کے اندر چھے کالج تھے، جن میں مختلف مضامین پڑھانے کا بندوبست تھا۔ اساتذہ عام طور پر وہ اشخاص ہوا کرتے تھے، جو اپنی لیاقت اور روحانی ترقّی کی بنا پر اعلیٰ تعلیم دینے کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ جس طرح آجکل کے زمانے میں ہر ایک پروفیسر عام طور پر صرف ایک ہی مضمون پڑھاتا ہے، اسی طرح نالندہ میں بھی اسی اصول کے مطابق مختلف مضامین کے لیے مختلف پروفیسر مقرر تھے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح ٹیکسلا یونیورسٹی میں مختلف فنون کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام تھا، ایسا نالندہ میں نہ تھا۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ جو بھکشو طلبہ یہاں تعلیم پاتے تھے، اُن کا کام زیادہ تر لوگوں کے اندر روحانی روشنی پہنچانا تھا۔ اُن کے سامنے روزی کمانے کا سوال بالکل نہ تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جو تعلیم اس جگہ دی جاتی تھی، وہ اس قدر عمیق تھی کہ بیان سے باہر ہے۔

نالندہ کی یونیورسٹی نو سو سال تک قائم رہی۔ بادشاہ شلادتیہ کے زمانے میں اس کا

سورج خوب چمکا، لیکن اس کے بعد زوال شروع ہو گیا۔ نویں صدی عیسوی میں وہ بالکل نیست و نابود ہو گئی۔

اودانتا پوری یونیورسٹی۔ آٹھویں صدی کے شروع میں جب نالندہ یونیورسٹی کا زوال شروع ہو گیا تھا، بنگال میں اودانتا پوری میں ایک اور یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس کے بانی بنگال کے حکمران گوپال یا لوکپال تھے، جو ۷۳۰ عیسوی میں گدی نشین ہوئے۔ اس یونیورسٹی کا وجود کوئی ساڑھے چار سو سال تک رہا۔ اس میں ہندو اور بدھ مذہب کی اعلیٰ کتب کی ایک مشہور لائبریری تھی، جو ۱۱۹۷ء میں بیرونی حملہ آوروں کی نذر ہو گئی۔

وکرم شیل کی یونیورسٹی۔ بنگال کے حکمران گوپال کے لڑکے دھرم پال نے ۸۰۰ عیسوی میں بہار میں بمقام وکرم شیل ایک اور یونیورسٹی قائم کی۔ یہ یونیورسٹی بھی کوئی چار سو سال تک تانترک بدھ مذہب کا مرکز رہی۔ نالندہ یونیورسٹی کی طرح اس میں بھی طلبا دور دور ممالک سے آکر داخل ہوتے تھے اور اس میں بھی چھے کالج تھے، جن میں مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں سے چار کالجوں میں تو ہر قسم کے طلبہ داخل ہو سکتے تھے، لیکن باقی دو کالجوں میں صرف وہی طلبہ لیے جاتے تھے، جو بدھ مذہب کے باطنی علم و ادب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ طلبہ کے لیے یہاں بھی تعلیم، کھانے اور رہائش کا انتظام مفت تھا۔ ساری تعلیم کا انحصار ملک کے بڑے بڑے شہزادوں اور رؤسا کی علم دوستی پر تھا۔

متھلا اور نودویپ کی یونیورسٹیاں۔ جس طرح ایک زبردست آندھی کے آنے پر بعض اوقات اونچے اونچے درخت اس کے زور کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن کمزور اور لچکدار پودے بچ نکلتے ہیں، اسی طرح جس وقت بنگال میں مسلم حکمرانوں کا عمل در آمد ہوا، تو ہندوؤں کے قدیم مرکزوں کو بہت ضعف پہنچا، لیکن جو چھوٹے چھوٹے دار العلوم تھے، وہ اس زوال سے بچے رہے۔ ان میں متھلا

اور نَودیپ کے دارالعلوم خاص کر قابلِ ذکر ہیں اور دونوں میں سے نودیپ کا رتبہ زیادہ بلند تھا۔ کیونکہ ان دشوار حالات میں بھی اس یونیورسٹی نے بنگال میں بہت سی مشہور ہستیاں پیدا کیں، جن میں رگھناتھ، رگھونندن اور شری چیتنیہ کے نام قابلِ تعظیم ہیں۔ یہاں منطق، سمرتی، جیوتش یا علم ہیئت صرف و نحو اور شعر و شاعری پر تعلیم عالیہ کا انتظام تھا۔ منطق پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔

بنارس اور قنوج کی یونیورسٹیاں جب مسلمان حملہ آور ہندوستان پر قابض ہوئے تو قدرتی طور پر ہندو تہذیب کچھ دیر کے لیے دب گئی، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس میں ایک نئی رَو پیدا ہوئی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں بہت سی ہستیاں پیدا ہوئیں، جنھوں نے ہندو تہذیب اور علم و ادب کی اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اِن مذہبی پیشواؤں میں رامانج آچاریہ، ولبھ آچاریہ، کبیر، سورداس، تلسی داس، نانک اور شری چتینہ کا نام تعظیم سے لیا جاتا ہے۔

اس وقت شمالی ہندوستان میں بنارس اور قنوج اور جنوبی ہند میں وِجے نگر ممتاز تعلیمی مرکز تھے۔ اِن میں بنارس کو اگر ہندو تہذیب کا صدر مقام کہیں، تو بالکل بے جا نہ ہوگا۔ گنگا کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے یہ ہمیشہ ہندوؤں کا مشہور تیرتھ رہا ہے اور اس کے علاوہ سیکڑوں سال تک یہ مقام مذہبی اور دنیاوی تعلیم کا مرکز رہا ہے۔ آئینِ اکبری میں بھی اس کا ذکر آتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں بھی یہ ایک بڑی مشہور ہندو یونیورسٹی تھی۔ آج کل بھی بنارس میں ایک یونیورسٹی قائم ہے، لیکن اس کا پرانی یونیورسٹی سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ جہاں پرانی تعلیم زیادہ تر مذہبی تعلیم ہوتی تھی، آج کل وہاں مغربی علوم و فنون پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ گو پرانے علم و ادب کا بھی چرچا ہے اور یونیورسٹی کا ایک حصّہ اس تعلیم کی طرف بھی متوجہ ہے، لیکن موجودہ بنارس یونیورسٹی کا مقصد زیادہ تر مغربی علوم و فنون کی اشاعت تک محدود ہے۔

(کاپی رائٹ)

فروبل اور حیاتیات

از

عبدالمجید خاں صاحب، بی اے،

(گزشتہ سے پیوستہ)

فروبل کے خیال کے مطابق انسان خلاصۂ موجودات ہے اور یہیں سے نفسیاتی ترقی شروع ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اسفل حیوانات اپنی جبلت کے معین ہونے کی وجہ سے ترقی نہیں کرسکتے، لیکن انسانی جبلت (Instincts.) یا انسان کے جبلی رجحانات اس قدر غیر معین ہیں کہ بے ساختگی اور نئے طریقوں کے لیے ان میں جگہ باقی رہتی ہے۔

پروفیسر رائیس (Professor Royce.) کہتا ہے کہ "دماغ اور شعور رکھنے والے حیوان کے اس رتبے پر، جو اُسے دنیا میں حاصل ہے، ایک نظریہ واضح کردیگی کہ اس کا جسم بھی نئے نئے طریقِ کار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے" اور فروبل کے لیے کھیل کا سب سے بڑا فائدہ اسی کی اسی بے ساختگی میں مضمر ہے۔

اس دور میں کھیل انسانی ترقی کا روشن ترین پہلو ہے، کیونکہ یہ اس چیز کا بیساختہ مظہر ہے، جو داخلی ضرورت تہیج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حالت میں کھیل انسان کا خصوصی وصف اور روحانی انکشاف ہے اور اس کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا آئینہ دار۔

مندرجہ بالا نظریے ایک دوسرے کی تردید کرنے کے بجائے موید ہیں۔ ان کے آپس میں فرق بیان کرنے سے یہ زیادہ ضروری ہے کہ ان کو جائز حدود سے متجاوز نہ ہونے دیا جائے۔ نظریۂ

اعادہ (Theory of Recapitulation.) میں فروبل کی تنبیہ "بچے سے اس طرح سلوک کرنا چاہیے، جیسے اس میں ماضی، حال اور مستقبل سب موجود ہوں" پیشِ نظر رکھنا چاہیے
اسی طرح ڈاکٹر ڈرمنڈ (Dr. Drummond.) کہتا ہے "اگر آپ بچے کو خیمہ اس لیے دینے پر مصر ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ خیمے میں رہا کرتے تھے، تو بیشک دیجیے اور وہ اُسے لے کر خوش بھی ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ہی ٹیلیفون کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے وہ رسّی اور چائے کا خالی ڈبہ بھی لے بھاگیگا۔" ممکن ہے کہ وہ آنکھ مچولی اپنے اجداد کے "شکار اور تعاقب" کے دور کا اعادہ کرنے کے لیے کھیلتا ہو، مگر ہمیں یہ بھی تو بتایا جاتا ہے کہ ورزش اس کے دَورانِ خون اور نشو و نما کے لیے لازمی ہے۔ آج موٹروں کے زمانے میں بھی دوڑ کر اپنی جان بچانا ضروری ہے ممکن ہے باغبانی ہمیں کسی زراعتی دَور کی یاد دلائے، لیکن زمین کھودنا پٹھوں کی بہترین ورزش ہے۔ پودوں کو پانی دینا ایک سائنٹفک تجربہ ہے، جس سے احساسِ قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور پھول تو تاثرات کے جمالیاتی پہلو سے متعلق ہیں۔ گو یہ پہلو بہت جلد نمایاں ہو جاتا ہے، مگر زندگی کے کسی ایک حصّے سے مخصوص نہیں ہوتا۔

فروبل کھیل کو بہت سے اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بچپن کے کھیل کا معتدبہ حصّہ جسمانی طاقتوں کی مشق کے لیے ہے اور اُس کی نوعیت "مقابلے" .Competetion کی ہونی لازمی ہے، کیونکہ بچہ انھیں طاقتوں کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ ۱۸۲۶ء ہی میں وہ نہ صرف شہروں کیلیے کھیل کے میدانوں کی ضرورت پر زور دیتا ہے، بلکہ کھیل کے لیے قائدین کا ہونا بھی ضروری قرار دیتا ہے، تاکہ کھیل میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے۔ لڑکوں کے کھیل میں اُس نے ایسے کھیل بھی شامل کیے ہیں، جن سے حواس کی مشق ہوتی ہے۔ جیسے چھپنے کے کھیل، رنگوں کے کھیل، نشانہ لگانے کے کھیل، جس میں سُننے اور دیکھنے کی مشق ہوتی ہے۔ پھر اُس نے اُن کھیلوں کا تذکرہ بھی کیا ہے

جن میں سوچ بچار اور فیصلہ کی ضرورت محسوس ہو۔ مثلاً ڈرافٹس Draughts وغیرہ۔ ان کو وہ دماغی کھیل کہتا ہے۔ کھیل کی جو قسم فروبل کو سب سے اہم اور لازمی معلوم ہوئی، وہ "تعمیری کھیل" Constructive play ہیں۔ کھیل کا یہ پہلو بہت سی چیزوں پر حاوی ہے۔ کیونکہ ان میں خیالات اور طاقت دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ فروبل کے لیے اس کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ "تعمیر سے، خواہ کتنی ہی سادہ اور ابتدائی کیوں نہ ہو، بچہ اپنی طاقتوں کا علم حاصل کرتا ہے۔ جو بچہ تھوڑا بہت تجربہ حاصل کر چکا ہے، اسے مٹی اور ریت سے کھیلنے سے خوشی ہوتی ہے اور وہ طاقت کے اس احساس کی بنا پر، جو اُسے پہلے حاصل ہو چکا ہے، اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

بچہ جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، اُس کی فوری نقل اُتارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُسے اپنی ذات اور طاقتوں کا اندازہ کرنے کے لیے دوسروں کی طاقتوں سے موازنہ اور مقابلہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حقیقی تجربہ اور عمل ہی سے وہ خیالات پیدا ہوتے ہیں، جس کا اظہار وہ آئندہ چل کر کرتا ہے۔ لہٰذا اپنی دید یا شنید کو دہرانا اُس کے لیے لازمی ہے۔

"اپنے کنبے میں بچہ اپنے والدین اور دوسروں کو کچھ نہ کچھ کرتے دیکھتا رہتا ہے۔ نتیجۃً وہ وہی کچھ کرنا چاہتا ہے، جو وہ دیکھتا ہے۔ اے والدین ہوشیار رہو! اگر تم نے ان کی مدد کو طفلانہ سمجھ کر یا رکاوٹ سمجھ کر رد کر دیا، تو ممکن ہے، تمھاری ایک ہی ضرب یا حرکت سے ان کی پھرتی اور تہیج عمل ضائع ہو جائے، گو ساری عمر کے لیے نہ سہی۔ اس جبلت کو مضبوط کرو اور اسے ترقی دو۔ تمھارے بچہ کو جس چیز کی اب ضرورت ہے، فوراً دے دو۔ اپنے کام میں اس کی مدد اور طاقت کا اضافہ کرو تاکہ اُسے اپنی طاقتوں کا شعور پیدا ہو اور اُن کی حدود کا تعین کر سکے۔"

فروبل کہتا ہے "جوں جوں بچے کا احساسِ طاقت اور شعور خودی بڑھتا جاتا ہے، اسی طرح ایسے ایسے مقبوضات کی ضرورت ہوتی جاتی ہے، جو اُس کے اور صرف اسی کے ہوں۔ اس کی

سلطنت اور مملکت گھر، صحن، جھونپڑی یا باغ کا ایک کونہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے اس ایک ایسے مرکزی نقطے کی اشد ضرورت ہے، جس سے وہ اپنے تمام اعمال اور افعال کو متعلق کر

جوں جوں اس کے خیالات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، بچے کے مقاصد میں بھی توَ ہوتی جاتی ہے اور وہ اس تعاون کی ضرورت کا احساس کرتا ہے جس سے بنی نوع انسان اُ دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس طرح بچے جب مل کر کھیلتے ہیں، تو اُن کے معاشرتی اور تم تاثرات بیدار ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت کا خیال پیدا ہو کر نہ صرف انصاف بلکہ صبر اور ہمدردی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

"جس کمرے کو بھرنا مطلوب ہے، اگر وہ بہت بڑا ہے یا وہ سلطنت جس کا انتظام ہے، بہت وسیع ہے، تو یقیناً وہ کُل جس کو پیدا کرنا ہے، بہت پیچیدہ ہوگا اور ہم خیال اشخاص برادرانہ تعاون کی ضرورت پیش آئیگی"۔ ہم کمرہ تعلیم Education Room. میں داخل ہوتے جہاں سات سے لے کر دس سال تک کے بچے تعمیری مکعب لکڑی کا برادہ، ریت اور جنگل سے لائی ہوئی سبز کائی سے کھیل رہے ہیں۔ جب بچے اپنا اپنا کام ختم کر چکتے ہیں، تو اپنے اپنے اور دو کے کام کو دیکھتے ہیں۔ اور ہر ایک کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ تمام انفرادی کاموں کو کر کے ایک کُل کا جزو بنا دیا جائے"۔ اس طرح ایک بچے کے گاؤں اور دوسرے کے قلعے کے درمیان سڑکیں بنائی جاتی ہیں۔ گتے کا گھر بنانے والا بچہ، کاغذ کی کشتیاں بنانے والے بچے سے مشورہ کرتا ہے، وہی گتے کا گھر پہاڑ کی چوٹی پر قلعے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں جھیل ہے۔ اس میں کشتیاں تیر رہی ہیں۔ سب سے چھوٹا لڑکا پہاڑ اور جھیل کے درمیان اپنی بھیڑ بکریاں چرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور سب کے سب ان چیزوں کے گرد کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں کی محنت کو اطمینان اور خوشی سے دیکھ رہے ہیں۔

اس قسم کے کھیل کی تعلیمی قدر و قیمت کو عہد حاضرہ کی مندرجہ ذیل کتب میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱) فلور گیمز Floor games. مصنفہ مسٹر ویلز Mr. Wells.

(۲) میجک سٹیز Magic cities. مصنفہ مسز نسبٹ Mrs. Nesbit.

(۳) پلے وے Play-way. مصنفہ مسٹر کالڈویل کک Mr. Coldwell Cook.

کسی مشترکہ مقصد کے لیے مل کر کام کرنا صرف چھوٹے چھوٹے بچوں پر ہی موقوف نہیں۔ "وہ دیکھیے بڑی عمر کے بچوں نے نہر پہ ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ اُنھوں نے نہریں، پل اور پشتے بنائے ہیں۔ ہر قدم پر انھیں ایک دوسرے کی سلطنت کی حدود میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ ہر ایک اپنے حقوق کا دوسروں سے مطالبہ کرتا ہے اور خود دوسروں کے حقوق تسلیم کرتا ہے اور ان بڑی بڑی سلطنتوں کے درمیان بڑے بڑے معاہدے ہوتے ہیں۔"

ہر شہر میں بچوں کے لیے کھیل کے وسیع میدان ہونے چاہییں۔ قوم کے لیے اس کے نتائج نہایت شاندار ہوں گے۔ آجکل کھیل مل کر کھیلے جاتے ہیں اور اس سے معاشرتی تاثرات اور قانون کی ضرورت کے احساس کی نشوونما ہوتی ہے۔

اِن کھیلوں میں بچے کی دو مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں۔ اوّل انفرادی اور دوم کسی جماعت کا ممبر ہونے کی۔ اِن دونوں حالتوں میں یقینی اور قابل اعتماد طاقت کا احساس اور اس کی ترقی بچے میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ منصف مزاجی، ضبطِ نفس، وفاداری، بے تعصبی، صبر، حوصلہ..... جملہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کھیل معاشرتی اور اخلاقی اوصاف کو بیدار کر کے بچے کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔

انگلینڈ میں بچوں کے کھیل کو ہمیشہ بنظرِ استحسان دیکھا جاتا رہا ہے اور امریکہ میں بھی

سلطنت اور مملکت گھر، صحن، جھونپڑی یا باغ کا ایک کونہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے اس دوڑ میں ایک ایسے مرکزی نقطے کی اشد ضرورت ہے، جس سے وہ اپنے تمام اعمال اور افعال کو متعلق کر سکے۔

جوں جوں اس کے خیالات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، بچّے کے مقاصد میں بھی توسیع ہوتی جاتی ہے اور وہ اس تعاون کی ضرورت کا احساس کرتا ہے جس سے بنی نوع انسان ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس طرح بچّے جب مل کر کھیلتے ہیں، تو اُن کے معاشرتی اور تمدنی تاثرات بیدار ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت کا خیال پیدا ہو کر نہ صرف جذبۂ انصاف بلکہ صبر اور ہمدردی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

"جس کمرے کو بھرنا مطلوب ہے، اگر وہ بہت بڑا ہے یا وہ سلطنت جس کا انتظام مقصود ہے، بہت وسیع ہے، تو یقیناً وہ کُل جس کو پیدا کرنا ہے، بہت پیچیدہ ہوگا اور ہم خیال اشخاص کے برادرانہ تعاون کی ضرورت پیش آئیگی"۔ ہم کمرۂ تعلیم Education Room. میں داخل ہوتے ہیں، جہاں سات سے لے کر دس سال تک کے بچّے تعمیری مکعب، لکڑی کا برادہ، ریت اور جنگل سے لائی ہوئی سبز کائی سے کھیل رہے ہیں۔ جب بچّے اپنا اپنا کام ختم کر چکتے ہیں، تو اپنے اپنے اور دوسروں کے کام کو دیکھتے ہیں۔ اور "ہر ایک کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ تمام انفرادی کاموں کو یکجا کر کے ایک کُل کا جزو بنا دیا جائے"۔ اس طرح ایک بچّے کے گاؤں اور دوسرے کے قلعے کے درمیان سڑکیں بنائی جاتی ہیں۔ گتّے کا گھر بنانے والا بچہ، کاغذ کی کشتیاں بنانے والے بچّے سے مشورہ کرتا ہے، وہی گتّے کا گھر پہاڑ کی چوٹی پر قلعے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں جھیل ہے۔ اس میں کشتیاں تیر رہی ہیں۔ سب سے چھوٹا لڑکا پہاڑ اور جھیل کے درمیان اپنی بھیڑ بکریاں چرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور سب کے سب ان چیزوں کے گرد کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں کی محنت کو اطمینان اور خوشی سے دیکھ رہے ہیں۔

اس قسم کے کھیل کی تعلیمی قدر و قیمت کو عہد حاضرہ کی مندرجہ ذیل کتب میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱) فلور گیمز Floor games. مصنفہ مسٹر ویلز Mr. Wells.

(۲) میجک سٹیز Magic cities. مصنفہ مسز نسبٹ Mrs. Nesbit.

(۳) پلے وے Play-way. مصنفہ مسٹر کالڈویل کک Mr. Coldwell Cook.

کسی مشترکہ مقصد کے لیے مل کر کام کرنا صرف چھوٹے چھوٹے بچوں پر ہی موقوف نہیں۔ "وہ دیکھیے بڑی عمر کے بچوں نے نہر پہ ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ انھوں نے نہریں، پل اور پشتے بنائے ہیں۔ ہر قدم پر انھیں ایک دوسرے کی سلطنت کی حدود میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ ہر ایک اپنے حقوق کا دوسروں سے مطالبہ کرتا ہے اور خود دوسروں کے حقوق تسلیم کرتا ہے اور ان بڑی بڑی سلطنتوں کے درمیان بڑے بڑے معاہدے ہوتے ہیں۔"

ہر شہر میں بچوں کے لیے کھیل کے وسیع میدان ہونے چاہییں۔ قوم کے لیے اس کے نتائج نہایت شاندار ہونگے۔ آجکل کھیل مل کر کھیلے جاتے ہیں اور اس سے معاشرتی تاثرات اور قانون کی ضرورت کے احساس کی نشوونما ہوتی ہے۔

ان کھیلوں میں بچے کی دو مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں۔ اول انفرادی اور دوم کسی جماعت کا ممبر ہونے کی۔ ان دونوں حالتوں میں یقینی اور قابل اعتماد طاقت کا احساس اور اس کی ترقی بچے میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ "منصف مزاجی، ضبطِ نفس، وفاداری، بے تعصبی، صبر و حوصلہ.... .... جملہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کھیل معاشرتی اور اخلاقی اوصاف کو بیدار رکھ کے بچے کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔

انگلینڈ میں بچوں کے کھیل کو ہمیشہ بنظر استحسان دیکھا جاتا رہا ہے اور امریکہ میں بھی

کھیل کے میدانوں اور کھیل کے قائدوں (Play leaders) کی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ مگر افسوس ہندوستان ابھی اس میں بہت پیچھے ہے۔ فروبل نے دس سال تک ہر عمر کے بچّوں پر تجربہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں کھیل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کیل ہا (Keilhan.) میں ہر قسم کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ فروبل کی تجویز تربیت کا ایک حصّہ یہ بھی تھا کہ ہر شخص بیلچہ اور کدال کو بھی کام میں لائے۔ ہر بچّے کے لیے زمین کا ایک ٹکڑہ وقف تھا، جس کو وُہ جس طرح چاہے کام میں لا سکتا تھا۔ ایبرز (Ebers.) نے جو ادبی ذوق کا دلدادہ تھا، اپنے حصّے میں گھاس بچھا رکھی تھی، جس پر لیٹ کر وُہ پڑھا کرتا تھا اور شعر کہا کرتا تھا۔ لڑکوں نے سٹیج اور پردے خود بنائے تھے اور سردیوں میں ہفتے میں ایک بار ڈرامہ دکھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اسکول میں جلد سازی اور لکڑی کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔

۱۸۲۶ء میں فروبل نے اپنا اسکول جاری کیا اور اس کے پورے سو سال بعد ۱۹۱۷ء میں مسٹر کالڈویل کک (Mr. Coldwell Cook.) نے پلے وے (Play-way.) شائع کی، جس میں اُس نے اپنے ان تجربات کو بیان کیا، جو اُس نے کھیل کو ذریعۂ تعلیم و تربیت بنانے کے لیے کیے۔ وُہ صورتِ حالات بستان الاطفال کے بعد اسکول بے لطف ہے، کیونکہ اس میں کھیل نہیں ہے سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کا خواب ایک ایسا اسکول ہے، جس کو Play-way commonwealth. کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ وُہ جوانوں کی تربیت میں شباب کی روح، تازگی، خوشی اور جوش ——— پھونک دینا چاہتا ہے۔

جغرافیے کی تدریس

از

مرزا مقبول بیگ صاحب، بدخشانی، بی اے،

(گزشتہ سے پیوستہ)

آب وہوا کا استوائی خطہ۔ یہ خطہ خطِ استوا کے دونوں طرف ۵ درجہ شمال اور ۵ درجہ جنوب میں واقع ہے اور تقریباً چھ سو میل چوڑے علاقے پر حاوی ہے۔ اس خطے کی حد یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ دس درجہ شمال اور دس درجہ جنوب تک چلی گئی ہے۔ اس خطے کا صحیح اور کامل نمونہ ایمیزن کی وادی ہے۔ اس کی نباتات مخصوص ہے۔ درخت لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ جنگل ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتے ہیں۔ درجۂ حرارت سال بھر اٹھتّر سے اسّی درجے تک رہتا ہے۔ زیادہ گرم اور زیادہ سرد علاقوں کے درجۂ حرارت کا تفاوت ۵ درجہ فارن ہیٹ سے زائد نہیں ہوتا۔ دن اور رات کے درجۂ حرارت کا فرق بھی کوئی زیادہ نہیں ہوتا۔ بارش بالعموم تمام موسموں میں ہوتی ہے، کوئی بھی موسم خشک نہیں ہوتا۔ موسم سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی غیر معمولی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ صبح صادق کے وقت مطلع عام طور پر غبار آلود ہوتا رہتا ہے۔ آٹھ نو بجے تک یہ دھند صاف ہو جاتی ہے۔ آسمان نکھر جاتا ہے اور سورج چمکنے لگتا ہے۔ دوپہر تک پورے زور کے ساتھ چمکتا ہے۔ عمل تبخیر بڑی تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہوائیں بخارات لے کر اوپر کو اٹھتی رہتی ہیں اور جلد ہی ٹھنڈی ہو کر ہلکے ہلکے ابر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ مینہ شام کے وقت برسنے لگتا ہے، بارش موسلا دھار ہوتی ہے لیکن بہت تھوڑے عرصے کے لیے۔ بجلی بڑے زور کے ساتھ چمکتی اور کڑکتی ہے۔ سورج کی شعاعیں

کھیل کے میدانوں اور کھیل کے قائدوں (Play leaders) کی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ مگر افسوس ہندوستان ابھی اس میں بہت پیچھے ہے۔ فروبل نے دس سال تک ہر عمر کے بچوں پر تجربہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں کھیل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کیل ہا (Keilhan.) میں ہر قسم کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ فروبل کی تجویز تربیت کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ہر شخص بیلچہ اور کدال کو بھی کام میں لائے۔ ہر بچے کے لیے زمین کا ایک ٹکڑہ وقف تھا، جس کو وہ جس طرح چاہے کام میں لاسکتا تھا۔ ایبرز (Ebers.) نے جو ادبی ذوق کا دلدادہ تھا، اپنے حصے میں گھاس بچھا رکھی تھی، جس پر لیٹ کر وہ پڑھا کرتا تھا اور شعر کہا کرتا تھا۔ لڑکوں نے سٹیج اور پردے خود بنائے تھے اور سردیوں میں ہفتے میں ایک بار ڈرامہ دکھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اسکول میں جلد سازی اور لکڑی کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔

۱۸۲۶ء میں فروبل نے اپنا اسکول جاری کیا اور اس کے پورے سو سال بعد ۱۹۱۷ء میں مسٹر کالڈویل کک (Mr. Coldwell Cook) نے پلے وے (Play-way) شائع کی، جس میں اُس نے اپنے ان تجربات کو بیان کیا، جو اُس نے کھیل کو ذریعۂ تعلیم و تربیت بنانے کے لیے کیے۔ وہ صورتِ حالات بستان الاطفال کے بعد اسکول بے لطف ہے، کیونکہ اس میں کھیل نہیں ہے سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کا خواب ایک ایسا اسکول ہے جس کو Play-way commonwealth. کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ وہ جوانوں کی تربیت میں شباب کی روح، تازگی، خوشی اور جوش — پھونک دینا چاہتا ہے۔

جغرافیے کی تدریس

از

مرزا مقبول بیگ صاحب، بدخشانی، بی اے،

(گزشتہ سے پیوستہ)

آب و ہوا کا استوائی خطہ۔ یہ خطہ خطِ استوا کے دونوں طرف ۵ درجہ شمال اور ۵ درجہ جنوب میں واقع ہے اور تقریباً چھ سو میل چوڑے علاقے پر حاوی ہے۔ اس خطے کی حد یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ دس درجہ شمال اور دس درجہ جنوب تک چلی گئی ہے۔ اس خطے کا صحیح اور کامل نمونہ ایمیزن کی وادی ہے۔ اس کی نباتات مخصوص ہے۔ درخت لمبے لمبے ہوتے ہیں جنگل ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتے ہیں۔ درجۂ حرارت سال بھر اٹھتّر سے اسّی درجے تک رہتا ہے۔ زیادہ گرم اور زیادہ سرد علاقوں کے درجۂ حرارت کا تفاوت ۵ درجہ فارن ہیٹ سے زائد نہیں ہوتا۔ دن اور رات کے درجۂ حرارت کا فرق بھی کوئی زیادہ نہیں ہوتا۔ بارش بالعموم تمام موسموں میں ہوتی ہے، کوئی بھی موسم خشک نہیں ہوتا۔ موسم سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی غیر معمولی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ صبح صادق کے وقت مطلع عام طور پر غبار آلود ہوتا رہتا ہے۔ آٹھ نو بجے تک یہ دھند صاف ہو جاتی ہے۔ آسمان نکھر جاتا ہے اور سورج چمکنے لگتا ہے۔ دوپہر تک پورے زور کے ساتھ چمکتا ہے۔ عمل تبخیر بڑی تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہوائیں بخارات لے کر اُوپر کو اُٹھتی رہتی ہیں اور جلد ہی ٹھنڈی ہو کر لکہ ہائے ابر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ عین شام کے وقت برسنے لگتا ہے، بارش موسلا دھار ہوتی ہے لیکن بہت تھوڑے عرصے کے لیے۔ بجلی بڑے زور کے ساتھ چمکتی اور کڑکتی ہے۔ سورج کی شعاعیں

جس وقت عموماً پڑتی ہیں، اس کے کچھ عرصے بعد بارش شروع ہو جاتی ہے اور بڑے زور کی ہوتی ہے
بارش ستر اسی انچ کے اوپر ہو جاتی ہے۔ ان مقامات پر، جو سمندر کے اثرات سے دور ہیں یا جہاں
نمی کی کمی ہے۔ مثلاً کانگو کی وادی کے داخلی حصے وغیرہ میں بارش کم ہوتی ہے۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے
کہ جوں جوں ہم خطِ استوا کے قریب آتے جائیں، گرمی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے
کہ استوائی علاقہ سب سے زیادہ گرم علاقہ ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ وہاں کا اوسط
درجۂ حرارت بڑھا ہوا ہوتا ہے، لیکن استوائی آب و ہوا بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ درجہ حرارت سو درجہ
فارن ہیٹ سے زائد نہیں ہوتا۔ مینہ اور اولوں کی بارش سے موسم میں خنکی رہتی ہے۔ استوائی جنگلات
کے اندرونی حصوں کی آب و ہوا یقیناً خراب ہے، اس لیے کہ وہاں ہوا ساکن رہتی ہے۔ باشندوں
کی صحت اچھی ہے۔ آب و ہوا خوشگوار ہے۔

اِستوائی خطے کی آب و ہوا ہمیشہ گرم مرطوب رہتی ہے، اس لیے نباتات بہت گھنی اور
افراط سے ہوتی ہے۔ وادی ایمیزان میں بڑے بڑے سدا بہار درخت چھائے رہتے ہیں۔ ہر سُو
سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ جنگلوں میں طرح طرح کے درخت ملتے ہیں۔ تنوّع بہت زیادہ ہے۔
ایک ایکڑ رقبۂ زمین میں جس قدر درخت ہوتے ہیں، سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔
شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہوگا کہ اتنے رقبے میں دو درخت ایک ہی قسم کے ہوں۔ درخت لمبے لمبے
ہوتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی وضع کے۔ شاخیں کم ہوتی ہیں اور عریاں۔ پتّے صرف چوٹی
پر ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درخت تاج پہنے ہوئے ہیں۔ بہت گنجان ہوتے ہیں اور
ایک دوسرے کے ساتھ اس صورت میں پیوست ہوتے ہیں کہ سورج کی کرنیں سطح زمین کو چھو نہیں
سکتیں۔ اس قسم کے گھنے جنگلات صرف جنوبی امریکہ میں ملتے ہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے استوائی حصوں
میں جنگلات اتنے گھنے نہیں ہوتے۔ قلیل عرصے کے لیے درختوں کی پت جھڑ بھی ہوتی ہے۔ مختلف

درختوں کی بہت بھرمار کے اوقات مختلف ہیں۔ جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں چونکہ سطح زمین سورج کی روشنی اور حرارت سے ہمیشہ محروم رہتی ہے، اس لیے وہاں چھوٹے چھوٹے پودے نہیں اُگ سکتے۔ درختوں کی جڑیں اور نچلے تنے پتوں اور گھاس پھوس سے ہمیشہ اٹے رہتے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں میں چوڑے چوڑے پتوں والی جڑی بوٹیاں افراط سے اُگتی ہیں۔ گھنے جنگلوں میں صرف وہی جانور رہ سکتے ہیں، جو درختوں پر بسیرا کر سکیں۔ مثلاً بندر، پرندے، زہریلے سانپ، چھپکلی وغیرہ۔ گھنے جنگلوں میں انسانوں کی آبادی خال خال ہے۔ باشندے بہت پس ماندہ ہیں۔ سماجی اور جسمانی حالت رکی رکی سی ہوتی ہے۔ ایمیزن کی امریکن انڈین اقوام اور کانگو کی پست اقوام وہاں کی آبادی کی مثالیں ہیں۔ موخرالذکر اقوام درختوں کی چوٹیوں پر گھر بناتی ہیں اور اس تدبیر سے نم آلود زمین کی مضرتوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ وہ جنگلات اس قدر گھنے نہیں اور جس میں پتے اور گھاس پھوس وغیرہ بھی زیادہ دیر تک نہیں رک سکتا۔ قدرت کی بہت سی حسین نعمتوں سے بہرہ یاب ہیں۔ ان میں آبادی نسبتہً زیادہ ہے۔ لوگ قوی ہیکل اور جفاکش ہیں، لیکن قدرے سست ہیں۔ ملایا اور جاوا کے لوگ مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جنگلوں کے درخت اگر ایک مرتبہ جل جائیں تو ان کی جگہ اور درخت نہیں اُگتے۔ اس لیے اقتصادی ترقی کی راہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ان علاقوں میں خودرو بوٹیاں کثرت سے اُگ آتی ہیں اور فصلوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ گھاس اور خاردار جھاڑیوں سے کھیتوں کو صاف بھی کر دیا جائے، جب بھی وہ اُگ آتی ہیں۔ استوائی جنگلات اگر باقاعدگی کے ساتھ صاف کر لیے جائیں اور فصلیں بوئی جائیں، تو یہ علاقے کافی زرخیز ہیں۔ پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سال میں ایک ہی کھیت سے کئی فصلیں لی جا سکتی ہیں۔ موسموں میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، اس لیے بیج بونے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا۔ کسان جب چاہتا ہے بیج بو دیتا ہے۔ استوائی علاقوں کی بڑی بڑی فصلیں ربڑ، ناریل کا تیل اور کھانڈ پر مشتمل ہیں۔ استوائی

خطّے کے علاقے، شمالی برازیل، وسطی افریقہ، اپرگنی کوسٹ، جزیرہ ملایا پر مشتمل ہیں۔

منطقہ حارہ کی آب و ہوا کا خطّہ۔ یہ خطّہ استوا کے شمال اور جنوب میں خطِ سرطان اور خطِ جدی کے درمیان واقع ہے۔ اس خطّے میں خاص طور پر گھاس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں درخت بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ گرم اور سرد موسموں کے درجۂ حرارت میں بہت نمایاں تفاوت ہے۔ استوا کے آس پاس کے علاقوں میں، جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے گرم اور سرد مہینوں کے درجۂ حرارت کا فرق بہت کم ہوتا ہے، لیکن خشک علاقوں میں یہ تفاوت تیس درجے ہوتا ہے۔ اس خطّے کے بڑے بڑے علاقے استوائی جنگلات میں بھی ہیں اور گرم ریگستانوں میں بھی۔ پہلی قسم کے علاقوں میں بارش ستّر سے اسّی انچ تک ہوتی ہے۔ ریگستان میں اس کا اندازہ پندرہ انچ تک ہے۔ بعض بعض علاقوں میں جہاں نمی بہت زیادہ ہوتی ہے، سال بھر کی بارش کا اندازہ دو سو انچ تک ہے ان علاقوں میں موسم خشک بھی ہوتے ہیں اور تر بھی۔ شمالی کرے میں گرم موسم اپریل اور مئی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد بارش شروع ہو جاتی ہے اور فضا میں خنکی آ جاتی ہے، برسات کے موسم کے آخر میں حرارت کچھ بڑھ جاتی ہے۔ اس کے بعد سردی کا آغاز ہوتا ہے۔ سردی کے موسم میں بارش نہیں ہوتی۔ کثرتِ باراں کی وجہ سے گھاس اُگ آتی ہے۔ درختوں کی نشوونما کے لیے مسلسل نمی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ان علاقوں میں جب موسم خشک ہوتا ہے، تو نمی نہیں رہتی، اس لیے درخت بھی نہیں اُگتے۔ نباتات یہاں مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ خطِ استوا کے آس پاس کے علاقوں کی کیفیت مختلف ہے۔ جہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے اور اس کے باعث نمی بھی خاصی رہتی ہے، وہاں گھنے جنگلات ایسے ہوتے ہیں، جن کے پتے مختلف موسموں میں جھڑ جاتے ہیں۔ پت جھڑ مختلف وقتوں میں ہوتی ہے۔ اس سے آگے ایک مخصوص علاقہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں چراگاہیں بہت ہیں۔ کہیں کہیں درخت بھی نظر آتے ہیں۔ ریگستان کی حدوں پر

نباتات بہت کم ملتی ہے۔ گھاس موٹی ہوتی ہے اور دبی دبی سی رہتی ہے۔ ریگستان میں پہنچ کر تو ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا، نہ گھاس نہ درخت، ریت کا ایک سمندر دکھائی دیتا ہے۔ جس کا نہ یہ کنارہ معلوم نہ وہ۔

خشک علاقوں میں بارش یقینی نہیں۔ خاص خاص موقعوں پر اگر بارش ہو جائے تو فصلیں بھی اچھی ہوتی ہیں، نہ ہو تو فصلیں کھڑے کھڑے خشک ہو جاتی ہیں۔ ایسے ناموافق حالات میں قحط بھی نمودار ہوتا ہے۔

استوائی جنگلات کے حیوانات ۔ ایسے جنگلات میں جانور بالعموم وہ ہوتے ہیں، جو درختوں پر چڑھ سکیں۔ چراگاہوں میں دو قسم کے جانور ملتے ہیں۔ تیز رفتار جانور، جو سبزی وغیرہ کھاتے ہیں۔ مثلاً مرگ اور ہرن وغیرہ۔ دوم درندے، مثلاً شیر اور چیتے وغیرہ، جن کا گزارہ مقدم الذکر جانوروں پر ہوتا ہے۔ چراگاہوں میں لوگوں کا گزارہ اکثر شکار پر ہے، لیکن چونکہ چراگاہوں میں گلے کے گلے جنگلی جانوروں کے ہیں، جو دودھ دیتے ہیں، اس لیے وہاں کے لوگ اُنھیں پالتے ہیں اور زیادہ تر انھیں کے دُودھ مکھن پر گزارہ کرتے ہیں۔ گویا یہاں کا انسان شکاری بھی ہے اور چرواہا بھی۔ اگر کوشش کی جائے، تو یہ چراگاہیں مفید کھیتوں میں بدلی جا سکتی ہیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع نہیں ہیں۔

منطقہ حارہ کی مون سون ہواؤں کا خطہ ۔ مون سون ہواؤں کے خطے کی آب و ہوا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دونوں خطوں میں بارش موسم گرما میں ہوتی ہے۔ سرما کا موسم بالعموم خشک رہتا ہے۔ منطقہ حارہ کے گھاس کے میدانوں میں بارش اس نمی کی وجہ سے ہوتی ہے، جو تجارتی ہوائیں اپنے ساتھ لاتی ہیں، لیکن مون سون ہواؤں کے خطے میں بارش کا سبب اس سے مختلف ہے۔ یہاں موسم گرما میں زمین سخت گرم ہو جاتی ہے۔ دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ ہوائیں ہلکی ہو کر اوپر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت	ا/۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۴/۲ ״
۹۲	״ ״ ״ دوم	۴/۲ ״
۹۳	״ ״ ״ سوم	۷/۲ ״
۹۴	جو مانگو	۳/
۹۵	اسرارِ دل	۵/
۹۶	جارج واشنگٹن . . .	ا/۶ پائی
۹۷	سکاؤٹوں کا بادشاہ . .	ا/۸ ״
۹۸	لوہے کا بادشاہ . . .	ا/۶ ״
۹۹	صابن کا بادشاہ . . .	ا/ا ״
۱۰۰	آزادی کا بادشاہ . . .	ا/۱۱ ״
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت	۲/۶ ״
۱۰۲	چھو منتر	۴/۵ ״
۱۰۳	فرصت کے کام . . .	۳/۴ ״
۱۰۴	دنیا کے کام کاج . . .	۵/۵ ״
۱۰۵	آداب و اخلاق . . .	۱۰/
۱۰۶	موقعہ	۵/۴ ״
۱۰۷	نیک اطوار	۲/
۱۰۸	خوشی کا کھیل	۳/۱۰ ״
۱۰۹	بہادر محمود	ا/۷ ״
۱۱۰	سہراب و رستم . .	۲/۱ ״
۱۱۱	دھوپ چھاؤں . . .	۳/
۱۱۲	راجہ ہریش چندر . .	۲/
۱۱۳	سنہری پرندہ . . .	۲/ا پائی
۱۱۴	گورو کے پانچ بچن . .	ا/۸ ״
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن . . .	ا/۴ ״

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۱۶	تبدیل قسمت	ا/۹ پائی
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳/
۱۱۸	راجہ گوپی چند . . .	ا/۷ ״
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری . .	ا/۶ ״
۱۲۰	بارہ بھائی	ا/۱۰ ״
۱۲۱	مشاہیرِ عالم حصہ اوّل	۳/
۱۲۲	״ ״ ״ دوم	۳/
۱۲۳	״ ״ ״ سوم	۳/

کتب لائبریری

برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	رسوم ہند حصہ اوّل	۶/۲ پائی
۲	״ ״ دوم	۷/۴ ״
۳	تخت سلیمانی	۸/۷ ״
۴	الہ دین چراغ . . .	۶/۴ ״
۵	رامائن کی کہانی	۲/۸ ״
۶	مہابھارت کی کہانی . . .	۶/۵ ״
۷	پیارا گورو نانک	۷/۳ ״
۸	سید انشاء اللہ خاں انشا .	۴/۱ ״
۹	سوانحعمری نواب مرزا خان داغ . .	۲/۴ ״
۱۱	״ نذلہ . . .	۶/۳ ״
	״ میر درد . . .	۴/۴ ״
	״ میر تقی . . .	۵/۵ ״
	״ شبلی . . .	۴/۴ ״
	״ مولانا نذیر احمد مرحوم	۳/۸ ״

سے نمی میں تفاوت ہے، اس لیے نباتات بھی مختلف علاقوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مون سون ہواؤں کا خطہ چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف۔ وہ علاقے جہاں بارش اسی انچ سالانہ سے زائد ہوتی ہے۔ ان میں ہمیشہ لہلہانے والے جنگلات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ استوائی علاقے کے جنگلات بھی یہاں ملتے ہیں۔ ایسے علاقوں میں چاول بہت کاشت کیے جاتے ہیں اور غالباً یہی ایک جنس ہے، جس پر وہاں کے باشندوں کا گزارہ ہے۔ یہاں خشک سالی کا اندیشہ کبھی لاحق نہیں ہوتا۔ البتہ سیلاب کا ڈر ضرور لگا رہتا ہے۔ ان سیلابوں کی ہولناکیوں سے محفوظ رہنے کے لیے تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ ایراودی کا ڈیلٹا اسی غرض کے لیے بنایا گیا ہے۔

ب۔ وہ علاقے جہاں بارش چالیس سے اسی انچ سالانہ تک ہوتی ہے۔ ان علاقوں کے جنگلات کے پتے بعض بعض موسموں میں جھڑ جاتے ہیں۔ درختوں کی پت جھڑ گرم اور خشک موسم میں شروع ہوتی ہے، لیکن ان علاقوں میں گاہے گاہے موسم خشک بھی ہوتے ہیں۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے نہریں وغیرہ بھی نکالی گئی ہیں۔ گنا، جوار اور تیل کے بیج بھی ان علاقوں میں ہوتے ہیں۔

ج۔ وہ علاقے جہاں بارش بیس سے چالیس انچ سالانہ تک ہوتی ہے، ان علاقوں میں خاردار درختوں کے جنگلات ہوتے ہیں۔ مون سون ہواؤں کے خطے کے جنگلات میں ساگوان کے درخت بہت ہوتے ہیں اور بڑی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن اگر بارش کافی نہ ہو، تو یہ درخت نشوونما نہیں پا سکتے اور ان کی جگہ خاردار جھاڑیوں کے جھنڈ پیدا ہوتے ہیں۔ خشک علاقوں میں باجرا پیدا ہوتا ہے اور یہی وہاں کے لوگوں کی خوراک ہے۔ سردیوں میں کہیں کہیں جو اور گندم بھی ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کے سرد خشک علاقوں کے گندم اور بجرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ تیل نکالنے کے بیج اکثر ہوتے ہیں۔ مون سون آب و ہوا کے خطے کے اس خشک علاقے کی مخصوص پیداوار کپاس ہے

اس علاقے کا انحصار مون سون ہواؤں پر ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بے موقع بارش ہونے لگتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضرورت کے موافق بارش نہیں ہوتی ۔ اس لیے کبھی کبھی قحط کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ لوگ عام طور پر قسمت کے شاکر اور قنوطیت پسند ہیں۔ نہروں کی اشد ضرورت ہے۔

د۔ وہ علاقے جہاں بیس انچ سے کم بارش ہوتی ہے۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ ریگستان پر مشتمل ہے۔ اگر آبپاشی کا خاطر خواہ انتظام ہو، تو پیداوار خاصی ہو جاتی ہے۔ ایسے علاقوں کی پیداوار زیرورختی پر مشتمل ہے۔ کہیں کہیں خار دار جھاڑیاں اور شاداب پودے بھی ہوتے ہیں۔

مون سون ہواؤں کے خطے کی نباتات استوائی جنگلات کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ صاف کرلی جاسکتی ہے۔ زمین اگر آسانی سے درست ہو جائے، تو پیداوار کافی ہو سکتی ہے۔ مون سون ہواؤں کا خطہ دنیا کے تمام خطوں سے زیادہ گنجان آباد ہے۔ باشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں۔ یہ لوگ اکثر وہیں پر آباد ہوتے ہیں، جہاں کی زمین زیادہ زرخیز ہو صرف اسی خطے کی آبادی تین کروڑ بیس لاکھ انسانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے نوّے فیصدی کا گزارہ زراعت پر ہے۔ مون سون کی آب و ہوا ہندوستان، برہما، انڈوچائنا اور جنوبی چین میں ہوتی ہے۔ بحر ہند کے اردگرد بالخصوص آسٹریلیا کے شمال مغربی ساحل اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے کچھ حصے کی آب و ہوا بھی ایسی ہی ہے۔ جنوبی امریکہ کے شمال مغربی کنارے کی آب و ہوا پر بھی مون سون کا اثر ہے۔ یہاں بھی مون سون ہوائیں ہی بارش لاتی ہیں۔ مون سون ہواؤں کے علاقوں میں ہندوستان اور جنوبی چین کی آبادی بہت زیادہ گنجان ہے اور اتنی گنجان ہے کہ وہاں کی پیداوار وہاں کے باشندوں کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ فرانسیسی انڈوچائنا، برہما اور سیام کی آبادی بہت کم ہے۔ وہاں کی پیداوار لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ ہندوستان سے برہما اور سیام کو چلے گئے ہیں۔ بہت سے چینی سیام اور انڈوچائنا میں پہنچ گئے ہیں۔ آسٹریلیا کے شمال مغرب

اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر حالات کچھ ہندوستان کی طرح ہیں، اس لیے ہندوستانیوں کی تسخیر کا موجب ہیں۔ شمالی آسٹریلیا میں جہاں آبادی بہت کم ہے، ہندوستان کی سی فصلیں اُگ سکتی ہیں۔ اگر اس وسیع وعریض علاقے کی زراعت کو ترقی نصیب ہوئی، تو ہندوستان کو اس سے بڑے بڑے سبق ملیں گے۔ آسٹریلیا کی خشک زمین میں تیل کے بیج اور Ground-nuts. افراط کے ساتھ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس نوع کی کامیابی کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ بہت سے اسباب مل کر فیصلہ کرتے ہیں کہ ان زمینوں کو کب ترقی ہوگی اور کس کے ہاتھ سے ہوگی۔ البتہ جغرافیہ دان کا یہ فرض ضرور ہے کہ قرائن و آثار سے کسی زمین کا پتہ دے۔

گرم ریگستان کا خطہ۔ گرم ریگستانی خطے منطقہ حارہ سے شمالی اور جنوبی قطبین کی سمت تقریباً بیس درجے اور تیس درجے کے درمیان واقع ہیں۔ خطِ استوا سے ہوائیں گرم ہو کر اُوپر کو اُٹھتی ہیں، جس فضا میں اُنھیں کافی ٹھنڈک پہنچتی ہے، وہاں برس پڑتی ہیں، لیکن اکثر ہوائیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اُنھیں کافی ٹھنڈک نہیں پہنچتی اور وہ اُوپر ہی اُوپر کو اُٹھتی جاتی ہیں، حتیٰ کہ خطِ سرطان اور خطِ جدی پر پہنچ کر نیچے کو آنا شروع ہوتی ہیں۔ یہ گرم ریگستان بالعموم وہیں پر واقع ہیں، جہاں یہ ہوائیں نیچے کی طرف لوٹنا شروع ہوتی ہیں۔ ہوائیں نیچے کو لوٹیں گی، تو ظاہر ہے کہ ان کا دباؤ زیادہ ہوگا۔ ایسے مقامات پر برسات بالکل نہیں ہوتی۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جب ہواؤں کا دباؤ زیادہ ہو، تو ہواؤں میں حرکت زیادہ ہوتی ہے اور حرکت کے سبب حرارت پیدا ہوتی ہے۔ ہوائیں سرد ہونے کی بجائے گرم ہو جاتی ہیں، اس لیے بارش نہیں ہو سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں سطح زمین پر معکوس ہوتی رہتی ہیں، اس لیے زمین فضا کی نسبت زیادہ گرم ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو ہوائیں گرم سطح زمین کی طرف آ رہی ہوں، بارش نہیں لائیں گی۔ گویا یہ خطہ ایسا خوش نصیب نہیں کہ اس میں وہ ہوائیں چلیں جن کے

کی کوشش میں سمندر کے پانی کے بخارات ہوں۔ بارش کی یہ محرومی عام طور پر مغربی علاقوں میں ہوتی ہے۔ مشرقی علاقوں میں جنوب مغربی تجارتی ہوائیں مینہ برسا دیتی ہے۔ ریگستانی علاقوں میں ابر آسمان پر شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سورج اپنی پوری شدت کے ساتھ عریاں زمین پر چمکتا ہے۔ دن بھر زمین تانبے کی طرح جلتی ہے، لیکن دن ڈھلتے ہی سورج کی حرارت زمین سے خارج ہونے لگتی ہے اور رات سے پیشتر ہی کامل طور پر خارج ہو جاتی ہے۔ راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں ——— اور اتنی ہی ٹھنڈی ہوتی ہیں، جتنے کہ دن گرم ہوتے ہیں۔ سورج کی شعاعیں اس خطے پر عموداً پڑتی ہیں۔ گرم موسم اور سرد موسم کے درجہ حرارت میں بہت تفاوت ہوتا ہے۔ بارش نہیں ہوتی کہ درجہ حرارت کو کم کر دے۔ بیشتر صحرا نشیب میں واقع ہیں۔ اگر بلندی پر واقع ہوتے، تو درجہ حرارت یقیناً کم ہوتا۔ حرارت کا بڑے سے بڑا درجہ آپ کو انھیں علاقوں میں ملیگا۔ صحرائے اعظم میں گوبے کا اوسط درجہ حرارت جنوری میں انتالیس درجے ہوتا ہے اور جولائی میں ترانوے درجے۔ گویا زیادہ سے زیادہ گرم اور زیادہ سے زیادہ سرد مہینوں میں تفاوت چوّن درجے کا ہوتا ہے۔

جیکب آباد کا اوسط درجہ حرارت، جو ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے، جنوری میں ستاون درجے ہوتا ہے اور جون میں اٹھانوے درجے۔

(باقی آئندہ)

مدرسے کے بچّوں کو نیک چلن بنانا

(اقتباس از کانفرنس گزٹ علیگڈھ)

(۱) مدرسین کا فرض جس طرح کتابیں پڑھانا ہے، اسی طرح ان کا سب سے بڑا فرض لڑکوں میں نیک عادتیں پیدا کرنا بھی ہے۔

(۲) نیک باتیں بتلانا بہت آسان ہے، مگران باتوں پر کام کر کے دکھلانا بہت مشکل ہے۔

(۳) اگر مدرسین یہ چاہتے ہیں کہ وُہ لڑکوں کو اچھی اچھی باتیں بتلائیں، تو یہ بات سب سے ضروری ہے کہ وہ خود اچھی اچھی باتیں پہلے اپنے میں پیدا کرلیں۔

(۴) جو باتیں لڑکوں کو سکھلانے سے پہلے ان میں پیدا ہونی ضروری ہیں، وہ یہ ہیں۔

(ا) اسکول کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی وُہ حد درجہ کی ایمانداری برتیں۔

(ب) وُہ ہمیشہ اپنے لباس میں اور اپنی عادتوں میں پاک وصاف رہیں۔

(ج) وُہ وقت کے حد درجہ پابند ہوں۔

(د) وُہ غبی، کمزور اور کم چلنے والے لڑکوں سے بہت صبر کے ساتھ پیش آئیں۔ شرمیلے اور جھینپنے والے لڑکوں سے ہمت افزائی کا سلوک کریں اور ہر چھوٹے بڑے سے بہت اخلاق سے پیش آئیں۔

(ہ) لڑکوں کے والدین سے جہاں تک ہوسکے، رواداری کا برتاؤ کریں۔

(و) لڑکوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نہایت درجہ انصاف سے کام لیں۔ اس میں طلبہ

کی بہبودی کا خیال عوام کے دباؤ کے مقابلہ میں زیادہ رکھیں۔

(ز) سزا دینے میں مدرّس اس بات کا خیال رکھیں کہ گالیاں دینے کے بجائے، وہ طلبہ کو ہمت دلا کر، نیکی کے جذبات اُبھار کر اُن کو نیکی کی طرف لائیں۔

(ح) سب سے آخر میں وہ طلبہ سے اتنے ہی کام کر دینے کا مطالبہ کریں، جس کو وہ واقعی طور سے ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے کر سکتے ہیں۔

اب جبکہ مدرسین نے اپنے آپ کو درست کر لیا، تو اب اس کو لڑکوں، بچوں کے چال چلن کے درست کرنے کی طرف قدم بڑھانا چاہیے۔

مگر ایسا کرنے سے پیشتر اس کو طلبہ کی دماغی اور جسمانی کیفیت سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ ہر طالب علم کا مزاج جیسے کہ اس کی شکل ہے، دوسرے لڑکے کے مزاج سے علٰحدہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے چال چلن کو درست کرنے کے واسطے نہایت ضروری ہے کہ ہر طالب علم کے مزاج کی علٰحدہ طریقے سے جانچ پڑتال کی جائے اور بجائے عام قاعدوں کے جاری کر دینے کے بعض بعض صورتوں میں علٰحدہ علٰحدہ ہدایات کی جائیں۔

بڑے لوگوں اور بچوں اور لڑکوں کے مزاج میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کا مزاج ایک حالت پر قائم ہو جاتا ہے اور بچوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ دوسرے بچّے کے بدن کی ساخت اور بڑے آدمی کی ساخت میں فرق یہ ہوتا ہے کہ بچّے کا بدن نرم ہوتا ہے، اس کے پٹھے ملائم ہوتے ہیں، اس کی ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں اور پورے آدمی کی جسمانی حالت اس کے خلاف ہوتی ہے۔

(ا) تو بچّے کا مزاج یا تو سوداوی ہوتا ہے۔ یہ بچّہ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا ہے، جھنجلاتا ہے، روتا جھینکتا ہے، چلّاتا ہے۔ دوسرے لڑکوں کو مارتا ہے۔ تکلیف دیتا ہے۔

ایسے بچے سے اگر نرمی کا برتاؤ کیا گیا، تو وہ بگڑ جائیگا، نرمی اس کے واسطے اچھی ثابت نہ ہوگی۔ بعض دفعہ بُرا بھلا کہہ دینے پر بھی کام نہ چلے گا، ایسے بچے کو جسمانی تکلیف ہی درست کر سکتی ہے۔

(۲) یا بچے کا مزاج صفراوی ہوتا ہے اور یہ کیفیت زیادہ بچوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ایسے بچے ضدی ہوتے ہیں جلد جلد مچل جاتے ہیں، مگر جلد ہی مان بھی جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو نرمی زیادہ فائدہ نہیں دیتی، نہ سخت سزا درست کر سکتی ہے، صرف خاص خاص صورتوں میں زبانی دھمکی کام دے جاتی ہے یا غصے کا اظہار، مدرس کے لال پیلا ہونے پر لڑکا سنبھل جاتا ہے۔

(۳) تیسری قسم کا مزاج بلغمی ہوتا ہے۔ اس مزاج کے بچے کو خاص دیکھ بھال اور حفاظت کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ بچہ اپنے طور پر مدرس کے واسطے اتنا بُرا نہیں ہوتا، مگر ضبط مدرسہ اس کی وجہ سے اکثر خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چونکہ اس مزاج کا بچہ نہایت نرم طبیعت ہوتا ہے دوسرے بچے جو صفراوی یا سوداوی مزاج کے ہوتے ہیں، وہ اس مزاج کے بچے کو برابر چھیڑتے رہتے ہیں اور دق کرتے رہتے ہیں۔ یہ بچہ چونکہ شرمیلے مزاج کا ہوتا ہے۔ دوسروں کی شکایتیں وغیرہ کم کرتا ہے، اس وجہ سے دوسرے لڑکے اور بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ ایسا لڑکا خود کوئی شرارت نہیں کرتا، البتہ دوسروں کو شرارت کا موقع دیتا رہتا ہے۔ دوسرے لڑکے ایسے لڑکے کی جا بیجا شکایت کرتے رہتے ہیں۔ ایسے بچے کے ساتھ نہایت نرمی کے برتاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مار پیٹ نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ بُرا بھلا کہنے سے اس بچے کے جذبات ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر سیدھے طریقے سے اس کو سمجھا دیا جائے، تو مان جاتا ہے۔ اس مزاج کے بچے اکثر صورتوں میں غبی ہوتے ہیں۔ بہت سست ہوتے ہیں، مدرسے کا کام سستی سے نہیں کرتے۔ اپنی جانب نیز دوسروں کی طرف سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ خاص خاص صورتوں میں خود پسند بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لڑکوں سے مدرس کا برتاؤ صبر اور تحمل کا ہونا چاہیے اور اگرچہ اس مزاج کے لڑکے بعض دفعہ دیر میں سنبھلتے ہیں، مگر مدرس کو

مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

(۴) چوتھی مزاجی کیفیت، جو بچوں میں پائی جاتی ہے، وہ دموی کیفیت ہے۔ اس مزاج کا بچہ چست، پھرتیلا، بعض بعض صورتوں میں شرمیلا ہوتا ہے۔ کام میں محنت کرتا ہے۔ تھکن سے نہیں گھبراتا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا ہے۔ تعلیم اور تربیت کے واسطے اس مزاج کا طالب علم بھی بہت عمدہ مصالحہ ہے۔ اگر مدرس نے ایسے مزاج کے طالب علم کی طرف ذرا بھی غفلت کی، تو اس نے لڑکے کو بگاڑا۔ مدرسے کے نام میں بٹہ لگایا اور اپنی کم لیاقتی کا ثبوت دیا۔ ایسے لڑکوں کو بیکار رکھنا، ان کے واسطے بہت بڑا ظلم ہے۔ اگر وہ بیکار رکھے جائیں گے، تو وہ دوسری بیکار باتیں سیکھ لیں گے۔ ایسے مزاج کا لڑکا دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں طاقتور بھی ہوتا ہے تو اگر مدرس صاحب نے ایسے بچے کو نیک کاموں میں نہ لگایا اور بیکار رہنے دیا، تو ایسا بچہ گالیاں دینا سیکھ لیتا ہے۔ مارتا ہے، دوسرے کمزور بچوں کو دق کرتا ہے، پریشان کرتا ہے۔ دوسروں کے آرام کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔

مار توڑ سے ایسا بچہ درست نہیں ہوتا۔ برا بھلا کہنے سے اس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ نرمی کے برتاؤ سے یہ بگڑ جاتا ہے، لہٰذا ایسے بچے کے ساتھ نرمی مفید نہ ہوگی، بلکہ ایسے بچے کی اصلاح صرف ایک طریقے میں ہے، وہ یہ کہ اس کو کبھی بیکار نہ رہنے دیا جائے، جس قدر کام میں اس کو لگایا جائے یہ چمکے گا اور مدرس اور مدرسے کا نام پیدا کریگا۔

(۵) پانچواں مزاج مرکب مزاج کہلاتا ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بچے کا ایک مزاج تو اصلی ہوتا ہے، مگر کبھی کبھی ایک اور مزاج بھی اپنا کام کرنے لگتا ہے۔ مثلاً صفراوی اور دموی کا مرکب، سوداوی اور دموی کا مرکب، صفراوی اور سوداوی کا مرکب مگر اس میں مدرس صاحب کو یہ دیکھنے کی ضرورت رہتی ہے کہ ایک خاص زمانے میں کونسی کیفیت کا غلبہ ہے۔ اسی لحاظ سے

بچے کی درستی کی کوشش کرنی چاہیے۔

اب جبکہ مدرس نے اپنے آپ کو درست کرلیا اور اس کے بعد لڑکوں کی مزاجی کیفیت سے آگاہی حاصل کرکے ان میں سے بری باتوں کو دور کردیا تو اب لڑکے اس قابل ہوگئے کہ ان کو نیک باتیں بتلائی جائیں۔

اب وہ نیک باتیں، جو بچوں کو نیک چلن بنائیں، کیا ہیں؟ وہ صرف چھے ہیں۔

(۱) مہربانی یا سخاوت (۲) ہمت، جرأت (۳) عدل و انصاف (۴) دور اندیشی (۵) اپنے آپ پر قابو رکھنا۔ اور (۶) سچائی

۱۔مہربانی۔ مہربانی، چہرے بشرے سے، زبان سے، مال سے، جان سے دوسروں کے ساتھ سلوک کرنے کا نام ہے۔

اس کی ابتدا ہمدردی سے ہوتی ہے۔ لڑکا جب دوسرے لڑکے کو دکھ میں دیکھتا ہے، تو وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو نیکی کی عادت ڈلوانے کے واسطے سب سے پہلا زینہ یہ ہے کہ پرندوں، چرندوں سے شروع کیا جائے۔ ان سے تکلیف دور کی جائے۔ ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے ان کی حالت درست کی جائے۔ اس کے بعد اپنے عزیز رشتے داروں پر مہربانی کی جائے۔ پھر پڑوسیوں سے سلوک کیا جائے۔ پھر اپنے شہر اور ملک کے ساتھ سلوک کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ پھر تمام مخلوق کی بہبودی کا خیال ذہن میں قائم کیا جائے۔

روزمرہ کے کاروبار میں مہربانی کا سلوک حد درجہ پسند کیا جاتا ہے جماعت کی درستی اسی سے ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مہربانی کرنے والوں کی تعداد ایک ملک میں بہت زیادہ ہو جاتی ہے، تو وہ دوسرے ملکوں پر قبضہ پالیتا ہے، یہانتک کہ پوری دنیا کا مالک ہو جاتا ہے۔

۲۔ہمت، جرأت۔ جب آدمی دوسروں کے ساتھ نیکی کا سلوک کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو

بُرے لوگ اُس کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔اس کا راستہ روکتے ہیں۔اس میں اس کے بدن کو تکلیف پہنچتی ہے۔دماغی تکلیف پہنچتی ہے،ان باتوں کے مقابلہ کرنے کا نام ہمت اور جرأت ہے۔

ہمت اور جواں مردی صرف جسمانی طاقت کا نام نہیں ہے نہ اس بات کا نام ہے کہ آدمی کتنی سختیاں جھیل سکتا ہے،بلکہ جھوٹ،فریب،بزدلی کے مقابلے میں آدمی جو طاقت،اپنی زبان،دل ودماغ اور بدن میں پیدا کرلیتا ہے،اس کو ہمت اور جرأت کہتے ہیں۔ہمت اور جرأت پیدا کرنے کے واسطے ضروری ہے کہ بزدلی دُور کی جائے۔خوف کو دل سے ہٹادیا جائے۔

بچّوں کو خوف دلانے والی باتوں سے دُور دُور رکھا جائے اور بھوتوں کے ڈراؤنے خیالوں کو اُن کے دماغ میں جگہ نہ دی جائے۔

۳۔ **عدل وانصاف**۔بُرائی اور بھلائی کو دماغ میں تولنے اور نیکی پر قائم رہ کر اس کا اعلان کرنا یہ عدل کہلاتا ہے۔آدمی جب نیکی سے واقف ہوگیا اور خوف اس کے دل سے دُور ہوگیا،تو اب وُہ وقت آتا ہے کہ وُہ یہ اعلان کرسکے کہ لوگو،اچھائی اور نیکی یہ ہے اور بُرائی یہ ہے۔اس کو کرو۔اس کو مت کرو۔عدل اور انصاف کی بنا غیر جانب داری پر ہے۔بچّوں کے دل میں یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ جس طرح ان کو دنیا میں نیک چلنی سے رہنے کا حق ہے،اسی طرح دوسروں کو بھی،حق حاصل ہے۔ظلم اور ناانصافی جس طرح ان کو بُری لگتی ہے،دوسروں کو بھی بُری لگتی ہے۔اگر کوئی بُری بات کرے،تو چاہے وُہ اپنا عزیز پیارا ہی کیوں نہ ہو،وُہ انصاف سے دُور ہے اور غیر جانب داری کی مشق پہنچا کر یہ کوشش کرنا چاہیے کہ بچہ یا لڑکا بُرائی دُور کرنے پر آمادہ ہو اور بُرائی جب ہی دُور ہوسکتی ہے،جبکہ وُہ بُرائی کا دشمن ہو جائے اور بُرا کام کرنے والے کو سزا دے یا سزا دلوائے۔

۴۔ **دوراندیشی**۔اس کیفیت کا نام ہے کہ کونسی بات اچھی اور کونسی زیادہ اچھی اور یہ کہ آخر

میں کس بات کا کیا عمدہ نتیجہ نکلیگا، اس کا نام دُور اندیشی ہے۔ گناہ کی لذّت دُور اندیشی پر سب سے موٹا پردہ ہے۔ گناہ حال کا جھوٹا نفع ہے۔ دُور اندیشی ہمیشگی کی بہبودی کا نام ہے۔ دُور اندیشی میں دماغ بُرے کام سے ٹھٹھکتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے۔ مَیں یہ کروں، تو کیا ہو اور ایسا کروں، تو کیا ہو اور یہ کہ کس کام میں واقعی اپنا اور دوسروں کا فائدہ ہے۔

دُور اندیشی کی صفت پیدا کرنے میں اچھے اور بُرے کام کی بھلائی اور بُرائی کی واقفیت کو پہلا دخل ہے واقفیت بھی ہو جائے، تب بھی جب تک نیک اور بد کی تمیز نہ ہوگی، دُور اندیشی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

دُور اندیشی کے منافی جو باتیں ہیں وُہ (۱) جلد بازی ہے۔ جلد بازی سے کتنے کام بگڑ گئے ہیں۔ جلد بازی گناہ کا شیوہ ہے۔ (۲) بہت زیادہ غور اور خوض اور فکر کرنے سے دُور اندیشی کو نقصان پہنچتا ہے اس واسطے کہ دماغ پھر صرف سوچنے کا ہی رہ جاتا ہے۔ (۳) تیسری بات جو دُور اندیشی کے خلاف پڑتی ہے، وہ پوری واقفیت کا نہ ہونا ہے۔ نیک بات اور بد بات میں فرق نہ کرنے سے خرابی لاحق ہوتی ہے (۴) یہ سب بھی ہو، لیکن اگر ایک بُرے کام کرنے کی حجّت اور دلیل ہی غلط ہو اور آدمی اس کو اپنے ذہن میں صحیح قائم کیے ہو، تو دُور اندیشی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ (۵) بُری باتوں پر اڑے رہنے پر بھی دُور اندیشی کا قیام مشکل ہو جاتا ہے۔

دور اندیشی جب ہی ممکن ہے، جبکہ اپنے اوپر قابو بھی ہو۔

۵۔ اپنے اُوپر قابو ہونا۔ انسانی صفات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آدمی اپنے دل و دماغ زبان بدن کو کہاں ٹھیک طور سے لگائے اور کہاں نہ لگائے، یہ اپنے اُوپر قابو پانا کہلاتا ہے۔

بچّے کے اعصاب بے قابو ہوتے ہیں۔ دل و دماغ، زبان سب بے قابو ہوتے ہیں۔ وُہ صحیح راستے پر مدرس ہی کے چلائے سے چل سکتا ہے۔ اس واسطے مدرس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وُہ طالب علم کو اس کے دماغ، دل، زبان اور اعصاب کا صحیح استعمال سکھائے۔ یہ صحیح استعمال سکھانے

کے واسطے ضروری ہے کہ مدرس طلبہ کے ذہن نشین کرا دے کہ ذاتی خوشی حاصل کرنا یہ انسان کا کمال نہیں ہے۔ ذاتی خوشی جو اکثر کھیل سے حاصل ہوتی ہے، اس پر پڑھنے کی تکلیف اٹھانا، جس میں بعد کو خوشی حاصل ہوتی ہے، زیادہ اچھا ہے۔

مستقل خوشی یا دوامی خوشی یہ ہمیشہ فوری خوشی سے اچھی ہوتی ہے۔ ذاتی خوشی چاہے وہ فوری ہو یا دوامی اپنے مقابلے میں دوسروں کو پہنچانا یہ ہر حال میں اچھا ہے اور اپنی ذاتی دوامی خوشی کو دوسروں کی فوری خوشی پر قربان کر دینا یہ انسانی کمال ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ انسان میں سب سے بڑا ملکہ صدق یا سچ کا پایا جائے۔

۱۱۔ سچ۔ سچ کی عادت ڈلوانے کے واسطے ضروری ہے کہ عادت ڈلوانے والا بھی نہایت سچا ہو۔ یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ جھوٹ، فریب، دغل فصل سے پرہیز کیا جائے۔

کوئی کنبہ، کوئی گاؤں، کوئی شہر جھوٹ سے سرسبز نہیں ہوتا ہے کوئی تجارت کبھی جھوٹ سے نہیں بڑھی۔ جھوٹ سے بڑے بڑے ملک غارت ہو گئے ہیں، تو جھوٹ سے بچنے اور دور رہنے کی سب سے پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے الفاظ سچے ہوں۔ ہمارے کام سچے ہوں۔ ایسے الفاظ جو سیدھے اور الٹے معنی رکھتے ہوں، اس کا استعمال کرنا کمزوری ہے۔ مبالغہ کرنا، خلاف واقعہ باتیں کرنا یہ جھوٹ کی ایک قسم ہے

آجکل کے مدرسوں میں جھوٹ کا جیسا چلن ہے، وہ سب پر ظاہر ہے۔ بہانے، دھوکا، فریب یہ بچہ اپنے گھر سے ساتھ لاتا ہے۔ ہوشیار مدرس پہلے بچوں سے یہ باتیں دھو دیں۔ اس کے بعد ان کو سچائی کی طرف لگانا چاہیے۔ ایماندار مدرس کبھی کسی طالب علم کو بے ایمان نہیں سمجھے گا۔ اگر آپ لڑکوں پر اعتبار کریں گے، تو لڑکے بھی بلا وجہ آپ سے جھوٹ نہ بولیں گے۔

انگلستان کے مشہور مدرسے رگبی کا نہایت مشہور ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر آرنلڈ کبھی کسی طالب علم پر جھوٹ کا شبہ نہیں کرتا تھا اس کے زمانے کے طالب علم کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر آرنلڈ سے جھوٹ بولنا بڑے شرم کی بات ہے وہ ہمیشہ ہم کو سچا سمجھتے ہیں

اُردو پڑھنا سکھانے کے ابتدائی مرحلے

از

انور علی صاحب بی اے، (آنرز) بی ٹی، اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس

تحصیل زیرہ (ضلع فیروزپور)

چونکہ طریقِ کار مقصد کے ماتحت ہوتا ہے اور حصولِ مقصد صحیح طریقِ کار پر منحصر، لہٰذا امیابی کے لیے مقصد کی ماہیت معلوم کرنا اور پھر اُس کی روشنی میں طریقِ کار کا تجویز کرنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارا پہلا سوال یہی ہے کہ پڑھنا کیا ہے؟

پڑھنا کیا ہے؟ مقررہ علامات کو مفہوم سے مربوط کر دینا پڑھنا ہے۔ علامات اور مفہوم کا تعلق پیدا ہونے کے کئی مدارج ہیں۔ کسی چیز یا حالت کا تعلق اس چیز یا حالت کے ساتھ بچے کے دماغ میں اس وقت سے شروع ہو جاتا ہے، جبکہ وہ بولنے والے کی آواز کو کسی حالت یا چیز کے ساتھ ربط پاتا ہے۔ مثلاً ماں زبان سے کہتی ہے 'وہ چاند' اور ساتھ ہی آسمان پر رات کو بڑی سی چمکتی وئی چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس عمل سے بچے کے ذہن میں 'لفظ چاند' اور 'چیز چاند' میں تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی عمل بار بار پیش کرنے سے تعلق ایسا پختہ ہو جاتا ہے کہ 'لفظ چاند' کہنے کے ساتھ ی فوراً چاند کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔

پڑھنے میں ابتداءً علامات اور آواز کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور چونکہ آواز کا پہلے ہی کسی چیز حالت کے تصور کے ساتھ ذہن میں تعلق پیدا ہو جاتا ہے یعنی علامات اور مفہوم مربوط ہو جاتے ہیں ں یہی پڑھنا ہے۔ جتنی سُرعت کے ساتھ ذہن علامت سے مفہوم کی طرف منتقل ہو، اُسی قدر پڑھنا

اچھا مانا جاتا ہے۔

پڑھنے کی ابتدا کن علامات سے ہو، بامعنی یا بے معنی سے؟ جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ پڑھنا یا بہ الفاظ دیگر الفاظ اور جملوں سے یا حروف سے؟ ہے ہی نام علامت اور مفہوم کے ربط کا، تو کیوں نہ ہم ابتدا ہی سے ایسی علامات کا پڑھانا شروع کر دیں، جن کا مفہوم بچے سمجھتے ہوں۔ ایسی علامات کیا ہو سکتی ہیں؟ حروف یا الفاظ اور جملے؟ جواب ہوگا۔ یقیناً الفاظ، کیونکہ حروف اس کے لیے بالکل مہمل ہیں۔ اس نے کبھی "الف" کو نہیں دیکھا اور نہیں جانتا کہ "کاف" کس بلا کا نام ہے۔ وہ تو الفاظ جانتا ہے۔ مثلاً پانی، روٹی، بھائی، بہن، ماں باپ وغیرہ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ پانی پیا جاتا ہے۔ روٹی اور ساگ کھائے جاتے ہیں، وغیرہ۔ یعنی وہ الفاظ کو بھی جملوں اور فقروں کی صورت میں زیادہ واضح طور پر سمجھتے ہیں، تو گویا ابتداء ایسے فقرات سے ہوئی یا ایسے الفاظ سے، جن کو بچہ خوب جانتا ہے۔

الفاظ کا انتخاب۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچہ کن کن الفاظ کو اچھی طرح سمجھتا ہے؟ یقیناً ان الفاظ کو جن کا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں بچے کے ماحول اور اس کی طبعی دلچسپیوں کو مدِ نظر رکھنا پڑیگا۔ مثلاً اگر بچہ دیہاتی ہے، تو وہ گائے، بیل، بکری، کھیت، ہل، ساگ، مکئی وغیرہ سے خوب آشنا ہوگا۔ اگر دکاندار کا بچہ ہے، تو وہ دکان، بازار، ترازو وغیرہ سے آشنا ہوگا۔ اگر سپاہی زادہ ہے، تو وردی، پیٹی، چور، تھانے وغیرہ کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھ سکیگا، لیکن ماحول کے علاوہ بچوں کی طبعی دلچسپیاں، جو تقریباً یکساں ہوتی ہیں، الفاظ یا جملوں کے انتخاب میں مدد دے سکتی ہیں، مثلاً قریبی رشتے داروں کے نام جیسے ماں باپ، بھائی بہن وغیرہ۔ پالتو جانوروں کے نام مثلاً گائے، بھینس، بکری وغیرہ۔ کھانے پینے کی چیزوں کے نام، مثلاً پانی، روٹی، ساگ، دال، لڈو، پیڑا، چوری وغیرہ۔ عام پرندوں کے نام مثلاً چڑیا، کوا، طوطا، چیل، مرغی، کبوتر وغیرہ۔

صرف الفاظ شناسی پر اکتفا کیا جائے یا الفاظ کا تجزیہ بھی ضروری ہے؟

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا اچھی طرح اور ہر قسم کے الفاظ پڑھنے کی قابلیت پیدا کرنے کے لیے ہمیں الفاظ شناسی کرنا ہی کافی ہے یا الفاظ کے اجزا یعنی حروف کا سکھانا بھی ضروری ہے۔ بظاہر الفاظ شناسی پر ہی اکتفا کرنا کافی معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے اور سوچا جائے کہ 'کل' کا علم بلند درجہ رکھتا ہے یا 'کل' کا علم ہونے کے بعد اجزا کا علم ہونا بھی، تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ اجزا کا علم ہونا اعلیٰ و ارفع ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ اجزا کا علم بذاتِ خود ضروری ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اجزا کے علم سے 'کل' کا علم زیادہ پختہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ہے، جو موٹر کو بحیثیت 'کل' کے جانتا ہے لیکن اُس کے اجزا سے واقف نہیں، لیکن دوسرا شخص ہے، جو موٹر کو بحیثیت 'کل' کے جاننے کے علاوہ اُس کے اجزا سے بھی واقف ہے۔ مؤخرالذکر یقیناً موٹر کے متعلق زیادہ وسیع اور پختہ واقفیت رکھتا ہے۔

کل کا علم پہلے ہے یا اجزا کا؟ یہاں الفاظ کے تجزیے کی ضرورت محسوس کرتے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اجزا کا علم محض 'کل' کے علم سے ارفع و اعلیٰ ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اجزا کا علم بھی ضروری ہو گیا، تو اجزا ہی سے شروع کر کے کل کی طرف کیوں نہ پہنچا جائے، لیکن جب ہم اپنی روزانہ زندگی پر غور کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ کسی چیز کے متعلق علم حاصل کرنے میں کیا مراحل طے کرنے پڑتے ہیں، تو یہی نظر آتا ہے کہ پہلے ہم کسی چیز کو بحیثیت کل کے جانتے ہیں، پھر اس کے اجزا سے بھی واقف ہونے کے بعد 'کل' کے علم کو زیادہ پختہ اور وسیع کرتے ہیں حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اجزا پر غور کرنے کے بغیر ہی کل کا ٹھیک تصور قائم ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال اس کو واضح کردیگی۔

جب ایک اجنبی شخص ہمارے پاس آتا ہے، تو ہم اس کو سر سے پاؤں تک سرسری نظر سے دیکھتے ہیں، یعنی 'کل' سے شناسائی کی ابتدا کرتے ہیں۔ پھر جب وہ کچھ اور دیر ہمارے پاس ٹھیرتا ہے، تو پھر ہم اُس کے خط و خال، حلیے، قد و قامت، لباس، گفتار و رفتار وغیرہ کی واقفیت

حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب ان اجزا سے واقفیت ہو جاتی ہے، تو ان پر غور کیے بغیر ہی اس شعر کو دیکھتے ہی بحیثیت 'کل' کے پہچان لیتے ہیں۔ عین یہی عالم پڑھنا سیکھنے کا ہے۔

طریق تہجّی ہے کیا؟ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ طریق تہجی ہے کیا؟ حروف کو بذریعہ اعراب جوڑ کر پڑھنے کا نام طریق تہجیّ ہے یعنی اس میں پہلے حروف کا علم ہونا ضروری ہے پھر حروف کو بذریعہ اعراب جوڑنے کے طریقے کو رٹنا پڑتا ہے اور ان بے معنی آوازوں کو ملا کر ایک ایسا مرکب بنایا جاتا ہے جس کی آواز ہرگز ہرگز اُن آوازوں (جن سے وہ لفظ بنتا ہے) کے مجموعے کے برابر نہیں ہوتی۔ مثلاً ہم کہتے ہیں۔ کاف زبر اور بے۔ اور پھر ان آوازوں کو ملا کر ایک آواز 'کَب' پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ کاف، زبر، بے کی آوازوں کا مجموعہ اور 'کَب' کی آواز میں کوئی مساوات نہیں۔ غرض اس طریق کی ابتدا حصول علم کے اصولوں کے خلاف اور اُس کے حروف کی آوازوں کا مجموعہ پیدا شدہ مرکب یعنی لفظ سے زیادہ ہے یعنی ہجے اور لفظ میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی خصوصاً بچوں کے لیے اس کا سمجھنا نہایت مشکل ہے۔

تو پھر الفاظ کے اجزا کو کیسے سکھایا جائے؟ طریق تہجّی تو بچوں کے لیے نہایت ناقص اور مشکل ثابت ہوا۔ پھر کس طرح الفاظ کے اجزا کو سکھایا جائے۔ اس کا حل اُس مثال سے ملیگا، جو ہم پہلے کسی شخص کو پہچاننے کے متعلق بیان کر آئے ہیں۔ جب ہم اس شخص پر بحیثیت 'کُل' کے نظر ڈال چکے تھے، تو پھر ہم نے اس کے اجزا یعنی خط و خال، آنکھ ناک، رنگ روپ، قدوقامت وغیرہ کے متعلق واقفیت پیدا کی تھی۔ اسی طرح ہم لفظ کو بحیثیت 'کُل' کے پہچاننے کے بعد اس کے اجزا مثلاً باپ میں 'با' اور 'پ' کی جو آواز لفظ باپ میں آتی ہے، اُس پر غور کریں گے۔ جس طرح اُس کی کل شخصیت اس کے خط و خال کو یاد رکھنے میں مُمد ہے۔ اُسی طرح کل لفظ باپ جس کو بچہ با آسانی ہونے کی وجہ سے یاد رکھ سکتا ہے، کی مدد سے اُس کے بے معنی جز یعنی 'پ' (صوت جو باپ میں ہے) کو ذہن نشین کر لیتا ہے۔ غرضیکہ الفاظ کے اجزا الفاظ کی مدد سے اور اسی صورت میں جیسا کہ وُہ

ان الفاظ میں آواز پیدا کرتے ہیں، آسانی سے اور مؤثر طریقے سے سکھائے جاسکتے ہیں۔

اعراب اور حروفِ علت کی اہمیت اور کیسے سکھائے جائیں؟ اردو پڑھنے میں اعراب اور حروف علت خاص اہمیت رکھتے ہیں، لیکن یہ ہیں کیا؟ محض منہ کی حرکات کی نشانیاں ہیں اور بس۔ ان کی اپنی آواز کوئی نہیں۔ زبر اور الف دونوں بھائی ہیں، جو کوئی آواز پیدا کرنے کے وقت منہ کو کھولتے ہیں۔ پیش اور واؤ دونوں بھائی ہیں، جو منہ کو گول کرتے ہیں۔ زیر اور یا دو بھائی بہن ہیں، جو منہ کو قدرے چوڑا کرتے ہیں۔ الف، واؤ، یا جب کسی لفظ یا لفظ کے کسی جزو کے شروع میں ہوں، تو یہ حرکات کا کام نہیں کرتے، اس وقت یہ اپنی آوازیں بذاتِ خود پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً 'وہ' میں 'واؤ' صرف منہ گول نہیں کرتا، بلکہ اپنی آواز بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح 'یاؤ' میں 'یا' اپنی آواز پیدا کرتی ہے۔ 'اب' میں 'الف' اپنی آواز رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کو حروفِ علت یا اعراب کا بھائی نہ سمجھا جائے، بلکہ بذاتِ خود اصوات کی طرح پڑھا جائے۔

ہم اکثر بآواز پڑھتے ہیں یا خاموش؟ جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ پڑھنے کا تعلق اصل میں فہم سے ہے نہ کہ آواز سے۔ اس لیے جب ہم پڑھنے کی دقتوں پر حاوی ہو جاتے ہیں، تو اکثر خاموش مطالعہ ہی کرتے ہیں، اس سے دو فائدے ہیں۔ ایک وقت کی بچت، دوسرے فہم میں آسانی اور وضاحت، اس لیے ابتدا ہی سے اردو پڑھنے کے اسباق میں خاموش مطالعے کا عنصر رکھ دینا چاہیے۔ ایسے فقرات ہوں، جن کو پڑھیں اور عمل کریں۔ مثلاً: جاؤ، آؤ، بیٹھو، اٹھو وغیرہ وغیرہ۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بچے ابتدا ہی سے الفاظ کو محض آواز میں تبدیل کرنا ہی نہیں سیکھیں گے، بلکہ الفاظ کو مطلب میں تبدیل کرنا جان جائیں گے۔

عملی کام سبق کو مؤثر اور دلچسپ بناتا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ بچے عملی کام کرنا بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم اردو پڑھانے کے اسباق میں ایسے اسباق

بھی رکھ دیں کہ لڑکے لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق جملے قینچی سے کاٹیں چسپاں کریں، کسی لفظ یا جملے پر نشان کریں یا کسی تصویر میں رنگ بھریں، تو بہتر ہو۔

خلاصہ۔ الغرض ہمارا اُردو پڑھانے کا قاعدہ ایسا ہونا چاہیے:۔

(۱) جو ابتدا ہی سے فہم سے تعلق رکھے۔

(۲) جو طلبہ کے معلوم ذخیرۂ الفاظ پر مبنی ہو۔

(۳) جو کل سے ابتدا کرے اور اخیر پر خاطر خواہ توجہ اور وقت دے کر کل کی طرف لائے۔ اجزا اصوات کی صورت میں ہوں۔

(۴) جس میں خاموش مطالعے کا عنصر ہو اور طلبہ کو عملی کام کا موقع دیتا ہو۔

(۵) جو بچے میں پڑھنے کا شوق پیدا کرے، نہ کہ نفرت۔

تناسخ

از

مسوخ صاحب

کہتے ہیں دُنیا کرم جگ ہے اور ہر شخص اپنے کیے کا پھل پاتا ہے۔ نیکی کرو، نیکی ملتی ہے۔ بدی کرو، بدی ملتی ہے۔ گیہوں ڈالو، گیہوں کاٹو، جَو ڈالو، جَو کاٹو، ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن شاید ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیکی کرو اس جنم میں اور بدلہ ملے، دوسرے جنم میں۔ گیہوں ڈالو اس فصل میں اور گیہوں کاٹو دوسری فصل میں۔ جو کچھ بھی ہو، ہم ان باتوں کا قائل نہیں۔ یہ ہم پر خواہ مخواہ کا خوف طاری کرنے کے طریقے ہیں، جو میرا جی چاہتا ہے، کرتا ہوں اور جی جو کچھ چاہیگا، کرتا رہونگا۔ یہ تو ہے میرا عقیدہ، لیکن ایک پیچ ایسا پڑ گیا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور گرہ ایک ایسی پڑی ہوئی ہے کہ میرے عقل کے ناخن اسے کھول نہیں سکتے۔

وہ بھی سُنیے۔

کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ مَیں اس سے پہلے بھی ایک موسم حیات کے لیے اس باغ جہاں میں کھل چکا ہوں۔ بہت سی باتیں پچھلے جنم کی یاد آتی ہیں اور تماشے کی بات یہ ہے کہ جب ان کی تصدیق بڑے بوڑھوں سے کرتا ہوں، تو وہ بالکل پوری اُترتی ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ ایک جنم کے کیے کی جزا اور سزا دوسرے جنم میں ملتی ہے، تو اُس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مجرم کو اپنی فردِ جرم سے آگاہی ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ مَیں ایسا ہی مجرم ہوں، جسے اپنی فردِ جرم یاد ہے۔ فردِ جرم کیا ہے، اپنی زندگی کے حالات یاد ہیں۔ کچھ کچھ بہت واضح طور پر اور کچھ کچھ بہت دھندلے اور کچھ بالکل بھولے ہوئے خواب کی طرح۔ مثلاً مجھے یہ یاد نہیں کہ میرا بچپن کہاں اور کس طرح

گزرا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک گاؤں تھا۔ ہم بہت سے بہن بھائی تھے۔ بہت بوڑھے اور ماں باپ تھے۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں بہت تنگی رہتی تھی۔ پولیس اور کچہری کا ہم پر بہت رعب تھا۔ دو چار بھائی بند سزا بھی پا گئے تھے اور جانے کیا کیا۔ پھر یہ یاد ہے کہ میں یہاں کالج والج میں پڑھتا رہا اور شاید ولایت بھی پڑھنے کے لیے گیا۔ وہاں کیا کچھ پڑھا اس کا ایک حرف یاد نہیں اور شاید اُس وقت بھی یاد نہ تھا۔ پھر لوٹ کر ہندوستان آیا۔ بیرسٹری بھی پاس کی تھی۔ یہاں کچہری میں بھی آنا جانا تھا، لیکن شاید کچھ ملتا ملاتا نہیں تھا۔ پھر میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گیا۔ اب یہ یاد نہیں کہ کیا کیا عہدے مجھے ملے لیکن آخر میں میں مدرسوں کا انسپکٹر ہو گیا تھا۔ پورے پانچ ضلعے اور چوبیس تحصیلیں میرے زیرنگیں تھیں۔ انگریزی کے ہائی اسکول، تحصیلی اسکول، دیہاتی مدارس سب کا میں حاکم بنا۔

خدا جانے انسپکٹر کے فرائض اس وقت کیا کیا تھے۔ مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میں اپنے آپ کو مدرسوں کے لیے وہی سمجھتا تھا، جو سپرنٹنڈنٹ پولیس جرائم پیشہ آبادی کے لیے ہوتا ہے۔ پولیس کا مقصد یہ نہیں کہ ارتکاب جرائم بند کر دیں، بلکہ منشا یہ تھا کہ ارتکاب جرم کے بعد مجرم کو مجسٹریٹ سے سزا دلوا دیں۔ اسی طرح میں مدارس میں اس غرض کے لیے نہ جاتا تھا کہ مدرسین کی رہنمائی کروں۔ ان کی مشکلات کو سوچوں اور سمجھوں۔ اُن کی دشواریوں میں اُن کی مدد کروں۔ انھیں نئے نئے طریقہ ہائے تدریس سے آگاہ کروں۔ اُن کے دل میں اپنی مثال سے جوشِ عمل پیدا کروں۔ میں تو اس لیے مدارس کا معائنہ کیا کرتا تھا کہ اپنے اقتدار اور اقبال کا مظاہرہ کروں اور مسلمہ قواعد کی خلاف ورزی نہ ہونے دوں۔ بہرحال یہ بحث طویل ہے کہ انسپکٹر کی حیثیت سے مجھے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہ کرنا چاہیے تھا۔ میں اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتا۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں خود کیا کیا کرتا تھا۔

موسم سرما کا بڑا حصہ شروع ہوا۔ میں نے اپنا پروگرام مرتب کیا۔ اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ جہاں جہاں شکار وافر ہے اور جہاں جہاں کارگزار ماتحت عملہ اچھا انتظام کر سکتا ہے، وہاں قیام اور مقامات زیادہ رکھے جائیں۔ سرکاری کاغذات تو میری پیشی کے منشی اور متصدی خود ہی رکھ لیتے تھے۔ میں تو صرف اپنی بندوقوں وغیرہ کا خیال خود کرتا تھا۔ تعلیم اور تدریس کے متعلق تازہ معلومات اور کتابوں کی مجھے فکر نہ ہوتی تھی۔ میں دورے پر اس لیے تھوڑا ہی جاتا تھا کہ کوئی تعلیمی اصلاح برپا کروں۔ میں تو اس لیے جاتا تھا کہ کچھ سیر و شکار ہو جائے اور ضمناً فرائض منصبی کی ادائگی یعنی ہر طرح تعلیمی اور تدریسی دُنیا میں امن و امان قائم رہے۔

کشن پور کے تحصیلی مدرسے کے معائنے کے لیے کوئی دو یا ڈھائی بجے کے قریب پہنچا ہونگا۔ دوپہر گزر چکی تھی۔ سوکھے سوکھے مدرسین نے میرا استقبال سڑک کے پاس سواری سے اُترتے ہی کیا۔ سڑک کا راستہ جھنڈیوں وغیرہ سے آراستہ تھا۔ عمارت کے سامنے ٹھیک وسط میں ایک دروازہ کھڑا کیا گیا تھا۔ اس پر خوش آمدید اور میری جان کی صحت و سلامتی کی دعائیں تھیں۔ جیسے میں کسی نرغے ہی میں تو پھنسا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے ناگوار گزری۔ کبھی کبھی مجھے سلام پر بھی غصہ آجاتا تھا۔

مدرسے کے احاطے میں گھوما، اس کا معائنہ کیا۔ صفائی بہت اچھی تھی۔ مدرس بہت کارگزار معلوم ہوتا تھا۔ پھر مدرسے کی عمارت میں داخل ہوا۔ سالانہ صفائی اور سفیدی کے بعد بارش ہو چکی تھی، لیکن شاید ہیڈ ماسٹر نے قصبے کے لڑکے لگا کر میری آمد کے سلسلے میں پھر سفیدی کرا دی تھی۔ تمام اسکول بہت صاف تھا۔ میں ایک ایک کونے میں ڈھونڈتا پھرا کہ کہیں تو کوئی جالا نظر آجائے، لیکن یہ مدرسہ تو جالوں سے بالکل پاک و صاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو مدرس اپنے اسکول کی عمارت میں مکڑی کے جالے صاف نہیں کراتے، اُن کے دماغ میں بھی حماقت کے جالے لگے رہتے ہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے میں چل پھر کر کلاسوں میں تدریس، دفتر کے کاغذات، امتحان کے

نتائج اور ایسی ہر بات کا معائنہ اور محاسبہ کر لیا اور پھر میں برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ تمام مدارس اپنی اپنی جماعتوں کو لیے ہوئے کھیل کے میدان میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ جسمانی ورزش دکھائی اور سب نے مجھے سلامی دی۔ غرضیکہ کچھ کم ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اس مزخرفات سے فارغ ہو کر ڈاک بنگلے پر آگیا۔

دوسرے روز شکار کھیلا اور تیسرے دن علی الصباح ایک دوسرے مقام پر پہنچا، جہاں جلسہ تقسیم انعامات کرنا تھا۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا اسکول تھا۔ یہاں کا ہیڈ ماسٹر نہایت محنتی اور کارگزار آدمی ہے۔ ترقی کی فکر میں ہے۔ اس معائنہ اور مقام کی رپورٹ ایک اخبار میں بھیجی گئی تھی، وہ کم و بیش یہ تھی:-

"مورخہ تاریخ ماہ ــــ۔ اسکول ہذا علی الصباح ہی آراستہ پیراستہ کیا گیا تھا اور بموجب عام اطلاع لوگ بارہ بجے سے ہی جوق در جوق آنے شروع ہو گئے تھے حتیٰ کہ تین بجے تک ہزاروں کی تعداد میں مرد و زن مدرسے کے صحن، چھت اور دیگر ملحقہ مکانوں کی چھت پر نہایت قرینے سے جمع ہو گئے تھے۔ مسٹر...... ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب ضلع... و... اور مسٹر.... صاحب اے، ڈی، آئی، فار پی ٹی اور شیخ..... صاحب اے، ڈی، آئی صاحب علاقہ شمولیت جلسے کے لیے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تشریف لائے۔

جناب.... ایسکوائر، پی، ای، ایس انسپکٹر مدارس ڈویژن.... جنھوں نے اس جلسے کی صدارت قبول فرمائی تھی، پونے تین بجے بموجب پروگرام اسکول ہذا کے زراعتی فارم میں پہنچے۔ فارم بھی اپنی آراستگی میں پیچھے نہ تھا۔ صاحب بہادر نے ہر ایک پلاٹ کو بغور دیکھا۔ بعد معائنہ ریمارک کیا۔ یہ فارم نہایت اچھا ہے۔ نیز مشورہ دیا کہ نمونے کا پلاٹ بھی اضافہ کیا جائے۔ اس کے بعد دیہاتی کلب کی کبڈی کے میچ کو ملاحظہ فرما کر زمیندار لوگوں کی ایسے کھیلوں میں رغبت

دیکھ کر خوش ہُوے۔ پورے تین بجے اسکول میں تشریف لائے۔ بعدازاں پہلی جماعت کا عجائب گھر، پبلک لائبریری، دستکاری، جوتی بنانا، ریڈ کراس سوسائٹی کا کام اور خوشخطی کے چارٹ، اسکول کے اعلیٰ نتائج اور حاضری و تعداد کے گراف۔ صحت کے متعلق وزن قد وغیرہ کے چارٹ ملاحظہ فرمائے۔ اخیر میں دیہاتی سائنس کا کمرہ ملاحظہ کر کے خوش ہُوے۔ جس میں نمونے کے عمدہ عمدہ بیج، حفظانِ صحت کے اصول اور مختصر سا عجائب گھر دیکھ کر نہایت محظوظ ہُوے۔

سوا تین بجے ممدوح نے کرسیِ صدارت کو زینت بخشی اور مندرجۂ ذیل کارروائی عمل میں آئی۔

(۱) سب سے پہلے طلبۂ مدرسہ نے دعائیہ نظم ہارمونیم باجے کے ساتھ گائی۔

(۲) ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسکول کی تعلیمی، اخلاقی ترقی پر اظہار خیال کیا۔

(۳) تقسیم انعامات، صاحب بہادر نے اپنے دستِ مبارک سے مستحق طلبہ کو انعامات تقسیم کیے۔

(۴) صاحبِ صدر کی تقریر، صاحب بہادر نے ایک برجستہ تقریر میں موجودہ تعلیم کا مقصد واضح کیا اور فرمایا کہ تعلیم حصولِ ملازمت کا وسیلہ بھی ہے اور اپنی زندگی کو عیش سے گزارنے کا بھی۔ صاحب ممدوح نے تمام اسکول کی کارروائی کو سراہا اور حسنِ کارکردگی کی داد دیتے ہُوے لاگ بُک میں نہایت اعلیٰ ریمارک درج فرمائے۔"

جلسہ ختم ہوگیا۔ دوسرے دن میں اپنے صدر دفتر آگیا۔ اب بھولے بسرے واقعات یا خواب کہاں تک دہراؤں۔ یوں ہی زندگی گزرتی رہی، سال گزرتے رہے اور ایک دن پنشن لینے سے پہلے ہی میں بھی اس دنیا سے گزر گیا۔

اب اس جنم میں مدرس ہوں اور انسپکٹر صاحب کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نظر سے غالباً میرے علاقے کے مدرسین مجھے میری مدرسی کے دَور میں دیکھتے ہونگے۔

تبصرہ

ہمیں "جارج ششم" کے عنوان سے ایک کتاب بغرض تبصرہ موصول ہوئی ہے۔ یہ ہمارے بادشاہ البرٹ فریڈرک آرتھر جارج ششم کی مختصر سی سوانح حیات ہے۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ مؤلف نے خود ہی اس کو اُردو میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ بعض بعض جگہ ترجمے کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب اُردو میں لکھی جائے اور اس میں انگریزی کا رنگ غالب ہو تو اجنبیت سی آجاتی ہے۔ مثلاً صفحہ ستائیس پر لکھا ہے "ہز رائل ہائی نس کا ایک اور اپریشن ہونا چاہیے" بعض ڈاکٹروں نے خیال ظاہر کیا۔ یہ فقرہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس انداز سے اُردو میں اپنایا جا سکتا تھا کہ مطلب میں بھی فرق نہ آئے اور بچوں کے فہم پر بھی بار نہ ہو۔ ہماری رائے میں یہ فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا:-

"بعض ڈاکٹروں نے خیال ظاہر کیا کہ ہز رائل ہائی نس کا ایک اور اپریشن ہونا چاہیے"۔

لفظی ترجمہ کرتے ہوئے بعض جگہ عبارت مغلق اور پیچیدہ ہو گئی ہے۔ صفحہ پندرہ پر لکھا ہے "ایک خوبصورت لڑکا ایک خوبصورت لڑکی کی طرف بیگناہ عمر کی تمام تر معصومیت اور ملاطفت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔" اسی قسم کے اور کئی فقرے ہیں، جن میں اندازِ بیان کچھ اُلجھا ہوا ہے۔ بیشتر الفاظ اور ترکیبیں تشریح کی محتاج تھیں۔ اگر حاشیہ میں اس کے متعلق نوٹ چڑھا دیے جاتے، تو بچوں کے لیے مفید ہوتا۔ مثلاً رائفل، رینج، کیمپ فائر، اقتصادیات، مدنیات وغیرہم۔

ہمیں اُمید ہے کہ دوسری اشاعت میں مؤلف متذکرہ امور کا خیال رکھیں گے۔ بہرحال کتاب دلچسپ ہے اور بچوں کے لیے معلومات سے پُر ہے۔ اس میں بادشاہ معظم کی زندگی کے

سچے حالات بے کم و کاست لکھے گئے ہیں۔ ہم ہر بچے کے مطالعے کے لیے اس کتاب کو ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ کتاب ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ لکھائی، چھپائی عمدہ ہے، کاغذ اچھا اور ٹائٹل خوبصورت ہے۔ تصویروں نے کتاب کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ دی ینگ پیپل پبلشنگ بیورو، لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ قیمت ۱۲ آنے ہے۔

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۳) | اگست ۱۹۳۷ء | نمبر (۵)

فہرست مضامین

اڈیٹوریل

چند روز کی بات ہے کہ اخباروں میں ایک نہایت ہی المناک واقعے کے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا اور حقیقت میں ایسے واقعات کچھ اس نوع کے ہیں کہ اگر ایک صدی میں ایک مرتبہ بھی ایسا ہو جائے، تو پوری ایک صدی اس پر رویا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک فرض شناس مدرس نے ایک طالب علم کی لاپروائی سے تنگ آ کر اُسے سبق یاد کرنے کی تلقین کی اور اس تلقین کو موثر بنانے کے لیے اس بچے کو دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ، اُستاد کا خوف، سزا کی تکلیف، بتدریج بچے کے جسم اور مزاج پر اثر کرتی گئی۔ ایک، ڈیڑھ گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہنے کے باعث بچہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اس بیہوشی سے پھر نجات نہ پائی، چند گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد مر گیا۔ اس سے چند سال قبل بھی ایک حادثہ اسی نوع کا ہو گیا تھا۔ اجمالاً وہ واقعہ یہ ہے۔ ایک غبی طالب علم کو تادیب کے لیے استاد نے ایک کوٹھری میں، جس میں مدرسے کا ٹوٹا پھوٹا اسباب پڑا رہتا تھا، بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکے نے چیخنا چلّانا شروع کیا۔ ماسٹر صاحب، سانپ! ماسٹر صاحب، سانپ! کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم جماعت لڑکے بعض ہنسے، بعض خائف ہوئے۔ ماسٹر صاحب نے نہایت بے پروائی سے طالب علم کی چالاکی پر محمول کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رونے دھونے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ ادھر گھنٹہ بھی ختم ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ لڑکا بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے لیے دوڑ بھاگ شروع ہوئی، لیکن کوبرا سانپ کا زہر اثر کر چکا تھا۔ شام سے پہلے پہلے سبق یاد کرنے کی تکلیف اور مدرس کے خوف سے وہ لڑکا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا۔

ایسے واقعات اگرچہ لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں، لیکن مدرسین کے لیے یہ ایک اہم مسئلہ پیش کرتے ہیں، یعنی ایک اُستاد کو کس حد تک اپنے طلبا کو جسمانی سزا دینے کا حق ہے اور محدود حق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہاں تک جائز ہے کہ کسی بچے کو کسی جرم کی جسمانی سزا دی جائے۔

میرا مقصد سررشتۂ تعلیم کے احکامات کا اعادہ کرنا نہیں۔ میں تو صرف ایک مدرس کی حیثیت سے اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر جماعت میں چند طلبہ قدرۃً غبی ہوتے ہیں اور چند نکمے اور بیکار جنھیں محنت، غور و خوض اور کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہوتی۔ مدرس کے سامنے چالیس کے قریب طلبا ہوتے ہیں۔ وہ چند کی خاطر زیادہ کی تدریس میں نقص انداز نہیں ہونا چاہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غبی روز بروز غبی تر ہوتے جاتے ہیں اور کام چور روز بروز زیادہ سست اور کاہل۔ اصول تدریس یہ چاہتے ہیں کہ مدرس تدریس کے دوران میں ان طلبہ پر بھی نظر رکھے اور انھیں اُن کی بساط اور مزاج کے مطابق معلومات دے کر اُوپر اُبھارے۔ مدرس کا یہ کام نہیں کہ زجر و توبیخ اور زدوکوب کرے اور بس ؏

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

میرے اس بیان کو پڑھ کر اکثر احباب یہ سمجھیں گے کہ حضرت نے کبھی مدرسے میں پڑھایا نہیں ہے اسی لیے یہ میٹھی میٹھی باتیں بنا رہے ہیں۔ کبھی مدرسے میں پڑھائیں، غبی لڑکے سے واسطہ پڑے، تو پھر ہم دیکھیں کہ یہ بلند آہنگ اصول کب تک قائم رہتے ہیں، لیکن میں مدرسے کی تدریس کا شرف بھی رکھتا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ کوئی لڑکا بھی ایسا نہیں ہوتا، جسے مار پیٹ کے بغیر راہ پر نہ لگایا جا سکے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ اُستاد اس بات کا عہد کر لے کہ میں اپنی انتہائی کوشش کمزور اور کام چور طلبہ کی اصلاح پر صرف کر دوں گا۔

۳

ایک بار دو قیدی قید خانے کے دروازے پر کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ نہایت زور کی بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا۔ چاند اور تاروں کی روشنی میں قید خانے کے باہر کی کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک نظر آ رہی تھی۔ ایک پہرے دار گھومتا پھرتا دروازے کے پاس آ پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے قیدیوں سے پوچھنے لگا: "کیا دیکھ رہے ہو؟" ایک قیدی بولا: "دیکھو چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتی ہے"۔ دوسرے نے کہا: "ستارے کیسے چمک رہے ہیں! کیا ٹھنڈے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ مدرسی ایک قید ہے۔ بے حد ناگوار۔ مدرسوں کے اختیارات محدود ہیں، یعنی، وہ اقتصادی، سماجی اور تدریسی قید خانے میں ہیں، لیکن یہ کیا فرض ہے کہ ہمیں پہلے قیدی کی طرح سڑک کی کیچڑ ہی نظر آئے اور آسمان کے تارے نظر نہ آئیں۔ میں فخریہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ہم پیشہ بھائی آسمان کے تارے دیکھنے کے عادی ہیں، شاید ہی کوئی سڑک کی کیچڑ دیکھتا ہو، لیکن میں یہ سوچ کر بھی سر جھکا لیتا ہوں کہ ایک لاکھ میں ایک سہی لیکن ہم میں سے ایک آدھ کیچڑ دیکھنے کا بھی عادی ہے۔

ہمارے مشاہرے قلیل سہی، ہماری حیثیت سماج کی نگاہ میں بلند نہ سہی، لیکن ہمارا پیشہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم میں سے ایک فردِ واحد بھی سڑک کی ذلیل کیچڑ پر نظر ڈالے اور تارے نہ دیکھے۔ ایسی مہلک سزائیں جو مہلک ثابت ہوں یا کیسی ہی جسمانی سزا سہی، ہمارے نزدیک ذلیل کیچڑ دیکھنا اور دلدل اچھالنا ہے۔ زندگی کی کش مکش روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ والدین اور استاد ابتدا سے اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو زندگی کی لڑائی لڑنے اور میدانِ حیات میں فاتح بننے کے لیے تیار کریں۔ مجھے اس خواہش اور کوشش کے خلاف احتجاج کرنے کی نہ خواہش ہے نہ ضرورت، میں تو صرف یہ بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خود

"زندگی" بھی ایک حسین چیز ہے۔ ہمیں چاہیے کہ محاربات حیات میں "لذتِ حیات اور حسنِ حیات" کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں اور اگر یہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہوئیں، تو یقین مانیے کہ ہمارے فرائضِ منصبی بھی ہمیں حسین اور دلکش ہی نظر آئیں گے اور ہمارے غبی لڑکے بھی ہمارے لیے اتنے ہی محبوب بن جائیں گے، جتنے ذہین طلبا اور کیا کوئی اپنی محبوب ہستیوں کو اذیت پہنچایا کرتا ہے؟ کیا کوئی اپنی محبوب ہستیوں کی ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا ہے؟ اگر یہ ہو سکتا ہے، تو ظاہر ہے کہ محبت کے اسالیب جلد از جلد بدل دینے چاہییں ؎

محبت آپ کو بیشک ہولے قرباں محبت کے　　　کہ لے کر ذبح کر ڈالا بہت جب پیار میں آئے

۵

روس کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد صاحب، ڈار، ایم اے، بی ٹی

روس یا جس کو موجودہ تاریخ اور سیاست میں نظام جمہوریت اشتراکی (U.S.S.R) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، رقبے کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے بڑا ملک ہے، جو یورپ اور ایشیا دونوں برِاعظموں میں پھیلا ہوا ہے، لیکن باوجود اس کے یہی ایک مغربی ملک تھا، جو یورپ کے دیگر ممالک کی ترقی کے باوجود بالکل پست حالت میں رہا اور اس کی پستی کی وجہ زیادہ طور پر زارانِ روس کی مطلق العنانی تھی۔ اس مضمون کا مقصد محض روس کے موجودہ نظامِ تعلیم کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے، اس لیے گزشتہ زمانے کی تعلیمی تاریخ کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ صرف چند اشارات کافی ہوں گے۔

اگرچہ مختلف بادشاہوں مثلاً پیٹر اعظم، سکندر اوّل و دوم وغیرہ نے عوام کی تعلیم کیلیے چند قوانین جاری کیے، جن پر کچھ عرصے تک عمل بھی کیا جاتا رہا، لیکن عام شاہانِ روس ایسے تھے، جنھوں نے عوام کی تعلیم کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے خطرناک سمجھا حتیٰ کہ نکولس اوّل کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جامعۂ ماسکو کو "بھیڑیوں کا مسکن" کہا کرتا تھا۔ انیسویں صدی کی پہلی تہائی کے ایک وزیر نے کہا کہ تعلیم ایک قسم کا نمک ہے، جس کو بالکل تھوڑا استعمال کرنا جسم کیلیے فائدہ مند ہے اور اس کا خیال تھا کہ عوام کی تعلیم بجائے فائدے کے قوم اور حکومت کے لیے نقصان دہ ہے اور آخری تہائی میں وزیر تعلیم کے حکم سے ایسے قوانین جاری کیے گئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں

اور مزدوروں کے بچوں کے لیے تمام مدارس بند کر دیے جائیں۔ ان تمام امتناعی حکموں کے باوجود صوبائی مجالس منتخبہ نے عوام کی تعلیم کے لیے کوششیں کیں، لیکن فوراً ہی اُن کو شاہی حکموں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ مگر پہلی ناکام بغاوت (۱۹۰۵ء) کے بعد ان مجالس نے عوام کی تعلیم کے لیے بادشاہ کی مخالفت کے باوجود مدارس کھولنے شروع کر دیے اور تقریباً ہر گاؤں میں چار سال کی جبری تعلیم رائج کرنی شروع کی، لیکن ان کا نتیجہ تسلی بخش نہ نکل سکا اور اُن کو یہ کارِ خیر بند کرنا پڑا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب رونما ہوا، تو اُس وقت ستر فی صدی جاہل تھے۔ ثانوی مدارس میں امیروں کے سوا کسی غیر کا داخلہ ناممکن تھا اور جامعات کے طلبہ کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی (یہ یاد رہے کہ روس کی کل آبادی ساڑھے سولہ کروڑ ہے)۔ اس تعلیمی بدانتظامی کے نتائج بہت ہولناک تھے۔ اس حالت میں جبکہ دوسرے مغربی ممالک میں صنعت و حرفت عروج پر تھی روس اس سے بالکل محروم تھا اور زراعتی معاملات میں بھی بالکل پست۔ اگرچہ ایسے وسیع ملک میں قدرتی خزانوں کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن اُن سے کسی قسم کا فائدہ نہ اُٹھایا گیا۔ چنانچہ اشتراکی حکومت کے اولین فرائض یہ تھے کہ ملک کی اقتصادی، تمدنی اور تعلیمی کمی کو پورا کیا جائے۔ ہمارے لیے اس تجربے کا مطالعہ کئی وجوہ سے بہت اہم ہے۔ اوّل تو روس کا ملک آغازِ اشتراکیت کے وقت مفلسی، بیروزگاری اور جاہلیت میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ ان تمام بیماریوں کا علاج بہت اہم کام ہے اور خاصکر اس حالت میں جبکہ دنیا کی تمام سرمایہ دار اقوام، اس اشتراکی تجربہ گاہ کے خلاف متفقہ طور پر مقابلے پر ڈٹی ہوئی تھیں اور اُس کے ساتھ ملک کی اندرونی حالت متواتر بغاوتوں اور بادشاہانِ روس کی غفلت کی وجہ سے اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ یہ صرف لینن اور اس کے رفقائے کار ہی کا دل گردہ تھا کہ ایسے نازک وقت پر اُنھوں نے ملک کو ابتری سے نکال کر دنیا کے دوسرے ممالک کے ہم پلہ کر دیا۔ دوسرے اس لیے کہ روس کا ملک تقریباً سارے کا سارا زراعتی ہے اور اُن طریقوں کا مطالعہ جن کے

ذریعے اشتراکی آمروں نے ملک کی اندرونی زراعت کو ترقی دی اور اس کے ساتھ ہی صنعت و حرفت کو چوٹی تک پہنچا دیا، ہمارے ملک کے لیے بیشمار سبق رکھتا ہے، لیکن ہمارے لیے اس جگہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُن مدارس میں جو زراعتی یا صنعتی علاقوں میں ہیں، محکمۂ تعلیم نے ن طریقوں سے نصاب کو مدوّن کیا، جس سے دیہات اور شہروں سے غریب باشندوں کے بچّے اپنی تعلیم کے پورے سال باقاعدہ مدرسوں میں گزار سکیں، کیونکہ ہندوستان میں ابھی تک اس بات کا علاج نہیں ہو سکا۔ تیسرے اس لیے کہ غربت کے ہوتے ہوئے انھوں نے کن طریقوں سے علیمِ عوام کو رائج کیا حتیٰ کہ اس وقت ۲۶ فیصدی کے بجائے ۹۸ فیصدی لوگ پڑھے لکھے موجود ہیں۔

اس بات سے تقریباً ناظرین واقف ہونگے کہ روس میں اس وقت ایسے طریقے پر حکومت ل رہی ہے، جو دنیا کے دیگر ممالک سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ اور مزدوری کی بحث ایک عاشی بحث ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف اتنی بات ہمارے مقصد کے لیے کافی ہے کہ نیا کے سب ممالک میں اصولاً انسانوں میں جماعتی تفریق موجود تھی اور چلی آرہی ہے اور یہ تفریق م طور پر دو قسموں میں تقسیم کی جاتی ہے: سرمایہ دار اور مزدور۔ یہ تفریق صنعتی ترقی کے آغاز سے یادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ چنانچہ کارل مارکس نے اس تقسیم کے خلاف آواز اُٹھائی۔ چونکہ اس سے یا کی تاریخ میں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں سرمایہ دار کا پلّہ بھاری رہا، اس لیے کارل مارکس اور ے کے رفقائے کار نے مزدور کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا۔ کارل مارکس ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ روس ۱۹۱۷ء میں انقلاب رُونما ہوا اور اس کے بعد اس ملک میں مارکس کے پیروؤں ہی میں سے ا آمر مقرر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی تعلیم کا مقصد دوسرے سرمایہ دار اقوام کی تعلیم کے مقاصد صول سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کو اشتراکی نگاہ سے آگاہ کر دیا جائے، یعنی ایسے افراد پیدا کیے جائیں، جو بجائے سرمایہ داری کے مزدوری کا

کے اصولوں اور قوانین سے واقف ہوں اور ان اصولوں کی خاطر جان تک دینے سے گریز نہ کریں لیکن یہ ہمدردی صرف ایک ملک کے افراد تک محدود نہیں، بلکہ تمام دنیا کے مزدوروں کے لیے ہے۔

اس مقصد کو مدِّنظر رکھ کر روسی مدبّرین نے تعلیمی تفصیلات میں چند تبدیلیاں کیں، جو قابلِ غور ہیں:۔

(۱) پہلا نتیجہ، جو اس اصول سے مترتب ہوا، یہ ہے کہ تمام تعلیم کی بنیاد "محنت" پر رکھی گئی۔ چونکہ زندگی اور روزگار کا مدار کام اور محنت پر ہے، اس لیے مدارس اور دیگر تعلیمی اداروں کو ماحول، خصوصی زندگی اور صنعت و حرفت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ مدرسوں اور کارخانوں (یا زرعی زمینوں) کے درمیان ایک قسم کا گہرا تعلق پیدا کیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنا لازمی قرار دیا گیا۔

(۲) تعلیم کی پہلی سیڑھی سے لے کر آخر تک تمام نصاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا[1]:۔

(ا) ماحول کے قدرتی مناظر (ب) انسانی محنت جو قدرت کی مخالف یا موافق طاقتوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ (ج) معاشری نتائج جو اس تعلق سے مترتب ہوتے ہیں۔

---

[1] چونکہ نصاب کی یہ تقسیم اب مروّج نہیں رہی، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں مختصر طور پر نصاب کی ایسی تقسیم کا ایک نمونہ درج کر دوں، جو ۸ سال سے ۱۲ سال کی عمر کے بچوں کے لیے تھا:۔

سال	قدرت	محنت	معاشرت
اوّل	مختلف موسم	اردگرد کے دیہات اور شہروں کی خانگی، محنتی زندگی کا مطالعہ	خاندان اور مدرسہ
دوم	پانی، ہوا اور زمین۔ معدنیات استعمال کے جانوروں اور پودوں کی خصوصیات اور ان کی حفاظت	گاؤں یا شہر کی مقامی زندگی	گاؤں یا شہر کے مختلف ادارے
سوم	علم طبیعیات اور علم کیمیا کے ابتدائی تصورات، مقامی حالات اور انسانی جسم کی ساخت اور کام	مقامی علاقے کی معاشی زندگی	صوبے کے معاشی ادارے۔ اپنے ملک کی گزشتہ تاریخ کا نقشہ
چہارم	روس اور دیگر ممالک کا جغرافیہ۔ انسانی جسم کی زندگی اور حالات	روسی جمہوریت کی حکومتی، معاشی پالیسی	روس اور دیگر ملکوں کا حکومتی نظام، انسان کی گزشتہ زندگی کا نقشہ۔

(۳) تیسرا اہم نتیجہ "جماعت بندی" (COLLECTIVISM) ہے۔ چونکہ اشتراکیت کے بنیادی اصولوں میں ایک یہ ہے کہ تمام انسان ایک سے ہیں اور دولت کی تقسیم بالکل مساویانہ ہونی چاہیے، اس لیے انھوں نے روزمرہ کے کاموں میں مل کر کام کرنے میں بڑا زور دیا۔ چنانچہ اسی اصول نے ان کے تعلیمی طریقے کا بھی فیصلہ کر دیا۔ بجائے ڈالٹن پلین کے جس میں ہر بچہ تقریباً دوسرے بچوں کی مدد کے بغیر اپنا کام خود سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہے، انھوں نے منصوبی طریقہ (PROJECT METHOD) اختیار کیا، جس میں تمام طلبہ ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ ایک کام کو سرانجام دیتے ہیں اور کام کا نتیجہ کسی خاص طالب علم کے نام سے منسوب نہیں ہوتا، بلکہ اس کی تکمیل سب طلبہ کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔

لیکن کچھ عرصے سے (غالباً سنہ ۱۹۳۰ء) روسی مدبّرین نے تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ان میں اور خاص کر نمبر ۲ اور نمبر ۳ میں کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں۔ مثلاً نصاب کو تین مختلف حصّوں میں تقسیم کرنے کے بجائے، اب علٰحدہ علٰحدہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور طریقۂ منصوبی کو تقریباً ترک کر دیا ہے، کیونکہ اس سے تسلی بخش نتائج پیدا نہیں ہو سکے، مگر مجموعی کام پر ابھی تک زور دیا جاتا ہے۔

روس کے ہر مدرسۂ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم اکٹھی ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں بعضوں نے اگرچہ اس کو پورے طور پر اختیار کر لیا ہے، لیکن بعض (مثلاً فرانس اور جرمنی) میں ابھی تک اس کی پیروی سے (بہ استثنائے ابتدائی) عام طور پر ہیز کیا جاتا ہے، مگر روسی مدبرین نے اس اصول کی قانوناً ترویج کی اور وہ اس کے نتائج سے بالکل مطمئن نظر آتے ہیں۔

روس کے تعلیمی اداروں کی تقسیم حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) پیدائش سے ابتدائی تعلیم کے آغاز تک:

(الف) پیدائش سے تین سال کی عمر تک

(ب) تین سال کی عمر سے آٹھ سال کی عمر تک

(۲) ابتدائی، بعدِ ابتدائی اور ثانوی:

- (ا) پہلے درجے کے مدارس (۸-۱۲) } ہفت سالہ مدارس } دہ سالہ مدارس
- (ب) دوسرے درجے کے مدارس (۱۲-۱۵) } ہفت سالہ مدارس } دہ سالہ مدارس
- (ج) تیسرے درجے کے مدارس } دہ سالہ مدارس

(۳) صنعتی تعلیم:

(ا) کارخانوں کے لیے تربیت گاہیں، جن کی مدت خواندگی چھے ماہ سے ایک سال تک ہے۔

(ب) ٹکنیکم (Technicum.) یعنی ثانوی صنعتی مدارس۔ مدت چار سال (۱۵-۱۹)

(ج) اعلیٰ تعلیم۔ اس کی مدت خواندگی چار یا پانچ ہے۔ (۱۸ - ۲۲ یا ۲۳)

(د) تعلیم و تربیتِ اساتذہ

(۴) سیاسی تعلیمی ادارے، جن کا مقصد بالغوں کو سیاسی یا صنعتی تعلیم دینا ہے۔

(۲)

چونکہ روس کا ملک صدیوں کے مظالم سے بالکل ویران اور بنجر ہو رہا تھا، اس لیے اشتراکیوں کا سب سے زیادہ اہم کام یہ تھا کہ کسی نہ کسی طریقے پر تمام روسیوں کے لیے کام مہیا کیا جائے اور اس طرح ان سب کی متفقہ کوششوں سے ملک کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اُن عورتوں کے لیے، جن کے بچے ابھی شیر خوار یا قابل پرداخت ہوں، کچھ سہولت مہیا کی جائے۔ چنانچہ تین سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے کریچیز (Chreches.) قائم کر دیے، جہاں کام پر جاتے وقت عورتیں اپنے بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں اور کام ختم کرنے کے بعد اُن کو وہاں سے لے جاتی ہیں۔ ان کریچیز کی ہر دلعزیزی کا اندازہ مندرجۂ ذیل

اعداد سے لگ سکتا ہے :-

کریچز کی تعداد کی ترقی

	شہروں میں	دیہات میں
سنہ ۱۹۲۸ء	۴۳۶۰۰	۴۱۷۰۰
سنہ ۱۹۳۲ء	۲۸۶۴۰۰	۴۳۵۰۰۰

ان کریچز میں، جن عمدہ طریقوں سے بچوں کی نگہداشت کی جاتی ہے، ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں ذیل میں ایک چشم دید بیانات درج کرتا ہوں۔ یہ حالات لینن گریڈ کے ایک ایسے ادارے کے ہیں، جو کپڑے کے ایک کارخانے سے ملحق تھا:

"اس کارخانے میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے اور ان میں سے نوّے فی صدی کے بچے اس ادارے میں رہتے ہیں۔ اس کی مہتمم ایک عورت ڈاکٹر ہے، جو علاوہ طبی علم کے بچوں کے نفسیات اور علمی طریقوں سے بخوبی واقف ہے۔ جب بچہ صبح آتا ہے، تو غسل کے بعد وہاں کے خاص کپڑے پہن لیتا ہے اور اس کے گھر کے کپڑے ایک علٰحدہ دراز میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ مقررہ وقت پر عورتوں کو چھٹی ملتی ہے اور وہاں آکر بچوں کو دودھ پلاتی ہیں اور خود ان کے لیے بھی کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ ہر ایک بچے کے لیے علٰحدہ بستر اور تولیہ وغیرہ ہوتا ہے اور تمام بچوں کی چیزوں کے پاس ایک خاص تصویر لگی ہوتی ہے، جس سے وہ اپنی اپنی چیزیں پہچان لیتے ہیں۔ دو سال سے اوپر کے بچوں کو کھانے سے پہلے اور بعد خود ہاتھ اور منہ دھونا سکھایا جاتا ہے۔ دو سے چار اور چار سے چھ مہینے تک کے بچوں کے لیے علٰحدہ کمرے ہیں اور چھ مہینے کے بعد وہ بڑے کمروں میں چلے جاتے ہیں، جہاں ان کی چلنے پھرنے کی مشق کے لیے مختلف قسم کے کھلونے ہوتے ہیں۔" یہ تمام ادارے وزیر حفظان صحت کے ماتحت ہیں اور والدین کو ان کی حفاظت اور خرچ کے لیے کچھ نہیں دینا پڑتا۔

تین سال سے لے کر آٹھ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے کنڈرگارٹن اور "کھیل کے میدان" قائم ہیں۔ موخرالذکر صرف گرمیوں میں دیہات میں قائم کیے جاتے ہیں، جہاں والدین کھیتوں یا کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور بچے کھلی ہوا میں، اساتذہ کی زیرنگرانی، کھیلتے اور کام کرتے ہیں۔ کنڈرگارٹن کے متعلق زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ سب ممالک میں تقریباً ایک ہی ڈھنگ پر چلائے جاتے ہیں۔ ان اداروں پر حکومت کی خاص توجہ ہے، جس کا نتیجہ ذیل کے اعداد سے واضح ہو جائیگا:۔

	۲۹-۱۹۲۷ء	۱۹۳۲ء	۱۹۳۳ء	۱۹۳۴ء
بچوں کی تعداد	۳۰۸،۰۰۰	۵،۲۳۲،۰۰۰	۷،۰۰۰،۰۰۰	۸،۶۰۰،۰۰۰

دوسرے پنجسالہ پروگرام کے مطابق اس سال (۱۹۳۷ء) ۷۵ فیصدی بچوں کے لیے (۳ سے ۸ سال تک) انتظام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل روس میں ایک کروڑ ستر لاکھ بچے کنڈرگارٹن میں تربیت حاصل کر رہے ہیں!

ان اداروں کا کام باقاعدہ عنوانوں کے ماتحت ہوتا ہے اور یہ بچوں کی سیاسی، جسمانی اور دماغی نشوونما کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ نیچے درجے کے کنڈرگارٹن کے چند عنوانوں کی مثال ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

عنوان نمبر (۱): گروہ کی زندگی کا نظم، جس کے دوران میں بچے دستی کام سے واقف کیے جاتے ہیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی پیروی کرتے ہیں اور حساب کے ابتدائی تصورات حاصل کرتے ہیں۔ گانے اور نقشہ کشی سے لذت اٹھانے کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

عنوان نمبر (۲): بچے صحت کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ماحول کی صفائی کرتے ہیں۔

(ان کے بعد مندرجہ ذیل عنوانات ہیں: انقلاب نومبر کے جشن میں حصہ لینا، سردیوں کے

کھیلوں کا انتظام، یادگارِ لینن کا دن، معاشی اور دستی کام کرنا، موسم بہار کا کام، پھول اور پھل لگانا اور ان کی نگہداشت۔

ان اداروں میں محنت اور مختلف قسم کے دستی کاموں کو بہت جگہ دی جاتی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ بچے شروع ہی سے ماحول کی ضروریات کے مطابق، اکھٹے مل کر مختلف قسم کے کام سمجھنے اور کرنے کی اہلیت حاصل کر لیں، لیکن چونکہ روس کی اقتصادی، معاشی حالت روز بروز تبدیل ہوتی جا رہی ہے، اس لیے اساتذہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ بچے بجائے اس کے کہ ایک خاص قسم کے کام کرنے کے عادی ہوں، ان کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ مختلف ماحول میں اپنی عقل و فراست کو استعمال کر سکیں، اس لیے انھیں مشینی کھلونے (مثلاً مکینو وغیرہ) دیے جاتے ہیں تاکہ وہ خود اپنے ہاتھ اور دماغ کی مدد سے مختلف قسم کی چھوٹی چھوٹی مشینیں بنا سکیں۔

اگرچہ کنڈرگارٹن دوسرے ملکوں میں رائج ہو چکے ہیں، مگر روس والوں نے ان کو اپنے اشتراکی نقطۂ نگاہ کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ چنانچہ ان اداروں کی تربیت مندرجۂ ذیل خصوصی اصولوں کے مطابق ہوتی ہے :- (۱) اپنی زندگی کو استوار کرنے کے لیے بچوں کا عملی کام کرنا اور اُن کاموں پر خاص طور پر زور دینا، جو معاشرت کے لیے فائدہ مند ہوں۔ (۲) ماحول، زندگی اور حالات کے ساتھ ایک زندہ تعلق پیدا کرنا۔ (۳) قدرت کا مطالعہ اور مادّی نقطۂ نگاہ کی پرورش۔ پہلے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں سے ایسے عملی کام کرائے جائیں، جو اوّل تو ان کے لیے فائدہ مند ہوں اور دوسرے اس محدود معاشرت کے لیے جس میں وہ رہتے ہیں۔ چنانچہ دوسروں کو کام کرتے دیکھ کر اور خود کام کرتے ہوئے بچوں میں صحیح معاشری صفات پیدا ہو سکتی ہیں، جن کے بغیر اشتراکی مقاصد کی کامیابی ناممکن ہے۔ ان مدارس کا تقریباً تمام کام بچوں کے مختلف گروہوں کے سپرد ہوتا ہے اور بعد میں اپنے مدرسے کے علاوہ باہر کھیتوں میں جا کر کسانوں کی مدد کرتے ہیں۔

معاشرت کی زندگی کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے لیے بچّوں کو مختلف موقعوں پر سیر و تفریح کے لیے باہر لے جایا جاتا ہے اور انھیں وہ چیزیں دکھائی جاتی ہیں، جن کو وہ سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً ترکھان اور لوہار کی دوکان۔ روسی مدبرین نے ان تجربات سے جو نتیجہ نکالا ہے، وہ یہ ہے کہ بچے بجائے معمولی کھلونوں سے کھیلنے کے، چھوٹی چھوٹی کیلیں، ہتھوڑے، چکیاں، آرے استعمال کرنے شروع کرتے ہیں اور اس طرح آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

ذیل میں مَیں چند آدمیوں کے چشم دید واقعات درج کرتا ہوں، جو اُنھوں نے روس کے ایک کنڈر گارٹن کے متعلق لکھے ہیں (یہ ادارہ ایک کارخانے سے ملحق تھا): "ساڑھے سات بجے بچّے آتے ہیں اور ۸ بجے تک حاضری لگتی ہے۔ ۹ بجے صبح کا کھانا اور پھر اس کے بعد ساڑھے دس بجے تک کام۔ کام کے بعد دوپہر تک کھیل۔ ساڑھے بارہ بجے کھانا کھاتے ہیں اور ایک سے لے کر ڈھائی بجے تک جسمانی صحت اور خاصکر دانتوں کی صفائی کے متعلق کام ہوتا ہے اور پھر بچے سو جاتے ہیں۔ چار بجے دودھ یا چاے تیار ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد کھیل شروع ہوتے ہیں۔ پانچ بجے بچّے والدین کے ساتھ گھر چلے جاتے ہیں۔ سوائے پکانے اور برتن دھونے کے باقی سارا کام خود بچے یا اساتذہ اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ مختلف کاموں کے لیے بچّوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ مانٹسوری کھلونے مہیا کیے جاتے ہیں اور تعلیم انھیں کھیلوں اور کاموں کے ضمن میں دی جاتی ہے۔ پریوں وغیرہ کے قصّوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور ان کے بجاے روزمرّہ کی زندگی کے حالات سے واقف کیا جاتا ہے۔ جس کارخانے سے یہ ادارہ ملحق ہے، وہاں کپڑے بُنے جاتے ہیں۔ چنانچہ بچّوں نے اپنے سرخ جھنڈے پر دھاگے کی استعمال شدہ ریلوں کی مہریں (Stamps.) اتار کر ایک موٹو بنایا تھا: "ہم کارخانے سے مفت روٹی حاصل نہیں کرتے۔ اس کھانے کے بدلے ہم لباس مہیا کرتے ہیں۔" یہ موٹو، جس

طریقے پر انھوں نے سیکھا، اس سے ان اداروں کے کام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک دفعہ بڑی عمر کے بچّے دیہاتی بچّوں کی سیرگاہ پر گئے۔ یہاں اُنھوں نے محسوس کیا کہ کسانوں اور دیہاتیوں کے لیے لباس کی ضرورت ہے، جو کارخانے والے مزدور تیار کرتے ہیں اور مزدوروں کے لیے کھانے کی ضرورت ہے، جو کسان تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس معمولی طریقے سے انسانوں کے باہمی تعلقات اور ضروریات کا پتہ چلتا ہے اور اس مضمون پر ایک نظم تیار کی گئی ہے، جو مدرسے میں سب بچّے گاتے ہیں . . . "

(باقی آئندہ)

نفسیاتِ جدید

از

قاضی محمد اسلم صاحب، بی اے (کینٹب) لکچرر گورنمنٹ کالج، لاہور

دُنیا کا کوئی مضمون آج اس تیزی سے نہیں بڑھ رہا ہے، جس تیزی سے نفسیات کا مضمون، اس مضمون کی ترقی کا دور کوئی پچاس ساٹھ سال سے شروع ہوا ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے، اس کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز ہوتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفسیات بچپن کے دور کو ختم کر کے بلوغت کے قریب پہنچ رہا ہے۔ بچپن میں نشوونما کی رفتار ایسی ہوتی ہے کہ جب تک کسی بچے کو لمبے لمبے وقفوں کے بعد نہ دیکھا جائے، اس کا بڑھنا اور بڑا ہونا دیکھنے والوں کو محسوس نہیں ہوتا، لیکن بچپن کے گزرنے کے ساتھ ہی بچے کے قد، اس کے اعضا اور اُس کی چال ڈھال میں ایسی تیز تبدیلی شروع ہو جاتی ہے کہ سب دیکھنے والے یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ بچہ بڑھ رہا ہے۔ یہی حال نفسیات کا ہے۔ ہر چار پانچ سال بلکہ ہر سال کے بعد اس کی شکل بدل جاتی ہے اور سوائے اس کے کہ ہم زمانے کے گزرنے کے ساتھ اپنی نظر کو وسیع کرتے جائیں، نفسیات کی حدود اور اس کی مختلف شاخوں پر پورے طور سے حاوی نہیں ہو سکتے۔

اس وجہ سے نفسیاتِ جدید پر، جو شخص کچھ کہنے کی جرأت کرے، اس سے یہ توقع رکھنا ناواجب ہے کہ وہ اس مضمون کی تازہ ترین شکل کو بالتفصیل بیان کر دے۔ ہاں یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اُن لائنوں کا کچھ مجمل حال بتا دے، جن پر نفسیات فی زماننا روز بروز بڑھ رہا ہے۔ سو اُن لائنوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نفسیات قیاس کی حدود سے نکل کر مشاہدے اور تجربے کی شاہراہ پر گامز

ہو کر روز بروز حقیقی علم کا رتبہ حاصل کر رہا ہے اور یہ انقلاب بذاتِ خود ایک نہایت لطیف اور دلچسپ منظر ہے، کیونکہ دنیا میں آج جو بہت سے علوم ہیں، اُن میں سے ہر ایک کسی زمانے میں قیاس سے زیادہ کوئی درجہ نہ رکھتا تھا، لیکن اس کے بعد ایک وقت ہر علم پر ایسا آیا کہ اُنھوں نے قیاس سے آزادی حاصل کی اور مشاہدے کی مستحکم بنیاد پر اپنی داغ بیل ڈال دی۔ علم طبیعیات کا حال گیلیلیو سے پہلے کیا تھا؛ چند قیاسی نظریے تھے جن پر علما وقت کو اصرار تھا لیکن گیلیلیو نے ان لوگوں کو مشاہدے کی طرف بلا کر اس علم کی کایا پلٹ دی اور اس وقت سے لے کر آج تک یہ علم روز بروز ترقی کر رہا ہے، وُہ انقلاب جو علم طبیعیات میں گیلیلیو اور اُس کے جانشینوں کی مساعی سے ظہور میں آیا؛ وہی انقلاب اب نفسیات میں جاری ہے اور روز بروز اس کی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پس اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ ایک علم، قیاس کے درجے سے نکل کر حقیقی علمی مقام کیسے حاصل کرتا ہے، تو اُسے نفسیاتِ جدید پر غائر نظر ڈالنی چاہیے، کیونکہ یہ انقلاب، جو اور علوم کے لحاظ سے گزشتہ کا واقعہ ہو چکا ہے، نفسیات کے لیے حال کی بات ہے۔

اس انقلاب کی تین شاخیں ہیں اور تینوں کا مظاہرہ نفسیات میں اس وقت بسرعت ہو رہا ہے۔ ایک شاخ تو یہ ہے کہ جہاں پہلے نفسیاتی مسائل کی تحقیق قیاس اور خیال آرائی پر موقوف ہوتی تھی، اب اس کی جگہ مشاہدے اور تجربے نے لے لی ہے۔ نو مشاہدے اور تجربے میں بہت بڑا فرق ہے۔ مشاہدہ کہتے ہیں، اُن امور کے دیکھنے کو جن کا ظہور ہمارے سامنے ہو رہا ہو، لیکن ان کا ظہور ہمارے اختیار سے باہر ہو۔ موسموں کی تبدیلی، وباؤں کا آنا، اس قسم کے قدرتی امور ہمارے سامنے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں اور جہاں تک ہو سکے، ہم ان کا مطالعہ کرتے اور اُن کو ایک علمی شکل میں ڈھال لیتے ہیں، لیکن تجربے سے مراد اس قسم کا مشاہدہ نہیں، تجربے سے مراد اُن امور کا دیکھنا اور نوٹ کرنا ہے، جن کے اسباب بھی تقریباً ہمارے اپنے اختیار میں ہوں اور

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴ر۱۱ پائی	۱۹	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ دوم	۸ر۱۱ پائی
			۲۰	״ ״ ״ حصہ سوم	۷ر
۲	״ دوسری ״	۶ر۱ ״	۲۱	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ ״
۳	״ تیسری ״	۷ر۶ ۔	۲۲	״ ״ ״ ״ دوم	۳ر۲ ״
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۳	قصص ہند حصۂ اوّل	۲ر۳ ۔
۵	״ ״ دوم	۵ر	۲۴	״ ״ ״ دوم	۸ر۲ ״
۶	״ ״ سوم	۷ر	۲۵	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۶	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ پائی
۸	״ ״ دوم	۳ر۷ پائی	۲۷	شہزادہ مہربان	۲ر۶ ״
۹	״ ״ سوم	۳ر۱۱ ״	۲۸	راما سیتا	۱ر۱۱ ״
۱۰	״ ״ چہارم	زیر طبع	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر لیا رام	۳ر
۱۱	״ ״ پنجم		۳۰	دروپدی	۱ر۸ پائی
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴ر۶ ״
۱۳	״ ״ نمبر ۲	۳ر۱۰ ۔	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید	۴ر
۱۴	״ ״ نمبر ۳	۵ر۳ ۔	۳۳	راجہ اشوک	۵ر
۱۵	انوار سہیلی کے انمول موتی	۲۴ر۸ ۔	۳۴	مہارانا پرتاپ . . .	۲ر۱ پائی
	״ حصہ ۱ ״ ״ ״		۳۵	شہاب الدین شاہجہان	۲ر۱۰ ۔
۱۶	״ حصہ ۲ ״ ״ ״	۴ر۱۰ ۔	۳۶	شیر شاہ سوری . . .	۲ر۱۱ ۔
۱۷	״ حصہ ۳ ״ ״ ״	۵ر۲ ۔	۳۷	نصیر الدین ہمایوں . .	۲ر۱۰ ۔
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اوّل	۷ر۷ ״	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر	۲ر۳ ״

نفسیات نے اپنے آپ کو انسان کے صنعتی کاروبار، انسان کی تعلیم اور انسان کی صحت کے لیے ایسے رنگ میں مفید ثابت کیا ہے کہ بہت سے اربابِ علم اب اُس دن کے منتظر ہیں کہ نفسیات دُنیا کی معاشری اور سیاسی پیچیدگیوں کے حل کرنے میں کامیاب ہو۔ یہ اُمید ممکن ہے درست نہ ہو، کیونکہ انسانی معاشرت کی اصلاح میں انسان کی صحت نیت کو بہت دخل ہے اور صحت نیت کوئی علم پیدا نہیں کر سکتا، لیکن جہاں تک انسانی معاشرت اور سیاست کی اصلاح کا تعلق محض علم سے ہے، اس میں کیا شک ہے کہ یہ اصلاح اب نفسیاتی علوم پر موقوف ہے اور ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ نفسیات، جس نے انسانی صنعت، تعلیم اور صحت میں مفید اور علمی اصلاح کے بہت سے راستے کھول دیے، ایک روز بنی نوع انسان کی بڑی بڑی مشکلات پر بھی حملہ آور ہو گا اور دنیا کو ایسے طریق بتائیگا، جن سے اُس کا وہ خوف و حزن بھی دُور ہو جائے، جو تمدنی، نسلی اور سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے آج ایک قوم کو دوسری قوم سے لاحق ہو رہا ہے۔

۲۰

جغرافیے کی تدریس

از

مرزا مقبول بیگ صاحب، بدخشانی، بی اے

(گزشتہ سے پیوستہ)

خطِ استوا کے قریب، ریگستان کی سرحد پر صحرا ریتلی زمین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر بارش بھی نو دس انچ تک ہو جاتی ہے۔ ٹمبکٹو میں بارش نو انچ ہوتی ہے اور اُسے منطقہ حارہ کی گھاس کے علاقوں کا ایک خشک حصہ کہا جاتا ہے۔ گھاس کے علاقوں میں بارش بیس انچ تک بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی حدوں پر جو تھوڑی بہت بارش ہوتی ہے، اسی موسم میں ہوتی ہے، جبکہ مون سون ہواؤں کے خطّے میں ہوتی ہے یعنی موسم گرما میں۔ یہ ریگستان قطبین کی جانب بحیرۂ روم کے علاقے میں تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے۔ یہاں سردیوں کے موسم میں بارش ہوتی ہے۔ قاہرہ میں سالانہ بارش ۱ ر ۳ درجے ہوتی ہے۔ یہ مقام اس خطّے کا صحیح نمونہ ہے۔

شمالی کرے میں قطعات زیادہ عریض ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی کرے کے صحرا جنوبی کرے کے صحرا کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ ریگستانی علاقہ مسلسل طور پر شمالی افریقہ سے شروع ہو کر بحیرۂ احمر تک چلا گیا ہے۔ اِن علاقوں کی آب و ہوا صحرائی آب و ہوا کہلاتی ہے۔ یہ ریگستان پھر عرب سے ہوتا ہوا بلوچستان کے دامن تک اور ہندوستان کے صحرائے اعظم تک پھیلا ہوا ہے۔

شمالی امریکہ میں ممالک متحدہ کے صحرا ہیں۔ جنوبی امریکہ میں پیرو یا اور چلّی کے۔ جو انڈیس سے

بحرالکاہل کے ساحل تک پھیلے ہوئے ہیں۔جنوبی امریکہ میں دریائے کالاہاری بحرالکاہل تک چلا گیا ہے۔

آسٹریلیا کے بیشتر حصے میں سالانہ بارش دس انچ سے کم ہوتی ہے۔اس لیے یہاں بھی ایک صحرا ہے، جو آسٹریلیا کا صحرائے اعظم کہلاتا ہے۔کچھ صحرا ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں نباتات کا وجود سرے سے نظر ہی نہیں آتا۔صحرا کے درخت دوسرے مقامات کے درختوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔درختوں کے نشوونما کے لیے پانی لازمی ہوتا ہے، لیکن صحرا میں پانی کہاں۔اس لیے صحرا میں صرف ایسے درخت ہوتے ہیں، جن کی جڑیں بہت لمبی ہوں ——— اور اتنی لمبی کہ پانی کی نمی تک پہنچ سکیں۔ان کے علاوہ ایسے درخت بھی ملتے ہیں، جن کے پتوں یا تنوں میں یہ صلاحیت ہو کہ پانی کی نمی کو کافی دیر تک محفوظ رکھ سکیں۔اس قسم کے درخت خال خال ہوتے ہیں۔جہاں کہیں ہوتے بھی ہیں، بڑی مشکل سے پروان چڑھتے ہیں، اس لیے قدرت نے ان کی بقا کا سامان کانٹوں کے ذریعے کر رکھا ہے تاکہ ڈھور ڈنگر کے حملے سے محفوظ رہیں۔

قدرتی پیداوار کے اعتبار سے گرم ریگستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اوّلاً وُہ حصے جو بڑھ کر منطقہ حارہ کے گھاس کے خطوں میں مدغم ہوتے ہیں۔یہ بہت خشک علاقے ہیں۔ثانیاً وہ حصے، جو بحیرۂ روم کی حد بنتے ہیں۔یہاں ادنیٰ قسم کی زیرو رختی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ریگستان کی صرف انھیں زمینوں کو اہمیت حاصل ہے، جو زرخیز اور سیر حاصل ہیں۔یہ علاقے بالعموم نشیبوں میں واقع ہیں، جہاں پانی کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اور سطح زمین کو نمی پہنچاتا رہتا ہے۔اس قسم کی زمینوں میں اگر کہیں چھپڑ یا کنواں ہو، تو اُس کے آس پاس ناریل کے جھنڈ اُگ آتے ہیں۔ریگستان میں بھی بہت سی سیر حاصل زمینیں ایسی ہیں، جو سیکڑوں میلوں کو محیط ہیں اور کافی زرخیز ہیں۔بہت سے لوگ اُن کو آباد ہو گئے ہیں۔ریگستان میں آبادی کم ہے، لیکن جو تھوڑی بہت ہے تین

اقسام پر مشتمل ہے۔ خانہ بدوش اقوام، جو اپنے اونٹوں کو لیے لیے پھرتی ہیں۔ یہی اونٹ ان کے سرمایہ حیات ہیں۔ اگر ان میں دیانت داری سے روزی کمانے کا جذبہ ہو، تو وہ باربرداری کا کام کرتے ہیں اور اگر اس قسم کے جذبے سے بے نیاز ہوں، تو ضبط و تنظیم کے ساتھ ڈاکے ڈالتے ہیں اور لشکر بری کرتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں، جو زرخیز علاقوں میں آکر آباد ہو چکے ہیں۔ یہ اکثر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں اور مویشی پالتے ہیں۔ ناریل وغیرہ کی بھی کاشت کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے قدرتی کانوں کے آس پاس آکر سکونت اختیار کرلی ہے۔ مثلاً جو لوگ چلی میں آکر آباد ہوئے ہیں، وہ وہاں کے قلمی شورے کے لیے آباد ہوئے ہیں۔ جنوبی آسٹریلیا میں سونے کی کانوں کی وجہ سے لوگ آئے تھے۔

انسان پر صحرائی ماحول کا اثر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ صحرا میں ہمیشہ ایک ہی قسم کا منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک ہی قسم کی زندگی ہوتی ہے، بے کیف سی، بے جان سی۔ اس میں کبھی کوئی تغیر و تنوع پذیر نہیں ہوتا۔ مطلع ہمیشہ صاف رہتا ہے۔ رات کے سفر کے لیے ہمیشہ رہنماؤں کی ضرورت رہتی ہے۔ ان تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر وہاں کے لوگوں کی توجہ زمین کے معاملے کی طرف نہیں، بلکہ آسمان کے مطالعے کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے صحرا کے لوگوں کے ذہن و افکار اکثر فلسفیانہ ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے مصر اور عرب کے عالم ہیں، جو ریاضی اور ہیئت کے ماہر ہوتے تھے اور جن کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجتا تھا۔ صحراؤں میں اکثر قدرتی چشمے ہوتے ہیں اور ان چشموں کے گرد لوگ آکر آباد ہو جاتے ہیں۔ چشموں کا پانی خشک بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں وہاں کے لوگوں کو بڑی بڑی دشواریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بیشتر تشنگی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اکثر ان زمینوں کو خیر باد کہہ جاتے ہیں۔ تازہ و شاداب جگہیں اپنے لیے تلاش کرتے ہیں اور پھر وہاں سے لوٹتے ہی نہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عرب سے جو لوگ نکل جاتے

تھے، اس کی بڑی وجہ یہی ہوتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خدائے مطلق کا عہد مصر کا عہد تھا۔ آپ نے عرب سے سفر اختیار کیا، تو اُس کی بھی وجہ یہی تھی۔

یہ امر خاص طور سے ذکر کے قابل ہے کہ ریگستان کی زمین زرخیز ہوتی ہے۔ مشکل تو پانی کی ہے۔ جہاں جہاں آبپاشی کے لیے پانی میسر آجائے، وہاں ریگستان اور بھی زرخیز ہو جاتا ہے۔ وادیٔ نیل اس نوع کی زرخیزی کی ایک مخصوص مثال ہے۔ امریکہ کا صحرائی کالوریڈو اور ہندوستان کا سندھ کا میدان، صحرائی آبپاشی کی اچھی مثالیں ہیں۔

ریگستان انسانوں کے باہمی اختلاط کی راہ میں بہت بڑی روک ہے۔ اگر بڑے بڑے صحرا درمیان میں حائل ہوں، تو ایک مقام کے باشندے دوسرے مقام کے باشندوں سے راہ و ربط قائم نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو دُنیائیں، ایک دوسری سے الگ تھلگ اور ایک کے باشندے دوسری دُنیا کے باشندوں سے ناآشنائے محض ہیں۔ صحرا قوموں کو جدا کرنے کا موجب ہیں۔ صحرا بہت محدود آبادی کے کفیل ہو سکتے ہیں۔ نقشوں اور خاکوں میں صحرائی آبادیوں پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ یورپین اقوام کے تصرف میں بڑے بڑے علاقے ہیں، لیکن یہ تصرف نام کا تصرف ہے۔ مثال کے طور پر اٹلی ہی کو لیجیے۔ شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم کا بیشتر حصہ اور سمالی لینڈ کے صحرا کا اکثر حصہ اٹلی کے زیرِ نگیں تھا۔ لیکن تمام وسعتوں کے باوجود صحرا میں آبادی کا بڑھتا ہوا سیلاب سما نہ سکا، ناچار تمام تر سیاسی قید و بند توڑ کر اسے ایبے سینیا کی طرف رُخ کرنا پڑا۔

بحیرۂ روم کی آب و ہوا کا خطہ۔ یہ خطہ ان علاقوں پر مشتمل ہے، جو بحیرۂ روم کے آس پاس واقع ہے۔ گرم ریگستانی علاقوں کی طرح یہ علاقے بھی گرم اور خشک ہیں۔ موسم گرما میں بگولے اُٹھتے رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں موسم سرما میں مغربی ہوائیں چلتی ہیں اور مینہ برساتی ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے۔ بحیرۂ روم کا خطہ معتدل آب و ہوا کا خطہ ہے۔ یہاں کا درجۂ حرارت کم ہے۔ بحیرۂ روم کی آب و

ہوا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سورج دن کے وقت، سال بھر پوری تاب کے ساتھ چمکتا رہتا ہے۔ گرما میں ابر کا نشان تک نہیں ملتا۔ سردیوں میں ابر کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بحیرۂ روم کی آب و ہوا کے خطے برِاعظموں کے مغرب کی طرف خطِ استوا کے دونوں طرف ۳۰ درجے سے ۴۵ درجے عرض بلد پر واقع ہیں۔ سب سے بڑا علاقہ وہ ہے، جو بحیرۂ روم کے ارد گرد واقع ہے۔ دوسرے علاقے حسبِ ذیل ہیں:۔ شمالی امریکہ میں کیلیفورنیا، جنوبی امریکہ میں وسطی چلی، مغربی افریقہ میں جنوب مغربی صوبجات کیپ اور مغربی آسٹریلیا کا جنوب مغربی حصّہ۔

اس خطّے کے علاقوں کے درجۂ حرارت اور بارش کے اندازوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ اگر ہم مشرق کی سمت بڑھتے جائیں، تو سردی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سرد مہینے کا درجۂ حرارت چھیالیس درجے ہے اور زیادہ وسیع علاقوں میں تو پچاس درجے تک بھی ہوتا ہے۔ موسم گرما میں گرمی بھی خاص پڑتی ہے اور خشکی بھی۔ زیادہ سے زیادہ گرم مہینے کا اوسط درجۂ حرارت ستر درجے ہے۔ اکثر علاقوں میں درجۂ حرارت اسّی درجے بھی ہوتا ہے۔ سردیوں میں بارش کی وجہ سے بہت زیادہ ٹھنڈک ہو جاتی ہے، لیکن جب مطلع صاف ہوتا ہے، تو سورج خوب چمکتا ہے۔ اس سے سردی کی شدّت کی بڑی حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ بارش کی مقدار بھی مختلف جگہوں میں مختلف ہے۔ سالانہ اوسط دس سے چالیس انچ کے مابین ہوتی ہے۔ کھلی جگہوں پر بارش بہت ہوتی ہے۔ سرما میں زمین نم ہوتی ہے اور گرما میں خشک۔ اس لیے ضروری ہے کہ پودے اسی پانی سے سال بھر کے لیے نمی حاصل کریں، جو سرما میں اکٹھا ہو جاتا ہے اور اس طرح گرما کی خشکی سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ آب و ہوا ایسے گھاس اور پودوں کے لیے مفید نہیں، جو زمین کی اوپر ہی کی سطح میں رہ جاتے ہیں اور جنھیں موسم گرما میں آغازِ بہار میں ہلکی ہلکی بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ بحیرۂ روم کے خطّے کی نباتات سدا بہار درختوں، بوٹیوں اور پھول دار

پودوں پر مشتمل ہے۔ ان کے پتوں کی ساخت اس قسم کی ہوتی ہے کہ نمی ان کے اندر دیر تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ زیتون اور بعض دیگر قسم کے درختوں کے پتوں پر ریشمی رویں سے اُگ آتے ہیں۔ یہ اسباب قدرت کی طرف سے مہیا ہیں تاکہ موسم کی شدت سے محفوظ رہیں۔ بیشتر پودوں، مثلاً انگور کی بیلوں کی جڑیں لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ بحیرۂ روم کے خطے کے نم آلود حصوں میں اچھے اچھے جنگلات ملتے ہیں۔

گرما کے خشک موسم کا ایک یہ فائدہ ہے کہ پھل اچھی طرح سے پک جاتے ہیں۔ سنگترہ، لیموں، نارنگی اور انگور وغیرہ یہاں کے مشہور پھل ہیں۔

گیہوں اور جَو بھی ہوتے ہیں۔ شہتوت کا درخت بہت ملتا ہے۔ سردیوں میں پہاڑ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ برف پگھلتی ہے، تو دریا چل نکلتے ہیں۔ آبپاشی زیادہ تر انھیں دریاؤں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ خطے کی اقتصادی ترقی میں ان دریاؤں کا بڑا حصہ ہے۔ اس خطے کی آب و ہوا انسان اور نباتات کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی قومیں تمدن کے اعتبار سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو زندگی کی بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ آب و ہوا بھی اچھی ہے، اس لیے ان کی طبیعتوں کا رجحان زیادہ تر عافیت اور سستی کی طرف ہے۔ لوگ بہت جلد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ گرما کی شام بے حد دلکش ہوتی ہے۔ یہ علاقے بہت بڑی آبادی کے کفیل ہیں۔ جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا میں ان علاقوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ بحیرۂ روم کے خطے کی پیداوار تقریباً ہر علاقے میں پائی جاتی ہے۔ انگور ہر علاقے میں ملتا ہے۔ سنگترے، لیموں، انگور اور دیگر پھلوں کے معاملے میں یورپ، کیلیفورنیا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے درمیان بڑی رقابت ہے۔ انگلینڈ میں سنگترہ صرف سردیوں کے موسم میں ملتا ہے، لیکن بحیرۂ روم کے خطے کے جنوبی کرے میں، جہاں کے موسم انگلینڈ سے مختلف ہوتے ہیں، یورپین مارکیٹ میں آپ کو ہر وقت نظر آجائینگے۔ اس

خطے میں، بحیرۂ روم کے جزیرے اور ارد گرد کے جزیرہ نما اسپین، پرتگال، جنوبی فرانس، اٹلی، یونان، روم، ایشیائے کوچک کے شام اور فلسطین کے مغربی ساحلی میدان، مراکو، الجیریا اور ٹیونس کا شمالی حصہ) شمالی امریکہ، شمالی کیلیفورنیا، جنوبی امریکہ میں چلی کا وسطی میدان وغیرہ شامل ہیں۔

گرم معتدل آب و ہوا کا خطہ۔ بحیرۂ روم کے خطے کی آب و ہوا براعظموں کے مغربی حصے میں ہوتی ہے۔ مشرقی حصوں میں ایک ہی عرض بلد کے درمیانی مقامات کا درجہ حرارت ملتا جلتا ہوتا ہے۔ بارش موسم گرما میں ہوتی ہے۔ یہ علاقے روئی کے علاقے کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ خطہ حسب ذیل علاقوں پر مشتمل ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ، بیشتر حصہ چین اور آسٹریلیا کا، آسٹریلیا کے جنوب مغربی ساحلی علاقے، جنوبی افریقہ، ارد گوئے اور جنوبی افریقہ میں جنوب مشرقی براز یل۔

بحیرۂ روم کے خطے میں یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن یہاں آب و ہوا یکساں نہیں ہوتی۔ ہر علاقے میں یہاں کے طبعی حالات کا اثر جداگانہ ہوتا ہے۔ جنوب مغربی ممالک میں اوسط درجے کی بارش سال بھر ہوتی رہتی ہے۔ عام طور پر گرما کے آخری حصے میں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ براعظموں کے اندرونی حصوں میں گرمی کے سبب دباؤ کم ہو جاتا ہے اور تجارتی ہوائیں سمندر سے اٹھ کر کم دباؤ والے حصوں میں پہنچتی اور مینہ برساتی ہیں۔ یہاں کی بڑی پیداوار کپاس ہے۔ وسطی اور شمالی چین ایشیا کے مون سون علاقے کے خطے ہیں۔ ان کی آب و ہوا ہندوستان اور جنوبی چین سے مختلف ہے، بالخصوص سردیوں کے موسم میں، بارش ہندوستان ہی کی طرح ہوتی ہے۔ حرارت کی وجہ سے ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے سمندر سے ہوائیں بخارات لے کر اٹھتی ہیں اور کم دباؤ والی جگہ لے لیتی ہیں۔ اور مینہ برساتی ہیں۔

سردی کے موسم میں سرد ہواؤں کو کوہ ہمالیہ روک لیتا ہے، لیکن چین اس معاملے میں خوش نصیب نہیں سخت سرد ہوائیں سارے موسم سرما میں سمندر کی جانب چلتی رہتی ہیں اور درجۂ

حرارت نقطۂ انجماد تک پہنچ جاتا ہے۔ پیکنگ کا درجۂ حرارت جنوری میں نقطۂ انجماد سے بھی گر جاتا ہے۔ شمالی اور وسطی چین میں زور کی برف باری ہوتی ہے۔ موسم گرما میں خاص گرمی اور نمی ہوتی ہے۔ مغربی علاقوں میں چاولوں کے لیے یہ آب و ہوا بہت مفید ہے۔ شمالی علاقوں میں بڑی بڑی فصلیں، گیہوں اور باجرے کی ہوتی ہیں۔ وسطی چین میں روئی ہوتی ہے۔ جنوبی کرے کے تین برِاعظموں کے علاقوں کی آب و ہوا ایک سی ہے، سارا سال بارش ہوتی رہتی ہے۔ گرمیوں میں تجارتی ہوائیں کچھ زیادہ ہی مینہ برساتی ہیں، لیکن یہ جنوبی برِاعظم بہت زیادہ وسیع نہیں۔ سردی کے موسم میں ان ہواؤں کا بہت زیادہ دباؤ بھی نہیں ہوتا۔ سرد ہوائیں باہر کی جانب چلتی رہتی ہیں، اس لیے جنوبی علاقے بہت زیادہ معتدل ہیں اور سردی بھی اعتدال کی ہوتی ہے۔ ملک ملک کی نباتات مختلف ہے۔ جنگلات بڑے بڑے ہیں، جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے، وہاں کے جنگلات سدا ہرے بھرے رہتے ہیں۔ یہ جنگلات استوائی جنگلات کے مقابلے کے ہیں، لیکن ان میں درخت زیادہ کھلے کھلے ہوتے ہیں۔ ناریل بہت علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ چین کے بہت سے قدرتی جنگلات کاٹ ڈالے گئے ہیں، اس لیے یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ وہاں جنگلات کس قسم کے تھے۔ جاپان کی آب و ہوا بھی ایسی ہی ہے، لیکن یہ چونکہ جزیرہ نما ہے، اس لیے حالات کچھ مختلف ہیں۔ یہ تمام علاقے انسانی آبادی کے لیے بہت موزوں ہیں۔ وسطی چین کی وادیوں میں چاول، کپاس، چائے، ریشم وغیرہ پیداوار ہوتی ہے اور اس لحاظ سے مون سون علاقوں سے مشابہ ہے۔ آبادی بہت زیادہ ہے، جس کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ آبادی فی مربع میل تین ہزار نفوس ہے۔ امریکہ ساری دنیا کی کپاس کا ذخیرہ ہے۔ آسٹریلیا کے مشرقی گھاٹ اور ناٹال میں کافی لوگ آباد ہو گئے ہیں۔ جہاں بہت سے جنگلات ایسے ہیں کہ انھیں چھیڑا تک بھی نہیں گیا۔ جنوبی امریکہ میں تو بہت سے جنگلات ایسے ملیں گے کہ ان میں انسان کی گزر مشکل ہے اور ان کی ہوا مضرِ صحت بھی ہے، اسلیے

ان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ۔

سو معتدل بحری آب و ہوا کا خطہ۔ اب ہم ایسے علاقوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو یورپ میں برطانوی جزائر اور شمالی امریکہ میں برطانوی کولمبیا کے ساحلی علاقوں پر مشتمل ہیں۔ یہ علاقے مغربی ہواؤں کے رہگذر میں واقع ہیں، مینہ برسانے والی ہوائیں سمندر سے اٹھتی ہیں اور سارا سال چلتی رہتی ہیں۔ اس خطے کی آب و ہوا کی دو خصوصیتیں ہیں۔ اولاً یہ کہ گرما اور سرما میں درجۂ حرارت کا تفاوت کم ہے۔ سارا سال بارش ہوتی رہتی ہے، مغربی ہوائیں تجارتی ہواؤں کی طرح یکسانیت کے ساتھ نہیں چلتیں، بلکہ بگولوں کی صورت میں چلتی ہیں۔ جغرافیائی اصطلاح میں یہ ہوائیں سائیکلون Cyclone. اور اینٹی سائیکلون (Anticyclone.) کہلاتی ہیں۔ شمال مغربی یورپ کے رہنے والے اچھی طرح اس امر سے آگاہ ہیں کہ مقامی موسمی حالات کا انحصار زیادہ تر انھیں سائیکلون اور اینٹی سائیکلون پر ہوتا ہے۔ سب سے بڑا علاقہ، جس کی آب و ہوا ایسی ہے، شمال مغربی یورپ ہے، لیکن برطانوی کولمبیا اور شمال مغربی ممالک متحدہ بھی اس خطے کے بہت اہم علاقے ہیں۔ چلّی کے مغربی حصے میں ایک چھوٹا سا علاقہ شامل ہے۔ افریقہ کا کوئی حصہ اس خطے میں شامل نہیں۔ آسٹریلیا میں تسمانیا اور نیوزی لینڈ اس میں شامل ہیں۔ یورپ میں گرم رووں کے باعث آب و ہوا کچھ زیادہ شدید نہیں۔ جوں جوں آپ مشرق کی طرف بڑھتے جائیں، سردی بتدریج بڑھتی جاتی ہے اور نسبتہً کم بڑھتی ہے۔ اس اعتبار سے یورپ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل شمال مشرقی یورپ، جس میں سردیوں کا درجۂ حرارت درجۂ انجماد سے کچھ اوپر ہے اور اوسط درجۂ حرارت چالیس درجے تک پہنچتا ہے۔ دوم وسطی یورپ، جہاں کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کم ہوتا ہے۔ گرم مہینوں کا اوسط درجۂ حرارت پچاس اور چھپتر کے درمیان ہے اور اوسط درجۂ حرارت پینسٹھ درجے ہے۔

بارش سال بھر خاص خاص موقعوں پر ہوتی ہے، لیکن مختلف جگہوں پر اس کا اندازہ مختلف

ہوتا ہے۔ مغربی جانب پہاڑ واقع ہیں اور وہاں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے سلسلہ ہائے کوہ کے مشرق میں خشک میدان ہیں۔ برطانیہ کے بعض حصّوں میں اسّی انچ سے زائد بارش ہو جاتی ہے۔ اور لیک کے ضلعے میں بھی۔ انگلینڈ کے مشرق میں بارش مشکل سے بیس انچ ہوتی ہے اور جرمنی کے مشرق میں اٹھارہ انچ تک ہوتی ہے۔

سرد معتدل آب و ہوا ایسے درختوں کے لیے قدرتی طور پر بہت مفید ہے، جن کی پت جھڑ ہوتی ہے۔ مون سون ہواؤں کے علاقے میں پت جھڑ گرمیوں میں ہوتی ہے۔ سرد معتدل آب و ہوا کے علاقے میں پت جھڑ سردیوں میں ہوتی ہے۔ ان جنگلات میں بہت سی مفید مگر سخت لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ یہ لکڑی استوائی خطے کی لکڑی سے نرم ہوتی ہے، لیکن شہتوت وغیرہ کی لکڑی سے سخت ہوتی ہے۔

پت جھڑ والے جنگلات شمال مغربی اور وسطی یورپ میں ہوتے ہیں۔ سرد معتدل آب و ہوا انسان کی نشو و ارتقا کے لیے بہترین آب و ہوا ہے۔ سردی یہاں کافی پڑتی ہے۔ سردی سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کافی جسمانی محنت کا کام کیا جائے۔ گرمیوں میں اتنی گرمی نہیں پڑتی کہ کوئی بیرونی کام کیا ہی نہ جا سکے۔ اس میں کلام نہیں کہ افراد اور قومیں منطقہ حارہ کی نسبت یہاں پر آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہیں لیکن یہ ترقی کی طرف جو قدم اٹھاتے ہیں، نہایت استوار اور مستقل ہوتا ہے۔ دنیا کے بہت سے تجارتی ملک برطانیہ، فرانس، جرمنی، بلجیم اور زیکوسلاویکیا اسی خطے میں پائے جاتے ہیں۔ یورپ کے اکثر و بیشتر حصّوں سے جنگلات کاٹ ڈالے گئے ہیں اور ان کی جگہ گلہ بانی، زراعت اور صنعت نے لی ہے۔ تمام اجناس گندم، جو، رائی وغیرہ خشک علاقوں میں اگتے ہیں اور گرم حصّوں میں جوار اگتی ہے۔ وہاں کے پھل سیب، بہی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ خشک علاقوں کی پہاڑی چراگاہوں میں بھیڑ بکریاں پالی جاتی ہیں۔ جن علاقوں میں زیادہ نمی ہے، وہاں گھاس

بہت ہوتی ہے اور مویشی کے لیے چراگاہیں بہت ہیں۔ جنوبی امریکہ کے سرد معتدل علاقے میں اصلاح و ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ برطانوی کولمبیا کا اکثر حصّہ چونکہ پہاڑی ہے، اس لیے وہاں زیادہ لوگ آباد نہیں ہو سکتے۔ گہری وادیوں میں، جو سلسلہ ہائے کوہ کو آپس سے جدا کرتی ہیں، بارش کم ہوتی ہے۔ بعض علاقے ایسے بھی ہیں کہ وہاں بارش پانچ انچ سے زائد نہیں ہوتی۔ جنوبی کرّے میں نیوزی لینڈ نے کافی ترقی کی ہے۔ چلّی کے علاقے میں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ لیکن وہاں پہاڑوں کا سلسلہ بھی دراز ہے، اس لیے وُہ علاقہ ترقی سے محروم ہے۔

ڈالٹن پلین

تجویز تعلیم انفرادی

از

محمد عبدالغفور خاں صاحب خلیق، ادیب فاضل، منشی فاضل

پہلا باب

وقت آگیا ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ موجودہ و مروجہ طریقۂ تعلیم میں وہ کیا خامیاں ہیں، جن کی وجہ سے ہر طالب علم بجائے خود اور ہر مدرس بحالِ خود ہراساں و پریشاں نظر آتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان، جن کو اسکول کی دوسری ذمّے داریوں، دُور از خیال مشکلوں، نائبوں کی کوتاہیوں اور بے معنی خانہ جنگیوں سے گزر کر اسکول کی اعلیٰ جماعت کے نتائج بہترین ثابت کرانے اور اسکول کی روایات قائم رکھنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے، کیوں سر پکڑ پکڑ کر بیٹھتے اور طلبہ کی انتہائی کمزوری، بے پروائی اور عدم توجہی کا رونا روتے رہتے ہیں اور بحالتِ مایوسی متانت و وقارِ منصبی کو خیرباد کہہ کر کھسیانی بلّی کھمبا نوچے کے مصداق نیچے کی جماعتوں میں کام کرنے والے اور ذمّے دار اُستادوں پر گرجتے برستے ہیں یا اگر کچھ مروت و چشم پوشی سے کام لیتے ہیں، تو "قہرِ درویش بجانِ درویش" کے مشہورِ عالم مقولے کے مطابق اپنی ہی قسمت و ناکامی کو قصور وار گردانتے ہیں۔

مایوسی ایسی کھلی اور مخفی حقیقتوں کی موجودگی اس امر کی ضامن ہے کہ ہم موجودہ طرزِ تعلیم سے کم و بیش اکتا ضرور گئے ہیں۔ اس کی خامیوں اور دور از کار مشکلات نے ہراسان و پریشاں کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سخت مایوسی اور گھبراہٹ کے عالم میں حصولِ مقاصد کے لیے غیر منضبط طور پر پائیں

بائیں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہیں۔

لیکن چونکہ خود مدرسین بھی موجودہ طرزِ تعلیم سے غیر محسوس طور پر متاثر ہو چکے ہیں، اس لیے ان کی قوتِ ارادی بھی مضمحل ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ مدرسین تو ایک طرف، خود ممتاز و اعلیٰ مدرسین بھی مروّجہ اصول و طرزِ تعلیم کو چھوڑ کر کسی دوسرے ممکن العمل اور مفید اصول و طریق کی طرف متوجہ ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے اور اپنے زمانۂ تعلّم سے زمانۂ تعلیم تک اسی مروجہ ماحولِ تعلیم میں رہنے کے باعث غیر معمولی طور پر اس کے اس قدر حامی ہو چکے ہیں کہ کسی نئے تجربے کو زیرِ عمل لا کر مقابلہ کرنے کا احساس ہی کھو بیٹھے ہیں۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عموماً اسی طرزِ تعلیم کو، جس میں طلبہ کی جماعتیں بنا کر اوقاتِ تعلیم کو مضامین کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا ہے اور پھر انضباطِ اوقات پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے، محض نمائش اور دکھاوے کے لیے برائے نام سامنے رکھ کر مختلف قابلیت و ذہنیت کے طلبہ کے دماغوں میں مقررہ نصابِ تعلیم کے نکات و مسائل اور اُن کے متعلق دوسروں کے خیالات ٹھونسنے کی اندھا دھند کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح دی ہوئی تعلیم و تربیت کا (اگر اسے تعلیم و تربیت کہہ سکیں) اندازہ کرنے کے لیے سال کے آخر پر امتحان کے مروّجہ طریق پر اُنھیں طوطے کی طرح رٹائے ہوئے خیالات کے اعادے کو وسیلۂ کامیابی قرار دیدیا جاتا ہے۔ گویا اس خوبصورت مگر بدحواسانہ قائم کردہ معیارِ قابلیت کی بلا کو امتحان کا نام دے کر ایک زبردست بُرائی کو رواجِ عام کا فرمان عطا کیا جاتا ہے، جو تمام دنیا کی تباہیوں، بربادیوں اور جنگِ عظیم جیسی لعنتوں کا واحد ذمّے دار ہے۔

اب یہ سمجھنا ہے کہ یہ خوبصورت بلا جسے عرفِ عام میں امتحان کہا جاتا ہے، کیا ہے؟

لیجیے! سُنیے اور ذرا غور سے سُنیے! طلبہ کی استعدادِ علمی پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر رشک و حسد کی

خلیج وسیع کر دینے، اطمینان کی جگہ اضطراب و بے تابی پیدا کرنے اور بے اعتباری و بدگمانی کا طوفان دنیائے اخلاق میں بپا کرنے کا نام ہے "امتحان"، جو نہ تو طلبا کی صحیح قابلیت جانچنے کا معیار ہے اور نہ باقاعدہ و بتدریج، ٹھوس، جامع اور موثر و پائیدار، تعلیم و تربیت کا محرکِ کار۔

تماشا یہ ہے کہ بے اعتباری کا شاندار مظاہرہ تو سال بسال ہمیشہ ہی بلاناغہ کیا جاتا ہے، لیکن سوچا نہیں جاتا کہ طلبہ کی اس پست اخلاقی کا اصل سبب جس کے لیے اتنے پاپڑ بیلے ہیں، چھپا ہے، تو آخر کہاں چھپا ہے؟ اور اس کا کیا علاج ہے؟

چونکہ ہم نے سوچا ہے اور عقل و دانش کی کسوٹی پر اس کو پرکھ کر کھوٹا پایا ہے۔ اس لیے یہ بیان کر دینے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ اگر جماعتی تعلیم کا طریقہ موثر و مفید ہے اور اس کے ذریعے ذہنی و اخلاقی تعلیم ٹھیک اور پائدار ہوتی ہے، تو پھر امتحان کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ پرچہ سوالات دے کر سپروائزر صاحبان کمرۂ امتحان سے باہر تشریف لے جائیں اور طلبا پر اعتبار کریں اور اگر یہ ممکن نہیں، تو پھر تعلیم اور امتحان کے ان دونوں طریقوں کو کرنے کے لیے وہی کریں، جو ہماری تجویز کا منشا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے موجودہ طرزِ تعلیم کے سلسلے کی ایک کڑی امتحان کا اصلی چہرہ، جو چند در چند مصلحتوں کے نقاب میں چھپا ہے اور جس کی بدولت تعلیم و تربیت کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے اور طلبہ میں خود سوچنے، نتائجِ غور و فکر کو بوجہ احسن اپنے الفاظ میں ظاہر کرنے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی مدد آپ کرنے اور کارگاہِ عمل میں اپنی کشتی کو خود کھینے کی قوتیں اول تو پیدا ہی نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں، تو ان کی نشو و نما جیسی کہ چاہیے نہیں ہو سکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی اور وہ دنیا میں اپنی زندگی کو کامیاب بنانے اور اپنے حریفوں سے میدان جیتنے کے لیے جائز طور پر، جو محنت اور وقت صرف کرتے ہیں، سب

اکارت جاتا ہے، کیونکہ ان کے پاس وُہ سرمایہ ہی نہیں، جس کی انھیں سچی کامیابی کے لیے قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔ جانتے ہو کہ وُہ سرمایہ کیا ہے؟ یہی ہمارے جسمانی اور دماغی قوا، جو قدرت نے ہماری شخصیت کو اعلیٰ اور ارفع بنانے اور دُنیا میں اپنے حریفوں سے جائز طور پر بازی لے جانے کے لیے ودیعت فرمائے ہیں۔

ایسی اوپری اور اُچٹتی ہوئی غیر موثر و ناپائدار تعلیم کے ثمرات جو بھی ہیں، وُہ آپ کے سامنے

"ایم۔اے بنانے کے کیوں مری مٹی خراب کی"

کے مشہور عالم مقولے کے مفہوم میں جلوہ گر ہیں۔

موجودہ دنیا پچاس یا سو سال پیشتر کی دنیا سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس سے قبل دُنیا نے کبھی ایسی بلند آہنگی کے ساتھ ایسے آدمیوں کو میدانِ عمل میں قدم بڑھانے کی دعوت نہیں دی، جو تعلیم و تربیت کے اعتبار سے قابلِ اعتماد اور ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ جن کے دماغی قوا میں وسعت اور نشو و نما کا جوہر موجود ہے اور جو تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے انسانیت کا ایک عملی نمونہ ہیں۔

اسی لیے ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ہر وہ چھوٹی سے چھوٹی خامی، جو ہمارے طریقۂ تعلیم میں موجود ہے اور ہر وہ خفیف سے خفیف لغزش جو کفایت شعاری یا کسی سرمایہ دارانہ مصلحت کی بنا پر ہماری درس گاہوں سے دُور ہو جانی ممکن ہے، گرفت میں لانے اور اس کے غیر محسوس خفیف مگر دیرپا اثر کو زائل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دورِ حاضرہ میں زندگی کی افسوسناک ناکامی دراصل مرد یا عورت کی غلط اور ادھوری تعلیم یا تربیت کا نتیجہ ہے۔ جائے غور ہے کہ انسان کی زندگی کا افسوسناک انجام اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس کام کو وُہ کرنا چاہتا ہے، اُسے باحسن وجوہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔

دوسرا باب
اظہار مافی الضمیر

تعلیم کا اصل مقصد جہاں تک کہ اس کا تعلق دماغ سے ہے، طلبہ میں خود سوچنے، غور کرنے اور پیدا شدہ خیالات کو اپنے الفاظ میں بطریقِ احسن بیان کرنے کا ملکہ پیدا کرنا ہے اور یہی وہ ملکہ ہے، جس کو اظہار مافی الضمیر (Self Expression) کہتے ہیں اور جو تعلیمی دنیا میں قوت بیانیہ کے نام سے موسوم و معروف ہے۔

دورانِ تعلیم میں اس کی قدر و قیمت ۔ ہم خواہ کسی طریقے سے تعلیم دیں مقصود بالذّات بہر نوع یہی ہوتا ہے کہ طلبہ دیے ہوئے یا از خود پیدا شدہ خیالات کو اپنے الفاظ میں بذریعۂ تقریر و تحریر صفائی کے ساتھ ظاہر کر سکیں اور یہ ایک ایسی چیز ہے، جس کے بغیر تمام کوشش و سعی بیکار، اور طالب علم کا دماغ بمنزلہ اس خزانے کے ہے، جس پر مہر کر دی گئی ہو اور جس کے کھولنے اور اس کے اندر کی بند چیزوں کو کام میں لانے سے ہمیں کوئی سروکار نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے خزانے کا ہونا یا نہ ہونا یکساں ہے۔ "برائے نہادن چہ سنگ و چہ زر" اس لیے تعلیم و تعلّم میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے، وُہ دوسری کسی بات کو نہیں۔

ایک ایسا طالب علم جو اظہارِ خیال کی قابلیت نہیں رکھتا، بلکہ محض طوطے کی طرح رٹے ہُوئے چند جملوں کو بجنسہٖ حرف بحرف ادا کر دینے ہی کو معراجِ کمال اور ذریعۂ کامیابی خیال کرتا ہے، اس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وُہ تعلیم سے کسی حد تک بھی بہرہ ور ہوا ہے، زود اعتقادی میں داخل اور حصولِ تعلیم کے عام مقصد و مذاق کو نظر انداز کرنا ہے، اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے، جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ "چار پائے بر وکتابے چند"

پس ثابت ہوا کہ وہی تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم کہلانے کی مستحق ہے، جو طلبہ میں اظہار مافی الضمیر

(Self Expression.) کی قوت پیدا کر سکے اور یہی وہ چیز ہے، جو موجودہ ومروجہ جامع طریقۂ تعلیم سے پیدا نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے، تو اتنی کمزور کہ معمولی بے توجہی یا سہل انگاری سے پھر مفقود ہو جاتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اکثر بچے جو گھریلو یا بازاری باتیں کرنے میں بڑے لسان چرب زبان معلوم ہوتے ہیں، جب کسی علمی مسئلے پر بولنے یا لکھنے لگتے ہیں، تو اُن کی زبان تتلا جاتی اور اُن کے قلم رُک جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اسی لیے کہ موجودہ طرزِ تعلیم میں اُنھیں بہت کم موقع ملتا کہ وہ کسی مسئلے کے متعلق آزادی سے سوچ سکیں اور نتیجۂ فکر کو بذریعۂ تحریر و تقریر اپنے الفاظ میں ا کر سکیں۔ اس لیے یہ ایک اصولی اور بنیادی نقص ہے، جس کی کمی کو پورا کرنے کا واحد ذمّہ دار اگر ہو سکتا ہے، تو وہ "ڈالٹن پلین" (تجویز انفرادی تعلیم) ہے۔ جس میں اس کا بہت زیادہ موقع ملتا۔ اور جہاں قدم قدم پر طالب علم کو دوسروں کے حاصل کردہ خیالات اور اپنے پیدا شدہ خیالات کو بذریعۂ تحریر یا تقریر ضرور ظاہر کرنا پڑتا ہے، ورنہ بصورت دیگر طالب علم کے لیے آگے بڑھنا محال نہیں، بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ انسان خواہ کیسا ہی قابل تعلیم یافتہ، ہوشیار، بارسوخ کیوں نہ ہو، لیکن اگر اس میں یہ خامی ہے کہ وہ جلد کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا اور فوراً اپ خیالات کو ایک نقطے پر جمع نہیں کر سکتا، تو وہ زندگی کی دوڑ میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اک ایسے لوگوں کی طرف سے ان کے دوستوں اور رشتے داروں کو محض اس لیے مایوسی ہوئی ہے کہ وہ کسی خاص نکتے یا موضوع پر اپنے خیالات کو بوجہ احسن ظاہر کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے

پیدا شدہ خیالات کو جامع و مناسب الفاظ میں ظاہر کرنے سے قوتِ فیصلہ کی نشو و نما خیالات میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب مشق بڑھ جاتی ہے، تو قادر الکلامی کا یہ ہوتا ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو نہایت مختصر و جامع الفاظ اور موثر انداز

بآسانی ظاہر کرنے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض مشاق و قادر الکلام مقررین کی یہ حالت دیکھنے اور سننے میں آئی ہے کہ وہ آغازِ تقریر میں تو چند الفاظ یا جملے اپنی قوتِ ارادی سے بیان کرتے ہیں اور پھر جب طبیعت ذرا گرما جاتی ہے، تو بغیر کسی ارادے کے خود بخود ان کی زبان سے نہایت نپے تُلے الفاظ اور محل کے مطابق زوردار موثر جملے ادا ہونے لگتے ہیں۔ ان کی یہ تمام فصیح کلامی اور جادو بیانی زیادہ تر اسی ابتدائی مشق و مزاولت کی مرہونِ منت ہوتی ہے، جو انھوں نے دورانِ تعلیم میں یا فنِ تقریر شروع کرنے کے اوائل میں کی ہوتی ہے۔

دُنیا میں دوسروں کو ہم خیال بنانے اور زبردست سے زبردست حریفوں کو چشم زدن میں متاثر کر کے تسخیر کر لینے کا ذریعہ تقریر ہے یا تحریر۔ تاریخ گواہ ہے کہ تحریر و تقریر کا کمال ایک ایسا چلتا ہُوا جادو ہے، جس کا توڑ باایں ہمہ تہذیب و ترقی آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔ ایک مشتعل مجمع کو ٹھنڈا کر دینا اور مردہ دلوں کے منجمد خون کو آتشِ غیرت و حمیت سے جوش دے کر مشتعل کر دینا۔ ہنستوں کو رونے پر مجبور کرنا اور روتوں کو کھِل کھلا کر ہنسا دینا ایک جادو بیان شاعر یا مقرر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جولیس سیزر شہنشاہ روما کے قتل پر خود اس کے معاونین کا تُل جانا، اگر ایسے ہی کلام سحر آفریں کا کام تھا، تو مقتول شہنشاہ کی لاش پر نفرین و ملامت کرنے والے بے حد مشتعل ہجوم کے دلوں کو پھیر کر غم و افسوس کی لہر دوڑانے اور چند ہی منٹ بعد قاتل امراء سے انتقام لینے پر آمادہ و مستعد کر دینے کا کام سرانجام دینے والا بھی یہی جادو تھا، جو مارک انٹینی کی زبان سے ادا ہُوا۔

پس ہمیں لازم ہے کہ شروع ہی سے اپنے شاگردوں میں اس نادر الوجود جوہر کی نشوونما کا خیال رکھیں اور جہاں تک ہو سکے انھیں موقع دیں کہ وُہ اپنے مطالب کو کم سے کم الفاظ میں صاف، واضح اور مؤثر طریق پر ادا کرنے کا سلیقہ پیدا کرنے لگیں۔ (باقی آئندہ)

ہماری غذا

از

فیروز حسن صاحب بٹ ایم اے، ایم او ایل، بی ٹی

اس عالم اسباب میں کوئی شئے فوائد سے خالی نہیں۔ کسی میں فوائد کم ہیں کسی میں زیادہ اور یہ انسانی درک، فراست اور تجربے کے توسط سے طشت از بام ہوتے رہتے ہیں۔ نقادانِ زما اس نظریے پر متفق ہیں کہ انسانی بقا کے لیے ہوا کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ ہوا سے عبارت متعفن آمیز ہوا نہیں بلکہ تازہ، صاف اور مفرح ہوا مراد ہے۔

انسانی نقطۂ نظر میں ہوا سے دوسرے درجے پر پانی ہے۔ اگر انسان کو پانی کے سوا اور کچھ نہ ملے، تو وہ چند روز تک بقیدِ حیات رہ سکتا ہے، لیکن مادرِ قدرت نے انسان اور جمیع حیوانات کے حفظ و بقا کے لیے ہر تخلیق کردہ شئے میں پانی کا کچھ نہ کچھ عنصر ودیعت کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فردِ بشر بغیر پانی پیے مسلسل کئی ماہ تک پانی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہوئے زیست کا لطف اٹھا سکتا ہے۔

اس مجمل مقدمے کے بعد ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ ہمیں کیا کھانا چاہیے۔

اکثر لوگ اپنی اشتہا کو کسی نہ کسی خوردنی شے کے استعمال سے فرو کر لیتے ہیں۔ یوں تو ایک گدھا بھی کسی کوڑی پر چرچگ اور ادھر ادھر منہ مار کر پیٹ کے دوزخ میں خورش کا ایندھن ٹھونس لیتا ہے، لیکن نتائجِ معلوم سا انسان کی شان اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔

فی زمانہ حفظانِ صحت کی جملہ تحریکات میں غذائی تعلیم کا مسئلہ سب سے اہم اور اخص ہے

تمام متمدن ممالک کے طول وعرض میں سیکڑوں ادارے مسئلۂ صحت کے حل کے لیے قائم ہیں۔ ان کا مقصد وحید عوام الناس کو قوی ہیکل، تنومند اور تندرست بنانا ہے۔ ان کی تمام تر سعی دفاع مرض ہے۔ امراض کو قبل ازیں کہ لاعلاج ہو جائیں، معلوم کر لینا اور علمی ایجادات کی وساطت سے ان کا قلع قمع اور استیصال کرنا ان کا اولین فرض ہے۔ اس قبیل کے مسائل بجملہ ادبی اور علمی مسائل کے ہمارے موقر انسپکٹران مدارس کے جاذب التفات ہونے چاہییں۔ لہٰذا مضبوط اجسام کی تعمیر کے لیے کسی خاص وصف کی خوراک لازمی ہے اور بیماریوں کے سدِّباب کے لیے خراب خوراک سے احتراز واجتناب ضروری ہے۔

میں اس مسئلے پر بحیثیت ایک اُستاد چند سطور تفویض قلم کروں گا۔ میری تمام نقد و نظر اور جرح وقدح طلبہ تک ہی محدود ہوگی۔ طالب علموں کو صاف ستھرا رہنے اور جسمانی مضبوطی کی تعلیم دینی چاہیے۔ ان کے لیے لازمی ہے کہ جسمانی تنومندی کے معیار کو نظر انداز نہ کریں، کیونکہ یہ محض انفرادی نقصان ہی نہیں، بلکہ قومی اور ملی خسارہ ہے۔

اساتذہ کا صرف یہی فرض نہیں کہ مدرسے میں بچے کی دماغی اور ذہنی نشوونما کا خیال رکھیں، بلکہ ان کا فرض عین یہ بھی ہے کہ ان کی تمام زندگی کی بالیدگی اور نشوونما کی نگہداشت کریں۔ ان کی دماغی، ذہنی، جسمانی اور اخلاقی، معاشری اور عمرانی بلکہ جمالی اور ان کی زندگی کے جتنے بھی شعبے اور کوائف ہو سکتے ہیں، سب کو ایک ساتھ پھولنے پھلنے اور پروان چڑھنے کی توفیق عطا کریں۔

جو اُستاد ان محولۂ بالا فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوتا، وہ حقیقی معنوں میں استاد کہلانے کا مستحق نہیں۔ کرسی حکومت پر متمکن ہو کر ہر کہ ومہ چیخ چلا کر گلا پھاڑ کر سونٹے گھونسے کے بل بوتے پر زیر تعلیم معصوم روحوں سے مارے باندھے کام لے سکتا ہے، لیکن صحیح معنوں میں یہ تربیت نہیں۔

جسم کی ضروریات ملحوظ رکھتے ہُوئے اغذیہ واشربہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جس کے متعلق ذیل کی چند سطور ہدیۂ ناظرین ہیں کہ خوراک ہماری تین حوائج کی کفیل ہے:۔

(۱) غذا بمنزلہ ایندھن کے ہے، ہمارے جسم میں گرمی اور طاقت پیدا کرتی ہے۔ اس سے ہمارے بدن کا خارجی اور داخلی نظام مشغولِ کار رہتا ہے۔

(۲) غذا ہماری جسمانی نمو اور ترمیم کے لیے تعمیری مواد بہم پہنچاتی ہے۔

(۳) یہ جسمانی عوامل و وظائف کو منظم و مرتّب کرتی ہے۔

ایک صحیح سالم، چاق چوبند اور تندرست جسم میں شرائط ثلاثہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ تینوں غیر متناسب مقدار میں ہوں، تو صحت کا قیام و دوام معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ اِس خطرے کے انتہائی درجے کا نام موت ہے۔

حفظانِ صحت کے محققین نے بلحاظ اجزائے ترکیبی اغذیہ کو پانچ حصص میں تقسیم کیا ہے (۱) پروٹینز (۲) کاربوہائیڈریٹس جس میں قند مصری شکر اور آٹا سوجی شامل ہیں۔ (۳) شحمیات جس میں گھی تیل اور چربی وغیرہ شامل ہیں۔ (۴) معدنی نمکیات جو کانوں سے برآمد ہوں (۵) پانی۔

ہر کھانے کی چیز ان میں سے کوئی نہ کوئی جُز جسم کو عطا کرتی ہے۔ پروٹینز چربی اور کاربوہائیڈریٹس رکھنے والی غذائیں گرمی پہنچانے والی غذائیں ہیں۔ کاربوہائیڈریٹس سب سے کم گرمی اور قوت دیتی ہیں اور زود ہضم ہوتی ہیں۔ چربی والی غذائیں سب سے زیادہ گرم اور مقوی ہیں، لیکن قوتِ ہاضمہ میں سستی پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے خَیرُ الاُمُورِ اَوسَطُھَا کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے چربی والی غذائیں اعتدال سے استعمال کرنی چاہییں۔

پروٹینز سب سے زیادہ قیمتی اور گرمی پہنچانے والی غذا ہے۔ یہ بدل ما یتحلل پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی جسمانی معمار ہے، جو نشوونما اور ترمیم و تنظیم میں بہت حد تک کارفرما ہے۔ اس کا

ذخیرہ ضروری ہے۔ اگر گرمی پہنچانے کی ضرورت روغن دار اور نشاستہ دار خوراکوں سے پوری ہو جائے، تو پروٹینز کی حاجت نہیں رہتی۔ اسے پھر تعمیرِ جسم کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ جسم کو پروٹینز کی معتد بہ مقدار کی ضرورت نہیں ہوتی۔

معدنی نمک جسم کی عام ساخت اور بناوٹ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تین ضروری معدنی نمکیات جو خوراک میں پائے جاتے ہیں، یہ ہیں۔ لوہا، کلسیم اور گندھک اور ان میں ایک نہ ایک جسم کے ہر حصے میں موجود ہے۔ لوہا خون کے لیے مفید ہے۔ کلسیم مضبوط ہڈیاں اور اچھے دانت بناتی ہے اور فاسفورس تمام بدن اور خاص کر اعصابی نظام کے لیے فائدہ بخش ہے۔ یہ نمکیات خوراک میں پائے جاتے ہیں اور ان کی قلیل مقدار کی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی بہت زبردست مقوم ہے۔ تقریباً ہر غذا میں بدرقے کا کام دیتا ہے۔ ان مذکورۂ صدر کے علاوہ حال ہی میں ایک اور شے دریافت ہوئی ہے، جسے وٹیمنز (Vitamins.) یعنی روحیں کہتے ہیں۔ وٹمینز کا ہر خوراک میں ہونا اشد ضروری ہے۔ یہ بعض امراض کا انسداد کرتی ہیں اور ان کے بغیر باقاعدہ نشوونما نہیں ہو سکتی۔ دودھ، مکھن، انڈے کی زردی، دالیں، آلو، سنگترے اور ٹماٹر کے رس میں پائی جاتی ہیں۔

مندرجۂ ذیل میں سے ہر روز کوئی نہ کوئی خوراک کسی ایک قسم میں سے استعمال کرنی چاہیے:-

(۱) پھل اور سبزیاں۔

(۲) دودھ، پنیر، انڈے، خشک مٹر، مچھلی اور گوشت۔

(۳) دالیں، چاول، گیہوں۔

(۴) کھانڈ اور شہد۔

(۵) روغن دار غذائیں، مکھن، گھی، سبزیوں کا تیل وغیرہ۔

ترکاریاں خاص کر جب ہری اور سبز ہوں اور میوے معدنی نمک بہم پہنچاتے ہیں۔ تازے

میووں اور ترکاریوں سے کاربوہائیڈریٹس تھوڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہیں اور ازالۂ قبض میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ اکثر میووں اور ترکاریوں میں وٹیمنز پائی جاتی ہیں۔

دوسرے نمبر کی غذاؤں سے پروٹینز حاصل ہوتی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مرکّب غذائیں ہیں۔ ان میں پروٹینز کی مقدار متفاوت ہے۔ سب سے زیادہ ضروری دودھ ہے، جو اس قدر اہم ہے کہ بذاتہ ایک کامل غذا ہے۔ ہم صرف دُودھ پر سالہا سال زندہ رہ سکتے ہیں۔ کوئی خوراک بھی اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ ہر بچے کو ضرور بلاناغہ تازے دُودھ کا ایک کٹورا تین چار بجے (دوپہر) کے درمیان پینا چاہیے۔ رات کو سوتے وقت دُودھ پینا نوجوان کے لیے سخت مضر صحت ہے اور صبح نہار مُنہ دُودھ پینا معدے میں کیڑے پیدا کرتا ہے۔ بعض بچّے دودھ سے متنفر ہوتے ہیں۔ ان کو دودھ کی بنی ہُوئی اشیا کھلانی چاہییں۔ دودھ میں وہ تمام اجزا جن کی جسم کو ضرورت لاحق ہوتی ہے، مناسب مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی پروٹین بہترین قسم کی ہوتی ہے، اس میں کھانڈ، چربی، سوڈا اور گندھک پائی جاتی ہے۔ اس میں وٹیمنز کی بھی بہت ہوتی ہیں، گو کافی مقدار میں نہیں ہوتیں، لیکن اس میں جو لوہے کے اجزا ہوتے ہیں، وُہ جلد ہی جسم میں جذب ہو جاتے ہیں۔

تیسری وُہ قسم ہے، جس سے ہم ایندھن کا کام لیتے ہیں۔ غلّے کی قسم کی غذاؤں میں تبدیلی نہایت ضروری ہے۔ بعض غلّوں میں بہت زیادہ چربی پائی جاتی ہے اور پروٹین اکثر میں پائی جاتی ہے اور تمام میں معدنی نمک کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

چوتھا نمبر محض مٹھاس پر مشتمل ہے، جو ایندھنی غذائیں ہیں۔ اکثر بچّے طبعاً مٹھاس کے دلدادہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا صحیح انتخاب کرنا اور ان کو صحیح ماکولات کی ترغیب دینی ضروری ہے۔ مدرسے کے دُکاندار کو اس بارے میں خاص ہدایات ہونی چاہییں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مکھیاں کھلی ہوئی مٹھائی پر جمع ہو جاتی ہیں اور دکاندار کے برتن بہت گندے اور میلے ہوتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر

صاحبان کو اس کی طرف فوری توجہ مبذول کرنی چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عملے کے باقی تمام اساتذہ اس اہم فرض شناسی سے سبکدوش ہیں۔ ان کو بھی صفائی اور ضروری دیکھ بھال میں بہت سرگرمی اور جوش سے عمل پیرا ہو کر ننھی روحوں کے آرام و صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے، ورنہ وہ بیسیوں بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔ مٹھاس چونکہ باقاعدہ غذا ہے، اس لیے بچوں کو ان کا پے درپے استعمال مضر ہے۔ خاص کر کھانے سے قبل نہ کھانی چاہیے، کیونکہ یہ بھوک روکتی ہے۔ ہاں مٹھاس کو کھانے کا باقاعدہ جز قرار دینا چاہیے اور اگر خشک کھجوریں دستیاب ہو جائیں، تو بعد از طعام کھا لینی چاہییں، کیونکہ وہ مٹھاس کی کمی کو بہ احسن وجوہ پورا کرتی ہیں۔

پانچواں نمبر روغن دار غذاؤں کا ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی چربی مکھن ہے اور اسے زیادہ مقدار میں استعمال کرنا چاہیے۔ ہنڈیا میں پکائی ہوئی روغن دار غذائیں دیر ہضم ہوتی ہیں، اس لیے چربی یا گھی میں غذا کو بہت کم وقت کے لیے بھوننا چاہیے۔

اکثر طلبہ میں اسکول میں داخل ہونے سے پیشتر کھانے پینے کی عادات راسخ ہو چکی ہیں۔ اگر یہ عادات و اطوار خراب ہوں، تو اُستاد صاحبان کا فرضِ عین ہے کہ ترغیب و ترہیب اور سعی و جہد سے نادان بچوں کو ان عادات بد سے نجات دلائیں اور اُنھیں سمجھائیں کہ

بچو! تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمجھ لو کہ اگر تم کسی بُری خصلت کے غلام ہو، تو تمھاری آئندہ زندگی یقیناً خوشگوار نہ ہوگی۔

روزانہ مقدار خوراک جو ہر تندرست نوجوان کو درکار ہے، حسب ذیل ہے :-

(۱) نائٹروجنی غذا (گوشت) دو چھٹانک۔ (۲) نشاستہ دار شیریں غذا، بارہ چھٹانک۔
(۳) پانی۔ (محض پانی یا غذاؤں میں) دو سیر سے اڑھائی سیر تک۔ (۴) مکھن گھی وغیرہ ایک چھٹانک۔
(۵) نمکیات (نباتی یا معدنی) آدھی چھٹانک۔

اوقاتِ غذا - کھانا ہمیشہ وقت مقررہ پر کھانا چاہیے، کیونکہ پابندیِ وقت سے اشتہائے صادق پیدا ہوتی ہے۔ معدہ غذا کے لیے منتظر اور اس کے ہضم کے لیے مستعد رہتا ہے۔ ایک دفعہ کھانا کھانے سے دوسری مرتبہ کھانا کھانے تک کم از کم ۶ گھنٹے کا وقفہ ضرور ہونا چاہیے۔

پُرخوری - کمزور آدمی کو غذا ہلکی اور تھوڑی کھانی چاہیے۔ اس کے لیے دودھ ساگودانہ وغیرہ مفید ہے ضرورت سے زائد نہیں کھانا چاہیے۔ اس سے بدہضمی، نفخ اور دردِ شکم ہو جاتا ہے۔ جی متلاتا ہے، قبض، بواسیر، نقرس کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسان موٹا، بھدا اور بدشکل ہو جاتا ہے اور جلن کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے۔ بعض اوقات ذیابیطس کی بیماری بھی پیدا ہو جاتی ہے اور گوشت زیادہ کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں، معدے میں فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ میں سستی ہو جاتی ہے۔ وجع مفاصل کی شکایت ہو جایا کرتی ہے۔

کم خوری - اگر خوراک ضرورت سے کم کھائی جائے، تو انسان کا بدن ضعیف و نحیف ہو جاتا ہے۔ چہرہ زرد اور آنکھوں میں حلقے پڑ جاتے ہیں اور دل و دماغ کمزور ہو کر معطل ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو آٹھ روز تک فاقہ دیا جائے، تو وہ مر جاتا ہے۔

حفظِ ماتقدم - بچے کو غذا کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے نائٹروجنی غذا کی بہ نسبت شیریں اور نشاستے دار غذا کی کم ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی کو عرصے تک گوشت وغیرہ نہ دیا جائے، تو وہ لاغر اور دُبلا ہو جائیگا، لیکن گھی اس کی کو پورا کر سکتا ہے۔

بچے چونکہ دماغی کام کرتے ہیں، اس لیے اُن کو زود ہضم اور ہلکی غذائیں استعمال کرنا چاہیے۔ ہر وقت منہ نہ چلاتے رہا کریں۔ پروٹینز کی زیادہ ضرورت ہے۔ سردی کے موسم میں ریاضت جسمانی یعنی ورزش کرنی چاہیے اور اس حالت میں عمدہ مرکب غذا کی ضرورت ہے۔ موسم گرما میں سبز ترکاریاں اور میوے زیادہ کھانے چاہییں اور گوشت، انڈے، چائے اور اس قسم کی گرم اور محرک اشیا کا بہت کم استعمال کرنا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

گھر پیارا گھر

از

ایف ایل برین، سی آئی ای، ایم سی، آئی سی ایس، کمشنر اصلاح دیہات پنجاب، لاہور

میری نگاہ میں گھر اور گاؤں کی زندگی کا اعلیٰ معیار یہ ہے:۔

چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اکثر کے گرد باڑیں لگا دی گئی ہیں۔ لوگ بہترین فصلیں کاشت کرتے ہیں۔ پانی ضائع نہیں کیا جاتا۔ عمدہ آلات کاشت اور بہترین مویشی دکھائی دے رہے ہیں۔ سڑکیں سیدھی اور کھیتوں سے اونچی ہیں اور ان پر گاڑیاں چل سکتی ہیں کوئی ایسا گڑھا یا نشیب موجود نہیں، جس کے اندر مچھر پیدا ہو سکتے ہوں اور نہ مکانوں کی مرمت ہی کے لیے مٹّی کو ہر جگہ سے کھودا جاتا ہے۔ اوّل تو اُپلے تھاپے نہیں جاتے اور اگر تھاپے جاتے ہیں، تو بہت ہی کم۔ اناج عورتوں سے نہیں پسوایا جاتا، بلکہ اس کام کے لیے خراس لگے ہیں۔ کوڑا کرکٹ ٹوکریوں میں بھر کر سر پر نہیں اُٹھایا جاتا، بلکہ اس مقصد کے لیے ٹھیلے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹٹیاں سیدھی سادھی بنی ہیں، جو زیادہ تر زمین میں گڑھے کھود کر بنائی گئی ہیں اور ان پر پردے کا بھی انتظام ہے۔ بہت سے بازاروں میں فرش لگا ہوا ہے اور ان میں نالیاں ہیں۔ کنوؤں کی منڈیریں اچھی طرح بنی ہیں۔ فالتو پانی کو نالیوں کے ذریعے چھوٹے باغ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ کنویں پر عورتوں کے نہانے، کپڑے دھونے اور بچّوں کو نہلانے کے لیے پردہ دار جگہ بنی ہوئی ہے۔

کنوؤں پر مویشیوں کے پانی پینے کو یا تو علیحدہ حوض بنے ہیں یا اس مقصد کے لیے عمدہ تالاب بنائے گئے ہیں، جن میں نہر سے صاف پانی جمع کیا جاتا ہے اور ان میں بارش یا آبادی کا

گندہ پانی اکھٹا نہیں ہو سکتا۔ کھیلوں کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ اکثر گھروں میں ایک ہفتہ وار اخبار آتا ہے۔ ایک ریڈنگ روم قائم ہے، جس میں ایک چھوٹی سی لائبریری ہے اور اس لائبریری میں کھیتی باڑی اور دوسری مفید اور عام دلچسپ باتوں کے متعلق کچھ رسالے اور عمدہ عمدہ کتابیں رکھی ہیں۔ ایک ریڈیو سٹ بھی لگا ہے۔ ہر قسم کی امداد باہمی کی انجمنیں موجود ہیں۔ پنچایت گاؤں کا انتظام کرتی ہے۔ ایک امدادِ باہمی کی انجمن کے وسیلے سے طبی امداد اور تربیت یافتہ دائی کی خدمات حاصل کی ہیں۔ کھلی جگھوں میں درخت لگے ہیں۔ غرض ہر جگہ رونق اور صفائی کا منظر ہے۔

اب گھروں کو دیکھیے، سب روشن اور ہوادار ہیں۔ دیواروں پر تصویریں اور سجاوٹ کی دوسری چیزیں لگی ہیں۔ چھتیں دھویں سے سیاہ نہیں۔ ہر ایک چولھے پر دھویں کی چمنی بنی ہے۔ دودھ کو بھوسے کے بکس میں گرم رکھا جاتا ہے، اُپلوں کی نرم آنچ پر نہیں رہنے دیا جاتا۔ باہر صحن میں پھول لگے ہیں۔ بچے صاف ستھرے، ضبط کے پابند، تندرست اور خوش و خرم ہیں۔ لڑکے لڑکیاں سب اسکول جاتے ہیں۔ ان کے کان نہیں چھیدے گئے ہیں اور نہ اُن کے بدن زیور سے لدے ہوئے ہیں۔ ماں عمدہ قسم کا کھانا پکاتی ہے۔ کپڑے سی سکتی ہے اور ان کی مرمت کر سکتی ہے۔ وہ معمولی دوائیں جانتی ہے اور انھیں استعمال کرتی ہے۔ وہ پڑھ لکھ سکتی ہے۔ اسکے پاس اپنی اور اپنے بچوں کی دلچسپی کے لیے اور گھریلو باتوں کے متعلق چند کتابیں ہیں۔ وہ عورتوں کی انجمن یا اسی قسم کی کسی اور مجلس کی ممبر ہے۔ اس کے کپڑے اور زیور سیدھے سادھے مگر عمدہ ہیں اور اُس نے اپنی حیثیت کے مطابق روپیہ خرچ کیا ہے۔ اس کا خاوند گھر کے اور زمینداری کے کاموں میں دلچسپی لیتا ہے اور کبھی بیکار نہیں بیٹھتا۔ گھر، کھیتوں اور گاؤں کو بہتر بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔ وہ ان تمام سوسائٹیوں کا ممبر ہے، جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی خاطر کھیلوں اور ہر ایسی کوشش میں، جو لوگ اس گاؤں کی تفریح یا ترقی

کے لیے کر رہے ہیں، بہت دلچسپی لیتا ہے، وہ اپنا روپیہ یا توسیونگ بنک میں جمع کراتا ہے یا اُس نے قرضے کی امداد باہمی کے ساتھ حساب کھول رکھا ہے۔ اس کے تمام کنبے کے مناسب وقت پر ابتدائی اور دوبارہ ٹیکا لگا ہوا ہے۔ گھر کے تمام لوگ مسہریاں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بیوی نے دوسری دواؤں کے ساتھ کونین بھی رکھ چھوڑی ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ خیالی تصویر ہے، تو مَیں ماننے کو تیار نہیں۔ یہ تمام باتیں پنجاب میں موجود ہیں۔ کچھ ایک جگہ اور کچھ دوسری جگہ۔ البتہ سب کی سب ایک جگہ اکھٹی کسی گاؤں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ ہے رہنے سہنے کا اعلیٰ معیار اور یہ ہے اصلاح دیہات کی اصل تعریف۔ کیا آپ اس معیار سے گرنا گوارا کریں گے۔

کمزور طالب علم اور استاد

از

فلک شیر خاں صاحب، ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول، جڑانوالہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

پچھلے مضمون میں راقم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کمزور طالب علم کی اصلاح کے بہت سے مروّجہ طریقے کامیاب نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے طریقوں کو چھوڑ کر اور کون سے طریقے ہیں، جن سے کمزور طالب علم کی اصلاح صحیح معنوں میں ہو سکتی ہے۔ راقم اس مضمون میں موجودہ طریقوں کے مقابل چند قابل عمل نئی تجاویز پیش کرنے کی کوشش کریگا، جن کا بندے نے ذاتی طور پر تجربہ کیا ہے۔

(۱) **حوصلہ افزائی۔** جیسا کہ پچھلے مضمون میں عرض کیا گیا تھا سختی اور مار پیٹ طلبہ کو کاذب، سُست، ڈھیٹ اور خائف بنا دیتی ہے اور بالآخر انھیں اسکول سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہے اور انھیں خودداری اور خود اعتمادی جیسے عطیے سے محروم کرتی ہے۔ برعکس اس کے حوصلہ افزائی متعلم کی بہتری کے نقطۂ نگاہ سے جادو کا اثر رکھتی ہے۔ ہر انسان کو اپنی کامیابی پر ناز ہوتا ہے۔ بچوں کو تو خاص طور پر اپنی کامیابی پر فخر ہوتا ہے۔ اگر انھیں شاباش دی جائے اور اس طرح حوصلہ افزا الفاظ سے انھیں محسوس کرایا جائے کہ وہ پہلے کی بہ نسبت ترقی کر رہے ہیں، تو یقیناً وہ دوبارہ شاباش لینے کی خاطر محنت سے کام کر کے استاد کو خوش کرنے کی کوشش کرینگے دوسری طرف اگر طالب علم کو لعنت ملامت کی جائے اور حوصلہ شکن الفاظ سے مخاطب کیا جائے، تو

اُس کی ہمّت بالکل ٹوٹ جاتی ہے اور ترقی کرنے کا عنصر آہستہ آہستہ ناپید ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں بچّے میں رشک کا مادہ غیر معمولی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اگر ایک کو دادِ تحسین دی جائے، تو دوسرے بچّے بھی اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راقم کا تجربہ ہے کہ اگر کچھ لڑکوں کی کاپیوں پر تعریفی الفاظ مثلاً گڈ (Good.) یا شاباش لکھے جائیں، تو وہ لڑکے ایک دوسرے کی کاپیاں لے کر مقابلہ کرتے ہیں کہ کس کو زیادہ دفعہ اس قسم کے تعریفی الفاظ ملے ہیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر زیادہ دفعہ شاباش لیں۔ اس طرح اگر کمزور طالب علم کی کاپیوں پر بھی حوصلہ افزا الفاظ لکھے جائیں اور زبانی طور پر بھی اُن کی تحسین آمیز الفاظ سے ہمت افزائی کی جائے، تو یقیناً اُن کا کام بھی پہلے کی بہ نسبت بہتر ہوگا۔

بعض اوقات زبانی شاباش بعض طلبہ پر حیرت انگیز اثر کرتی ہے۔ راقم نے شاباش کے کئی تجربے کیے ہیں۔ بعض طلبہ جو سختی کی وجہ سے بگڑ چکے تھے، انھیں 'شاباش' نے ایک دن میں سدھار دیا۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے کلاس میں ایک سوال کیا، تو ایک کمزور طالب علم نے کچھ صحیح جواب دیا۔ مَیں نے اُسے شاباش دی۔ یہ دیکھ کر ایک اور لڑکے کے مُنہ سے جو کمزور ترین طلبہ میں سے تھا، بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔ ماسٹر صاحب اگر مَیں بھی اسی طرح ٹھیک جواب دوں، تو کیا مجھے بھی اسی طرح شاباش ملیگی۔ مَیں نے کہا۔ ہاں، اگر تم بھی ٹھیک جواب دو، تو تمھیں بھی شاباش ملا کریگی۔" اس دن سے اُس لڑکے نے دل و جان سے کام کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اپنی کمی پوری کرلی۔ واضح ہو کہ یہ لڑکا جماعت میں بھی کمزور تھا اور اپنی روزمرّہ شرارتوں کی وجہ سے اسکول میں بہت بدنام بھی ہو چکا تھا، لیکن اُستاد کی نرمی اور شاباش لینے کی اُمنگ نے اُسے ایسا رام کیا کہ اس کے بعد میرے پاس کبھی اُس کی شکایت نہیں پہنچی۔ ہمّت افزائی سے قدرتی طور پر بلند ہمتی اور بلند نظری پیدا ہوتی ہے۔

(۲) **گھر کا کام اور اُس کی درستی۔** گھر کا کام دیتے وقت اُستاد کو یہ بات مدِنظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف دماغ عنایت کیے ہیں۔ ایک مقررہ وقت میں جتنا کام ایک ہوشیار طالب علم کرسکتا ہے، کمزور طالب علم اُتنا ہی کام کرنے سے قاصر ہے۔ کمزور طالب علم کو اتنا ہی کام دینا چاہیے، جتنا وُہ آسانی سے کرسکے۔ اگر کبھی وُہ سارے کا سارا کام مکمل نہ کرسکے، تو درگزر کرنی چاہیے، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں جہاں تک ممکن ہو، کمزور طالب علموں کی کاپیاں اُن کی موجودگی میں درست کرنی چاہییں۔ ہوشیار لڑکا اپنی کاپی سے بھی درستی سمجھ سکتا ہے۔ کمزور طالب علم کے لیے بسا اوقات اُستاد کی امداد کے بغیر کاپی کی غلطیاں سمجھنا اور درست کرنا ممکن نہیں۔

(۳) **طلبہ کے حواسِ خمسہ یعنی تمام حسیات سے اپیل۔** بعض انسانوں کا ذہن سماعی ہوتا ہے، بعض کا لمسی اور بعض کا بصری۔ مؤخرالذکر ذہن کے طلبہ کے لیے تختہ سیاہ کا استعمال نہایت ہی ضروری ہے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تختۂ سیاہ کے صحیح اور بروقت استعمال ہی سے بیشتر طلبہ کی تعلیمی حالت میں نمایاں فرق پڑجائیگا۔ اسی طرح لمسی ذہن والوں کے لیے تحریر کی مشق اور سماعی والوں کے لیے تقریر کی مشق کی اشد ضرورت ہے۔ بچوں کے قوائے ذہنی پوری طرح نشو و نما نہیں پا چکے ہوتے، اس لیے مختلف حسّیں ایک دوسرے کی کماحقّہٗ امداد نہیں کرسکتیں اور نہ ایک حس دوسرے کی عدم موجودگی میں اُس کی کمی ہی پوری کرسکتی ہے، جیسا کہ سولہ سترہ برس کے بعد ممکن ہوسکتا ہے۔ اگر اس اسٹیج پر یعنی سولہ سترہ سال کی عمر تک کے بچّوں کے جملہ حواسِ خمسہ سے پوری طرح استفادہ کیا جائے، تو طلبہ کی بہت سی کمزوریاں رفع ہوجائیں گی۔ اس ضمن میں تختۂ سیاہ کا استعمال اشد ضروری ہے۔

(۴) **تعلیم کے جدید بہترین طریقوں سے واقفیت۔** اس صدی میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہو رہی ہے۔ مشاہیرِ عالم تعلیم کے مسائل کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ نئی نئی تھیوریاں نکل رہی ہیں، جن میں بہت سی

قابلِ عمل بھی رہیں۔ بحیثیتِ معلّم ہمیں لازم ہے کہ ہم تعلیم کے جدید ترین نظریے سے واقفیت رکھیں اور تدریس کے نئے نئے طریقوں سے آگاہ ہوں اور انھیں آزما کر اپنے اسباق کو دلچسپ بنائیں اور لڑکوں کو مستفید کریں۔ طریقۂ تدریس اور تعلیم کی کتب پڑھنے سے قدرتی طور پر ہمارا مطمعِ نظر وسیع اور نصب العین بلند ہوگا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے، جو بدقسمتی سے بیشتر اساتذۂ کرام میں نہیں ملتی۔

(۵) **اُستاد اور مطالعہ**۔ کامیاب اُستاد بننے کے لیے اپنے پڑھانے کے مضمون پر مکمل عبور ضروری ہے۔ اُسے اپنے مضمون کی مختلف کتب کا مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ جب تک معلّم اپنے مضمون پر خاص طور پر حاوی نہ ہو، پڑھاتے وقت سبق دلچسپ نہیں بنا سکتا اور دلچسپی پیدا کیے بغیر طلبہ سبق کی طرف توجّہ نہیں دینگے۔ علاوہ ازیں اُستاد کی صحیح عزّت و توقیر اور طلبہ پر اس کا رعب زیادہ تر اُسکی ذاتی قابلیت پر منحصر ہے۔ اُستاد کو کامیاب اُستاد بننے کے لیے ساری عمر طالب علم رہنا لازم و لابدی ہے۔

(۶) **علم نفسیات سے واقفیت**۔ نفسیات کے علم سے اُستاد کا روشناس ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ طالب علم کی طبیعت کا صحیح جائزہ لینے سے قاصر رہیگا۔ ان کے میلانات و رجحان کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکیگا۔ نتیجۃً اُن کی تکالیف کا کامیابی کے ساتھ ازالہ نہ کر سکیگا۔ علم نفسیات کی دو چار ابتدائی مستند کتابیں پڑھنا ہر اُستاد کو کامیاب اُستاد بننے کی خاطر لازمی ہے۔

(۷) **اُستاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات اور اُستاد کی شخصیّت**۔ اُستاد کی ذمّہ داری چند سطور کی تدریس پر ختم نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بس ہمارا کام کتاب کا ایک آدھ صفحہ روزانہ پڑھا دینا ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں آئندہ نسل کی تعمیر ہے اور ہمیں اس اہم ذمّہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے۔ تدریس کے علاوہ ہمارا فرض بچّے کو صحیح معنوں میں تعلیم و تربیت دینا ہے تاکہ وہ اخلاقی، جسمانی اور ذہنی طور پر مکمل انسان بن سکے۔ طلبہ کے والدین کثیر تعداد میں اَن پڑھ ہیں۔ اس وجہ سے اُستاد کی ذمّہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے، اس لیے لازم ہے کہ باپ کی مانند وہ

بچّے سے روحانی اور قلبی تعلقات پیدا کرے۔ بچّہ سے باپ کی طرح اس حد تک محبّت کی جائے کہ وُہ بھی اُسے والد کا درجہ دینے لگے۔ یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب اُستاد بچّے سے دِلی ہمدردی پیدا کرے۔ اُس کی مسرّتوں اور دکھوں میں حتّی الوسع شریک ہو، اُس کی ہر ممکن امداد کرے۔ غرضکہ صحیح معنوں میں اس کا رہنما اور سرپرست ہو۔ بچّے کی شخصیت کو پسِ پشت نہ ڈال دیا جائے بلکہ اس پر اعتماد کیا جائے، اُسے سوسائٹی کا ایک معزز رکن تصوّر کیا جائے۔ حتّیٰ کہ بچّہ اُستاد کو اپنا مربی اور مہربان خیال کرے اور اُس کے سامنے اپنی مشکلات کا پورے طور پر اظہار کر سکے۔ تب ہی اُستاد اپنے شاگرد کے میلانات، دلچسپیوں اور طبیعت کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے، جس کے ذریعے اُس کے لیے طالب علم کی بہتری، فلاح اور تعلیمی اصلاح کے ذرائع اور اسباب سوچنا زیادہ آسان ہو جائیگا۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے اُستاد کا رویّہ اور برتاؤ اپنے شاگردوں کے ساتھ قدرے کھلا ہونا چاہیے۔ شام کے وقت اُسے ان سے ملنے جلنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ مل جل کر کھیلنے سے اُستاد اور بچّے دونوں کی صحت اچھی رہیگی۔ ہر دو میں باقاعدگی کی عادت پڑیگی اور اُستاد کو شاگرد کی طبیعت کو ٹھیک طرح پہچاننے کا موقع مل جائیگا۔ بچّہ اُستاد کے سامنے اپنی مشکلات ظاہر کرنے میں شرم محسوس نہیں کریگا اور نہ جھجکے گا۔

اُستاد کو شاگردوں سے مخاطب ہوتے وقت خندہ روئی اور خوش اخلاقی سے کام لینا چاہیے۔ اُنھیں بچّے کو عزیز بھائی کہہ کر پکارنا چاہیے۔ طلبہ ہمارا دلی احترام جب ہی کرینگے، جب ہم اُن کی عزّت کرینگے۔ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ بعض اصحاب طلبہ سے مخاطب ہوتے وقت لفظ 'او' استعمال کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر کالج کے دستور کے مطابق اسکول میں بھی طلبہ کو مسٹر کہہ کر پکارا جائے۔

مندرجۂ بالا سطور سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ اس قدر نرمی برتی جائے، جس سے مدرسے کے نظم و ضبط میں خلل پڑنے کا خدشہ ہو۔ نظم و ضبط کے بغیر خود بچّے کی زندگی کامیاب نہیں ہوگی لیکن

اصل نظم وضبط سختی سے پیدا نہیں ہوتا۔ نظم کے لیے ضرورت ہے کہ اُستاد کی اپنی زندگی نظم وضبط کی تصویر ہو، جو طلبہ کے لیے نمونے کا کام دے۔ جو معلم وقت پر جماعت کی حاضری نہیں لگاتے یا وقت پر مدرسے یا جماعت میں نہیں آتے اور باقاعدگی کے ساتھ مجوزہ پروگرام کے مطابق کام نہیں کرتے۔ انھیں اپنے شاگردوں سے بھی یہ اُمید کم رکھنی چاہیے کہ وہ باقاعدہ وقت پر کام کریں گے۔ دیر کرکے آنے والے طالب علم کو وہی اُستاد تنبیہ کرتے اچھا لگتا ہے، جو خود وقت پر آنے کا عادی ہو۔ اُستاد کی اپنی زندگی جمیع اوصاف کا مرقع ہو۔ اُس کی زبان سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ طالب علم کے دل پر نہ مٹنے والا نقش بن جائے۔

(۸) **محنت**۔ یہ صحیح ہے کہ ذہانت فطری ہے، قدرت کا عطیہ ہے، انسان کا ذاتی سرمایہ ہے، جو آباؤ اجداد سے ملتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ طالب علم کی کامیابی کا دارومدار ذہانت پر ہے حقیقت پر مبنی نہیں۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ فوق البشر شخصیت (Genius) کا تین چوتھائی محنت میں مضمر ہے۔ بغیر محنت کے انسان اپنی ذہانت سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ محنت بہت سی کمیوں کو پورا کرنے والی ہے۔ محنت کے بغیر اچھا ذہن بھی ناکارہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے طلبہ جنھیں ہم کند ذہن خیال کرتے ہیں، اگر اُنھیں ہمت افزائی سے آہستہ آہستہ محنت کا عادی بنایا جائے، تو یقیناً اُن میں سے بہت سے طالب علم کام کرنے لگیں گے اور وہی ہمیں اچھے بھلے ذہین معلوم ہوتے لگیں گے۔

اِن سطور سے میرا یہ مطلب نہیں کہ سو فیصدی کمزور طلبہ ان تجاویز پر عمل کرنے سے اپنے ہم سبقوں کے ساتھ چلنے لگیں گے۔ کچھ نہ کچھ ایسے لڑکے بھی ہونگے، جو جسمانی یا ذہنی قوتوں میں نقص ہونے کی وجہ سے پڑھنے کے قابل نہیں ہونگے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر مذکورۂ بالا تجاویز کے مطابق پورے طور پر عمل کیا جائے، تو بہت سے طالب علم جنھیں ہم بالکل ناکارہ سمجھتے ہیں، جماعت کے ساتھ چلنے لگیں گے۔ اگر اِن کوششوں کے باوجود کچھ لڑکے ایسے پائے جائیں، جن پر اصلاح

کی تمام تدابیر کامیاب نہ ہوں، تو لازم ہے کہ انھیں اُن کے والدین اور ہیڈ ماسٹر کے مشورے سے اسکول چھوڑنے کی ترغیب دی جائے۔ بجائے اس کے کہ اُن کی اسکول میں فضول عمر ضائع کی جائے، انھیں اسکول سے ہٹا کر کسی اور کام میں لگانے کا مشورہ دیا جائے، جہاں اُن کے دماغ چل سکیں، لیکن واضح رہے کہ ایسے طلبا کی تعداد بہت قلیل ہوتی ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ اساتذۂ کرام کو تدریس کے پُرانے نظریے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید طریقِ تعلیم کو انصاف اور رواداری سے پڑھیں۔ اگر ایسا ہو، تو ہمیں بہت سی قابلِ عمل اور مفید باتیں مل جائیں گی۔ اس طرح قوم کی زندگی میں ایک حیرت انگیز اصلاح ہو جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اُستاد ہی کے نقطۂ نظر سے اُس کے راستے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ یہ مسلمہ ہے کہ اُستاد کی ذمّے داری اور فرائض کا کماحقہٗ معاوضہ نہیں ملتا۔ تاہم اُسے اپنے عالی پیشے کی توقیر کرنی چاہیے اور مادی فوائد کو نظر انداز کرنے کی کوشش۔ وُہ اپنی محنت کا صلہ اس بات میں سمجھے کہ اگر اُس کی قوم کا ایک فرد بھی سدھر گیا، تو گویا وُہ اپنی اہم ذمّے داری سے سبکدوش ہو گیا۔ یہ ایک روحانی فتح، عظیم الشان قربانی اور ملک و قوم کی بے لوث خدمت ہے۔

قوم کی قسمت کا بنانا یا بگاڑنا مدرّس کے ادنیٰ اشارے پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مہذب ممالک میں اُستاد کی عزّت مشاہیرِ ملک سے زیادہ کی جاتی ہے اور مدرسی کے پیشے کو تمام پیشوں سے افضل و اعلیٰ گنا جاتا ہے۔

اِسکاؤٹنگ

از

مولوی علی موسیٰ رضا صاحب، اسسٹنٹ آرگنائزنگ کمشنر بوائے اسکاؤٹ

"اسکاؤٹ" اگرچہ ہمارے کانوں کو اجنبی لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا مفہوم ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ ہر زمانے میں ان اوصاف کے لوگ موجود رہے ہیں، جن کو ہم اس وقت لفظ اسکاؤٹ سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ لفظ فوجی اصطلاح سے ماخوذ ہے اور اس کے لغوی معنی یہ ہیں کہ وہ جانباز سپاہی، جو فوج کے پیش پیش دشمن کے ملک میں جاتے ہیں اور نہایت ہوشیاری اور جرأت سے مشکلات کا مقابلہ کر کے اور اپنی جان پر کھیل کر ایسے معلومات حاصل کرتے ہیں، جو فوج کی نقل وحرکت میں کام آسکتے اور اس کی مہم کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کام انھیں لوگوں سے انجام پا سکتا ہے، جن کی جسمانی تربیت سخت ترین جفاکشی اور محنت کی متحمل ہو سکے، جن کی دماغی تربیت پیش آنے والی مشکل میں عقدہ کشائی کر سکے اور ان کو دوسروں کا محتاج نہ رکھے اور جن کی اخلاقی تربیت اجتماعی مفاد کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو بھلا دے اور وقتِ ضرورت جان کی بازی لگانے میں دریغ نہ کرے۔

جو لوگ ان اوصاف کے مالک ہیں، ان کو فوج کے باہر بھی ہم اسکاؤٹ کہتے ہیں۔ "کیرکٹر" یا سیرت جس کا نام ہے، وہ اِنھیں اوصاف کا مجموعہ ہے اور "اسکاؤٹنگ" کی تربیت کے ذریعے ملک کے بچوں میں ہم انھیں اوصاف کو پیدا کرنے کے متمنی ہیں، کیونکہ آج کے بچے کل شہری ہونگے اور انھیں کی عمدہ تربیت پر قوم و ملک کی ترقی اور فلاح کا انحصار ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدارس میں جو تعلیم بچوں کو دی جاتی ہے، کیا اس کا بھی یہی مقصد نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ مدارس میں ضرور اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی نشوونما ہو، لیکن باوجود اس کے عام طور سے کتابی معلومات پر بہت زور دیا جاتا ہے کتابیں رٹ لینے اور امتحان کی ذمے داری کو پورا کرنے میں بچوں کا تمام وقت صرف ہو جاتا ہے۔ نہ اخلاق کی تعدیل و تہذیب کا موقع، نہ کارآمد فنون اور دستکاریوں کی طرف توجہ، نہ صحت جسمانی کا خیال، نہ حواس خمسہ کی تربیت و ترقی کی گنجائش۔ نہ حب قومی اور وطن کی تلقین اور نہ قومی خدمت اور بے غرض جفاکشی و ہمدردی کی عادت۔ غرض مدارس میں شریک ہو کر لڑکا کسی خاص علم یا فن میں ماہر تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کی ہر جہتی تربیت بہت کم ہوتی ہے۔ اسکاؤٹنگ کی تربیت میں اس کمی کو پورا کرنے کی مؤثر اور نتیجہ خیز کوشش کی گئی ہے۔ اسی واسطے اس کو ایک جدید تعلیمی تحریک کہا جاتا ہے نہ کہ فوجی یا سماجی تحریک اور اسی واسطے، جہاں کہیں اس کو جاری کیا گیا ہے، وہاں کی حکومت نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی ہے اور اپنے تعلیمی بجٹ سے اس کی مالی امداد کا انتظام کیا ہے۔

لڑکوں کے سن کے لحاظ سے ان کی نفسیاتی ضروریات بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں۔ اس لیے اسکاؤٹنگ کے تربیتی پروگرام کو، ان ضروریات کے مدنظر، تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لڑکوں کی تربیت کا ابتدائی حصہ ساتویں سال سے شروع ہو کر گیارھویں سال پر ختم ہوتا ہے۔ پروگرام کے اس حصے کو "کبنگ" کہتے ہیں۔ گیارہ سال سے سترہ سال تک، جو تربیت دی جاتی ہے، اس کو "اسکاؤٹنگ" کہتے ہیں۔ اس طرح ساتویں سال سے پچیس سال تک، جو تربیت کا انتظام ہے، اس کو "روورنگ" کہتے ہیں۔ اس طرح ساتویں سال سے پچیس سال تک اسکاؤٹنگ یا کشافہ کی مسلسل تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔

وقت کے اختصار کے مدنظر یہ امر دشوار ہے کہ ان تینوں قسموں کی تعلیم پر واضح بحث کی جاسکے۔ اصل مقصد اور حقیقی اصول، یعنی جسم، دماغ اور اخلاق کی تربیت ان تینوں مدارج پر یکساں مشتمل ہے۔

فرق صرف اس بات کا ہے کہ جس عمر میں جیسا کام لڑکے کی طاقت، صلاحیت اور ذہانت کے موافق ہوتا ہے، اس طرح اس پر عمل کروایا جاتا ہے۔ بطور نمونہ میں یہاں صرف گیارہ یا سترہ سال کی عمر کے لڑکوں کی تربیت کا خلاصہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جن کو "اسکاوٹ" کہا جاتا ہے۔

لڑکوں کی کامیاب تربیت کا پہلا اصول یہ ہے کہ ان کی طبیعت سے واقف ہو کر ان کے فطری رجحانات کو معلوم کیا جائے اور ان کے مناسب حال تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ اکثر اُستادوں کے پاس جوہر لیاقت یہی ہے کہ لڑکا خاموشی پسند، مودّب اور شائستہ نظر آئے۔ لیکن بچپن کی دنیا میں شور و غل، ہلچل اور اضطراب کی فراوانی ہے۔ کھیل تماشہ، مار پیٹ اور کھانا پینا بچپن کی دنیا کے تین لازمی عناصر ہیں۔ اسی پر لڑکے مرتے ہیں اور بدقسمتی سے یہی وہ باتیں ہیں، جن سے اُستاد اُن کو باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچوں کے قانون میں میز پر چار گھنٹے ڈٹے رہنا ایک سزا ہے اور تضیع اوقات۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ کسی لڑکے نے اپنے والدین سے یہ خواہش کی ہو کہ اس کو اُستاد کے پاس پڑھنے بھوایا جائے، جہاں وہ صبح سے شام تک کتابوں کو سامنے رکھ کر رٹتا رہے۔ یہ کام لڑکے کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے، جس کے اندر ہنسی، مذاق، دل لگی، کھیل کود، مار پیٹ، شور و غل، شرارت اور شوخی بھری ہوئی ہے اور یہی اس کے لڑکپن کا تقاضا ہے۔ اگر تعلیم و تربیت کا منشا یہ ہے کہ بچے کے ان فطری رجحانات کو دبا دیا جائے، تو یہ ہرگز مستحسن نہیں۔ بچوں کی عادت ہمیشہ اُستاد کے ان تعلیمی نظریوں سے برسرِ پیکار رہیگی اور یقیناً اسی قانون کو آخر میں کامیابی ہوگی، جو تقاضائے فطرت کے موافق ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ اس لڑائی میں چند افراد ایسے بھی نکل جائیں، جو اپنی اصلی فطرت کو کھو بیٹھیں اور علم کے کچھ حصے سے بہرہ یاب بھی ہو جائیں، لیکن کثرت انھیں لوگوں کی ہوگی، جو ہمیشہ باغی رہیں اور لطف تو یہ ہے کہ باغی آخر میں چل کر قوم میں سرخرو اور نامور ہوتے ہیں۔ دُنیا کے زبردست ناموروں کے بچپن کے واقعات میں بہت سی ایسی ایسی نظیریں ملیں گی، جن کے ساتھ ان کے اُستادوں نے بیزاری ظاہر کی اور جو کبھی

اپنے مدرسے کی چار دیواری میں نیکنام نہ رہے حتیٰ کہ نیوٹن اور ڈارون جیسے سائنس والوں نے بھی اپنے اُستادوں سے کوڑھ مغزی کے تمغے حاصل کیے۔

اسکاؤٹنگ کا تمام نظامِ تعلیم لڑکے کی اُنھیں فطری اوصاف کو مدِ نظر رکھ کر قائم کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک کھیل کہا جاتا ہے جس میں اُستاد بحیثیت ایک بڑے بھائی کے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ایک کھیل کا ماحول پیدا کر دیتا ہے، جس میں وہ اپنے آپ مصروف ہو کر جسمانی حیثیت سے مضبوط اور جفاکش، دماغی حیثیت سے ہوشیار اور مصروف بہ کار اور اخلاقی حیثیت سے شریف اور فرض شناس ہو جاتا ہے۔ اب ذرا تربیت کی کچھ تفصیل سن لیجیے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اسکاؤٹنگ کی تربیت لڑکوں کی زندگی میں کس قدر انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔

۱۔ جسمانی تربیت۔ جتنی بھی معلومات اسکاؤٹنگ کے نصاب میں بچوں کو بہم پہنچائی جاتی ہیں، ان کی تعلیم کھیلوں کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اس میں انھیں نہ صرف ورزش ہی ہو جاتی ہے، بلکہ اُن کے حواسِ خمسہ کی تربیت کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔

اسکاؤٹنگ کے نصاب کی بہت سی آزمائشیں گھر کے باہر پوری کرنی پڑتی ہیں اور ان کی ٹریننگ بیرون در مصروفیتوں کے ذریعے دی جاتی ہے۔ ہائکوں اور کیمپوں کا قیام اسی تربیت کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ یہ مصروفیت اسکاؤٹوں کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ صاف و پاک آب و ہوا، قدرت کے خوبصورت مناظر، جنگل کے سایہ دار درخت اور ان پر چہچہاتے ہوئے پرند، جھیل، ساگر اور پہاڑ یہ سب چیزیں کیمپ کے ماحول میں شریک ہیں اور اُن کی رفاقت میں اپنی مدد آپ کرتے ہوئے، اپنی آسائشوں کو خود آپ فراہم کرتے ہوئے اور اُن تمام کاموں کی مشق کرتے ہوئے جو کشافہ کے مختلف نصابوں میں مقرر ہیں، اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ تھوڑی ہی مدت کے لیے کیوں نہ ہو لڑکوں میں تازہ خون پیدا ہوتا ہے اور انھیں جفاکشی اور محنت کا عادی بننا پڑتا ہے، جوان کی جسمانی نشوونما کے لیے بے حد ضروری اور کارآمد ہے۔

۲۔ دماغی تربیت۔ دماغ کی تربیت و تعلیم حسیاتِ جسمانی پر منحصر ہے۔ جب تک حواس کی موزوں تربیت نہ ہوگی، دماغ کی عمدہ نشوونما غیر ممکن ہے۔ اسی حقیقت کے مدّ نظر اسکاؤٹنگ کے سارے نصابی مضامین ایسے ہیں، جن میں پانچوں حواس کی تربیت اور سائنٹفک ملحوظ رکھی گئی ہے۔

رسّی کا استعمال، چاقو اور کلہاڑی کا استعمال، ڈنڈے کا استعمال، جھاڑ چڑھنا، ڈیرا کھڑا کرنا، جنگل یا بارش میں آگ سلگا کر کھانا پکانا، سُراغ رسانی کرنا، تیرنا، ستم رسیدوں کی طبّی امداد کرنا، تاروں اور قدرتی نشانیوں سے وقت اور سمت معلوم کرنا، پیمائش کرنا اور راستے کے نقشے تیار کرنا، اشاروں سے پیام رسانی کرنا اور درختوں، جانوروں اور پرندوں کے حالات سے واقف ہونا۔ غرض اسی قسم کی بہتیری ایسی چیزیں ہیں، جو ایک آدمی کی زندگی میں ہر وقت کام آتی رہتی ہیں اور جن کا علم حاصل کرنا ایک اسکاؤٹ کے لیے لازمی ہے۔ ان کے لیے علاوہ مہارتی تمغہ جات کے ذریعے لڑکوں میں فنون اور دستکاریوں کی تحصیل کا شوق پیدا کرنے کے اُن کے فطری رجحانات کے مطابق ان کے منتخبہ فنوں کے اکتساب میں ان کی حوصلہ افزائی اور ضروری سہولت فراہم کی جاتی ہے تاکہ آگے چل کر اپنے اس شوق اور فنی مہارت سے مالی فائدہ بھی اٹھا سکیں اور اُن میں کسی کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

۳۔ اخلاقی تربیت۔ اسکاؤٹنگ چند کارگزاریوں کا ایک پروگرام نہیں ہے، بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک عمدہ طرزِ عمل ہے۔ اسکاؤٹنگ کی تمام مصروفیات کی سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ لڑکا ان میں مصروف ہوتے ہوئے، اسکاؤٹ ماسٹر کے راست اثر میں آجائے اور اسکاؤٹ ماسٹر اس زمانے میں اس کے رجحانات کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ سیرت سازی کی تربیت کا یہ عام اصول ہے کہ جب تک کسی کام کو باربار نہ کروایا جائے، اس کی عادت نہیں پڑ سکتی اور عادت انسان کی طبیعت ثانی نہیں، بلکہ طبیعت اوّل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ اسی اصول کے مدِّ نظر اسکاؤٹنگ کے قوانین تجویز کیے گئے ہیں، جو کل مذاہب کے اخلاقی مواد کا نچوڑ ہیں اور ٹروپ اور پٹرول

کی تنظیمی مصروفیتوں میں شریک ہو کر انکا اس بات کے مواقع حاصل کرتا رہتا ہے، جس میں وہ اپنے آپکو قابلِ اعتماد، وفاشعار، مددگار، ہمدرد، خوش اخلاق، مہربان، اطاعت گزار، کفایت شعار، بہادر، پاکباز اور رواداربنا سکتا ہے۔ اسکاؤٹوں کا نصب العین "تیار باش" تجویز کیا گیا ہے۔ دوسرے کی خاطر کم ازکم روزانہ ایک بھلائی کا کام کرنا اس کا شعار ہے۔ جس لڑکے کی تربیت خود اس حلف سے آغاز ہو کہ:۔

میں اپنی شرافت کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ خدا، بادشاہ اور ملک کے فرائض اپنے امکان بھر کوشش سے انجام دونگا اور اسکاؤٹ قوانین کی پابندی کرونگا۔ دوسروں کو ہر وقت مدد دیتا رہوں گا اور اپنے جسم کو مضبوط، ذہن کو مصروف بیدار اور اخلاق کو پاک رکھونگا۔

اور جس کے بیرونِ مدرسہ اوقات اس اعلیٰ فضا میں بسر ہوں، جہاں سیکڑوں مشاغل کے ذریعے کشمکش حیات میں کامیاب جد وجہد کیلیئے "تیار باشی" کا عملی درس دیا جاتا ہے، اگر وہ قومی سپاہی نہ بنے، تو پھر اور کیا ہو سکتا ہے

چند غلط فہمیاں۔ قبل اس کے کہ میں اپنے مضمون کو ختم کروں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند غلط فہمیاں دُور کر دوں۔ اسکاؤٹنگ میں تمام مذہب اور ملت کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ اس کے تحت کسی خاص مذہبی تعلیم کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ یہاں آ کر لڑکے یہ سیکھتے ہیں کہ جس طرح ان کو اپنا مذہب عزیز ہے اسی طرح دوسروں کو اپنا مذہب پیارا ہے، اس لیے ہر شخص کے مذہبی احساسات کا احترام کرنا اسکاؤٹوں کا ایک قانون ہے۔ البتہ ایک مذہب جس پر سب قائم ہو جاتے ہیں، وہ خدائے واحد کی بندگی کا اعتراف اور تمام انسانوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ ہے۔ اس کے علاوہ اسکاؤٹوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہبی شعار کی پابندی کریں اور ملک میں رواداری اور امن قائم کریں اور اُس تنگ نظری کو دور کر دیں، جس کی وجہ سے لوگ آپس میں دست و گریباں ہیں۔

اسکاؤٹ کا خاکی لباس اور اُن کی جماعت بندی اور چند مشغلوں کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اسکاؤٹنگ بھی ایک فوجی تعلیم ہے۔ اسکاؤٹ کی وردی، اس کا پٹرول، اس کا ٹروپ، ورزش

کے طریقے اور دیگر مصروفیتیں اگرچہ بظاہر اس تحریک میں فوجی نمائش پیدا کر دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس کو فوج سے کوئی تعلق نہیں ۔ کام میں یکسانی اور باقاعدگی اور مذہبی امتیازات کو دور کر کے ایک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے یہ چیزیں ضروری سمجھی گئیں۔ بندوق اور دوسرے فوجی لوازمات اسکاؤٹ ٹروپوں کے سامان میں شریک نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چند مصروفیتیں جو فوجی تعلیم کا جزو ہیں، اس کے نصاب میں شریک ہیں، لیکن اسکاؤٹ ۔ جو ایک قومی سپاہی ہوتا ہے اور جس کا نصب العین تیار رہنا ہے، لازمی طور سے ان چیزوں کو بھی حاصل کرتا ہے، جو وقت ضرورت اس کو جانباز سپاہی بنا سکیں تاکہ وہ اُن بدی کی طاقتوں کا مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کرے، جو ملک کو تباہ کرنیوالی ہیں۔

قدامت پسند لوگوں کا ابھی ہمارے ملک میں ایک کثیر حصہ موجود ہے۔ ان لوگوں کی نظروں میں اسکاؤٹنگ کو اس واسطے وقعت نہیں حاصل ہو سکی کہ اس کی ظاہری شکل میں مغربیت زیادہ نمایاں تھی اور یہ وجہ اس کی معنوی خوبیوں پر پردہ ڈال دینے کے لیے کافی تھی۔ پھر کس طرح اسکاؤٹنگ ان کے نزدیک مقبول ہو سکتی تھی، لیکن ان لوگوں نے اس بات کا احساس نہیں کیا کہ اس وقت جس قدر بھی مفید اور کارآمد تمدنی ضروریات کی تکمیل ہو رہی ہے، وہ سب مغرب ہی کے زیر اثر ہے۔ ایسے مغرب پرست زمانے میں کشافہ جیسی سیرت ساز تحریک کو مغربی ہی لباس میں زیادہ کارآمد بنایا جا سکتا ہے اور پھر وہ لباس جو اس میں مروج ہے، کشافی مصروفیات میں نہایت آرام دہ، کم خرچ اور دیرپا ثابت ہوا ہے۔

ملک میں ایک اور طبقہ ایسے افراد کا ہے، جو تعصب کی عینک سے ہر چیز کو دیکھنے کا عادی ہے۔ چنانچہ ان کی نگاہِ تجسس نے اسکاؤٹوں کے گھٹنوں کی عریانی کو اپنی نکتہ چینی کا ہدف بنا کر سرے سے کشافہ کے لباس کو خلاف مذہب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ فریضۂ نماز کی ادائگی نیم پاچوں میں ممنوع قرار دے دی گئی۔ حالانکہ نکروں کا استعمال مدرسے کی بازی گاہوں میں بلا اعتراض ایک زمانے سے مروج ہے۔ جن لڑکوں میں نماز کی پابندی کی عادت ہے، وہ نکر پہن کر اپنی عادت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اگر گھٹنوں کی عریانی ان کی نماز میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہے، تو ان کے جسم پر اور بہت سی چیزیں ایسی موجود ہیں، جو اس عریانی کا علاج ہو سکتی ہیں۔ خود نکر ایسی بنائی جا سکتی ہے، جو وقتِ ضرورت گھٹنوں کے نیچے تک پہنچ سکے۔ غرض نماز کے پختہ ارادے کے سامنے یہ ایک عذر لنگ ہے۔

ایک اور عام غلط فہمی، جو اسکاؤٹوں کے فرائض کے متعلق ملک میں پھیلی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں نے اسکاؤٹنگ کے محکمے کو ایک ایسا محکمہ سمجھ رکھا ہے، جہاں سے بلا اُجرت مزدور میلوں، عرسوں اور جلسوں میں دستیاب ہو سکتے ہیں اور آئے دن اکثر ایسی درخواستیں آتی رہتی ہیں کہ فلاں کام کے لیے اتنے اسکاؤٹ روانہ فرمائے جائیں وغیرہ۔ بلاشبہ اسکاؤٹنگ کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خدمت کرنے کی عملی تربیت بچوں کو دی جائے اور اسی مقصد کے پیش نظر پہلی امداد، ڈوبتے کو بچانے، آگ سے آدمیوں کو نکال لانے وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہر روز کم از کم ایک نیک کام کرنے کا فرض مقرر کر دیا گیا ہے تاکہ لڑکوں میں دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور ایثار سے کام لینے کی عادت پڑ جائے اور اگر موقع مل جائے، تو اسکاؤٹ جماعتیں خدمتِ خلق بھی انجام دے سکتی ہیں۔ بشرطیکہ اس کام سے خود ان کی اپنی تربیت کا کوئی اچھا موقع نکلتا ہو، لیکن کسی ادارے کا اس امر کی توقع رکھنا کہ چونکہ اسکاؤٹ رضاکارانہ اور بلا معاوضہ خدمت کرتے ہیں، اس لیے کسی خاص موقع پر اور عرصے تک ان سے خدمت لی جائے، تو انتظام میں آسانیاں ہونگی، اسکاؤٹنگ کے اصول کے خلاف اور بچوں کی تربیتی فلاح کے بالکل منافی ہے۔ تحریک کشافہ کا اصل کام اور خدمت یہی ہے کہ اپنی جماعت کے بچوں کی خدمت اور تربیت کرے اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ جسمانی، دماغی اور اخلاقی قوائے عمل کا ایک بہترین نمونہ بن کر مستقبل میں ملک کی تمدنی قابلیت میں اضافہ کریں اور ملک و مالک کی خیر خواہی میں وقتِ ضرورت اپنا سب کچھ نثار کر دیں۔

یہ ہے اسکاؤٹنگ اور اس کی نشر و اشاعت، فروغ و ترقی میں ملک جس قدر حوصلہ افزائی کرے کم ہے۔ (ماخوذ از حیدرآباد لیکچر)

مفید اللغات اُردو

یہ کتاب محکمہ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ مدارس اور دیگر مکاتب کی ضروریات اور عام طلبہ و شائقین کی سہولت کے لئے نہایت کوشش محنت اور عرقریزی سے تیار کرائی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہزاروں الفاظ عربی، فارسی، پنجابی، ترکی، انگریزی وغیرہ زبانوں کے جلی قلم سے مع ان کے اعرابوں کے نہایت صحت اور صفائی سے دئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے مقابلے میں اس کے معنی نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کئے گئے ہیں یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے اور کپڑے کی خوبصورت سنہری جلد سے مزین ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے ۲

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

گزارش

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ سلسلہ آسان حساب، مصنفہ میر خورشید حسن صاحب بی اے، بی ٹی، ڈسٹرکٹ انسپکٹر او سکولز، لاہور پر ۲۵ فیصدی کمیشن دی جاتی ہے۔ اگر اس سلسلۂ حساب کو مدارس میں جاری کیا جائے، تو جہاں طلبہ کو اس مفید سلسلے سے مستفید ہونے کا موقع ملیگا، وہاں ان کے اخراجات میں بھی کافی بچت ہوگی۔ یہ سلسلہ نہایت ہی آسان اور مقبول ہے۔ اُمید ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحبان اس سلسلے کو جاری کر کے مشکور فرمائیں گے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز
ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۳)	ستمبر ۱۹۳۷ء	نمبر (۶)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

ماہِ اگست ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک بھاری رقم خرچ کرکے انگلستان سے دو ماہرینِ تعلیم مسٹر اے، ایبٹ اور ایس ایچ ، وڈ کو اس غرض سے دعوت دی تھی کہ وہ گورنمنٹ کو ملک کی ضروریات کے مطابق نظامِ تعلیم میں لازمی تبدیلیاں رائج کرنے کی رائے دیں۔ ان دو صاحبان نے دہلی، صوبجات متحدہ اور پنجاب میں دورے کیے اور حالات کا مطالعہ کرکے ایک رپورٹ مرتب کی، جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ رپورٹ کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّے میں مسٹر وُڈ نے تمام تعلیم پر اور دوسرے حصّے میں مسٹر ایبٹ نے تعلیم دستکاری پر بحث اور سفارشیں کی ہیں۔ ہم اس مضمون میں صرف ان سفارشوں کا ذکر کرینگے، جو وُڈ صاحب نے ابتدائی تعلیم کے متعلق کی ہیں۔

سب سے پہلے وُہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم جہاں تک ممکن ہو سکے، ٹرینڈ مستورات کے سپرد ہونی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ تعلیم گاہوں کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے، کیونکہ وہاں تقریبًا ہر تعلیم گاہ میں ابتدائی تعلیم کی ذمّے دار عام طور پر مستورات ہیں۔ اس امر کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ عورت بچّے کی پرورش میں نمایاں حصّہ لیتی ہے، اس لیے وُہ اس کی ضروریات، خواہشات اور جذبات کو سمجھنے میں مرد سے زیادہ اہل ہے، لہٰذا اگر بچّے کی پرورش کے علاوہ اس کی ابتدائی تعلیم بھی اس کے سپرد کر دی جائے، تو بہتر نتائج برآمد ہونگے۔

ابتدائی تعلیم کے نظام میں اس قسم کی تبدیلی رائج کرنے سے ہمارے ملک کو ایک بڑا بھاری فائدہ یہ ہوگا کہ یہاں دیہاتی بچوں کی تعلیم کا سوال، جو مدت سے مشکلات پیش کر رہا ہے، بخوبی حل ہو جائیگا اور خاص کر لڑکیوں کی تعلیم میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگیگا۔ آجکل تعلیم نسواں کا انتظام سوائے چند بڑے بڑے شہروں کے کہیں بھی تسلی بخش نظر نہیں آتا۔ دیہات کے لوگ، جو عام طور پر قدامت پسند ہوتے ہیں، اپنی لڑکیوں کو لڑکوں کے اسکولوں میں بھیجنے سے گریز کرتے ہیں اور لڑکیوں کے لیے درسگاہیں اتنی کم ہیں کہ وہ سب کی سب تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے اگر ابتدائی تعلیم مستورات کے ہاتھ میں آجائے، تو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کا سوال آسان ہو جاتا ہے۔

وُڈ صاحب کی مذکورۂ بالا سفارش قابلِ غور ہے۔ اس کو عملی شکل دینے میں چند مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، جن کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس وقت ملک میں اُستانیوں کی تعداد اتنی نہیں کہ وُہ ملک کے ہر گوشے میں ابتدائی تعلیم کو اپنے ذمّے لے سکیں اور جو قلیل تعداد اُستانیاں موجود ہیں، اُن کی بود و باش اور طرزِ معاشرت عام طور پر شہری زندگی سے وابستہ ہے۔ وُہ اس قابل نہیں کہ وُہ اپنی زندگی کو ایک دم دیہاتی سانچے میں ڈھال سکیں، اس لیے ان میں سے کثیر تعداد دیہات میں کام کرنے سے کتراتی ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتی اور شہری زندگی میں اس قدر تفاوت ہے کہ اگر چند مستورات نے دیہات میں تعلیمی کام کرنے کا بیڑہ اُٹھایا بھی، تو گاؤں کے لوگوں کی طرف سے ان کی وُہ حوصلہ افزائی نہیں کی گئی جس کی وُہ مستحق تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک باوجود ہماری کوششوں کے ابتدائی تعلیم اس مرحلے تک نہیں پہنچ سکی، جہاں تک ہماری خواہش تھی۔

ہم وُڈ صاحب کی اس رائے سے متفق ہیں کہ جب تک مستورات ابتدائی تعلیم کو اپنے

ہاتھ میں نہیں لیتیں، تب تک تعلیم عام نہیں ہو سکتی، لیکن اس امر کو عملی جامہ پہنانے میں کافی دیر لگے گی، اس لیے اس وقت تک ضروری ہے کہ ملک میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل کوششیں کی جائیں۔

اوّل شہری اور دیہاتی زندگی میں جو اتنا زیادہ فرق ہے، اُس کو دُور کیا جائے۔ دیہات میں موجودہ تہذیب کی برکات کو رائج کیا جائے اور شہروں سے اس کی بُرائیاں دُور کی جائیں۔

دوم لڑکیوں کی تعلیم پر اتنا ہی زور دیا جائے، جتنا کہ لڑکوں کی تعلیم پر۔

سوم جہاں لڑکیوں کی تعلیم کا علیحدہ انتظام نہیں، وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے یکجا اسکول کھولے جائیں۔

دوسری اہم سفارش جو وُڈ صاحب نے کی ہے، وہ یہ ہے کہ پرائمری اسکولوں میں تعلیم بالکل کتابی ہی نہ ہو، بلکہ اس کا تعلق بچّوں کی روزانہ زندگی، اُن کی خواہشات اور جذبات سے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُستاد علم کو طلبہ کے دماغ میں ڈنڈے کے زور سے ٹھونسنے کے بجائے بچّے کی گوناگوں عادات و حرکات کا مطالعہ کرے اور تعلیم کو ان پر مبنی کرتے ہوئے دلچسپ بنائے۔ ہمیں افسوس سے اقبال کرنا پڑتا ہے کہ گو ساری دُنیا نئی تعلیم کے اصولوں سے مستفید ہو رہی ہے، لیکن ہندوستان میں خاص کر دیہاتی اُستاد ابھی تک پُرانی لکیر کا فقیر چلا آتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کو بچّے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تاکہ وہ اس کا تعلق اپنی زندگی کے ساتھ محسوس کرے اور اُس کی تحصیل میں دلچسپی ظاہر کرے۔

وُڈ صاحب کی تیسری سفارش یہ ہے کہ ہر ایک اسکول کے تعلیمی نصاب میں دستکاری کو جگہ دی جائے۔ اس واسطے نہیں کہ اس سے بچّے اپنی روزی کمانے کا سوال حل کر سکیں، بلکہ اس لیے کہ جو کام کرنے کی خداداد طاقت ہر ایک بچّے میں موجود ہے، اُس کی پُورے طور سے

نشوونما ہوسکے۔ ہر ایک بچّے کی خواہش ہوتی ہے کہ وُہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے، اُدوڑے، کُودے، نئی نئی اشیا بنائے، ان کو توڑے اور پھر بنائے۔ بچّے کی ان عادات کو دیکھ کر بعض والدین اور اساتذہ شرارت کا اظہار سمجھ کر انھیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن آج کل کے ماہرین علمِ حیوانات کا دعویٰ ہے کہ ان حرکات کے ذریعے بچّہ اپنی اندرونی طاقتوں کو نشوونما دینا چاہتا ہے۔ اگر ان حرکات کو سیدھے راستے پر ڈالا جائے، تو اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں اور اگر ان کو دبا دیا جائے یا ان کی تربیت نہ کی جائے، تو وُہ ناجائز ذرائع سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس لیے تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بچّے کی یہ حرکات بامعنی سمجھی جانی چاہییں اور ان کی نشوونما کے لیے ضروری سامان مہیا کرنا چاہیے۔

ابتدائی تعلیم کے بارے میں وُڈ صاحب نے چوتھی سفارش یہ کی ہے کہ ہر ایک اسکول میں جسمانی تعلیم کا انتظام خاطر خواہ ہونا چاہیے تاکہ اس سے اسکول کا ہر ایک بچّہ پورا پورا فائدہ اُٹھا سکے۔ موجودہ انتظام تسلی بخش نہیں ہے، کیونکہ اس کے مطابق صرف چند چیدہ طلبہ ہی مستفید ہوتے ہیں۔ مسٹر جی کے چسٹرٹن، جو ایک مشہور مضمون نگار گزرے ہیں، اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں جب انگلستان میں کرکٹ بھدّے طور پر کھیلا جاتا تھا، اُس وقت انگلستان کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، لیکن موجودہ زمانے میں جبکہ کرکٹ ایک مشکل فن بن گیا ہے، ملک میں کمزوری کے نشان نظر آنے لگے ہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ زمانۂ ماضی میں انگلستان کا ہر ایک بچّہ اس کھیل میں حصّہ لیتا تھا، اس لیے گو اس وقت یہ کھیل بہت خوبی سے نہیں کھیلا جاتا تھا، لیکن انگلستان کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی۔ اس کے برعکس آج کل اگر بائیس آدمی کرکٹ کھیلتے ہیں، تو بائیس سو سے زیادہ تماشبین ہوتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت ہندوستان کی ہے۔ وُڈ صاحب کی رائے میں سب کھیل دلچسپ اور فائدہ مند ہونے چاہییں اور ان کا انتظام اس طرح ہونا

چاہیے کہ ہر ایک طالب علم ان سے فائدہ اور حظ اُٹھا سکے۔

مذکورۂ بالا سفارشوں کا منشا یہ ہے کہ طلبہ ابتدائی درسگاہوں کو جائے دہشت نہ سمجھیں، بلکہ ان میں خوشی خوشی آئیں اور وہاں آکر اپنی اندرونی طاقتوں کو پورے طور پر تربیت دے سکیں۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد صرف نوشت و خواند تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے علاوہ اس کا ضروری نصب العین یہ بھی ہے (اگر نہیں ہے، تو ہونا چاہیے) کہ طالب علم اپنے ارد گرد کے مناظرِ زندگی میں دلچسپی پیدا کرے اور اپنے جذبات و احساسات کی تربیت کر سکے۔ اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک دو شرائط کا پورا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے ہم ان کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

پہلے یہ کہ اساتذہ کافی تعلیم یافتہ ہوں۔

دوم ان کا زاویۂ نگاہ وسیع ہو، یعنی، وُہ صرف پُرانی لکیر کے فقیر ہی نہ ہوں، بلکہ خود بیدار مغز ہوں اور نئی تعلیم کے اصولوں سے واقف۔

سوم وُہ بچے کی اندرونی و بیرونی زندگی سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں اور دونوں میں موافقت پیدا کرنے کے اہل ہوں۔

چہارم اُن کو اپنے پیشے سے محبت ہو۔

ہمارے خیال میں مذکورۂ بالا شرائط تب تک پوری نہیں ہو سکتیں، جب تک حکومت اساتذہ کو اُن کی خدمات کے صلے میں معقول معاوضہ دینے کا بندوبست نہیں کرتی، کیونکہ اچھی تنخواہوں کے بغیر بیدار مغز تعلیم یافتہ اشخاص کا ملنا مشکل ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ زمانۂ ماضی میں بھی اساتذہ کی خدمات کا معاوضہ بہت زیادہ نہیں ہوا کرتا تھا، لیکن زمانۂ ماضی اور موجودہ زمانے کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پُرانے زمانے میں اُستاد کی ضروریات تھوڑے ہی سے

سرمائے سے پوری ہوجاتی تھیں، لیکن آجکل حالاتِ زندگی بہت تبدیل ہوگئے ہیں۔ اُستاد موجودہ مہذّب سوسایٹی کا اتنا ہی ضروری جز ہے، جتنا کوئی اُور پیشہ ور۔ اس کو رہنے کے لیے مکان، پہننے کے لیے کپڑے اور کھانے کے لیے خوراک کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی دوسرے پیشوں کے لوگوں کو۔ اس کے علاوہ اسے اپنے مطالعے کو برقرار رکھنے کے لیے کتابوں کی بھی ضرورت رہتی ہے۔ ایسے حالات میں اگر ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم قابل شخصوں کے ذمّے ہو، تو ضروری ہے کہ ان کی قدر کی جائے اور اُن کی خدمات کا معقول معاوضہ دیا جائے۔

مسٹر وُڈ کی آخری سفارش یہ ہے کہ ملک کے مختلف صوبوں میں مخصوص جگہوں پر نارمل اسکول یا ٹریننگ کالج کھولے جائیں اور ان میں اساتذہ کو ابتدائی تعلیم دینے میں ماہر کرنے کے لیے تین سال کی ٹریننگ دی جائے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ علمِ تدریس پر ہر ایک شخص حاوی نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصولوں اور پریکٹس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ باقاعدہ ٹریننگ حاصل کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اشخاص ابتدائی تعلیم کا کام اپنے ذمّے لینا چاہتے ہیں، اُن کو اپنی تعلیم کی تکمیل میں کافی سرمایہ اور وقت صرف کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس امر کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے کہ مستقبل کے اساتذہ کو ابتدائی تعلیم کو کامیاب بنانے کے لیے کافی وقت اور روپیہ خرچ کرنا ہوگا، حکومت ان کی قدر دانی کریگی اور ان کی تنخواہیں اُن کی خدمات کی اہمیت کے مطابق مقرر کریگی، تاکہ وُہ اپنے کام کو خوش دلی و خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔

ہم نے اس مضمون میں صرف انھیں سفارشوں پر بحث کی ہے، جن کا تعلق ابتدائی تعلیم سے ہے۔ آئندہ موقع مِلا، تو باقی سفارشوں کو بھی اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرینگے۔

۷

روس کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد صاحب، ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۳)

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تفریق جیسے ہمارے ہاں یا دوسرے ممالک میں رائج ہے، روس میں موجود نہیں (اگرچہ اب اس میں فرق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے)۔ صرف تین درجے کے مدارس ہیں، جن میں یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ پہلے درجے کی خواندگی چار سال کی ہے، لیکن بعض قومی آزاد جمہوریتوں میں، جہاں تعلیم بعض حالات میں دو زبانوں میں ہوتی ہے، (روسی اور مادری)، وہاں پانچ سال لگتے ہیں۔ دوسرے درجے کے مدارس میں بچے بارہ سے پندرہ برس کی عمر تک رہتے ہیں۔ ان دونوں درجوں کو ملا کر ہفت سالہ مدارس (Semiletka.) کہتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ آتا ہے، جہاں طالب علم پندرہ سے اٹھارہ برس کی عمر تک رہتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت روس میں دس سال تک عام مفت تعلیم لازمی ہے، لیکن دہ سالہ مدارس ابھی پورے طور پر رائج نہیں ہوئے، کیونکہ ۱۹۳۱-۳۲ء سے ان کی طرف توجہ دی جانی شروع ہوئی ہے۔ اس لیے اگرچہ اصولاً صنعتی تعلیم، عام تعلیم کی تکمیل کے بعد شروع ہونی چاہیے، لیکن چونکہ ملک بالکل پست حالت میں تھا، اس لیے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے فی الحال اس اصول کو ترک کر دیا گیا ہے اور ہفت سالہ مدارس کے بعد ہی صنعتی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

لینن کا یہ فقرہ کہ جاہل اور اَن پڑھ انسان کبھی فتح حاصل نہیں کر سکتے، ان کی تعلیم کا بنیادی اصول تھا۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے روسی مدبّرین نے ۲۶-۱۹۲۵ء میں تمام ملک کے لیے عام ابتدائی (مفت) تعلیم کا قانون جاری کر دیا اور پورے زور شور سے کام شروع ہوا۔ چار سال کی ان تھک کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء میں، جہاں پہلے صرف ۳۳ فیصدی پڑھے لکھے موجود تھے، وہاں ۶۲،۶ فیصدی ہو گئے۔ ذیل کے اعداد سے، جو صرف R.S.F.S.R. کے متعلق ہیں، اس ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

	۲۸-۱۹۲۷ء	۳۲-۱۹۳۱ء	
ابتدائی مدارس میں بچوں کی تعداد	۶،۷۹۶،۴۰۰	۱۲،۸۶۷،۵۰۰	یعنی ۶۳،۳ فیصدی ترقی ہوئی
اعلیٰ مدارس میں بچوں کی تعداد	۸۲۶،۲۰۰	۲،۷۸۱،۳۰۰	یعنی ۳۶۶،۶ فیصدی ترقی ہوئی

اور یہی حالت باقی آزاد قومی جمہوریتوں کی ہے۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دوسرے پنجسالہ پروگرام کے پہلے ہی سال میں چار سالہ لازمی تعلیم تمام R.S.F.S.R. میں رائج ہو چکی تھی اور شہروں اور صنعتی مراکز میں ہفت سالہ لازمی تعلیم اور اُن طالب علموں میں سے، جنھوں نے دیہاتی چار سالہ مدارس کی تعلیم ختم کر لی تھی، ۶۰ فیصدی ہفت سالہ مدارس کے پانچویں سال میں داخل ہو گئے۔ اِن کے آئندہ پروگرام سے پتہ چلتا ہے کہ وُہ مندرجہ ذیل ترقی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں :-

(۱) چار سالہ مدارس کی ترقی اب ممکن نہیں، کیونکہ لازمی تعلیم اب عام ہو چکی ہے، یعنی، کل آبادی کے تعلیمی عمر کے بچوں کی تعداد، جو ان مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ۹۸ فیصدی ہے۔

(۲) لیکن ہفت سالہ اور دَہ سالہ مدارس میں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ آمدنی زیادہ ہو اور ملک خوشحال ہو، تو لازمی تعلیم بجائے چار سال کے پہلے، سات سال کر دی جائے اور آخر میں دس سال -

۱۹۳۳ء میں مندرجۂ ذیل ترقی ہوئی (R.S.F.S.R.)

	۱۹۳۲ء	۱۹۳۳ء	
ہفت سالہ مدارس میں	۲,۶۷۸,۰۰۰	۳,۸۴۸,۰۰۰	یعنی ۴۳ فیصدی
دو سالہ مدارس میں	۴۵,۰۰۰	۱۱۶,۰۰۰	یعنی ۱۵۹ فیصدی

اس کے بعد کوشش کی جارہی ہے کہ سارے (R. S. F. S. R.) میں ۱۹۳۷ء میں اتنے مدارس قائم کیے جائیں کہ ان میں تین کروڑ اور پانچ لاکھ بچے تعلیم حاصل کرسکیں۔ ہفت سالہ مدارس کو دیہات میں زیادہ وسعت دی جارہی ہے اور دو سالہ مدارس کو شہروں میں۔

روس میں ان مدارس کو پہلے یونیفائڈ لیبر اسکول (Unified Labour School.) کہتے تھے۔ اگرچہ تھوڑے عرصے سے یہ نام بدل دیا گیا ہے، لیکن اصول تعلیم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ موجودہ زمانے کے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ مختلف قسم کے تمدنی مشاغل اور عملی کاموں پر مدرسے کی تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہیے اور بجائے الفاظیت کے، جو گزشتہ صدیوں کے مدارس کی خصوصیت تھی (اور آجکل ہندوستان میں وہی پرانا اصول کارفرما ہے) فعالیت کو زیادہ نمایاں جگہ دینی چاہیے، کیونکہ ماحول کے تمدنی مشاغل میں حصہ لیے بغیر دماغی ارتقا ممکن ہی نہیں۔ پروفیسر ڈیوئی (Dewey.) جو اپنے نقطۂ نگاہ میں اشتراکی اصول سے سب سے زیادہ نزدیک ہے، محنت کو مدارس کی تعلیم کا مرکز بنانا چاہتا ہے، مگر اشتراکی ماہرین اس کو محض تعلیم کا مرکز ہی بنانا نہیں چاہتے، بلکہ مدرسے کے تمام نصاب پر حاوی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا محور ہے، جس پر مدرسے کی تعلیم کا انحصار ہونا چاہیے۔ فرض کیا جائے کہ ایک ایسا مدرسہ ہے جس میں محنت کے مختلف شعبوں کے مطالعے کے لیے کافی سامان ہے اور جہاں ہر مضمون کا انحصار محنت پر ہے، لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھی ایک اہم کمی

رہ جاتی ہے۔ وُہ کیا ہے؟ ایک زندہ اور پختہ تعلق مضمون اور زندگی کے درمیان جو نہ صرف نظری طور پر کتابوں سے حاصل کیا جائے، بلکہ عملی طور پر حاصل کیا جائے، یعنی، اگر پڑھنا لازمی اور ضروری ہے، تو عملی زندگی کے مختلف مشاغل سمجھانے بھی کوئی کم اہمیت نہیں رکھتے اور اشتراکی مدارس میں یہ مشاغل نہ صرف معاشری (Social.) ہونے چاہییں، بلکہ فائدہ مند بھی ہوں۔ فائدہ مند ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: وہ کام جس سے مدرسے اور طالب علموں کو فائدہ ہو اور دوسرے وُہ کام جس سے ارد گرد کے رہنے والوں کو فائدہ پہنچے۔ روسی مدبرین کے نزدیک دوسرے معنی زیادہ بہتر ہیں، کیونکہ ایسے کاموں کی ملک کو بہت ضرورت ہے۔ پروفیسر پنکے وچ (Pinkevitch) جن کی دو تصانیف سے میں نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے، اس کی وجہ یُوں بیان کرتے ہیں: "ہم لوگوں کی غربت، جہالت اور پستی کی وجہ سے ہمارے مدرسوں کے لیے عملی، تمدنی اور معاشی ترقی کی اہمیت دولت مند ملکوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے" اور یہی حال اس وقت ہندوستان میں ہے۔

پس روسی مدبرین کی رائے کے مطابق محنت کی دو خصوصیات ہونی چاہییں۔ اول یہ کہ محنت بارآور (Productive.) ہو اور دوم یہ کہ معاشری حیثیت سے فائدہ مند (Socially useful) ہو۔ بارآور محنت مدارس میں کئی مختلف طریقوں سے رائج کی گئی ہے مثلاً باورچی خانے میں، مدرسے کی زمین میں پھل پھول اور ترکاریاں کاشت کرنے سے یا مدرسے کے ملحقہ کارخانے میں کام کرنے سے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محنت محض محنت کرنے کے لیے یا بچوں کو ہمیشہ سکھانے کے لیے نہیں داخل کرنی چاہیے، بلکہ صرف تعلیمی اغراض کے لیے۔ جیسا کہ ایک روسی مصنّف لکھتا ہے: "ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ مدرسہ آخر مدرسہ ہے۔ کارخانہ یا فیکٹری نہیں۔ اس سلسلے میں ایک روسی مدرسے کے تعلیمی طریقے کا بیان دلچسپی سے خالی نہ

ہوگا، کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح محنت، تعلیم اور زندگی میں تعلق پیدا کیا جاتا ہے۔

ایک مدرسے کے طالب علم اپنی تعلیم کے آخری سال کے دوران میں چھ ماہ تک سہ پہر کو ایک کپڑا بننے والے کارخانے میں جاتے ہیں (ہفتہ میں پانچ دفعہ اور روزانہ دو گھنٹے)۔ کچھ مدت تک تو وہ کاریگروں کو کام کرتے دیکھتے رہتے ہیں اور پھر خود کام کرنے لگتے ہیں، لیکن اس دوران میں مدرسے کی تعلیم جاری رہتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر مضمون کا آغاز اس کارخانے کے مشاہدات سے کیا جائے تاکہ کام میں زندگی پیدا ہو جائے اور بچے کام ذاتی شوق سے کر سکیں۔ ذیل میں دو ایک مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) **تاریخ**۔ اُس خاص کارخانے کی تاریخ سے آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد عام روسی کارخانوں اور روسی صنعت کی ترقی کی تاریخ آتی ہے اور چونکہ صنعت و حرفت کی ترقی سرمایہ داری نظام کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے دیگر تاریخی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ مثلاً سامراج (Imperialism.)، جنگِ عظیم، خاتمۂ شہنشاہیت اور اشتمالی دور۔

(۲) **معاشیات** (Economics.) یہ بحث اُس کارخانے ہی سے شروع ہوتی ہے۔ پھر مزدوروں کی سماجی حیثیت، عورتوں اور بچوں کی مزدوری کا سوال، مزدوری کرنے کے لیے کتنے گھنٹے کام کرنا چاہیے۔ اُجرت اور محصول (Tariff policy.)، انجمن اتحاد مزدوراں (Trade Union.) اور اس کا مقصد، کارخانوں کا ساز و سامان، پیدائش کے ذرائع اور اُن کا مختلف جگہوں اور ملکوں میں بھیجنے کا انتظام، زر، اعتبار (Credit.)، تجارت، منڈی کا بھاؤ، نفع، اشتراکی جمہوریت میں پیدائش کا انتظام اور صنعتی بدحالی وغیرہ وغیرہ مباحث زیرِ غور آتے ہیں۔ لیکن یہ سب مضامین بچوں کی عمر اور سمجھ کے مطابق سمجھائے جاتے ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ محنت کا دوسرا رُخ (یعنی معاشری حیثیت سے فائدہ مند ہونا)

کس طرح روسی مدارس میں رائج ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:۔

(۱) معاشری اور سیاسی کام۔ مقامی مجالس قوانین ساز کے انتخاب میں لوگوں کو حصہ لینے کے لیے اُبھارنا اور کوشش کرنا کہ صحیح آدمی کا انتخاب عمل میں آسکے۔ انتخاب کے دوران میں لوگوں میں اشتہارات وغیرہ بانٹنا اور رائے دہندگان کی فہرست مرتب کرنا، بعض انجمنوں کے لٹریچر کو عوام میں تقسیم کرنا اور اُن کے لیے چندہ فراہم کرنا وغیرہ۔

(۲) عوام میں توسیع علم کے لیے کوشش کرنا۔ مذہب اور توہم پرستی وغیرہ کے خلاف خیالات پھیلانا، بے خانماں و یتیم بچّوں کی مدد کرنا، افراد اور جماعتوں میں جوانوں، بچّوں اور کسانوں یا مزدوروں سے جہالت کے دُور کرنے کی کوشش کرنا، دیہات کے کتب خانوں اور ریڈنگ روموں کی ہر طریقے سے مدد کرنا، عوام کو اخبار پڑھ کر سُنانا اور اُن میں تقسیم کرنا، وغیرہ۔

(۳) حفظانِ صحت۔ صحت افزا عادات پیدا کرنے کا پرچار کرنا اور مختلف قسم کی بیماریوں اور خاص کر چھوت کی بیماریوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا، تمباکو اور شراب کے خلاف پرچار کرنا، دیہات کے ریڈنگ روم کے لیے نقشے اور موٹو تیار کرنے اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے گھروں میں حفظانِ صحت کا خیال رکھنا، بازاروں اور کنوؤں کی صفائی کا خیال رکھنا اور مقامی دواخانے کے لیے مختلف قسم کی بوٹیاں جمع کرنا، وغیرہ۔

یہ وُہ اشغال ہیں، جو روسی مدرسوں میں عام طور پر رائج ہیں۔ نہ صرف یہ کہ یہ کام بچّوں کے ذوق کے مطابق ہیں، بلکہ دنیاوی زندگی کے مشکل معاملات کو حل کرنے میں عملی طور پر مدد ملتی ہے۔ ان کا اور دوسرے اسی قسم کے فائدہ مند اشغال کا مقصد یہ ہے کہ ارد گرد کے لوگوں کی حالت بہتر ہو جائے اور اس طرح قوم کی مجموعی حالت مضبوط ہو جائے، لیکن ان بیانات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مدرسے کی عام تعلیم کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ ان مشاغل کے متعلق یہ احتیاط کی جاتی ہے

کہ وُہ بچّوں کی دماغی حالت کے مطابق ہوں اور مدرسے کی تعلیم میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ اگر ان مشاغل کو بچّوں کی نفسیاتی ضروریات کے مطابق رکھا جائے، تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان مشاغل سے بچّوں کی تعلیم میں بہت آسانی ہو جائیگی۔

آجکل ان مدارس کا نام سوویٹ پولی ٹکنک سکولز (Soviet Polytechnic Schools) رکھا گیا ہے اس تبدیلی کا مقصد یہ نہیں کہ وُہ اپنے مدارس سے صنعت کو نکال دینا چاہتے ہیں، بلکہ چونکہ روسی ماہرین کی رائے کے مطابق، مدارس میں صنعتی تعلیم کو خاص جگہ دینی چاہیے۔ اسی لیے انھوں نے یہ نام مقرر کیا ہے۔ "پولی ٹکنک" سے مراد یہ ہے کہ مدرسوں میں بچّے کسی خاص صنعت کو نہ سیکھیں، بلکہ مختلف صنائع کے اصولوں سے واقفیت حاصل کر لیں۔ کارل مارکس لکھتا ہے: "صنعتی (Poly-technical) تعلیم وُہ ہے، جس سے پیدائش اشیاء کے عام اصولوں کی تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ ہی بچّوں کو تمام صنائع کے سادہ اوزاروں کے استعمال کرنے کا عملی طریقہ آجائے۔ اس سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ مارکس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ سماج میں جو اشتراکی اصولوں کے ماتحت قائم ہونے والا ہے، تقسیم عمل کا اصول جو اس وقت بڑژوا ریاستوں میں قائم ہے، مٹا دیا جائے۔ اس تقسیم عمل کے اصول نے انسانوں میں ایسی تفریق پیدا کر دی ہے، جس سے دُنیا کے اقتصادی نظام میں ایک زبردست مصیبت پیدا ہو گئی ہے۔ اسی لیے روس میں تمام صنعت حکومت کے ماتحت ہے، جو مجموعی طور پر قوم کے فائدے کے لیے چلائی جاتی ہے۔ اسی مقصد کو پُورا کرنے کے لیے تعلیم کو ایسے رنگ پر ڈھالا گیا کہ بچّوں کو ہر قسم کی صنعت سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وُہ ہر اُس صنعت میں کام کر سکیں گے، جہاں حکومت کو ان کی ضرورت ہوگی۔ بڑژوا ریاستوں میں صنعتی انقلاب کے بعد تقسیم عمل کا اثر ایسا بُرا ہوا ہے کہ مزدور بیچارے محض مشین کے پرزوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ وُہ اپنا مخصوص حصّہ ختم کرنے کے علاوہ دیگر سب باتوں

سے ناواقف ہیں۔حتیٰ کہ انھیں اپنے کیے ہوئے کام کی معاشری قدر کا اندازہ نہیں ہوتا۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی دماغی نشوونما بالکل کالعدم ہوتی جاتی ہے۔خود پروفیسر ڈیوئی (Dewey.) جو امریکہ ایسے سرمایہ دار ملک کے ممتاز رکن ہیں، اس حالت کے شاکی ہیں اور اسی لیے انھوں نے اس حالت کے خلاف احتجاج کیا ہے۔چنانچہ وہ اپنی کتاب "آئندہ کے مدارس" (Schools of tomorrow.) میں تین اصول قائم کرتے ہیں۔

(۱) موجودہ دور میں یہ بہت اہم ہے کہ ہر فرد فراست و دانائی کے ساتھ ایسا کام کر سکے جس سے اُس کی عزت برقرار رہے اور وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کام کی حیثیت اور اہمیت کو سمجھے اور اُس کے کرنے میں لذت محسوس کرے۔

(۲) موجودہ دور میں فرد واحد کا کام، دوسرے افراد کی بھلائی اور برائی پر اتنا اثر انداز ہوتا ہے کہ قرونِ گزشتہ میں اس کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا۔

(۳) کارخانوں کے کام میں مہارت حاصل کرنے کے لیے علوم طبیعیہ اور علوم معاشری کے اصول اور قوانین کا جاننا لازمی ہے۔اگر کاریگروں اور مزدوروں کو ماہرینِ فن بنانے کے علاوہ انسان بنانا لازمی ہے، تو ضروری ہے کہ اِن کو مشینوں کے بنیادی اصولوں سے واقف کیا جائے اور اِسی طرح معاشری اصولوں سے۔

اِن سے جو تعلیمی نتائج پیدا ہوتے ہیں، وہ واضح ہیں۔تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم اپنے علم کو زندگی کی ضروریات سے وابستہ کرنا سیکھ لیں اور پھر وہ علمی قوانین حاصل کریں، جن کے بغیر عملی زندگی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتی۔اس کے علاوہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ اُن کو کسی خاص پیشے کے لیے تیار کیا جائے، بلکہ اُن کی اُن جبلی خصوصیات کو نمایاں کیا جائے، جن کی مدد سے وہ عملی دُنیا کے کاموں میں ایک زندہ ذوق دکھا سکیں۔نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اپنی زندگی کے

مختلف شعبوں میں، خواہ وُہ خانہ داری کے معاملات ہوں یا روزی کمانے کے، عقل وفراست کو استعمال کرسکیں گے۔" اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ باغبانی، پارچہ بافی، لکڑی اور دھات کا کام، کھانا پکانا اور اسی قسم کے مختلف مشاغل، جو انسانی کاروبار میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور مدارس جدید میں داخل کیے گئے ہیں، محض روزی کمانے کا ذریعہ ہیں، تو ہم ان کی واقعی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت وحرفت کے تمام کاروبار ایک ناگزیر مصیبت معلوم ہوتے ہیں، جن کو وُہ محض حصول معاش کی خاطر گوارا کرتے ہیں، لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں، بلکہ اُن حالات کا ہے، جن میں یہ کام کیے جاتے ہیں۔ دورِ حاضرہ کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اہمیت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے، اس لیے تعلیم کا فرض ہے کہ وُہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے اور ان کا سائنس پہ۔ مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کیے جاتے، بلکہ اپنی داخلی قدروقیمت کی بنا پر۔ جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواہشات سے آزاد ہو جاتے ہیں، تو ان کے ذریعے سے ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں، جو بجائے خود مفید ہیں۔ اس وقت وُہ واقعتہً دماغ کی آزاد تربیت کا باعث ہوتے ہیں۔" (پروفیسر ڈیوئی۔ دیکھو اصول تعلیم مصنفہ پروفیسر غلام السیدین صاحب ص۲۱۱-۲۱۲)

ان اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے روسی ماہرینِ تعلیم نے مدرسوں میں مختلف قسم کے سامان مہیا کیے ہیں، لیکن چونکہ ابھی سرمایہ ناکافی ہے، اس لیے تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکا۔ پھر بھی جو کچھ اُنھوں نے کیا ہے، ہندوستان کی ترقی کو دیکھتے ہوئے واقعی حیرت انگیز ہے، خاص کر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اصلاحات صرف سترہ سال کے اندر ہوئی ہیں۔ تقریباً ہر مدرسے کے ساتھ ایک صنعتی کارخانہ یا زرعی زمین ہوتی ہے، جہاں اساتذہ کی زیرِ نگرانی بچے کام کرتے ہیں۔ چنانچہ لینن گراڈ میں بجلی کے ایک کارخانے کا تعلق مدرسہ نمبر ۸۰ سے ہے، جس کیلیے

وہاں کے مہتمم نے ایک علیحدہ چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا ہے، جہاں ہر طالب علم کے لیے پورا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ بڑی عمر کے بچے بڑے کارخانے میں بھی کام کرتے ہیں۔ کام شروع کرنے سے پہلے اُنھیں مشینوں کے کاموں کے متعلق خاص ہدایات دی جاتی ہیں۔

بہت مدت تک روسی مدارس میں طریقۂ ڈالٹن اور طریقۂ منصوبی استعمال ہوتے رہے۔ جن کے ذریعے تمام تعلیم ہوتی تھی، لیکن ۱۹۳۱ء میں یہ طریقے بند کر دیے گئے، کیونکہ تجربے سے معلوم ہوا کہ ان طریقوں سے بچے کے علم میں صحیح اضافہ نہیں ہوتا اور نہ بچوں کو منظم طور پر کام کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے منصوبی طریقے کے مطابق نصاب کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا: قدرت، محنت اور معاشرت اور ان تین عنوانوں کے تحت سب مضامین کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کی مثال میں نے ص۲ کے فٹ نوٹ میں درج کر دی ہے۔ اس وقت جو طریقہ رائج ہے، وہ "سبق" پڑھانے کا ہے، یعنی "جماعت" میں باقاعدہ ٹائم ٹیبل کے مطابق سبق پڑھایا جاتا ہے۔ (یہ یاد رہے کہ یہ طریقہ ۱۹۳۲ء سے پہلے رائج نہ تھا۔) اُستاد کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو باقاعدہ تعلیم دے، لیکن طریقۂ تعلیم کسی حالت میں انفعالی نہ ہونا چاہیے۔ نصاب کے لیے باقاعدہ کتابیں مقرر کی گئی ہیں اور اُن پر پورا پورا زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۲۵ اگست ۱۹۳۲ء اور ۱۲ فروری ۱۹۳۳ء کے نئے فیصلے کے مطابق ساڑھے چار کروڑ درسی کتابیں طبع کی گئیں۔ ان میں سے بعض انقلاب سے پہلے کی کتابیں ہیں، جن میں تھوڑا بہت ردّ و بدل کر دیا گیا ہے، مگر عام مطالعے اور عملی کام پر بہت زور دیا جاتا ہے اور ہر استاد کے ذمّے فرض ہے کہ انفرادی طور پر ہر طالب علم کی تعلیمی ترقی کے متعلق کوشاں رہے۔

مندرجۂ ذیل دو نقشوں سے پہلے اور دوسرے درجے کے مدارس کی خواندگی، نصاب اور ٹائم ٹیبل معلوم ہو جائیگا:۔

شہر کے ابتدائی مدارس کی خواندگی

(وقت گھنٹوں میں)

مضامین	سال اوّل	دوم	سوم	چہارم
مادری زبان	۶	۶	۵	۵
حساب	۵	۵	۵	۵
علمِ طبیعی	۲	۲	۲	۳
علمِ معاشری (Sociology.)	۲	۲	۲	۲
جغرافیہ	۰	۰	۲	۲
دستی کام	۲	۲	۳	۳
غیر ملکی زبان	۰	۰	۰	۲
جسمانی ورزش	۱	۱	۱	۱
فنونِ لطیفہ (ڈرائنگ وغیرہ)	۱	۱	۱	۱
گانا	۱	۱	۱	۱
میزان	۲۰	۲۰	۲۲	۲۵

دیہاتی مدارس کی خواندگی میں صرف اتنا فرق ہے کہ مادری زبان، حساب اور فنونِ لطیفہ، یعنی، ڈرائنگ کے لیے ذرا زیادہ وقت دیا جاتا ہے اور اس کے بدلے غیر ملکی زبان شاملِ نصاب نہیں ہوتی۔

ثانوی مدارس کے صرف دوسرے درجے کا نصاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے، کیونکہ اگرچہ دہ سالہ مدارس کا رواج روس میں ۱۹۳۴ء سے ہوا ہے اور آجکل وُہ بخوبی چل رہے ہیں لیکن اس کے نصاب کی تفصیل ابھی مہیا نہیں ہو سکی۔

مضامین	سال پنجم	ششم	ہفتم
مادری زبان اور علم و ادب	۵	۴	۴
غیر ملکی زبان	۲	۲	۲
تاریخ	۲	۲	۳
علم معاشرت	۱	۱	۰
جغرافیہ	۲	۲	۱
ریاضی	۵	۴	۵
علم طبیعیات	۲	۳	۲
بیالوجی (Biology.)	۲	۲	۲
علم کیمیا	۰	۲	۳
دستی کام	۵	۴	۵
ڈرائنگ	۱	۱	۱
گانا	۱	۱	۱
جسمانی ورزش	۲	۱	۱
منسوریشن (Mensuration.)	۰	۱	۱
میزان	۳۰	۳۰	۳۱

ان مدارس کے متعلق صرف ایک اور چیز کا ذکر کرنا باقی ہے۔ وہ ان مدارس میں بچوں کی خود انتظامی (Self management.) اور حکومت خود اختیاری (Self Government ہے۔ ان سے بچوں کی اخلاقی حالت بہتر ہوتی ہے اور مدرسے کے ضبط و تادیب میں بڑی آسانی

ہوجاتی ہے اور دوسری طرف بچّے ماحول کی زندگی میں فائدہ مند طریقے سے حصّہ لے سکتے ہیں۔ اگرچہ ۱۹۳۲ء سے پہلے یہ دونوں طریقے مدرسے کی سیاست میں اس قدر نمایاں حصّہ رکھتے تھے کہ مغرب کے دوسرے ممالک میں یہ چیزیں رائج نہ تھیں۔ ان کی گزشتہ حیثیت کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں، جیسے خانگی مدارس کو چلانے والی انتظامی کمیٹیاں ہوتی ہیں، لیکن اب ان کی اہمیت بہت کم کردی گئی ہے اور اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر کی ذمّے داری زیادہ کردی گئی ہے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ ہر مدرسے میں بچّوں کی اپنی انجمنیں ہوتی ہیں، جہاں تعلیم کے معیار کو بلند کرنے اور ضبط و تادیب قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور اس طرح اُستادوں کے کام میں مدد ملتی ہے۔ خود انتظامی مندرجہ ذیل طریقوں سے ہوتی ہے: ہر جماعت مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہوتی ہے، مثلاً حفظانِ صحت کا گروہ، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام مدرسے کی صفائی اور بچّوں کی صحت کا خیال رکھے۔ کھانا کھلانے والا گروہ، جس کے افراد بچّوں میں کھانے کے برتن تقسیم کرتے ہیں۔ کتب خانے کا گروہ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک مدرسے کی کونسل بھی ہوتی ہے۔ یہ مدرسے کے کام کا معائنہ کرتی ہے اور اس میں مختلف مقامی انجمنوں کے نمائندے ہوتے ہیں مثلاً مجالس منتخبۂ قانون ساز، انجمن اتحادِ مزدوراں وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض طالب علم اور اُن کے والدین بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر اِن کا صدر ہوتا ہے، لیکن ان سب انجمنوں کا کام مدرسے کے کام میں ہیڈ ماسٹر کی مدد کرنا ہے اور کسی حالت میں اس کی رائے سے خلاف نہیں جا سکتے چنانچہ ان کمیٹیوں کا کام انتظام کرنا نہیں، بلکہ محض رائے دینا ہے۔ اسی طرح ضبط و تادیب قائم کرنے کے لیے مختلف ادارے ہیں، جن میں سے دو بہت مشہور ہیں۔ مثلاً دی ینگ پاینیرز (The Young Pioneers.) اور دی ینگ کمیونسٹ لیگ (The Young Communist League) پہلی انجمن ادنیٰ مدارس کے لیے ہے اور دوسری اعلیٰ مدارس کے لیے۔ ان انجمنوں کا کام تقریباً اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کی طرح اور ہر طالب علم ان انجمنوں کا رکن ہو سکتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ان انجمنوں کے کارکنوں کی تعداد کل طالبعلموں کی ۳۷٫۵ فیصدی تھی اور ۱۹۳۳ء میں یہ تعداد ۵۱۳ فیصدی تک پہنچ چکی تھی۔

(باقی آئندہ)

ڈالٹن پلین

تجویز تعلیم انفرادی

از
محمد عبدالغفور خاں صاحب، خلیق، ادیب فاضل، منشی فاضل

(گزشتہ سے پیوستہ)

تیسرا باب

آزادی

آزادی ۔فطرۃً انسان آزاد پیدا ہُوا ہے، اس لیے اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ سوچنے سمجھنے اور اُس کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہو تاکہ اس طرح وہ طاقتیں، جو قدرت اُس کو ودیعت فرمائی ہیں، بے روک ٹوک نشوونما پائیں اور حسب منشائے فطرت انسان کا بننے کی طرف رہنمائی کریں، اس لیے لازمی ہُوا کہ قبل اس کے کہ انسان کے شجرِ حیات میں طا وعظمت کی شان نمایاں ہو، اُس کو اپنی نشوونما کے لیے آزاد ہونا چاہیے۔ عمل کی آزاد خیال کی آزادی اور اظہار رائے کی آزادی انسان کی کامل نشوونما کے لیے ازبس ضروری

یہاں آزادی سے مراد شخصی اور فطری آزادی ہے اور اس کے فوائد سے مراد یہ وُہ فوائد ہیں، جو من حیث التعلیم حاصل ہو سکتے ہیں۔ گو اس کے فوائد بے شمار اور ظاہر و ہیں کہ تعلیمی دنیا سے تعلق رکھنے والی ہر ہستی ان سے بیش و کم ضرور واقف ہے تاہم،

مشتے نمونہ از خروارے چند حسب ذیل ہیں :۔

(۱) طالب علم اپنی ضروریات کو بغیر کسی بیرونی تحریک کے محسوس کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

(۲) اپنی درسی مشکلات کو حسب ضرورت دُور کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

(۳) ضبط کی غیر ضروری پابندیوں سے آزاد ہو کر ضابطۂ نفس کا پابند ہو جاتا ہے۔

(۴) اور اس طرح وُہ اپنے رفقائے کار سے تعاون و موالات کرنے لگتا ہے۔

(۵) جمہوری اصول و قوانین کا احترام دل سے کرنا اور ان پر کاربند ہونا سیکھتا ہے۔

(۶) ذمّے داری کا بار اپنی ذات پر محسوس کرنے لگتا ہے۔

(۷) آزادی سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، جو انسانی کامیابی کی جان اور اعلیٰ شخصیت کا جوہر ہے۔

(۸) تجویزِ کار اور اپنے کام کو دل و دماغ اور روح کے کامل انہماک سے بآزادی تمام پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے باعث عزم راست اور مستقل مزاجی پیدا ہوتی ہے اور عزم و استقلال ہماری کامیابی پر ایک زبردست اخلاقی اثر ڈالتا ہے، کیونکہ اس اثر کی بدولت لوگ ہماری ذات پر اعتماد کرتے ہیں اور اعتماد سے ہماری ساکھ قائم ہو جاتی ہے اور ہمیں اخلاقی مدد مل جاتی ہے۔

(۹) تمام منتشر طاقتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔

غرض کہ بچے کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کو ایسے ماحول میں رکھا جائے کہ وُہ اپنے رجحانِ طبع کے مطابق خاص حدود کے اندر جب، جیسے اور جو کام پسند کرے، کرتا رہے تاکہ فارغ التحصیل ہو کر خاص اسی کام کے لیے تیار ہو سکے، جو قدرت اس سے لینا چاہتی ہے اور یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ ہم شروع ہی سے بچّے کو اس حد تک تعلیمی

آزادی دیدیں، جہاں تک کہ اُستاد کی رہنمائی ونگرانی میں مقاصد بالا کے حصول کی غرض سے اس کو درکار ہے۔ آزادی پاکر بچہ اپنے کام میں بے اعتنائی و بے پروائی کا اظہار کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اپنے فرائض کو باقاعدگی سے انجام دینے لگتا ہے۔ ہر وقت گھڑی کی طرف دیکھتا نہیں رہتا۔ کیا آپ موجودہ طریقۂ تعلیم کی صورت میں بچے کی اس نفسیاتی کیفیت کا اندازہ نہیں کرتے کہ جب چھٹی کا گھنٹہ بجتا ہے، تو طالب علم اسکول سے نکل کر اسی طرح مسرور نظر آتے ہیں جس طرح ایک قیدی اپنی رہائی پر خوش ہوتا ہے۔ اس قسم کے احساس ناگواری کو مٹانے اور اپنے مدارس کو طلبا کی دلچسپیوں اور مسرتوں کا مرکز بنانے کے لیے فلاسفر شیراز شیخ سعدیؒ اپنے حکیمانہ انداز میں کیا خوب فرماتے ہیں ؎

کس نہ بیند کہ تشنگانِ حجاز — بر لبِ آبِ شور گرد آیند

ہر کجا چشمۂ بود شیریں — مردم و مرغ و مور گرد آیند

موجودہ طرزِ تعلیم میں جہاں اور سیکڑوں خامیاں ہیں، وہاں ایک خامی یہ بھی ہے کہ عموماً طلبہ کی جماعتیں بنا کر اوقاتِ تعلیم کو مضامین کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا ہے اور پھر انضباطِ اوقات پر مذہبی رسوم کی طرح نہایت سختی سے عملدرآمد کیا جاتا ہے۔

چونکہ جماعتی تعلیم کو باقاعدگی کے ساتھ پورا کرنے کے لیے اسکول میں گھنٹے بجتے ہیں، جو تبدیلیِ مضامین کا الارم ہیں، اس لیے طلبہ کو پابندیِ اوقات کے لیے عین اس وقت جب کہ طبیعت کسی خاص مضمون میں لگی ہوتی ہے، توجہ ہٹا کر طوعاً وکرہاً دوسرے مضامین کی طرف دماغ لڑانا پڑتا ہے، جو ایک ذہنی کوفت اور سخت کسل ہے اور صحیح معنوں میں دانستہ بے توجہ کرنے کا ذریعہ۔

ان حالات میں محض اوقاتِ مدرسہ میں کسی ٹھوس، جامع اور دیرپا تعلیم کی توقع رکھنا ناممکنات

سے ہے اور خاص یہی وجہ ہے کہ معدودے چند ذہین طلبا کے سوا باقی تمام کے تمام بہت کم موجودہ درسگاہوں سے اصلی معنوں میں مستفیض ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر طلبہ گھر پر فرداً فرداً بطور خود ذاتی سعی سے کام لے کر محنت نہ کریں، تو بہت جلد موجودہ طرزِ تعلیم کا پول کھل جائے اور اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے، تو گھر پر طلبہ کو کام دینے کی بدعت اور اسکول ٹائم کے بعد ٹیوشن کی ضرورت ببانگ دُہل پکار پکار کر سُنا رہی ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم غیر تسلی بخش ہی نہیں، بلکہ اس قابل ہے کہ جس قدر بھی جلد ہو سکے، اس کو تبدیل کر دیا جائے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ موجودہ صورت میں طالب علم کام کو اپنا کام سمجھ کر نہیں، بلکہ اُستاد کا کام خیال کر کے کرتا ہے۔ لہٰذا سوائے اس صورت کے کہ اس کی دماغی اور جسمانی ساخت غیر معمولی طور پر واقع ہُوئی ہو، وُہ اپنی خداداد طاقتوں کے صرف ایک حصّے سے کام لیتا ہے۔ وُہ کام کی تکمیل کا ذمّے دار اپنے بجائے بڑی حد تک اُستاد کو قرار دیتا ہے، وُہ اُستاد کے بھروسے پر اپنے ذہن و دماغ پر دباؤ ڈال کر کسی پیچیدہ مسئلے کو خود حل کر لینے کی زحمت سے بچنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس طرح وُہ نئی بات پیدا کرنے اور اپنے دماغی قواے سے کام لینے کا چور ہو جاتا ہے۔ اسکول ٹائم کے بعد جب وُہ رخصت ہوتا ہے، تو دوسرے دن اسکول آنے تک وہ اپنے آئندہ کام کا طریقِ کار سوچنے اور اُس کی ذمّے داریوں سے بے نیاز رہتا ہے۔

ہم جو انفرادی تعلیم کی تجویز پر عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، تو اس کا مطلب یہی نہیں کہ اس طرح طالب علم کو بہت زیادہ معلومات علمیّہ حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہیں، بلکہ اس لیے کہ کام کی ذمّے داری کا صحیح احساس اس میں پیدا ہوتا اور وُہ اپنے کام کی فکر خود کرنے لگتا ہے اور یہی ہے، وہ راز، جو انسانی سیرت کی نشوونما میں کارفرما ہے۔ اگر اس کی صداقت میں کچھ شک ہو، تو آقا اور ملازم کی دماغی حالت و طاقت کا موازنہ عملی زندگی میں کرنا ہوگا

اور اس حقیقت پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ایک ملازم، جب تک دوسروں کا کام کرتا رہتا ہے، اس دوران میں نہ کوئی ترقی کر سکتا ہے اور نہ اپنی آمدنی بڑھانے کے وسائل سوچ سکتا ہے، لیکن جب وہ آزاد ہو کر اپنا کاروبار کرتا ہے، تو ترقی کی کیا کیا صورتیں دماغ سے نکال کھڑی کرتا اور کس کس طرح اپنے کاروباری حریفوں سے میدان جیت لینے کے ذرائع سوچتا اور ان پر عمل کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

حیاتیات پر لیکچر

از

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی ایم اے

(گزشتہ سے پیوستہ)

لڑکیوں کے لیے حیاتیات پر لیکچر کا اختتام مندرجہ ذیل طور پر کیا گیا تھا۞:

اِنسانی بچّہ بھی ہاتھی کے بچّے کی طرح اپنی ماں کے پیٹ میں انڈے سے بڑھتا ہے اور اسے خوراک اور آکسیجن اُن چھوٹی چھوٹی خون کی رگوں سے پہنچتی ہے، جو گھونسلے کی جلد تک پہنچی ہُوئی ہوتی ہیں۔

جب بچّہ بہت چھوٹا ہوتا ہے، تو اُس کی ہڈیاں سخت نہیں ہوتیں، بلکہ نہایت کمزور ہوتی ہیں اور اُنھیں آسانی سے صدمہ پہنچ جاتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ ہم روزانہ حرکت کرتے ہوئے اپنے آپکو کتنے ہچکولے دیتے ہیں۔ بعض دفعہ سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے ہم آخری سیڑھی پر پاؤں رکھ کر اُترنے کے بجائے غلطی سے زمین پر آ رہتے ہیں یا کرسی پر بیٹھتے ہوئے نشست کا غلط اندازہ کر کے ہم دھم سے گر پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہچکولے پیٹ کے بچے کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں، اس لیے قدرت نے اُسے ان ہچکولوں سے محفوظ رکھنے کے لیے نہایت عجیب انتظام کیا ہے، یعنی، پیدا ہونے والے بچّے کے اردگرد قدرت نے گھونسلے میں پانی کی طرح سیال مادہ رکھا ہے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ گھونسلے کی دیواروں کو جو جھٹکے یا ہچکولے لگتے ہیں، وہ اس سیال مادے

۞ لڑکوں کے لیکچر میں اُن جسمانی اعضا کا ذکر کیا جا چکا ہے، جو کہ پیدائش سے قبل بچّے کو محفوظ رکھتے ہیں۔

تک رہ جاتے ہیں اور بچّے کو چوٹ نہیں لگتی۔

تقریباً نو مہینے کے بعد بچہ اس قدر بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ پیدا ہو سکے، اس لیے گھونسلے کی دیواریں اُسے باہر نکالنے کے لیے دبانے لگتی ہیں۔ اگر تمھیں گھونسلے اور اس کے قریب کے اعضا کا وہ نقشہ یاد ہے، جو تمھیں گزشتہ ہفتے دیا گیا تھا، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ گھونسلہ ایک ایسی نالی سے ملا ہُوا ہے، جو رانوں کے درمیان جا کر کھلتی ہے۔ جب بچّہ باہر آنے لگتا ہے، تو یہ نالی پھیل کر بڑی ہو جاتی ہے، تاکہ بچّہ آسانی سے باہر نکل سکے۔ اس طرح سے بچّہ پیدا ہوتا ہے۔

جب بچّہ پیدا ہو جاتا ہے، تو وہ ہماری طرح اپنے پھیپھڑوں سے سانس لینے لگتا ہے۔ اب اُسے خوراک بھی کسی اَور صورت سے ملتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب بچّہ ماں کے پیٹ میں بڑھتا ہوتا ہے، اُس وقت اُس کی ماں کی چھاتیاں اس امر کے لیے تیار ہوتی جاتی ہیں کہ اُسے اُن ایّام میں خوراک دے سکیں، جب وہ پیٹ سے باہر آجائے اور یہ خوراک بھی بہترین خوراک ہوتی ہے، یعنی، دودھ۔

ماں پر پورے نو مہینے ایک طرح کا بوجھ رہتا ہے، کیونکہ اس عرصے میں اُسے دو جانوں کے لیے غذا کھانی پڑتی ہے اور سانس لینا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جب بچّہ پیدا ہونے لگتا ہے، تو اُس وقت بھی نالی کے پھیلنے کی وجہ سے ماں کے درد ہوتا ہے۔ اس لیے جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے، تو ماں کو کچھ دن آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹنا پڑتا ہے، لیکن اگر تم کسی نئی ماں سے سوال کرو، تو وہ تم سے ان قربانیوں اور تکلیفوں کا ذکر نہیں کریگی، جو پورے نو مہینے اُسے بچّے کو تندرست رکھنے کے لیے برداشت کرنی پڑیں، بلکہ وہ اس امر سے مسرور ہوگی کہ اُس کے ہاں تندرست بچّہ پیدا ہُوا ہے۔

تمھیں ایک اور بات پر بھی غور کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ تمھارے پیدا ہونے کے

بعد بھی تمھاری ماں کو تمھارے لیے کیا کچھ کرنا پڑا۔ تمھیں معلوم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اُستانی بننا چاہے، تو اُسے ابھی پانچ سات سال اور تعلیم حاصل کرنے پر صرف کرنے پڑینگے۔ اسی طرح اگر تم ہسپتال میں نرس بننا چاہو، تو تمھیں اُس وقت تک یہ کام سیکھنے بھی نہ دیا جائیگا، جب تک تمھاری عمر اٹھارہ سال نہ ہو جائے اور اس کے بعد تمھیں نہایت مشکل کام کرنا پڑے گا، لیکن ماؤں کو یہ کام سیکھنے کے بغیر اُستانی اور نرس کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ہم نے اسکول میں داخل ہونے سے پیشتر بہت سی بڑی بڑی باتیں اپنی ماؤں سے سیکھی تھیں۔

لہٰذا تم کو مَیں مشورہ دینا چاہتی ہوں کہ تمھیں اُس وقت کا خیال رکھنا چاہیے، جب کہ تم میں سے بہت سی مائیں بن جائیں گی اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تمھاری زندگی کا یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا اور تمھیں اس کے لیے ہر طرح سے تیار رہنا چاہیے۔ ماں کا دماغ اور جسم نہایت تندرست ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں ماں بننے سے قبل اس کی عمر اتنی ہو جانی چاہیے کہ وُہ ماں کے فرائض پوری طرح ادا کر سکے، کیونکہ اگر وُہ عمر میں چھوٹی ہوگی، تو اُس کی ساری قوت بچّے کی پرورش کرنے کے بجائے اپنے آپ کو بڑھانے پر صرف ہو جائیگی۔ علاوہ ازیں اگر ماں کی صحت اچھی نہ ہوگی، تو بھی اس کے بچّے پر اس کا اثر پڑیگا۔

میرا خیال ہے کہ مَیں نے کافی واضح طور پر تمھیں سمجھا دیا ہے کہ ماں بننا کتنی بڑی ذمّے داری ہے اور یہ کہ ہماری ماؤں نے ہمیں کتنی مصیبتوں سے پالا ہے۔

ہماری غذا

از
فیروز حسن صاحب بٹ، ایم اے، ایم او ایل، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

عام صحت اور کھانا کھانے کے متعلق ضروری ہدایات

ہوا۔ جہاں تم رہتے اور کام کاج کرتے ہو، وہاں تازی ہوا ہونی چاہیے۔ ہلکے ڈھیلے مسام دار کپڑے پہنا کرو۔ کھلی ہوا میں چلو پھرو۔ تازی کھلی ہوا میں سویا کرو۔

خوراک۔ مختلف قسم کی غذا کھاؤ۔ دودھ کو مختلف صورتوں اور طریقوں میں استعمال کرو۔ بہت زیادہ نہ کھاؤ اور جلدی نہ کھاؤ۔ چبا چبا کر کھاؤ۔ کھانے کے بعد کم از کم آدھ گھنٹہ آرام کرنا چاہیے۔ کھانے سے فوراً پہلے یا فوراً بعد پانی نہیں پینا چاہیے۔ کھانا کھا چکنے سے کم از کم دو گھنٹے بعد پانی پینا چاہیے۔ پس خوردہ کھانا نہیں کھانا چاہیے اور نہ کسی کا پیا ہوا پانی ہی پینا چاہیے۔

عادات۔ بیٹھے، کھڑے، سوتے اور چلتے وقت سیدھا اور اکڑ کر رہنا چاہیے۔ مسکرات مثلاً سگرٹ، چرس، شراب وغیرہ سے کلی احتراز کرنا چاہیے۔ ہمیشہ صاف ستھرے اور پاکیزہ رہو اور بیماریوں کی چھوت سے اجتناب کرو۔ صبح اُٹھ کر اجابت کے بعد معمولی سی ورزش کرو۔ مسواک سے دانتوں اور حلق کو صاف کرو۔ ناک، آنکھ اور ناخنوں کو ہمیشہ پاک صاف رکھو۔

وزن۔ ہر سہ ماہی اپنے وزن کا جائزہ لیتے رہو۔ زیادہ چربی (بدن میں) خطرناک اور ضرر رساں ہے

سنہری اصول۔ ہمیشہ ہشاش بشاش رہنے کی کوشش کرو اور غم و فکر سے کوسوں دُور بھاگو۔

انسان کی غذائے طبعی کیا ہے؟

"انسان وہی ہوتا ہے، جو کچھ کہ وُہ کرتا ہے" لیکن میں اسے ذرا رد و بدل سے یوں لکھ دیتا ہوں کہ انسان وہی ہوتا ہے، جو کچھ وُہ کھاتا ہے۔ بے شک انسان کی خوراک اس کے جسمانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی قوے پر بہت زبردست اور اَمِٹ اثر ڈالتی ہے۔ دنیا میں تین قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔

(۱) (HERBIVOROUS) وُہ جانور، جو گھاس پات پر گزارہ کر کے پیٹ پالتے ہیں، مثلاً گائے، بھینس وغیرہ۔

(۲) (CARNIVOROUS) وہ حیوانات، جو گوشت کھاتے ہیں، مثلاً شیر، ریچھ، چیتا وغیرہ۔

(۳) (OMNIVOROUS) وُہ جانور، جو ہمہ خور ہیں، یعنی گوشت بھی کھا لیتے ہیں اور سبزی بھی۔ اس جماعت میں حضرت انسان بھی شامل ہیں۔

طبعی افعال و خواص کے اعتبار سے ان تینوں جماعتوں کا انتخاب غذا اختیاری نہیں، بلکہ قدرت نے ان کے قویٰ اور اعضا کی ساخت ہی ایسی بنا دی ہے کہ وُہ صرف وہی چیزیں کھا سکتے ہیں، جس کے لیے ان کے اعضا موزوں و مناسب ہیں۔ بکری گھاس ہی پر گزارہ کرے گی اور شیر اپنے تیز پنجوں اور لمبے دانتوں سے شکار کر کے گوشت ہی کھائیگا۔ گوشت کھانے والے اور سبزی کھانے والے حیوانوں میں فرق مندرجہ ذیل جدول سے واضح ہو جائیگا:۔

گوشت خور جانور

(۱) اِن کے منہ میں چار نوک دار لمبے لمبے دانت ہوتے ہیں۔ ان دانتوں کو کچلیاں یا نشتر دانت بھی کہتے ہیں۔ یہ گوشت کو چیرنے اور اس کو پھاڑنے میں بہت معاونت کرتے ہیں۔

(۲) اِن کے معدے تھیلی کی طرح ہوتے ہیں۔

(۳) اِن کے جبڑے اُوپر نیچے حرکت کر سکتے ہیں، دائیں بائیں حرکت نہیں کر سکتے۔

(۴) اِن کی آنتیں بہت لمبی نہیں ہوتیں، ان کے جسم کی لمبائی سے صرف تین گُنا لمبی ہوتی ہیں۔

سبزی خور جانور

(۱) اِن کے مُنہ میں نشتر دانت نہیں ہوتے۔ اور ان کے بجائے چوڑی چوڑی ڈاڑھیں ہوتی ہیں، جو گھاس اور سبزی چبانے میں مدد دیتی ہیں۔

(۲) ان کے معدے خانے دار ہوتے ہیں۔

(۳) ان کے جبڑے دائیں بائیں حرکت کر سکتے ہیں۔ تاکہ غذا خوب اچھی طرح پیسی جا سکے۔

(۴) اِن کی آنتیں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ بھیڑ کی آنتیں اس کے جسم کی لمبائی سے ستائیس گُنا لمبی ہوتی ہیں۔

اگر ہم انسان کا ان دونوں کے ساتھ مقابلہ کریں، تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ سبزی خور جانوروں کی طرح اس کے مُنہ میں ڈاڑھیں بھی ہیں۔ اس کے جبڑے اوپر نیچے بھی متحرک ہو سکتے ہیں اور دائیں بائیں بھی۔ اس کا معدہ تھیلی بھی رکھتا ہے اور خانے دار بھی ہے۔ اس کی انتڑیاں نہ زیادہ لمبی ہیں، نہ بہت چھوٹی، بلکہ ان کی لمبائی اُس کے جسم سے چھے گنا ہے۔

لہٰذا غذا بھی انسان کے لیے سبزی اور گوشت سے مخلوط ہونی چاہیئے تاکہ سبزی کھانے سے وُہ سبزی خور جانوروں کی طرح تن و توش میں اُونچا اور طاقتور ہو اور گوشت کھانے سے گوشت خور جانوروں کی طرح قوی اور دلیر ہو۔

اگر گوشت زیادہ کھایا جائے، تو مزاج سُست اور تند ہو جاتا ہے اور طبیعت

زود رنج اور غصّہ آور ہو جاتی ہے۔ خود غرضی اور نفسانیت بڑھ جاتی ہے، لیکن گوشت کھانے والی قومیں سبزی کھانے والی قوموں کی بہ نسبت زیادہ دلیر، زیادہ قوی جنگجو اور مشقت طلب ہوتی ہیں۔ اسی لیے پٹھان اور راجپوت گوشت بہت زیادہ کھاتے ہیں، لیکن امن پسند اور صلح جُو اقوام زیادہ تر سبزی کھاتی ہیں۔ ہندوستان گرم ملک ہے۔ اس میں گوشت کا زیادہ استعمال نہیں چاہیے اور خاص کر گرمیوں میں زیادہ گوشت کھانا مضرِ صحت ہے۔

دودھ

دودھ ایک ایسی غذا ہے، جو نوزائیدہ بچّے سے لے کر سال خوردہ بُڈھے پھونس تک کیلیے مفید و نافع ہے۔ اسے سب لوگ کامل غذا تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام اجزائے ضروریہ ہوتے ہیں، جن سے انسان کا جسم پرورش پاتا ہے۔ ایک سیر دودھ کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سوا چھٹانک ایلبیومن (اُردو نام پنیر، عربی نام جُبن اور انگریزی نام کیسین)۔ (۲) ایک چھٹانک نمکیات۔ (۳) سوا چھٹانک شکر۔ (۴) ایک چھٹانک مکھن۔ (۵) باقی پانی

شیر خوار بچّوں کے لیے دودھ ایک کامل غذا ہے۔ انھیں نو مہینے تک "شیر مست" ہی رکھنا چاہیے اور کسی غذا کا مُنہ نہیں دکھانا چاہیے۔ ایک نوجوان چار سیر روزانہ دودھ پی کر پوری طاقت اور طبعی بالیدگی حاصل کر سکتا ہے۔ انگریزی ممالک میں ایسے شخص بھی ہیں، جنھوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، دودھ پر ہی بسر اوقات کی ہے۔ دودھ کا اچھّا یا بُرا ہونا ہر حیوان کی عمر، خوراک اور صحت پر موقوف ہے۔ اگر گائے جوان ہوگی، تو دودھ طاقت ور اور میٹھا ہوگا اور اگر بوڑھی کمزور اور بیمار ہوگی اور چارہ بھی اچھا نہ کھائیگی، تو اُس کا دُودھ بھی بیماری پیدا کرنے والا ہوگا۔

بھیڑ کا دودھ۔ بھیڑ کا دودھ بکری کے دودھ سے زیادہ گاڑھا اور چکنا ہوتا ہے۔ دیر ہضم اور ثقیل ہوتا ہے۔

بکری کا دودھ۔ بھیڑ کے دودھ سے پتلا ہوتا ہے۔ اس میں پکرک ایسڈ بھی پایا جاتا ہے۔

اِس لیے اس میں سے کچھ بُو بھی آیا کرتی ہے۔ سِل اور دق کے مریضوں کے لیے بہت مفید ہے۔
لاہور، امرتسر اور پنجاب کے بڑے بڑے دیگر اضلاع میں دیکھا گیا ہے کہ بعض انجان لوگ بکری کا دودھ
بغیر جوش دیئے اور گرم کرنے کے پیا کرتے ہیں اور مالٹا فیور کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں۔ مالٹا فیور ایک بخار
ہے، جو تیس چالیس برس تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بکری کا دودھ جوش دیئے بغیر ہرگز نہیں پینا چاہیے۔

گائے کا دودھ - یہ شیر خوار بچوں کے لیے صحیح و موزوں غذا نہیں۔ لیکن جوانوں اور بوڑھوں کے لیے مفید اور زود ہضم غذا ہے۔

بھینس کا دودھ - یہ گاڑھا اور زود ہضم ہوتا ہے۔ انسان کو بھینس کی طرح وحشی اور سست بنا دیتا ہے۔ پیٹ میں نفخ پیدا کرتا ہے۔ اس سے انسان موٹا ہو جاتا ہے اور اس کی عقل موٹی ہو جاتی ہے۔

گدھی کا دودھ - یہ ماں کے دودھ کے بدلے بچوں کو پلایا جا سکتا ہے۔ کمزور اور بیمار بچوں کو موافق آ جاتا ہے۔

اونٹنی کا دودھ - اونٹنی عام طور پر جنگلوں میں کانٹے دار جھاڑیاں اور نمکین جڑی بوٹیاں کھاتی ہے، اس لیے اس کا دودھ بھی نمکین ہوتا ہے۔ یہ مستسقی (مریضِ جلندھر) یعنی جو شخص بار بار پانی پیے اس کے لیے نفع بخش ہے۔

گھوڑی کا دودھ - یہ بھی گدھی کے دودھ کی طرح سل اور دق کے مریضوں کے لیے بہت مفید ہے۔

اسی ضمن میں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مرضِ سل چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے، جنھیں مائی کروب کہتے ہیں، پیدا ہوتا ہے۔ جرمنی کے ڈاکٹروں نے انیسویں صدی کے آخر میں یہ مرض دریافت کیا تھا۔ یہ بیماری متعدی ہے، یعنی ایک دوسرے کو چھوت سے لگ جاتی ہے اور گائے کے دودھ اور بعض اوقات اس کے گوشت سے بھی یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سل کے مریض کی چھوت سے گائیں بیمار ہو جاتی ہیں اور پھر دودھ پینے والے سل اور دق کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر گائے کو تنگ و تاریک غلیظ اور گندے مکانات یا مضافات میں رکھا جائے

تو وُہ اس مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کا دودھ پینے سے یہ مرض لگ جاتا ہے۔ یہ مرض امریکہ، فرانس، جرمنی اور انگلستان میں عنقا ہو رہا ہے، لیکن ہمارے بدنصیب ملک میں روز بہ روز رو بہ ترقی ہے، اگرچہ اس کے انسداد کے لیے سالی (کوہ مری)، بھوت، دھرم پور، مہابلیشور (پونہ) اور اور مقامات پر صحت گاہیں (سینے ٹوریم) اور بیمار خانے کھولے جا رہے ہیں، لیکن حفظانِ صحت کے اصول کو مدِّ نظر رکھے بغیر اس موذی مرض کا قلع قمع ہونا ناممکن ہے۔ لاہور جیسے غدار شہروں میں یہ مرض روز افزوں ہے۔ بلدیات کا انتظام اطمینان بخش نہیں۔ گورنمنٹ کو اس طرف خاطر خواہ اقدام کرنا چاہیے۔ اس مرض کی روک تھام کے لیے تندرست اور صاف گائے کا دودھ پینا منفعت بخش ہے، جو لوگ عام راستوں میں تھوکیں، ان کو قانوناً سزا ملنی چاہیے۔ ریل گاڑیوں، فیکٹریوں، کارخانوں اور ٹانگوں وغیرہ کے علاوہ عام بیاہ شادی اور مجالس کے مواقع پر تھوکنا ممنوع ہونا چاہیے۔

اجزائے دودھ کا نقشہ

نام	پانی فی صدی	مکھن فی صدی	نمکیات فیصدی	پنیر فیصدی	شکر فی صدی
عورت کا دودھ	۸۸٫۰۰	۲٫۹	٫۱۶	۳٫۷	۵٫۸۷
گائے کا دودھ	۸۶٫۸۳	۳٫۵	٫۷	۴٫۹۲	۴٫۵
بکری کا دودھ	۸۷٫۵۴	۴٫۲۰	٫۵۶	۳٫۷	۴٫۰
بھیڑ کا دودھ	۸۱٫۰۰	۶٫۵	٫۵	۸٫۰۰	۴٫۰
گدھی کا دودھ	۹۱٫۱۷	۱٫۲	٫۴۲	۱٫۸۹	۵٫۵

دودھ کی پہچان

عمدہ اور تازہ دودھ سفید ہوتا ہے، اس کا ذائقہ شیریں اور مزیدار ہوتا ہے۔ بالکل صاف ہوتا ہے اور جوش دینے سے پھٹتا نہیں۔ جو دودھ نیلگوں ہو، وُہ ٹھیک نہیں ہوتا، اسے ہرگز ہرگز نہیں پینا چاہیے۔

ایک تعلیمی مشغلہ

از

ماسٹر ہنسراج صاحب، کرسچین ہائی اسکول، کھڑ

علوم وفنون کا ہر شعبہ بسرعت تمام ارتقائی منازل طے کرتا جارہا ہے۔ تعلیم و تعلّم میں بھی اس کا جس قدر عمل دخل ہے، وُہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ فرسودہ اور دقیانوسی طریقۂ تعلیم وداع کیے جارہے ہیں۔ اُن کی خشکی اور کرختی کو ہر بالغ نظر انسان نہایت شدّت سے محسوس کر رہا ہے۔ مفکرین نِت نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں، جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد بعض کو مقبول اور بعض کو مردود قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدامت پسند طبقہ ہر نئے طریقِ کار کی مخالفت پر کمربستہ رہتا ہے اور اس کو مٹانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا، مگر ان کورمقلدوں اور زمانہ ناشناسوں کی سنتا کون ہے؟ وُہ تو اسیجانِ شب کی طرح اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اُن کی مخالفت اُلٹا اثر کرتی ہے۔

عالی ظرف اور اولوالعزم شخصیتیں نئے طریقِ کار کو محکِ عمل پر پرکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ پرکھتی ہیں، حسن و قبح کا اندازہ لگاتی ہیں۔ قباحتوں کا بدل پیش کرتی ہیں، زمانہ خود انھیں مقبول و مردود قرار دے دیتا ہے۔ گریمر ایسے مضمون کو دماغ پر ایک بار تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ استقرائی عمل سے اس کو دلچسپ بنانے کی انتہائی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طلبہ اس کی خشونت کو بدستور سابق محسوس کرتے ہیں۔ طوعاً و کرہاً تعلیم تو پاتے ہیں، لیکن نتیجہ وہی ہوتا ہے، جو ہونا چاہیے۔

اسکول کی چار دیواری سے نکلتے ہی گرامر جس کا اکتسابی صورت میں جاننا ضروری ہے، صفحۂ خاطر سے حرفِ باطل کی طرح مٹ جاتی ہے۔ اگر یاد بھی ہوتی ہے، تو عملاً اس کا کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوتا۔ دو سطریں بھی سیدھی نہیں لکھ سکتے۔ غلط عبارت کو درست نہیں کر سکتے۔ نامکمل جملوں کو مکمل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو ثبوت اس بات کا ہے کہ وُہ بجبر و اکراہ اصول تو یاد کر لیتے ہیں، تعریفیں تو رٹ لیتے ہیں، لیکن اُن سے مستفید ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ کُلّ جدیدٍ لذیذٌ کے مصداق ہم اس وقت کو مدِّنظر رکھ کر ایک تجویز مفکّرین اور اہل الرائے حضرات کے سامنے رکھتے ہیں، جس کو محکِ عمل پر پرکھ کر حتی الامکان عیوب کو دور کر دیا گیا ہے۔ ہم اس کو آئندہ لفافہ سسٹم کے نام سے یاد کرینگے۔ اُمید واثق ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر گرامر سے متعلقہ تمام مشکلات پر قابو پایا جا سکیگا۔ یہ مشغلے کا مشغلہ ہے اور تعلیم کی تعلیم۔

لفافہ سسٹم کی علت غائی کھیل کھیل میں طلبہ کے دلوں پر گرامر کا نقش بٹھانا ہے یا یُوں کہیے کہ غیر محسوس طور پر اصطلاحات اور اُن کے متعلقہ امورِ ضروریہ کا مستحکم کرنا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ سسٹم کن اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کے خصوصی اور اساسی اصول کون کون سے ہیں؟

ا۔ تقلید (IMMITATION) بچّے فطرۃً نقال واقع ہُوئے ہیں۔ شوخیِ طبع ان کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔ نچلا بیٹھنا اُن کے لیے امرِ محال ہے۔ روز مرّہ بچّوں کی نشست و برخاست میں ہم اس قسم کی صدہا مثالیں مشاہدہ کرتے ہیں، جو بچّوں کے اس فطری جذبے کو واضح طور پر ذہن نشین کرتی ہیں۔ کسان کے بچّوں کا کھیت بنا کر حل چلانا، دُکاندار کے بچّوں کا ترازو بنا کر وزن کرنا، اہلِ حرفہ کے بچّوں کا اُنھیں پیشوں کی تقلید کرتے دکھائی دینا، جو ہمیشہ اُن کے سامنے کیے جاتے ہوں۔ دوسرے بچّوں کا آواز کی نقل کرنا، کسی کے جسم اور چہرے کی شکل بنا کر چلنا وغیرہ۔ لفافہ سسٹم کی بنا اسی جذبۂ فطری پر ہے۔ یہ امر بھی استقرائی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ طلبہ سے

پوچھا جائے کہ تم نے لفافہ دیکھا ہے؟ تم میں سے کون کون لفافہ بنا سکتے ہیں؟ اکثر طلبہ ایسے ہونگے، جنھوں نے لفافہ دیکھا ہوگا اور چند ایسے بھی ہونگے، جو لفافہ بنا سکیں۔ لفافہ دکھایا جا بنانا بتایا جائے اور بنوایا جائے۔

۲۔ عجوبہ پسندی (ORIGINALITY) بچے جس طرح فطرۃً نقال ہوتے ہیں اُسی طرح عجوبہ پسندی کا عنصر بھی اُن پر غالب ہوتا ہے۔ وہ ہر نئی چیز پر جس پر کسی قدر جاذب کا رنگ غالب ہو، لوٹ ہوتے ہیں۔ لفافہ سسٹم میں اس کی اہمیت بھی ملحوظ رکھی جاتی ہے حتی الوسع فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ لفافے اُنھوں نے بہتیرے دیکھے ہونگے، لیکن دیکھے ہونگے سادے۔ اس لیے اگر لفافوں پر حاشیہ لگواکر نقش و نگار کرائے جائیں پھول، پتّیاں اور پسندیدہ اشکال بنوائی جائیں اور اُن میں مناسب رنگ بھروائے جائیں، اُس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ بچوں کے لیے جاذب نظر اور دلی مسرت کا باعث ہونگے۔

۳۔ تحقیق و تجسس (CURIOSITY) متذکرۂ بالا اصولوں کو عمل میں لانے کے بچے لفافوں کو بروئے کار لانے کی وجہ معلوم کرنے کے درپے نظر آئیں گے، کیونکہ جب بچے ماحول کی اشیا کو سرسری طور پر سمجھنے کے اہل ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنی معلومات کے دائرے روز بروز، بلکہ لحہ بہ لحہ توسیع چاہتے ہیں۔ اس لیے اس جذبے سے، جس قدر ممکن ہو، فائدہ اُٹھا جائے۔ ابتدائی مراحل کو جلد از جلد طے کیا جائے اور منزلِ مقصود پر پہنچنے کا ہر ممکن سامان کیا جائے، مگر یہ یاد رہے کہ ہمارا اصل مدعا زبان پر عبور حاصل کرانا ہے، جو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور لفافہ سسٹم جو ایک ذریعۂ کامیابی ہے، ذریعہ ہی بنے نہ کہ مقصد

اب طریقِ عمل پر بھی ایک نظر ڈالتے جائیے۔ لفافوں کی تیاری کے بعد اہم لودھ کام اصطلاحاتِ صرف و نحو کا طلبہ میں تقسیم کرنا ہے۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے لیے ضرور

کہ معلم ماہر نفسیات ہو۔ طلبا کی ذہنیت کا انفرادی طور پر مطالعہ کر سکتا ہو اور صلاحیت کا اندازہ لگا سکتا ہو۔

مدرّس مجوزہ اصطلاحوں میں سے ہر طالب علم کے لیے ایک ایک اصطلاح مقرر کرتا جائے اور ہر ایک طالب علم مقررہ اصطلاح اپنے لفافے پر جلی قلم سے خوشخط اور درست لکھے اور کمرے میں متعینہ جگہ پر لٹکائے۔ روزانہ ایک لفظ، جس پر اُس اصطلاح کا انطباق ہوتا ہو، کاغذ کے چھوٹے سے جو کور پُرزے پر لکھ کر لفافے میں ڈال دیا کرے۔

ہفتہ عشرہ گزرنے پر تمام طلبہ سے آموختہ اصطلاحوں کی فرداً فرداً تعریف اخذ کرائے۔ بعدازاں طلبہ کاغذ کی وصلی پر، متوسط قلم سے، اپنے الفاظ میں لکھ کر متعلقہ لفافوں میں ڈالیں۔ جب اصطلاح اور اُس کی تعریف طلبہ ذہن نشین کر لیں، تو چند ایسے جملے اُن کے سامنے پیش کیے جائیں، جن میں آموختہ اصطلاحات کی مثالیں ہوں۔ اس طرح اصطلات کی امتیازی خصوصیت اخذ کرا کر ذہن نشین کرائی جا سکیگی۔

اِس طریق میں پختگی کے اصول پر کاربند رہنا نہایت ضروری ہے، ورنہ تعمیر بیکار ہوگی اور وُہ یوں ہو سکتا ہے کہ غلط جملے طلبا کے سامنے پیش کیے جائیں اور اُن سے تصحیح کرائی جائے۔ نامکمل جملوں کو مکمل کرایا جائے۔ جملوں کی تحلیل صرفی کرانا بھی اس میں مفید ثابت ہوگا۔ جو اصطلاحیں مشتق ہوں، اُن کے اشتقاق کے طریق، اُس کی مختلف صورتیں، گردان وغیرہ متعلقہ امور ضروریہ سے یکے بعد دیگرے واقفیت دلائی جائے اور مشق کرا کے اُسے ذہن نشین کرایا جائے اور طلبا لکھ کر لفافوں میں بھی ڈالتے رہیں۔

مشق کے لیے خطوط نویسی بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے کامل استفادہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جبکہ خطوط موضوع خاص ہی سے متعلق ہوں۔ خطوط نویسی

ہی میں ارکانِ زبان اور اعانِ زبان کی تعلیم بھی دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ مدرس خواں کے صحیح استعمال سے واقف ہو تاکہ غیر محسوس طور پر طلبہ میں بھی یہی روح پھونکنے میں کامیاب ہوسکے جو مقصدِ اولیٰ ہے، لیکن یہ خیال رہے کہ یہ طریقہ گریمر کے سکھانے کا نہیں، بلکہ آموختہ ذہن نشین کرانے کا ذریعہ اور اُس کو مستحکم کرنے میں ممد و معاون ہے۔ گریمر سکھانے کا طریقہ کیا ہے اور کس طرح وُہ کھیل کھیل میں طلبا کے دلوں پر نقش کی جاسکتی ہے؟ ایک مستقل مضمون میں عرض کیا جائیگا۔

لفافہ سسٹم کی کامیابی کا انحصار مدرس کی اپنی قابلیت اور ذاتی سعی پر ہے۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وُہ نہ صرف صرفی اور نحوی قواعد پر حاوی ہو، بلکہ بچّوں کے دلوں میں گریمر جاننے کی حقیقی خواہش پیدا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو اور ایسی چاٹ لگا سکتا ہو کہ بچے ہر وقت اُس کا مزہ چکھنے کے خواہاں اور اُس سے لطف اندوز ہونے کے متمنّی نظر آئیں۔ اپنے مقصد کو موقع و محل پر اُن کے سامنے بطریقِ احسن پیش کرے۔ ٹھونسنا مضر ہے، کیونکہ اس سے جو تعلیم ہوتی ہے، طبیعت اُسے بار خیال کرتی ہے اور موقع پاکر اس بوجھ کو اُتار پھینکتی ہے۔

حضرات! جب بچے اس مرحلے پر پہنچ جائیں کہ یہ سسٹم اُن کے دلوں میں گھر کر جائے اور وُہ اس پر کاربند ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچنے کے متمنّی ہوں، تو مدرس بھائی کی ذمّے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اُسے پہلے سے زیادہ تندہی، محنت اور کاوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اُس کی ذراسی بے پروائی طلبا کے لیے سمِ قاتل ہوگی اور اس کا تمام کیا کرایا خاک میں مل جائیگا۔ ایسے موقع پر تختۂ سیاہ کا استعمال جو مدرسے کی روحِ رواں ہے، نہایت ضروری ہے جہاں تک گریمر سکھانے میں لفافہ سسٹم کا تعلق ہے، گریمر کی درسی کتب بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ ہاں، اگر کتابیں اپنے سامنے پڑھوا کر اپنے ہی پاس رکھ لی جائیں، تو اُن کے

مفید ہونے میں شک نہیں۔ بصورت دیگر بچے تعریفیں ہی نہیں رٹیں گے، بلکہ اُن کی مثالیں بھی رٹ لیں گے اور بوقتِ ضرورت نگلا ہُوا اُگل دینگے، جس سے ہمیں اپنے مدعا میں کامیابی حاصل کرنے میں وقت پیش آئیگی۔ مدرس طلبہ کے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہو اور کتاب بھی ایسی، جسے وُہ اپنی خیال کریں تاکہ موقع بہ موقع اُس کو دیکھنے اور سمجھنے میں دریغ نہ کریں۔ بچے اُس کو ہوّا خیال نہ کریں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ مدرس ماہرِ نفسیات اور طلبا کا ہمدرد ہو اور بوقتِ ضرورت اُس کی ذات ان صفات کا مظہر ہو۔

ناظرین! معترض اصحاب کے جو اعتراضات اب تک ہمیں موصول ہُوئے ہیں، وُہ مع جوابات حوالۂ قرطاس وقلم کیے جاتے ہیں تاکہ مضمونِ مذکور میں، جو کمی محسوس ہو، وُہ ان جوابات کے مطالعے کے بعد پوری ہو سکے اور معترض حضرات کے لیے بھی باعثِ تسکین و تشفی ہو۔ (۱) ہر لڑکا مفوضہ اصطلاح ہی سے واقف ہوگا۔ (۲) بہت سی اصطلاحات کا ذہن میں رکھنا مشکل ہوگا۔ (۳) ہر روز ایک ایک لفافہ کی پڑتال کرنا ناممکن ہوگا۔

پہلے اعتراض کا جواب تو یہ ہے کہ اس سسٹم میں ہفتے کے اختتام پر مفوضہ لفافوں کا تبادلہ کرا دیا جاتا ہے۔ مدرس کو ہر ہفتے لفافوں کی سرسری پڑتال کرنی پڑتی ہے، تاکہ ناقص اور کم فہم طلبا کی ناکامی پر غور کر کے فوری علاج کر سکے۔

دوسرا اعتراض معقول نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ جب بچے لفافے تیار کر لیں گے، اُن پر اصطلاحیں لکھ کر کمرے میں لٹکاتے رہیں گے، بار بار اُن کی نظر اصطلاحوں پر پڑیگی، تو وہ خود بخود ذہن نشین ہوتی جائیں گی اور حافظہ اُنھیں بلا حیل وحجت اور سعی و کوشش محفوظ کرتا جائیگا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جب کوئی طالب علم کسی نئے اسکول میں داخل ہوتا ہے، تو وُہ اسکول کے بہت سے لڑکوں کے خدوخال میں تمیز کرنے اور نام جاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ جس کی وجہ

صرف یہی ہے کہ وہ اُن کو اکثر دیکھتا ہے، اُن کے نام بار بار سُنتا ہے۔ یہ بدیہی ثبوت ہے کہ بچّہ اپنی ماحولی اشیا کے نام ذہن میں محفوظ کرتا جاتا ہے، بس یہی مسلّمہ اس اعتراض کا جواب ہے

۳۔ اس میں شک نہیں کہ مدرس اور طلبہ کے لیے روزانہ پڑتال کرنا مشکل ہے، لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہفتے کے بعد جب لفافوں کا تبادلہ ہوگا، تو اُن کی پڑتال بھی ہو جائیگی۔ طلبا اور مدرس کو گاہے بگاہے نگرانی کرتے وقت، جو غلطیاں معلوم ہوں، اُن کو قلم زد کرکے اپنے دستخط کرتے جائیں اور غلطی معلوم کرنے والا لفافے کے ذمّے وار کو درست کردہ غلطی سے آگاہ کرتا جائے نیز اُس طالب علم کو جسے وہ اغلاط کا حامل لفافہ ملے، آگاہ کر دیا جائے کہ ان اغلاط کا دُور کرنا تمھارا فرض ہے۔ اگر لفافے میں بھی نقائص ہوں، تو وُہ بھی اُسی سے دُور کرانے کی کوشش کی جائے۔ یہ گویا پختگی کے اصول پر عمل پیرائی ہے۔ دلچسپی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جس لڑکے کی درست کردہ اغلاط مصدقۂ مدرس سب سے زیادہ ہوں، وُہ لفافہ سسٹم کے اُس بلّے کا مستحق قرار دیا جائے، جو اسی مقصد کے لیے تیار کر لیا گیا ہو۔ اس سے بچّوں کے پسندیدہ لوازم میں ایک گونہ اضافہ ہوگا، مگر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ بلّا ہر ہفتے مستحق کے پاس جاتا رہے اور یہ بلّا یا میڈل دیتے وقت معلوم اغلاط کی زیادتی کے علاوہ حسنِ کارکردگی کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

حضرات! لفافہ سسٹم ایک ایسا ذریعۂ تعلیم بھی ہے، جو گریر کے ذہن نشین کرنے کے علاوہ دوسرے مضامین کی امداد و اعانت میں بھی پیش پیش ہے اور یہ اُن مضامین کی تعلیم میں مفید ہے، جن کا سیکھنا ہر طالب علم کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً

ریاضی۔ لفافہ بناتے وقت پیمائش کا طریق اور پیمانے کا استعمال معلوم ہو جاتا ہے۔ مربع، مستطیل، تکون اور مدوّر اشکال سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

کنڈر گارٹن۔ گونہ لیئی، پیمانہ اور قینچی کے استعمال کرنے، کاغذ موڑنے، کاٹنے اور چسپاں کرنے کی

مشق ہوتی ہے۔

آرٹ۔ لفافے پر انواع و اقسام کی اشکال بنانے اور اُن میں رنگ بھرنے میں مہارت ہوجاتی ہے۔

املا۔ اصطلاحات، تعریفات اور متعلقات لکھنے سے لکھنے کی مشق ہوتی ہے۔

زباندانی۔ عام لفافوں کی وجہ ایجاد اخذ کرانے کے بعد خطوط نویسی کی طرف راغب کرنا اور ارکانِ زبان (ضرب المثل، محاورہ، روزمرہ وغیرہ) کے صحیح استعمال سے زباندانی کا ملکہ پیدا کرنا، اس سسٹم کے اوصافِ حمیدہ میں سے ہے۔

علاوہ ازیں سسٹم مذکور عملی، ذہنی اور اخلاقی فوائد بھی اپنے اندر مخفی رکھتا ہے، جن کا مختصر ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے۔

عملی۔ مضامینِ خمسہ میں جو وجہ تعلق بیان کی جاچکی ہے، وہی عملی مفاد کی فہرست ہے۔ علاوہ ازیں ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہوتی ہے، جس کی تشریح محتاجِ بیان نہیں۔

ذہنی۔ اصطلاحات کے ذہن میں محفوظ رکھنے سے قوتِ حافظہ، لفافے کی ہیئت اور دیگر اشکال کی صورتیں ذہن میں لانے سے قوتِ متصورہ اور خود ساختہ تصاویر میں بُری بھلی کا فیصلہ دینے سے قوتِ متمیزہ نشوونما پاتی ہے۔

اخلاقی۔ لفافہ سپرد کرنے سے طلبہ میں ذمّے داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مقررہ فرائض کی انجام دہی، بوقتِ ضرورت دوسرے کی امداد، خوبصورتی کا مذاق، رشک اور صفائی ایسی نیک صفات پیدا ہوتی ہیں۔

ہم اُن ہم مشرب اصحاب سے، جو گرامر کے خشک اور بنجر میدان کو سرسبز و شاداب بنانے میں خاص طور پر کوشاں ہیں اور اس کی سیرابی کے لیے تدابیر سوچتے رہتے ہیں، استدعا کرتے ہیں کہ آپ ذرا اس راہ پر گامزن ہو کر اسے بھی آزما دیکھیے۔

تعلیم و تربیّت

از

سید اختر احسن صاحب، بی اے، بی ٹی،

ہر اس شخص کے لیے، جو مدارس سے کسی قسم کا تعلق رکھتا ہے، واجب ہے کہ وہ 'تعلیم و تربیت' کے صحیح مفہوم سے باخبر ہو۔ مدرس یا معائنہ کنندہ، جو اس جملے کے معانی سے بے خبر ہے، وہ محکمۂ تعلیم کے مقاصد کے لیے بے اثر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض صاحبان، جن کا درس و تدریس کے ساتھ تعلق ہے، اُن کو نہ طلبا کے اخلاق کا خیال ہے، نہ اُن کے اطوار کا احساس۔ نہ قوم سے محبت، نہ اپنے شاگردوں سے مروت، محض اُب، جُب' پڑھانا، وہ بھی اس طریقے سے، جو آج سے پچاس سال قبل رائج تھا، اُن کا مشغلہ ہے۔ عالم جمود ان پر طاری ہے۔ نشوونما کرنا اُن کے لیے دوبھر ہے۔

تعلیم کے لغوی معانی 'علم پڑھانے' کے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صرف کتابوں کا پڑھانا تعلیم کے تحت میں آتا ہے، حالانکہ 'تعلیم و تربیت' لازم و ملزوم ہیں۔ 'تربیت' کا مطلب 'پرورش کرنا' ہے۔ تعلیم، تربیت کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ عالم بے عمل ایک ایسے حیوان کی مانند ہوتا ہے، جس پر کتابوں کا انبار لاد دیا گیا ہو۔ کیا وہ حیوان جس پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا گیا ہو، عالم کہلا سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ اسی طرح وہ شخص جس نے محض الفاظ کے معانی، اصطلاحات کی تعریفیں اور مختلف اصول رٹ لیے ہوں اور دماغ میں ٹھونس رکھے ہوں، مگر اُن سے فائدہ حاصل نہ کرتا ہو اور اُن کو معرض عمل میں نہ لا سکتا ہو، وہ صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا

مستحق نہیں۔ ایک شخص طب کے تمام اصول و فروعات پر عبور رکھتا ہے، اُس کو یہ علم ہے کہ فلاں مسئلہ فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر لکھا ہے، کسی خاص مرض کا علاج فلاں جگہ مندرج ہے، مگر رض کی تشخیص نہیں کر سکتا اور نہ نسخہ ہی تجویز کر سکتا ہے، تو کیا وہ طبیب کہلانے کا حقدار ہے۔ اب پھر نفی میں ملے گا۔ ایک اور شخص ہے، جو یہ جانتا ہے کہ بندوق کے پکڑنے کا کیا طریق ہے۔ ندوق کس طرح چلائی جاتی ہے، مگر عملاً اُس نے کبھی بندوق نہیں چلائی، نہ اُس نے بندوق کو ھولا، نہ اس میں کارتوس ڈالے، تو ایسا شخص نشانہ باز نہیں کہلا سکتا ہے۔ اسی طرح جس مُدعا ے لیے علم سکھلانا ہے، اگر اس کے لیے طلبہ کو سدھایا نہ جائے، عادی نہ بنایا جائے اور اس کے ستے پر نہ ڈالا جائے، تو ایسی تعلیم اپنے نام کی حقدار نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تعلیم ست طریقے پر نہیں دی گئی، اس لیے 'تربیت' کا تعلیم کے ساتھ ساتھ ہونا ازبس ضروری ہے۔ ں لیے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ 'تربیت' صرف تعلیم کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ تربیت کی ابتدا بچے ے پیدا ہونے کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔ والدین اور اساتذہ کا اشتراکِ عمل بھی اس مدعا کے ول کے لیے لازمی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ ہر سال فوج میں جھوٹی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ طبّی مدارس میں طلبہ کو شفا خانے کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ ریلوے اسکول میں مختلف شعبہ جات کا عملی کام سکھایا جاتا ہے۔ سب کا جواب فقط یہ ہے کہ نصاب کے ختم ہونے پر متعلقہ اشخاص اُس خاص کام کرنے کے ہو جائیں۔

علم کا مقصد زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ حقیقی علم سے مُراد یہ ہے کہ ہم اُن مقاصد اشنا ہو جائیں، جن کے لیے خالقِ حقیقی نے اس عالمِ فنا کی اشیا کو تخلیق کیا۔ جس شے کی ن کا مقصد کچھ نہ ہو، وہ نیست کے برابر ہوتی ہے۔ سقراط نے بجا طور پر زور دیا ہے کہ

کوئی شخص اپنے آپ کو خود نقصان نہیں پہنچا سکتا، نہ وُہ اپنی ہستی کو معرضِ خطر میں ڈال سکتا ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ چوری کی سزا قید ہوتی ہے، جو مال چوروں کے ذریعے حاصل ہو، وہ غصب کردہ ہوتا ہے۔ ایسا مال کبھی وفا نہیں کرسکتا، اکثر اوقات یہ مال مقدموں یا دیگر خرافات میں خرچ ہو جاتا ہے، قید و بند کی تکالیف اس کے ماسوا ہوتی ہیں، وُہ چوری کے خیال کو بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ کوئی شخص صحت کے قواعد کو جانتا ہو، تو اُن کے توڑنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اگر انسان اپنی ہستی کو سمجھ لے اور یہ جان لے کہ وُہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کا بدیں حیثیت دنیا میں کیا فرض ہے، تو بدی اس سے سرزد نہیں ہوسکتی۔ تمام دُنیا میں امن و امان کا دَورہ ہوسکتا ہے۔ (یہ علم کس طرح حاصل ہو۔ بچے کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی قوتوں کو ترقی دے کر اُن کی مکمل نشوونما کردی جائے۔ سماج اور ماحول کا اثر اس طرح ڈالا جائے کہ وُہ مقاصد مقررہ کے حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کا نام تربیت ہوگا۔

جو بچے مدرسے میں آتے ہیں، اُن کو صرف درسی کتب پڑھا دینا، جو تعلیم کے زُمرے میں شامل ہے، کافی نہیں ہوسکتا، بلکہ مدرس کو اُنھیں سوسائٹی یا سماج کے لیے تیار کرنا ہے جس میں اُنھیں تعلیم کے اختتام کے بعد داخل ہونا ہے، تاکہ وُہ اُن کے سمجھ دار رکن بن سکیں۔ اچھے شہری اور راے دہندے بنیں۔ وُہ شہریت کے فرائض اور طرزِ حکومت سے واقف ہو جائیں۔

بچہ جب مدرسے میں آتا ہے، تو اپنے ساتھ خاص عادات و خصائل لے کر آتا ہے مدرس کا فرض ہے کہ بچے کی اس طرح سے تربیت کرے کہ اُس کی بُری عادتیں چھوٹ جائیں۔ نیک عادات اس میں پیدا ہو جائیں تاکہ بچہ نیک راستے پر چل سکے۔ پسندیدہ راہ پر گامزن ہو۔

تربیت کا مرکز بچہ ہے۔ مدرس کو بچے کے اندرونی اوصاف کی نشوونما کرنی ہے اُس کے اندر نیک اوصاف کے جو بیج ہیں، اُن کی آبیاری کر کے معراج پر پہنچانا ہے۔

ہندوستان میں صرف مدرس کو بدنام کرنا کہ وہ بچوں کی تربیت خاطرخواہ نہیں کرسکتا، سخت غلطی ہے، کیونکہ یہاں کا نظامِ تعلیم صرف منشی پیدا کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا، تربیت اس کا مقصد نہیں تھا، اس لیے نظامِ تعلیم میں بھی تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ چونکہ مدارس میں نئی نئی تحاریک دس سال سے شروع ہو گئی ہیں۔ بہت سے صاحبان اُن کے مقصد کے سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے اُن پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ان سب نئی نئی تحریکوں کا مقصد تربیت ہی ہے۔

اقسامِ تعلیم

تعلیم کو ذیل کی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مہیا کرنا ہر تعلیمی درسگاہ کا فرضِ اولین ہے۔

(۱) جسمانی تعلیم۔ اس سے مراد جسم کی نشوونما، اس کی صفائی، بینائی کی نگہداشت، دانتوں کی حفاظت، کھانے میں میانہ روی، تازی ہوا میں رہنا، صحت کا قائم رکھنا اور اُسے ترقی دینا ہے۔

(۲) ذہنی تعلیم۔ اس کا مطلب روزمرّہ کی معلومات بہم پہنچانا، معلوماتِ جدیدہ سے آگاہ کرنا، قوتِ فہم و استدراک کو بذریعہ بحث و مباحثہ تیز کرنا اور خاص مسائل میں مشق و مہارت کرنا، عمدہ دماغی عادات ڈالنا اور اُس کو مفید مشاغل میں مصروف رکھنا ہے۔

(۳) اخلاقی تعلیم۔ اس کا مقصد نفس کی صفائی، نیک اطوار کا حاصل کرنا، اچھی عادتوں کا پیدا کرنا اور بچے کو مجموعۂ نیکی بنانا ہے تاکہ اُس کا چلن نیک عادات کا مجموعہ بن جائے۔

ان تینوں اقسام کو اگر اس بحث کی روشنی میں دیکھا جائے، جو تربیت کے بارے میں ہو چکی ہے، تو اس نتیجے پر پہنچنا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ تربیت و تعلیم میں یہ ہر سہ شامل ہیں۔

پس ہر مدرس کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی مکمل طور پر نشوونما کرے۔ (کاپی رائٹ)

مدرسے کی معموریت

از

محمد الدین صاحب ثاقب، اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکولز اجنالہ

وہی اک داستانِ عشق ہم دہراتے رہتے ہیں
بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیان اپنا

برکاتِ تعلیم۔ با احساس افراد سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ علم ہی ایک ایسی ہمہ گیر طاقت ہے، جس سے کسی کو بقائے دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ علم ہی ایک ایسا چشمہ ہے، جو انسانیت و شرافت کے تمام جوہروں کو زندہ و تابندہ رکھنے کا باعث ہے۔ علم ہی وہ نغمۂ لطیف و جان نواز ہے، جس پر صاحبانِ ایقان و عرفان آج تک عالمِ کیف و وجد میں ہیں۔ علم ہی وہ مئے تازہ ہے، جو پیکرِ انسانی میں حیاتِ نو پیدا کر دیتی ہے۔ المختصر عروسِ زندگی کی آسائش ہے، تو اسی سے اور نبضِ کائنات میں جنبش ہے، تو اسی سے۔ پھر ایسی حیات افروز شے کے لیے جس قدر کاوش و کاہش ہو بجا ہے یا نہیں؟ ایسی شمعِ ضیا بار کے لیے جس حد تک طلب و جستجو ہو روا ہے یا نہیں؟ یقیناً اس کے شوقِ جمال کیلیے امتیازِ صبح و شام کو نظر انداز کر دینا چاہیے اور اس کے خال و خط سے لطف اندوز ہونے کے واسطے دامن و گریبان کے تار تو علٰحدہ رہے، تارِ نفس تک قربان کر دینا لازم ہے۔

جہالتِ عامّہ سے جہاد۔ لیکن اس معاملے میں سب سے بڑی روک باشندگانِ ہند کا تعلیم سے غیر مانوس اور علم سے بے بہرہ ہونا ہے۔ اگر تمام اہلِ وطن تعلیم کے قدر دان ہوں اور تعلیم کی

ضرورت و اہمیت کو سمجھتے ہوں، تو ممکن نہیں کہ اپنی اولاد کو جاہل رکھنا پسند کریں تعلیم کی اہمیت سے واقف ماں باپ جانتے ہیں کہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ کی مثال اُس اندھے کی سی ہے، جو رنگین، جانفزا اور فردوس تمثال مناظر میں پھرتا ہے اور اُن سے محظوظ و لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ جاہل کے لیے نہ دنیا میں حقیقی عزت و حشمت، ناموری و شہرت ہے، نہ عاقبت میں مسرت و عظمت۔ وُہ اِن حقائق و واقعات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ چور، ڈاکو، بدمعاش وغیرہ سے جیلوں کی کوٹھڑیاں جو بھری پڑی ہیں، سب جہالت ہی کے کرشمے ہیں اور گنوارپن اور آوارگی ہی کے نتائجِ قبیحہ۔ باوجود اس کے بے علم اور سطحی نظر رکھنے والے والدین اپنی اولاد کو اسکول میں بھیجنے کی نسبت اِن سے گھر کے معمولی کام کاج کرانے، مویشی چرانے اور گھاس چارہ منگوانے کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس جاہل طبقے میں زیادہ تر تعداد زراعت پیشہ کسانوں، دیہاتی دستکاروں، مثلاً: نجاروں، آہنگروں، بافندوں، گاذروں، کفش دوزوں، خاکروبوں اور نداّفوں وغیرہ کی ہے، جو عام طور پر مبلغین و محرکین تعلیم کی تمام کوششوں کو اس قسم کے حوصلہ شکن الفاظ سے خاک میں ملا دیتے ہیں کہ لڑکا میرے روزانہ کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ گائے، بکریاں چراتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو کھلاتا ہے۔ اب پڑھائی میں کیا رکھا ہے۔ گھر کا کام سیکھے گا، تو پیٹ بھرنے کے قابل ہو سکیگا۔ آگے اس کا بڑا بھائی پڑھ کر بیکار پھر رہا ہے۔ مدرسے میں بیٹھ کر وُہ کسی کام کا نہیں رہا۔ نہایت آزاد خیال اور آوارہ ہو گیا ہے تعلیم کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہم غریب لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ وغیرہ وغیرہ

پس تعلیم اور مدرسے کے متعلق عدم توجہی بلکہ نفرت کے جذبات، جو اس وقت خاص طور سے کارفرما دکھائی دیتے ہیں اور مذاقِ عامہ و رجحانِ طبائع میں جو انقلاب ہو گیا ہے، جس میں بیکار تعلیم یافتگاں کی کثیر تعداد نے اضافہ کر دیا ہے، اس کے خلاف ایک زبردست، مسلسل، متواتر اور منظم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مدرس کو چاہیے کہ علم کی ضرورت و اہمیت، علم کے فوائد و برکات،

مادی و روحانی علم کی غرض و غایت حقیقی نہایت مدلل و مُبرہن طریق پر آزاد اقوام و ممالک اور خاص اپنے ملک کی مثالیں دے کر واضح کرے۔ جہاں اور جس محفل میں بیٹھے، یہی بیان کرے کہ تعلیم بڑی چیز ہے۔ کسی قوم و ملک کی فلاح و بہبود تمام تر تحصیل علم ہی میں مخفی ہے۔ معاشرت اور تمدن کی اصلاح و ترقی تعلیم ہی پر انحصار رکھتی ہے۔ صاحب علم، نیک و بد، خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ کی گفتگو معقول و پُر معنی ہوتی ہے۔ تعلیم کے بغیر دنیوی امور و فرائض انسانی کی انجام دہی بوجہ احسن نہیں ہو سکتی۔ تعلیم سے بہرہ ور شخص ہی اپنے خاندان، اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے مذہب کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ ہو سکتا ہے۔ برخلاف اس کے جاہل اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں سوچنے اور غور کرنے کا مادہ یکسر نہیں اور اپنے نفع و نقصان کو بالکل نہیں جانتا۔ اس کا دماغ منجمد، عقل تیرہ اور ذہن تاریک ہوتا ہے۔ جاہل دل و دماغ سے خوبی اور فائدے کی اُمید رکھنا وہم پر مبنی ہے۔ جس قدر کسی کام میں ہوشیاری، استواری اور منفعت بخش ہونے کی اُمید ایک تعلیم یافتہ سے ہو سکتی ہے، غیر تعلیم یافتہ سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جاہل لوہار اپنے باپ دادا کے طریق پر ہی پرانی طرز کے قفل بنانے سیکھ سکیگا، مگر تعلیم یافتہ اس میں کئی قسم کی جدتیں پیدا کر کے دکھائیگا اور اپنے فن میں چار چاند لگا کر شہرت عام پیدا کر سکیگا۔ اسی طرح دیگر پیشہ ور افراد جو تعلیم سے بہرہ اندوز ہوں، تو دیگر ممالک کے ہم پیشہ اصحاب کے حالات سے واقفیت حاصل کر سکتے اور اُن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بے انتہا دماغی و ذہنی ترقی حاصل کر سکتے ہیں اور عامہ خلائق کے لیے مفید ترین شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔ تعلیم یافتہ دکاندار اپنی دکان کو نہایت خوبی کے ساتھ آراستہ کریگا اور دکان کا حساب کتاب نہایت صاف رکھیگا۔ اس کی کوئی رقم ضائع نہ ہو سکیگی۔ کوئی شے ضائع نہ جائیگی۔ غیر ممالک کی مشہور فرموں سے خط و کتابت کر کے بہترین مال منگوا سکیگا اور اپنے مقامی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اشیا کے درآمد و برآمد کے لین دین سے اپنی دکان کو چمکا سکیگا۔ تعلیم یافتہ دھوبی جس خوبی کے ساتھ کپڑے

دھوئے گا، غیر تعلیم یافتہ ہرگز نہیں دھو سکیگا۔ کسان کا بیٹا (تعلیم یافتہ) اپنے بیلوں کو صاف چارہ ڈالیگا، صاف پانی پلائیگا اور کئی طرح کے طریق رائج کر کے اپنی زراعت کو ترقی دیگا۔ اعلیٰ بیج، مفید آلاتِ کشاورزی، اچھے مویشی، اعلیٰ زمین ان سب کو وہ خوب سمجھیگا وغیرہ وغیرہ۔ غرض مدرس جس قسم کے آدمیوں میں بیٹھے، سلسلۂ گفتگو میں تعلیم کی ضرورت واضح کرے۔ وہ ہر قوم ہر پیشے کے آدمیوں میں جاکر تعلیم کی اشاعت کے لیے کوشاں ہو۔ اس طرح تعلیم کے فوائد عوام پر منکشف ہونگے اور وہ خوشی سے اپنی اولاد کو تعلیم دلائیں گے۔

پروپگنڈا ورک۔ کسی چیز یا بات یا کام کو رواج دینے، اُسے وسیع پیمانے پر اشاعت دینے اور عوام کو اُس کی جانب راغب کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا، یہ بھی تعلیم کا پروپگنڈا ہے۔ محکمے نے نہ صرف پروپگنڈا کرنے کی ہدایت کی ہے، بلکہ خاص طور پر زور دیا ہے کہ جس قدر ممکن ہو، جلوس نکالیں، ڈرامے کریں اور ہر مہینے رپورٹ کریں کہ کس قدر کام کیا۔ یہ عین حقیقت ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے بچے شیریں لب و لہجے میں مفید، قابلِ عمل، نتیجہ خیز گیت گائیں گے، لکچر دینگے اور عوام اُن سے اصلاحی، اخلاقی اور صحت کے لیے مفید ہدایات پائیں گے اور طلبہ میں اس چھوٹی سی عمر میں اتنی بلند پایہ دماغی ترقی، شائستگی اور تہذیب دیکھیں گے، تو خود بخود اپنے لڑکوں کو اسکول بھیجیں گے۔ محکمے نے اپنی جانب سے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ سینما لاریوں اور میجک لینٹرنوں کے ذریعے تصاویر دکھا دکھا کر، مختلف اجتماعات اور میلہ جات میں تقریریں اور نمائشوں کا انتظام کر کے تعلیم کے فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔ مدرسین اگر جوش و خروش کے ساتھ تعلیم کا پروپگنڈا کریں، تو عوام بہت جلد تعلیم کی ضرورت محسوس کریں گے اور فراہمی طلبہ کا بوجھ نہایت ہلکا ہو جائیگا۔

کھیل۔ بچّوں کا کام شبانہ روز کھیلنا ہے۔ انھیں کھیلنے کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا اور

اسی کام کو شوق سے کرتے ہیں، جس میں کھیل موجود ہو۔ لڑکے خود کھیل کر اور اوروں کو کھیلتے دیکھ کر
نہایت خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان میں مل جائیں اور خوب کھیلیں۔ پس اسکولوں میں کھ
کو اس قدر رواج دیا جائے، لڑکوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد اسکول میں آسکتی ہے۔ اس کے لیے
ضرورت ہے کہ تمام کا تمام اسکول مختلف اوقات میں مفید و دلچسپ کھیل کھیلتا نظر آئے۔ اس
طرح جو سب لڑکے بھی کھیل کھیلنا چاہیں گے اور والدین کو مجبور کر کے اسکول میں آئیں گے۔ اور
ہماری تو رائے ہے کہ تعلیم کو اس قدر دلچسپ بنایا جائے تو مفید ہے۔ علاوہ ازیں کھیلوں کے بغیر جسما
نی تربیت کا کھیل ہی سے تعلیم کا بڑا فائدہ ہے، نقصان نہیں اور کمزور جسم میں کمزور دماغ اور کمزور دماغ
سے کمزور تعلیم کی امید ہو سکتی ہے۔ پس فراہمی طلبا و حسن تعلیم کے لیے مدرسین اپنے اسکولوں میں
کھیلوں کو زیادہ سے زیادہ رواج دیں۔

کمرۂ جماعت اوّل۔ جس کمرے میں جماعت اوّل بیٹھتی ہو، وُہ اسکول کا بہترین کمرہ اور بہتر
طریق پر آراستہ ہو، جس میں تعلیمی چارٹ، تصاویر، نقشہ جات اور کیلنڈر وغیرہ آویزاں ہوں، بچّ
میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لیے سامان بکثرت جمع کیے گئے ہوں۔ اس کمرے میں اگر ایسے کھلو
جن سے کھیل کر بچّے خوش ہوں، رکھے جائیں اور بچّے ان سے کھیلیں، ان کے متعلق آپس میں گفتگ
کریں، تو یقیناً ان کی واقفیت میں بہت اضافہ ہوگا اور وُہ نہایت خوش ہونگے، اسکول چھوڑنا پ
نہ کریں گے اور ہر صبح ان کھلونوں سے کھیلنے کا شوق انھیں گھر سے اسکول کھینچ لائیگا۔ اس طرح
آراستہ پیراستہ کمرے میں بیٹھ کر ایک گونہ مسرت محسوس کرینگے اور مدرس کو انھیں گھر سے بُلا کر لانے
ضرورت محسوس نہ ہوگی اور فراہمی طلبہ کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔

جماعت اوّل کا مدرس۔ جماعت اوّل کا مدرس نہایت ہنس مکھ، بچّوں کے ساتھ بچہ بن
بچّوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے والا ہو، کیونکہ مدرس کی ذات، اس کے اقوال و افعال، اس کی حر

ملنات جس قدر بچوں کو کھینچ سکتی ہیں اور کوئی شے نہیں کھینچ سکتی۔ پس مدرس ایسا ہو کہ لڑکے اُس سے
بّت کریں۔ اُس کے پاس بیٹھنا، اُس کی باتیں سُننا، اس سے پڑھنا، اس سے کھیلنا خوشی سے
سند کریں۔ اُس کے حُسنِ سلوک، اُس کی خندہ جبینی اور اُس کی تعلیم کے دل سے قدر دان ہوں۔
ماعت اوّل کے لیے تند مزاج، بات بات پر جھڑکنے والا مدرس کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔
س فراہمی طلبا کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے ان اوصاف سے متصف مدرس کو جماعت اوّل کی
علیم کے لیے لگایا جائے۔ اس طرح بچوں کو گھر سے بُلانے کی ضرورت نہ رہیگی۔

یوم والدین محکمے نے مدارس میں ہر سال یوم والدین منانے کی ہدایت کی ہے۔ یہ روز اگر اپنی
ہمیت کو پورے طور پر واضح کر دے اور لڑکوں کے والدین کے دلوں میں تعلیم کا شوق کوٹ کوٹ کر
بھر دے، تو فراہمی طلبہ کا بوجھ مدرسین کے سر سے بہت حد تک ہلکا ہو سکتا ہے یعنی، اسی روز
علیم کے اغراض و مقاصد، فوائد و منافع نہایت خوبی کے ساتھ بیان ہوں تعلیم کی ضرورت و اہمیت
پر اچھی طرح تبادلۂ خیالات ہو اور انھیں کے بچے مختلف موضوعات پر لکچر اور نظمیں بیان کریں اور
پنی ذہنی، عقلی اور ہر قسم کی ترقی کا سکہ ان کے دلوں پر جما دیں، تو ممکن نہیں کہ انھیں اپنے بچوں کو
سکول بھیجنے میں پس و پیش ہو۔ پس فراہمی طلبہ کے لیے مدرسین کو چاہیے کہ یوم والدین نہایت
ہتمام کے ساتھ منائیں۔

فسران کی توجہ اگر گاؤں کے منتظمین یعنی نمبردار اور پٹواری اور ذیلدار صاحبان اپنے
رائض کی فہرست میں اس بات کو بھی شامل کر لیں کہ انھیں قابلِ تعلیم اطفال کے سرپرستوں کو برضا و
رغبت یا مجبوراً بچوں کو ہر حالت میں اسکول بھیجنا ہے، تو مدرس کی مشکلات بہت حد تک کم
ہو سکتی ہیں۔ محکمے کی وقعت عوام کی نظروں میں بڑھ سکتی ہے اور تعلیم عام ہو کر ملک سے جہالت
کا خاتمہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ افسرانِ تعلیم، تحصیلداراں اور علاقے کے

مجسٹریٹ صاحبان گاہے گاہے اس کے متعلق دریافتِ حالات، ہدایات اور تنبیہ کے سلسلے کو جاری رکھیں۔ یہ ایسے امور ہیں، جن کی اہمیت کو ہمارے مدرسین سمجھتے ہیں، جو ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں، وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ دراصل مذکورۃ الصدر تمام تحریر کو اگر ایک ہی لفظ میں بیان کرنا ہو، تو اُسے "پروپیگنڈا" ہی کہا جائیگا۔ اس کے علاوہ کسی اسکول کی سرسبزی و شادابی اور معموریت کا راز ہیڈ ماسٹر کی شخصیت، اسٹاف کی یک جہتی، ضبط و تعلیم کی باقاعدگی اور پبلک اور معلّمین کے اشتراکِ عمل میں مضمر ہے۔ مضمون کسی قدر طویل ہو گیا، لیکن اگر اس کی کسی قدر وضاحت نہ کی گئی، تو موضوع تشنۂ تکمیل رہیگا۔

ہیڈ ماسٹر کی شخصیت - (۱) وہ سیرت و اخلاق کے لحاظ سے قابلِ تقلید نمونہ ہو۔ اس کے اخلاق کی بلندی سے معلّمین، طلبہ اور پبلک اس کی گرویدہ ہو۔ (۲) وہ عمدہ ضابط ہو، یعنی، اُس میں ایسے اوصاف ہوں، جن سے ضبط قائم رہ سکے۔ اس کے لیے وہ عملے اور طلبہ کا ہمدرد، صائبُ الرائے اور متحمّل مزاج ہو۔ اُس کے فیصلوں میں استحکام ہو۔ خود دار، باوقار اور معاملہ فہم ہو۔

اسٹاف کی یکجہتی - سب معلمین میں اتفاق ہو۔ وہ ہیڈ ماسٹر کے فرماں بردار ہوں اور اُس کے احکام پر دل سے عمل کریں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ (۱) آپس میں ہمدردی پیدا کی جائے۔ (۲) ہیڈ ماسٹر ان پر ناروا رعب کی نمائش نہ کرے۔ (۳) طلبہ اور پبلک کے سامنے ان کی خفّت نہ کرے۔ (۴) ان کی نکتہ چینی نہ کی جائے، بلکہ ہمدردی سے رہنمائی ہو۔ (۵) ناروا داد و ستد کو قطعاً بند کر دیا جائے۔

ضبط و تعلیم کی عمدگی - اس کے لیے (۱) کام باقاعدہ ہو۔ (۲) اسکول ٹائم فضول گفتگو میں ضائع نہ کیا جائے۔ (۳) کھیل اور ورزش روزانہ ہو تاکہ دوسرے لڑکوں کے لیے کشش و جذب کا موجب ہو۔ (۴) ہر روز صبح خدا کی تعریف اور اصلاحی نظمیں گائی جائیں۔ (۵) اسکول

کا احاطہ خوشنما ہو۔ (۶) مکان مدرسہ کافی اور اصولِ حفظِ صحت کے مطابق ہو۔ (۷) حاضری باقاعدہ ہو۔ (۸) طلبہ کے اخلاق کی نگہداشت کی جائے۔ طلبہ کے علمی مقابلے کرائے جائیں اور پبلک کو دکھائے جائیں۔ (۱۰) تعلیم کے نتائج مشتہر کیے جائیں اور طلبہ کی سہ ماہی ترقی کی رپورٹیں بھیجی جائیں۔

معلمین اور پبلک کا اشتراکِ عمل یعنی، پبلک کے ساتھ معلمین کا رسوخ قابلِ تعریف ہو خصوصاً گاؤں کے سرکردہ اشخاص سے مدرس کے تعلقات نہایت خوشگوار ہوں۔ اس کے لیے (۱) معلم لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ہو۔ (۲) پبلک کو مقامی حالات کے مطابق مفید اُمور بتائے جائیں۔ (۳) اگر پبلک زراعت پیشہ ہے، تو نئے نئے زرعی انکشافات سے آگاہ کیا جائے۔ (۴) اصولِ حفظانِ صحت کا پرچار کیا جائے۔ میجک لینٹرن وغیرہ کا استعمال ہو۔ (۵) گاؤں کے آپس کے جھگڑوں میں حصّہ نہ لیا جائے، بلکہ فضول رسم و رواج کی زیر باری، زیورات اور مقدمہ بازی کے نقصانات واضح کیے جائیں۔ اصلاحی انجمنیں اور کوآپریٹو بنک جاری کیے جائیں۔ (۶) تعلیم عامہ کے لیے نائٹ اسکول اور گرل اسکول جاری کیے جائیں۔ تعلیم کے فوائد اور غرض و غایات بیان کیے جائیں۔ (۷) اخبار و رسائل پڑھ کر سنائے جائیں۔ (۸) غلط افواہوں اور گمراہ عقیدوں کی تردید کی جائے (۹) پبلک کو ان کے بچوں کے اخلاق کی نگہداشت کے متعلق مشورے دیے جائیں۔ (۱۰) جلوس نکالے جائیں اور اصلاحی نظمیں گائی جائیں۔ (۱۱) مقامی میلوں اور تماشوں میں تعلیمی پرچار کیا جائے۔ (۱۲) یوم والدین منایا جائے اور اس میں پبلک کے ساتھ ان کے بچوں کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ (۱۳) اگر مدرس طبیب ہے، تو پبلک کو طبی امداد مفت دے۔

غرضکہ۔ اگر ہیڈ ماسٹر اعلےٰ شخصیت کا مالک ہو، معلمین، پبلک اور طلبہ کو اپنے تدبّر اور حُسنِ سلوک سے گرویدہ کر سکے، پبلک میں اسکول اسٹاف کی عزّت اور اثر و رسوخ قائم کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اسکول اسٹاف بھی مقامی حالات کے ماتحت پبلک کی رہنمائی کرنے کی قابلیت رکھتا ہو اور ہیڈ ماسٹر اور اسٹاف یکجہتی سے اسکول کو پبلک کے سامنے ایک بہترین اخلاقی مرکز اور تربیت گاہ کی حیثیت میں پیش کر سکیں، تو یقیناً بے آباد اسکول آباد ہو سکتا ہے اور آباد اسکول خوشگوار نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

قیامِ ضبط مدرسہ میں اساتذہ اور سرپرستوں کا تعاون

میرے خیال میں بچّوں کی نشو و نما سے گھر کا جو تعلق ہے۔ اس سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کی تعلیم اس وقت تک قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی، جب تک مدرسہ اور گھر دونوں مل کر حصّہ نہ لیں اور باہمی اتحادِ عمل کے ساتھ ان کے سدھارنے اور مفید بنانے کی کوشش نہ کریں۔ آج کل تو یہ حالت ہے کہ مدرسے کے معلّموں کو گویا طلبہ کی خانگی زندگی سے اور گھر والوں کو ان کی تعلیمی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ یہ صورتِ حال بہت افسوسناک اور مضر ہے۔ کسی شخص کی زندگی بھی مختلف شعبوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی کہ انھیں ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو، چہ جائیکہ بچّوں کی زندگی، جن کی ذات سراسر وحدت کا مظہر ہوتی ہے۔ بچّے روزانہ چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً اٹھارہ گھنٹے مدرسے کے باہر، گھر میں اور اس کے آس پاس بسر کرتے ہیں۔ ان کے ذہن اور سیرت کی تشکیل صرف مدرسے کے وقت تک محدود نہیں، بلکہ بیداری کے ہر لمحے میں ہوتی رہتی ہے اور کم سے کم بچپن میں تو گھر کا اثر مدرسے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اگر گھر کا مجموعی اثر مفید ہے اور مدرسے کے کام میں اعانت کرتا ہے، تو بچّے کی نشو و نما مناسب طریقے پر ہوگی لیکن اگر ان دونوں کے اثرات ہم آہنگ نہیں اور مدرسے کی تربیت گھر میں زائل ہو جاتی ہے یا گھر کی عمدہ روایات اور عادتیں مدرسے میں پختہ نہیں ہوتیں، تو طالب علم کے نفس میں ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ اس کی زندگی کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ اس کی ایک معمولی سی مثال زبان اور گفتگو کا مسئلہ ہے۔ اکثر طلبہ کے گھروں پر جو زبان بولی جاتی ہے، وُہ غلط گنواروں کی بولی ہوتی ہے، جو ماحول

کے اثرات پر مبنی ہوتی ہے۔ مدرسے میں بحیثیتِ مجموعی اس سے بہتر اور زیادہ صحیح زبان رائج ہوتی ہے۔ طالب علم مدرسے میں داخل ہوتا ہے، تو اُستاد کوشش کرتے ہیں کہ وُہ صحیح بولے، لیکن گھر کی پڑی ہوئی عادت آسانی سے نہیں چھوٹتی، بلکہ روزمرہ کے اثر سے اور پختہ ہوتی جاتی ہے۔ بالعموم یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو طلبا ابتدائی یا ثانوی مدارس کی تعلیم حاصل کرکے چھوڑ دیتے ہیں، وُہ پہلے تو ایک عجیب مخلوط زبان بولتے ہیں جس میں کچھ تو ان کی تعلیمی زبان کا جُز ہوتا ہے اور کچھ ان کے گرد و پیش کی روزمرّہ کا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وُہ مدرسے کی زبان رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں اور تقریباً وہی زبان بولنے لگتے ہیں، جو ان کے گرد و پیش رائج ہوتی ہے۔

اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اکثر تعلیمی مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے، جب تک گھر اور مدرسہ، یعنی، والدین اور اُستاد مل جُل کر بچّوں کی تربیت کا انتظام نہ کریں اور جب تک ضبطِ مدرسہ میں ان دونوں کی شرکت نہ ہو، تب تک مدرسہ کامیاب صورت میں نہیں چل سکتا۔ سب سے پہلے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ والدین اور سرپرست یہ محسوس کریں کہ ان کے شہر یا گاؤں کا مدرسہ کوئی اجنبی یا غیر سرکاری ادارہ نہیں، جو ان کی زندگی اور مشاغل سے بے تعلق ہے، بلکہ ان کی تمدنی زندگی کا ایک اہم و لازمی، ضروری اور لابدی جُز ہے: جس کے بغیر اِن کا کام کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو باتوں کی خاص ضرورت ہے: ایک تو یہ کہ والدین اور معلّموں میں باہمی میل جول ہونا چاہیے تاکہ وُہ ایک دوسرے کی ضروریات اور مقاصد سے واقف ہو جائیں اور اپنے بچّوں کی تربیت کے لیے بہترین اور مناسب ترین ذرائع اختیار کر سکیں۔ دوسری بات، جو ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے، یہ کہ مدرسے کو بحیثیت ایک تعلیمی ادارے کے ایسے مشاغل اختیار کرنے چاہییں، جو گرد و پیش کے بالغ لوگوں کو براہِ راست فائدہ پہنچائیں۔ موجودہ تعلیم کا یہ اصول ہے کہ مدرسے کو اپنے شہر یا گاؤں کی

تمدنی زندگی کا مرکز ہونا چاہیے اور لوگوں کو بہترین طرزِ تعلیم سے روشناس کرانا چاہیے۔

مغربی ممالک میں جا بجا اور ہندوستان میں کہیں کہیں اس قسم کے تجربے کیے گئے ہیں، خصوصاً گاؤں کی زندگی کی اصلاح، لوگوں کی طرزِ معاشرت اور حفظانِ صحت کے انتظام میں مدرسوں نے جو حصّہ لیا ہے، وُہ غور اور مطالعے کے قابل ہے اور اس قسم کے کام بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ مدرسے کا نازک فرض یہ ہے کہ نہ صرف طلبہ کی انفرادی بہبودی کا خیال رکھے، بلکہ ان کو اجتماعی ذمّے داریوں اور فرائض کی بجا آوری کے لیے بھی تیار کرے۔ اس فرض کی دِقّت اور نزاکت کا پورا احساس اُنھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے، جو مدرسے اور گھر کے ضبط و ربط اور اشتراکِ عمل میں پوری طرح سے حصّہ لیں اور جہاں تک ہو سکے، تعصبات، اختلافات، ذات پات کی بندشوں اور قیود کو حتی الامکان دُور کرنے کی کوشش کریں اور اس کے بجائے بچّوں اور نوجوانوں میں میل جول، محبّت و اتحاد بڑھانے کی پوری پوری کوشش کریں۔

پس مدرسے کا فرض اوّلین یہ ہے کہ طلبا کے والدین سے جہاں تک ممکن ہو، اتحادِ عمل پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ آج کل یہ فضا پھیلی ہوئی ہے کہ اکثر والدین یا سرپرست مدرسے میں بچّوں کو ساتھ لاکر شریک کرانا کسرِ شان سمجھتے ہیں، بلکہ کسی نوکر یا رشتے دار کے ساتھ بچّوں کو مدرسے روانہ کر دیتے ہیں تا ان کی شرکت مدرسے میں ہو جائے۔

صدر مدرسین کو چاہیے کہ اس بات کا سخت خیال رکھیں کہ جب تک کوئی بچّہ مع اپنے والدین یا سرپرست کے مدرسے میں شرکت کے لیے نہ آئے، اس وقت تک بچے کو مدرسے میں شریک نہ کریں، کیونکہ اس سے کم سے کم ان کو مدرسہ دیکھنے اور آنے کی ترغیب ہو گی۔ دوسری بات جو ضروری ہے، وُہ یہ کہ ماہانہ رپورٹ بچے کے متعلق والدین کے پاس روانہ کریں اور ان کی

اطلاع یابی کے دستخط لیں اور اس کی سخت نگرانی رکھیں اور اس ماہانہ رکارڈ کو نہایت محفوظ رکھیں۔ بچوں سے ان کے والدین یا سرپرست کے گھر کے پتے دریافت کرلیے جائیں، بلکہ ممکن ہو، تو فارم شرکت میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھیں تاکہ بوقتِ ضرورت سرپرستوں سے باقاعدہ خط و کتابت کی جاسکے۔

جب کبھی کوئی سرپرست مدرسے آئے، تو مدرس مدرسہ کو چاہیے کہ اُس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور اس سے تعلیم کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرے۔ اگر کوئی بات واقعی اصلاح طلب ہو، تو اس پر خود بھی غور کرے اور اربابِ صدر کو بھی اس کی اطّلاع کرے۔ والدین کو بچوں کے وظیفے اور فیس کی معافی وغیرہ کے متعلق بھی ترغیب دلائے تاکہ وہ بچوں کو وظیفۂ ترغیبی کے دلانے میں کوشاں رہیں۔

مدرسے میں ہر سال یا ہر میقات پر ایک یا دو جلسے کیے جائیں، جس میں والدین یا سرپرستوں کو ضرور مدعو کیا جائے اور اس جلسے میں صدر مدرسہ کی جانب سے ایک جامع تقریر ہو، جس میں اسکاؤٹنگ، کھیل اور مدرسے کی زائد از نصاب مصروفیات اور دیگر جدید تحریکات کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔ مثلاً دستی مشاغل، ڈرل، اسکاؤٹنگ وغیرہ کے فوائد اور خوبیاں اور ان کا بچوں کی آئندہ زندگی پر اثر نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان کے سرپرستوں کے سامنے بیان ہو اور سرپرستوں کو بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ آئے دن جو جھگڑے چلے آتے ہیں، ان سے مدرسین کو نجات حاصل ہو۔

جلسے میں بچوں کو مختلف انعامات تقسیم کیے جائیں تاکہ ان کے والدین کو یہ محسوس ہو کہ ان کے بچے بھی انعامات لینے کے قابل ہوچکے ہیں، انعامات زیادہ قیمتی نہ ہوں۔ مثلاً کتاب، معمولی تمغے، سارٹیفکیٹ اور لکھنے پڑھنے کی چیزیں دی جائیں اور دورانِ تقریر میں انعامات پانے

والے طلبہ کی مختصر تعریف بھی کریں۔ اس سے ہر دو کے دل پر کافی اثر پڑے گا۔

جلسے میں مدرسے کی سالانہ کارگزاری کی تفصیلی رپورٹ پڑھی جائے جس میں ہر ایک شعبے کی علٰحدہ علٰحدہ تدریجی ترقّی بیان کی جائے۔

غرض یہ ہیں وُہ طریقے جن سے والدین مدرسے آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کبھی خالی اوقات میں جب کوئی سرپرست آئے، تو صدر مدرسہ کو چاہیے کہ مدرسے کے تمام اسٹاف سے ان کا تعارف کرائے اور ہر جماعت کی طرزِ تعلیم اور نصاب وغیرہ بتلائے۔

اس سے یہ ہوگا کہ سرپرستوں کو ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو جائے گی، رفتہ رفتہ ملنے آنے کے عادی بن جائیں گے۔ آئندہ سے بچّوں کے تعلیمی امور میں دلچسپی لیں گے اور گھر پر بچوں کے ہوم ورک اور حاضری مدرسہ کی کافی نگرانی کریں گے۔ غرض اس اتّحادِ عمل سے بچّوں کی کافی نگرانی اور تعلیم میں مدرسین کو سہولت ہوگی۔ ضبطِ مدرسہ میں کافی مدد ملے گی اور مدرسے اور گھر کے تعاون کا جو مسئلہ زیرِ بحث ہے، وُہ آسانی کے ساتھ حل ہو جائیگا۔

(ماخوذ از حیدرآباد ٹیچر)

اشتہار

گزارش

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ سلسلۂ آسان حساب مصنّفہ خورشید حسن صاحب بی اے بی ٹی، ڈسٹرکٹ انسپکٹر او سکولز، لاہور پر ۲۵ فیصدی کمیشن دی جاتی ہے۔ اگر اس سلسلہ حساب کو مدارس میں جاری کیا جائے، تو جہاں طلبہ کو اس مفید سلسلے سے مستفید ہونے کا موقع ملیگا، وہاں ان کے اخراجات میں بھی کافی بچت ہوگی۔ یہ سلسلہ نہایت ہی آسان اور مقبول ہے۔ اُمید ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحبان اس سلسلے کو جاری کر کے مشکور فرمائیں گے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

اشتہار

نو ترمیم

آئینِ شہریت مع قوانینِ صحت

جسے حال ہی میں محکمہ تعلیم نے بذریعہ سرکلر نمبر $\frac{8494009}{14\cdot4\cdot37}$ تمام مڈل کی جماعتوں کے لئے منظور فرمایا ہے۔

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان مڈل سکولز و لوئر مڈل مدارس پر واضح ہو کہ سال گزشتہ اس مضمون کے متعلق جو محکمہ نے منظور کی تھیں، وُہ سب ایک سال کے لئے تھیں اور ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کے بعد وُہ سب نامنظور ہو گئی ہیں۔ اس لئے اب سال گزشتہ کی منظوری پر کوئی کتاب رائج نہیں ہو سکتی۔

یہ کتاب جس کی منظوری محکمہ نے ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو دی ہے، شہریت و حفظِ صحت کی اس اسکیم کے عین مطابق ہے، جو محکمہ تعلیم نے مڈل کلاسز کے لئے منظور فرمائی ہے۔ اس کتاب میں اس مضمون کے ہر موضوع پر مفصل واقفیت دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور جدید اصطلاحات کے متعلق ضروری امور بیان کر دئے گئے ہیں۔ اسے قابل اور تجربہ کار مصنفین نے اُردو اور انگریزی کی ان تمام کتب کو مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے، جو اب تک چھپ چکی ہیں۔

کتاب کی زبان سلیس، دلچسپ اور مؤثر ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہترین ہے۔

نوٹ:۔ اگر کوئی شخص آپ کو کسی ایسی کتاب کے رائج کرنے کے متعلق کہے۔ جس پر ۱۹۳۷ء کے سرکلر نمبر کا جواز نہیں ہے، تو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ رائج نہ ہو۔ کیونکہ وُہ منظور شدہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس منظور شدہ کتاب کو رائج فرمائیں گے، تو ہم بہت شکر گزار ہونگے۔

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۴) | اکتوبر ۱۹۳۷ء | نمبر (۱)

فہرستِ مضامین

۱

ایڈیٹوریل

مسٹر ووڈ نے اپنی رپورٹ میں دیہاتی مڈل اسکولوں کے بارے میں کچھ ہدایات درج کی ہیں، جن کا ہم مختصر طور پر ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان میں نوّے فی صدی کے قریب لوگ دیہاتوں میں آباد ہیں، اس لیے دیہاتی مڈل اسکول کو ایک نہایت ضروری اور مفید تعلیم گاہ سمجھنا چاہیے۔ کون ذی عقل انسان ہے، جو یہ نہیں سمجھتا کہ جب تک دیہات کے بچّوں کی تعلیم خاطر خواہ نہ ہوگی، دیہات سدھار کی سب گفتگو بیسُود ہے۔ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں تو لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قوم کی ترقی کے لیے ہر بچّے کو کم ازکم تیرہ یا چودہ سال کی عمر تک تعلیم مفت اور لازمی طور پر دینی چاہیے، کیونکہ تبھی ہم ایسے افراد پیدا کر سکتے ہیں، جو اپنے ملک کے لیے باعثِ فخر ہوں۔ ہندوستان میں شاید وہ دن ابھی بہت دور ہے، جب ہم یہ کہہ سکیں کہ اس ملک کا ہر فردِ بشر کم ازکم مڈل اسکول تک تعلیم یافتہ ہے۔ پھر بھی ہم کو اس بات کی سعی ضرور کرنی چاہیے کہ جو موجودہ نظامِ تعلیم ہے، اس سے ہمارے طلبہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ ایک امرِ مسلمہ ہے کہ ابتدائی تعلیم تبھی مفید ہو سکتی ہے، جب اس کا دارومدار طلبہ کی اردگرد کی قدرتی اور سوشل زندگی پر ہو، یعنی، جس ماحول (Environment) میں رہ کر بچّے پرورش پا رہے ہیں، اس سے تعلیم کا گہرا تعلق ہونا چاہیے۔ اگر انھیں ایسی چیزیں پڑھائی جائیں، جو اُن کی روزمرّہ کی زندگی سے وابستہ نہ ہوں اور جن میں وہ دلچسپی نہ لے سکتے ہوں، تو وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے سراسر باعثِ نقصان ہونگی۔ اس وقت

ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرین تعلیم اس امر کی طرف توجہ کریں کہ مڈل اسکولوں کا مروجہ نصاب تعلیم کس حد تک طلبہ کی ضروریات کے مطابق ہے اور اس میں کون کون سی تبدیلیاں کی جائیں تاکہ یہ بچوں کے اندرونی جذبات و حرکات کی ترجمانی کر سکے اور ان کے اردگرد کی زندگی کو ان کے لیے دلچسپ بنا سکے۔

مندرجۂ بالا ہدایت کا یہ مطلب نہیں کہ چونکہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور یہاں کے لوگ عموماً پیشہ کاشتکاری میں مشغول رہتے ہیں، اس لیے دیہاتی مڈل اسکول عام طور پر زراعتی درسگاہیں ہونی چاہییں۔ یہ خیال کہ ان ابتدائی تعلیم گاہوں کا منشا اچھے کاشتکار پیدا کرنا ہے، سراسر غلط ہے۔ آجکل سائنس نے ہر پیشے کے علم کو کافی مشکل اور اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔ علم زراعت کو سیکھنے کے لیے کیمسٹری، فزکس اور بیالوجی کے علوم کی ازحد ضرورت ہے۔ اس لیے مڈل اسکول کے طلبہ سے یہ توقع کرنی کہ وہ اس علم کو بخوبی سمجھ لیں گے نادانی نہیں تو کیا ہے۔ لہٰذا ان درسگاہوں کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو علم زراعت کے دقیق اصول سمجھائیں، بلکہ یہ کہ جو مظاہر بچے اپنے اردگرد دیکھتے ہیں، ان سے وہ پورا حظ اور فائدہ اٹھا سکیں اور علم کو اس طرح حاصل کریں کہ اپنے قدرتی جذبات و خواہشات کی خاطر خواہ تربیت کر سکیں۔

اس کے بعد مسٹر ووڈ اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ تعلیم اور دیہات سدھار کا آپس میں کیا تعلق ہونا چاہیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محکمۂ تعلیم کو اس نیک کام میں ضرور حصّہ لینا چاہیے، لیکن اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ایسا کرنے سے کہیں بچوں کی تعلیم میں کسی قسم کا ہرج واقع نہ ہو۔ اگر تمام دیہاتی درسگاہوں کو دیہات سدھار کا مرکز بنا دیا گیا، تو اس سے اساتذہ کی ذمّے داری دوطرف ہو جائیگی۔ ایک تو انھیں تدریس کا کام کرنا ہوگا اور دوسرے

دیہات سدھار کے لیے گاؤں میں پروپیگنڈا۔ گمان غالب ہے کہ اپنے افسروں کو خوش کرنے کی خاطر اساتذہ تعلیم کے کام میں کوتاہی کرنا شروع کر دیں یا دوسری طرف دیہات سدھار کا کام صرف ظاہرداری تک ہی محدود رہ جائے۔ اس کے علاوہ دیہاتی اسکولوں کے اساتذہ کی کثیر تعداد اس کام کو بخوبی کرنے کی شاید اہل نہیں سمجھی جا سکتی۔ اگر اساتذہ کو اس مطلب کے لیے تیار کرنا ہے کہ وُہ بچّوں کی تعلیم کا بھی خیال رکھیں اور ساتھ ہی دیہات سدھار کے بھی پاسباں بنیں، تو اُن کے لیے دو شرائط کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔

پہلے یہ کہ ان تعلیم گاہوں میں اساتذہ کا رتبہ اعلیٰ کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ وُہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ ان کی ٹریننگ کا باقاعدہ انتظام ہو۔ اُن کی تنخواہیں معقول ہوں اور اُنھیں اس بات کا پورا یقین ہو کہ اگر وہ اچھا کام کرینگے، تو اُن کی قدر و منزلت ہوگی۔

دوسرے یہ کہ محکمۂ تعلیم کے علاوہ دوسرے محکمہ جات اس کے دوش بدوش کام کریں۔ دیہات سدھار کا کام اتنا وسیع ہے کہ صرف ایک محکمہ ہی اسے اکیلا نہیں سنبھال سکتا۔ اس بارے میں وُڈ صاحب کی رائے ہے کہ محکمۂ تعلیم اور محکمۂ حفظانِ صحت کو مرکزی سوشل سروس محکمے سمجھنا چاہیے اور ان کے ساتھ کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ کو بھی اس کام میں کافی حصّہ لینا چاہیے۔ اگر یہ محکمہ جات متفقہ کوشش کریں، تو دیہات سدھار کا کام بخوبی ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس کا بار زیادہ تر دیہاتی تعلیم گاہوں پر ہی رہا، تو نتائج اچھے نہیں برآمد ہونگے۔

اس کے بعد وُڈ صاحب اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ مڈل اسکولوں کے نصاب میں انگریزی زبان کو کونسی جگہ دینی چاہیے۔ آج کل ہمارے صوبے میں تین قسم کے اسکول موجود ہیں۔ ایک ورنیکلر مڈل اسکول، دوسرے ورنیکلر مڈل اسکول جہاں انگریزی آپشنل مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور دوسرے اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول۔ گورنمنٹ نے ۱۹۳۲ء میں

زیر صدارت سر جارج اینڈرسن ایک کمیٹی مقرر کی تھی، جس نے یہ تجاویز پیش کیں
پرائمری تعلیم کو بجائے چار سال کے پانچ سال تک وسعت دیدی جائے۔ اس کے بعد
موجودہ مڈل اسکولوں کے بجائے لوئر سیکنڈری اسکول ہوں، جو چھٹی سے نویں جماعت
تک تعلیم دیں۔ پھر ہائر سیکنڈری اسکول ہوں، جو دسویں سے بارھویں جماعت تک
تعلیم دیں۔ یہ تجاویز ابھی تک زیر غور ہیں۔ اینڈرسن کمیٹی نے اس بات کی بڑے زور سے سفارش
کی ہے کہ لوئر سیکنڈری اسکولوں میں (Medium of Instruction) ورنیکلر ہو۔
مسٹر وڈ نے بھی اسی سفارش کو مدِنظر رکھ کر ورنیکلر پر زور دیا ہے۔ آج کل ہمارے طلبا
کی یہ حالت ہے کہ آٹھویں جماعت تک تین تین زبانیں سیکھتے ہیں، لیکن اپنے خیالات کا
اظہار ایک میں بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ انگریزی، سنسکرت
فارسی اور عربی زبانیں، جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا تعلق طلبہ کی روزمرہ کی زندگی
سے کچھ نہیں ہوتا، اس لیے وہ ان میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
طلبہ کے اندر جو قدرتی چستی و چالاکی ہوتی ہے، وہ ان زبانوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس لیے
وُڈ صاحب فرماتے ہیں کہ مڈل اسکولوں میں زبان دانی پر اتنا زور نہ دینا چاہیے کہ جس سے
بچے زندگی کے لطف کو کھو بیٹھیں۔ لہٰذا اس اسٹیج پر تعلیم بذریعۂ مادری زبان ہی دینی چاہیے
اور اسی میں بچوں کو طاق کرنا چاہیے، جہاں اس کی از حد ضرورت ہو اور ان میں بھی یہ بطور
آپشنل مضمون پڑھائی جانی چاہیے۔

آخر میں وُڈ صاحب فرماتے ہیں کہ نصابِ تعلیم کی رفارم کے لیے ضروری ہے کہ
ہندوستان کے ماہرینِ تعلیم بچوں کے اندرونی جذبات و حرکات اور اُن کے ماحول کا بغور
مطالعہ کریں اور تعلیم کا دارومدار ان پر رکھیں۔ اس بارے میں اُن کی رائے ہے کہ دس اور چودہ

برس کے درمیان کی عمر کے بچے عام طور پر خود تجربہ کرنے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ جہاں ایک چھوٹا بچہ انجن کے کھلونے کو دیکھ کر ہی خوش ہوجاتا ہے، اس کا بڑا بھائی یہ چاہتا ہے کہ اسے توڑ کر اُس کے پُرزے پُرزے کردے اور پھر دیکھے کہ وہ کیسے بنتا اور چلتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس عمر میں بچوں کے اندر کام کرنے کی بہت خواہش ہوتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک چیز کی خود دیکھ بھال کریں اور اگر ہوسکے، تو اُسے خود بنائیں۔ لہٰذا اساتذہ کو چاہیے کہ تدریس کے کام میں بچوں کے اس قدرتی جذبے کو ضرور مدِنظر رکھیں اور طلبہ کے لیے ایسے مشاغل مہیا کریں، جن سے وہ تعلیم بھی حاصل کریں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قدرتی خواہشات و جذبات کی بھی تربیت کرسکیں۔ اس سے ایک طرف ملک کو فائدہ ہوگا اور دوسری طرف ہمارے دیہاتی مڈل اسکول بچوں کے نقطۂ نگاہ سے پُرلطف درسگاہیں بن جائیں گے۔

۶

روس کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد صاحب، ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۴)

خالص صنعتی تعلیم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں ابتدائی اور ثانوی اور دوسرے حصّے میں اعلیٰ التعلیم۔ ہفت سالہ مدارس کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کارخانوں کی تربیت گاہیں ہیں، جہاں خواندگی کی مدّت چھ ماہ سے ایک سال ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ٹیکنیکم (Technicum) ہے، یعنی، ثانوی صنعتی تعلیم جہاں خواندگی کی مدّت چار سال ہے۔ تعلیم اعلیٰ کے مدارس میں صرف وُہ بچّے داخل ہو سکتے ہیں جنھوں نے دس برس کے مدارس کی تعلیم ختم کر لی ہو اور ان کی خواندگی عموماً چار سے پانچ سال تک ہے۔ اُن کاریگروں کے لیے جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، علٰحدہ مدارس ہیں، جن کو ورکر فیکلٹیز (Wor ke r's Faculties) کہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہمارے ہندوستان کی طرح روس میں تعلیم اعلےٰ کے کالج نہیں ہیں، وہاں تعلیم اعلیٰ کا ہر ادارہ خاص مقصد کے لیے بنا ہے، جہاں وُہ خاص قسم کے ماہرین فن کو تربیت اور تعلیم دیتے ہیں :-

۷

صنعتی تعلیم

ابتدائی و ثانوی

(۱) کارخانوں کے لیے تربیت گاہیں
مدّت ۶ ماہ سے ایک سال

(۲) ٹکنیکم (Technicum)
مدّت چار سال

اعلیٰ تعلیم
(۳) مختلف صنعتی ادارے

(۱) اِن مدارس کا مقصد یہ ہے کہ کم سے کم مدّت میں ایسے کاریگر پیدا کریں، جو اپنے فن میں ماہر ہوں اور اُن کی تعلیم بھی کافی اچھی ہو اور طالب علموں کو مدرسے اور کارخانے دونوں میں باری باری کام کرنا پڑتا ہے۔ ان مدارس کی خواندگی کی مدّت دو سال ہے۔ ہفتے کے چالیس گھنٹوں کے حساب سے بیس گھنٹے مدرسے میں گزارتے ہیں اور بیس گھنٹے، یعنی چار گھنٹے روزانہ کارخانے میں۔ اِن مدارس نے ملک کی ضروریات کو اچھی طرح پورا کیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بہت ترقی ہوئی۔ جس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے :-

	سنہ ۱۹۲۳ء	سنہ ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء	سنہ ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۳۲ء
طالبعلموں کی تعداد	۵۰،۰۰۰	۱۰۹،۴۰۳	۱۶۳،۰۰۰	۵۸۲،۰۰۰	۹۷۵۰۰۰	۱۱۷۷۰۰۰

پہلے پنجسالہ پروگرام کے اختتام پر ان مدارس سے ساڑھے چار لاکھ ماہرین فن تعلیم حاصل کر چکے تھے، لیکن سنہ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے ان مدارس کے انتظام میں تبدیلی کر دی۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ ان کی مدّت خواندگی ضرورت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے یہ مدت دو سال سے کم کر کے صرف چھے ماہ اور بعض حالات میں ایک سال کر دی۔ دوسرا نقص تھا کہ ان مدارس میں عملی کے بجائے نظری تعلیم پر بہت زور دیا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اکثر طلبہ تعلیم ختم کرنے کے بعد، بجائے کارخانے میں کام کرنے کے، ثانوی مدارس میں داخل ہوتے، جس سے حکومت اور ملک کو بہت نقصان ہوتا تھا۔ ان تکالیف کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے

اب صنعتی تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ طریقۂ تعلیم بالکل ویسا ہی ہے، یعنی، دن میں پانچ یا چھے گھنٹے عملی کام کارخانے میں اور ۲ یا ۳ گھنٹے نظری تعلیم۔ یہ مدارس صنعتی تعلیم میں سیڑھی کا کام نہیں دیتے، یعنی اعلیٰ صنعتی تعلیم میں داخل ہونے کے لیے ان مدارس کی سند کی ضرورت نہیں۔ ان کا مقصد صرف ماہرِ فن کاریگر پیدا کرنا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اعلیٰ صنعتی تعلیم حاصل کرنا چاہے، تو وہ ان مدارس کی تعلیم کے بعد اُن میں داخل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ (اور یہ شرط لازمی ہے) اس نے اس تعلیم کے بعد تین سال تک کسی کارخانے میں کام کیا ہو۔ ان تمام رکاوٹوں اور شرائط کا مدعا یہ ہے کہ حکومت نے جس مقصد کے لیے یہ مدارس قائم کیے تھے، (یعنی کارخانوں کے لیے کاریگر تیار کرنا) وہ فوت نہ ہو جائے۔ چنانچہ کاریگروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہُوا۔ اگر پہلے پنجسالہ پروگرام کے ماتحت ساڑھے چار لاکھ کاریگر پیدا ہُوے، تو اب دوسرے پنجسالہ پروگرام کے مطابق پچیس لاکھ کاریگر تیار ہو رہے ہیں۔ یہ تمام مدارس وزیرِ صنعت کے ماتحت ہیں۔

زراعت کے کام کے لیے بھی مختلف مدارس ہیں، جن کے لیے حکومت کی طرف سے مختلف زراعتی تجربہ گاہیں قائم کی گئی ہیں۔ چار سال کے اندر (۱۹۳۱ء۔۱۹۳۴ء) زراعتی کام کے لیے ساڑھے چار لاکھ کاریگر تربیت حاصل کر چکے ہیں اور دوسرے پنجسالہ پروگرام کے مطابق ڈھائی لاکھ اور کاریگر تیار کیے جا رہے ہیں۔

(۲) ثانوی صنعتی تعلیم۔ ایسے مدارس کو روس میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، ٹکنیکم (Technicum) کہتے ہیں اور ان کا داخلہ ہفت سالہ مدارس کی تعلیم کے بعد شروع ہوتا ہے اور خواندگی کی مدت چار سال ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی مختلف صنائع کے لیے درمیانی درجے کے بہترین کاریگر پیدا کیے جائیں۔ ان مدارس کے نصاب کو ہم ذیل کے حصوں

میں تقسیم کرسکتے ہیں :۔

(۱) عام سائنٹیفک (۲) صنعتی (۳) عام تعلیمی (۴) خصوصی

مثال کے طور پر ہم عمارتی علم سیکھنے والوں کا نصاب درج کرتے ہیں :۔

(۱) عام تعلیمی مضامین : سیاسی معاشیات ، اشتراکی اقتصادی اصول ، روسی زبان اور بعض غیر ملکی زبانیں ۔

(۲) سائنٹیفک اور صنعتی مضامین : ریاضی (Maths) علم طبیعیات ، علم کیمیا ، ڈرائنگ ، بیالوجی ، عمارت کے مسالہ جات ، عمارت سازی (Pure maths) اور اصول نقشہ نویسی (Principles of planning) وغیرہ ۔

(۳) خصوصی مضامین : ڈیزائننگ (Designing) نہروں اور پانی کے دیگر راستوں کا مطالعہ ، عمارتوں میں گرمی پہنچانے کا انتظام اور طریقہ ، گندی ہوا کے خارج کرنے کے ذرائع ، تاریخ عمارت سازی ، عمارت سازی کے مختلف سٹائل (Style)

ان مضامین میں ۱۸ فیصدی عام تعلیمی ہیں ، ۵۰ فیصدی سائنٹیفک اور صنعتی اور ۳۲ فیصدی خصوصی ، خواندگی کی مدت ختم کرنے کے بعد امتحان نہیں ہوتا ، بلکہ ہر طالب علم ایک مقالہ لکھ کر پیش کرتا ہے ، جس کی تیاری کے لیے اُسے تین مہینے کی مہلت ملتی ہے ۔ عملی کام میں تمام وقت کا ۳۰ یا ۴۰ فیصدی حصّہ خرچ ہوتا ہے ۔

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ان مدارس کا درجہ ثانوی اور اعلیٰ مدارس کے درمیان ہے ۔ اس لیے طریقۂ تعلیم بھی دونوں طرح کا ہے ۔ پہلے درجے میں طریقۂ تعلیم ثانوی مدارس کا ہے ، یعنی سبق دیے جاتے ہیں ، لیکن اعلیٰ درجے میں لیکچر دیے جاتے ہیں ۔ چونکہ ان مدارس کی اہمیت ملک کی ضروریات کے مطابق بہت زیادہ ہے ، اس لیے انھوں نے بہت ترقی کی ہے جس کا اندازہ

مندرجۂ ذیل اعداد سے ہوسکتا ہے :-

	۱۹۲۸ء	۱۹۳۲ء
مدارس کی تعداد	۱۶۵۰	۳۰۰۰
	۲۵۳۶۰۰	۱۰۰۰۰۰ یعنی ۳۹۴،۳۷ فیصدی ترقی ہوئی

پہلے پنجسالہ پروگرام کے اختتام (۱۹۳۲ء) پر ۳۰۸۸۰۰ درمیانی درجے کے ماہرین فن کاریگر ایسے مدارس سے نکلے۔ دوسرے پنجسالہ پروگرام کے مطابق (جو ۱۹۳۷ء میں ختم ہوجائیگا) نولاکھ ایسے کاریگر تیار ہورہے ہیں۔

(۳) ہم نے اعلیٰ تعلیم کو صنعتی تعلیم کے تحت میں جگہ دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روس میں ہندوستان اور دیگر ممالک کی طرح عام مضامین (مثلاً تاریخ، فلسفہ، ادب وغیرہ) کے لیے کوئی علحدہ کالج نہیں۔ سب ادارے ایسے ہیں، جن کا واحد مقصد ملک کی روزمرّہ کی صنعتی اور دیگر حرفتی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے حسب ذیل ہیں :-

صنعتی ادارے	۱۶۳	ان سب میں طلبہ کی تعداد ۴۹۱۰۰۰ ہے۔
زراعتی ادارے	۱۳۵	
معاشرتی اور سیاسی ادارے	۷۲	
معلمی ادارے	۱۶۵	
طبی ادارے	۶۳	

ان مدارس کے نظم ونسق میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں، لیکن ۱۹۳۴ء کے آغاز سے ان کے انتظام میں بہت اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ ۳-۱۹۲۹ء تک تو تعلیم اعلیٰ کا انتظام وزیر تعلیم کے سپرد تھا، لیکن جونہیں کہ صنعت وحرفت نے ترقی کی، یہ انتظام حکومت کے حسب منشا

نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں تعلیم اعلیٰ کے مختلف اداروں کو مختلف وزیروں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ صنعتی تعلیم، صنعت و حرفت کے ساتھ پورے طور پر وابستہ ہو جائے۔ لیکن اس تبدیلی سے ایک خرابی نمودار ہوئی۔ یہ ادارے تقریباً چودہ مختلف وزیروں اور مختلف وفاقی اداروں کے ماتحت آگئے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ (ا) مختلف مدارس میں کوئی تعلق نہ رہا، جس کی وجہ سے تعلیم اور نصاب کا معیار مختلف ہو گیا۔ (ب) بہت سے نئے مدارس قائم ہوئے، جن کی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ (ج) بہت سے خصوصی مضامین کی تعداد بڑھا دی گئی۔

ان خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے ۱۹۳۲ء میں ایک "مرکزی انجمن انتظامیہ" قائم کی گئی، جس کے احکام کی رُو سے خصوصی مضامین کی تعداد کم کر دی گئی اور مدارس کا تمام انتظام مختلف وزیروں کے ہاتھ میں دیدیا گیا اور مختلف وفاقی (Federal) اداروں سے واپس لے لیا گیا۔ اس کے علاوہ اس مرکزی انجمن نے "اعلیٰ صنعتی تعلیم کی خاص کمیٹی" ۱۹۳۳ء میں قائم کی۔ ان فیصلوں کا نتیجہ بہت معنی خیز ثابت ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں تمام صنعتی مدارس کی وہ تمام خرابیاں، جو مختلف ہاتھوں میں ہونے سے پیدا ہو گئی تھیں، کمیٹی کے مرکزی انتظام کے ساتھ ہی درست ہو گئیں۔ چنانچہ

(ا) خصوصی مضامین کی فہرست کو بہت کم کر دیا گیا۔ ان کی تعداد ۱۹۳۲ء میں سات سو تک پہنچ گئی تھی، لیکن ۱۹۳۴ء میں ان کی تعداد آدھی سے بھی زیادہ گر گئی اور بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ کم ہو گئی۔ مثلاً زراعت میں اگر پہلے خصوصی مضامین ۸۷ تھے، تو اب گیارہ رہ گئے۔ علم کیمیا میں ۸۷ سے ۳۱ اور فن عمارت سازی میں ۴۶ سے گر کر ۱۶ تک آ پہنچے۔

(ب) تمام کمزور ادارے، جو اس جوش کے زمانے میں نمودار ہوئے تھے، یا تو بالکل بند کر دیے گئے یا بڑے اداروں کے ساتھ ملا دیے گئے۔ چنانچہ ان کی تعداد بہت گر گئی۔

مدارس		۱۹۳۲ء	۱۹۳۴ء
صنعتی		۲۱۱	۱۶۲
زراعتی		۱۳۸	۱۰۷
نقل و حرکت	(transport)	۴۱	۲۸
		۳۹۰	۲۹۷

ان کے علاوہ تمام نصاب اور مضامین میں ضروری تبدیلیاں کی گئیں۔ چنانچہ اس بات کا پورا خیال رکھا گیا کہ علاوہ اپنے صنعتی فن کے تمام لوگ عام سائنٹیفک تعلیم بھی حاصل کر سکیں۔ ان مدارس کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہر ایک کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی نہ کسی کارخانے میں کم ازکم پانچ سال کے لیے کام کرے۔

ان مدارس میں دو قسم کی تعلیم ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی تعلیم بلند درجہ رکھتی ہے اور اس میں طالب علموں کو عام سائنٹیفک اصول (جن پر موجودہ زمانے کی صنعت کا انحصار ہے)، قومی اقتصادیات اور تمدّن اور خاص کر اشتمالی حکومت کا اقتصادی اصول جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ دوسری قسم کی تعلیم چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے اور چند مضامین میں خصوصیت سے تعلیم دی جاتی ہے۔ پہلی قسم کی مدّت خواندگی پانچ سال اور دوسری کی چار سال۔ نصاب میں عملی کام کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ شروع ہی سے طلبا اپنا تمام عملی کام کارخانے میں یا کالج کے معمل میں کرتے ہیں تاکہ آئندہ کام کے لیے انھیں مناسب تربیت حاصل ہو سکے۔ اور یہ عملی کام، کل نصاب کا ۳۰ سے لیکر ۶۰ فیصدی تک ہوتا ہے۔ ان کاموں کے لیے یہ مدارس ایک باقاعدہ کارخانے کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں اور زراعتی مدارس کے لیے علیحدہ زمینیں ہوتی ہیں، جہاں وہ تجربات کر سکتے ہیں۔ ان تمام کاموں کے لیے طالب علموں کو کارخانوں سے

باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔

طریقۂ تعلیم کے متعلق بھی روسی مدبّرین نے بہت سے تجربات کیے۔ ان تجربات کا کچھ ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہاں صرف اعلیٰ (صنعتی) تعلیم کے متعلق کچھ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بڑی مدّت تک طریقۂ ڈالٹن استعمال ہوتا رہا اور لیکچروں کا طریقہ بالکل رائج نہ تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں مل کر گروہوں میں استاد کی زیر نگرانی کام کرتے تھے۔ ہر گروہ ۲۰ سے لیکر ۳۰ طلبہ پر مشتمل ہوتا تھا اور ہر گروہ کے لیے مختلف عنوان مقرر کیے جاتے تھے، جن کو وُہ معمل میں حل کرتے تھے۔ پھر ہر گروہ کے چھوٹے گروہ تھے، جن میں تین تین چار چار طالب علم ہوتے۔ ان چھوٹے گروہوں کو بریگیڈ (Brigade) کہتے تھے اور اس طریقے کو بجائے ڈالٹن کے لیباریٹری بریگیڈ سسٹم (Laburatory Brigade System) کہنے تھے۔ لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ اس طریقے سے بچے اپنی ذمّے داری کو محسوس نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ استاد اور شاگردوں کا تعلق جس سے بہت سے تعلیمی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، پیدا نہیں ہوتا۔ ان وجوہات کے باعث مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے اس طریقے کو موقوف کر دیا اور دوسرا طریقہ اختیار کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے: ہر ایک طالب علم اپنے کام کا خود ذمّے دار ہے اور استاد کی نگرانی زیادہ کر دی گئی ہے، چنانچہ وُہ سب طالب علموں کے مجموعی اور ہر طالب علم کے انفرادی کام کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن اس کام پر پورا زور دیا جاتا ہے کہ لڑکے اپنے اپنے کام کے ذمّے دار رہتے ہوئے بھی مجموعی کام کر سکیں۔ یہ طریقہ مندرجۂ ذیل دو شقوں پر مبنی ہے:۔

(۱) اُستاد لیکچر دیتا ہے، جس کے بعد طالب علم مجموعی طور پر اس کو سمجھنے اور نتائج نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۲) معمل کا کام، یعنی، ہر طالب علم انفرادی طور پر وہ کام معمل میں کرتا ہے، جو اُس کے

سپرد کیا جاتا ہے اور اُستاد نگرانی کرتا ہے۔ خواندگی ختم کرنے کے بعد ہر طالب علم ایک مقالہ لکھ کر پیش کرتا ہے، جس کی تیاری کے لیے اُسے دو سے پانچ ماہ تک کی مدت دی جاتی ہے۔ اس مقالے کی منظوری کے بعد اسے سند مل جاتی ہے۔

اس تعلیم کے علاوہ بعض مدارس میں بعدِ تحصیل (Post-graduate) کی خواندگی بھی ہوتی ہے۔ یہ خواندگی صرف سائنس کی تحقیقات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ۱۹۳۳ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس بعدِ تحصیل کی خواندگی میں صرف وُہ اشخاص داخل ہو سکتے ہیں، جنھوں نے دو سال تک کسی کارخانے میں شاندار طریقے سے کام سرانجام دیا ہو۔ اُس کی مدت دو یا تین سال تک ہوتی ہے اور طالب علموں کو انفرادی طور پر تحقیق کرنی ہوتی ہے، جس کے بعد وہ اپنے مضمون پر چند تقریریں کرتے ہیں اور کامیاب طلبہ سائنس کی بلند ترین ڈگری (Candidate of Science) حاصل کرتے ہیں۔

اِن طالب علموں کی پہلی تعلیم کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا، جو اعلیٰ (صنعتی) مدارس میں داخل ہوئے (۱۹۳۳ء):

۴۹ء۴ طالب علموں نے ورکرز فیکلٹیز (Worker's Faculties) کی تعلیم ختم کی تھی۔
۱۴ء۵ 〃 〃 مختلف قسم کی تیاری کی خواندگی ختم کی تھی۔
۱۲ء۹ 〃 〃 عام تعلیم کے تیسرے درجے کی خواندگی ختم کی تھی۔
۳ء۸ 〃 〃 عام تعلیم کے دوسرے درجے کی خواندگی ختم کی تھی۔
۴ء۸ 〃 〃 کارخانوں کی تربیت کی خواندگی ختم کی تھی۔
۱۴ء۶ 〃 〃 ٹکنیکم کی خواندگی ختم کی تھی۔

۱۹۳۳ء سے ان مدارسِ اعلیٰ (صنعتی) میں داخل ہونے کے لیے (خواہ انھوں نے کسی

اور مدرسے کی سند ہی کیوں نہ لی ہو)، ایک لفظ کا امتحان لازمی قرار دیدیا ہے، جس کے مضامین حسب ذیل ہیں: روسی زبان اور ادب، ریاضی، علم طبیعیات، علم کیمیا اور علم معاشیات (Sociology) اور ہر مضمون میں پاس ہونا لازمی ہے۔ مختلف مضامین کا نصاب حسب ذیل ہے:-

روسی ادب: سب سے بڑے روسی ادیب اور چند اشتراکی دور کے ادیب بھی شامل ہیں۔

ریاضی: حساب، جبر و مقابلہ، علم ہندسہ اور علم مثلث۔

علم طبیعیات: حرارت، نور، برق، مقناطیسیت، میکانک۔

علم معاشیات: اقتصادی سیاسیات اور اشتراکی جنگ برائے پرولتاریہ

امتحان کا معیار عام طور پر مغربی اور خاص کر انگلستان کے میٹریکولیشن کے معیار سے بہت بلند ہے۔

اس وقت تقریباً اعلیٰ (صنعتی) مدارس کے تقریباً ۷۵ فیصدی طلبہ کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے اور ایسے طالب علموں کے لیے بے شمار رعایات اور سہولتیں ہوتی ہیں۔ ان کے کھانے، پینے، پڑھنے، رہنے اور کام کرنے کی ہر چیز حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی ہے اور ہر سال چند طلبہ (۱۹۳۲ء میں ایسے لڑکوں کی تعداد ۷۵۰۰۰ تھی) کو خاص صحت افزا مقام پر آرام کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وظیفے کی رقم کا معیار، امتحان میں کامیابی کے درجے اور جماعت پر منحصر ہوتا ہے۔ ذیل کے نقشوں سے اصلی رقم کا پتہ لگ سکتا ہے۔ (رقم روسی سکہ روبل میں ہے، جو دو شلنگ کے برابر ہوتا ہے، یعنی، ایک روپیہ ۵ آنے ۶ پائی)۔

	پہلا سال	دوسرا	تیسرا	چوتھا	پانچواں
معمولی کامیابی	۷۰	۸۰	۹۰	۱۱۰	۱۳۰
خاص کامیابی	۸۰	۹۰	۱۱۰	۱۳۰	۱۵۰

اِس طرح ان مدارس کے اساتذہ کے لیے اسی طرح کی سہولتیں ہیں۔ ان تمام اخراجات کی وجہ سے ان مدارس پر حکومت کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ ہر طالب علم پر ۱۹۳۳ء میں اوسطاً تقریباً ۱۵۰۰ روبل خرچ آئے اور کل خرچ تقریباً ستّر لاکھ روبل ہوا اور ۱۹۳۴ء میں ایک سو کروڑ روبل خرچ ہوئے (یہ یاد رہے کہ کل تعلیم پر ۱۹۳۴ء میں ۸,۵۰۰,۰۰۰,۰۰۰ روبل خرچ ہوئے)۔

اِن مدارس کی ترقی کا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے :۔

	۱۹۲۸ء	۱۹۳۳ء
مدرسوں کی تعداد	۱۲۰	۱۶۸
طالب علموں کی تعداد	۱۶۰۰۰	۴۶۹۲۱۵

اِن طالب علموں کی تقسیم مختلف مدارس کے لحاظ سے یوں تھی۔ (۱۹۳۳ء) :

قسم مدارس	تعداد طلبہ
صنعتی	۱۷۹ء۳ ہزار
زراعتی	۶۱ء۲ ″
نقل و حرکت و ذرائع خط و کتابت (Mean for transport and communication)	۴۶ ″
طبی	۴۶ء۳ ″
دیگر	۴۳ء۱ ″

پہلے پنجسالہ پروگرام کے خاتمے پر (۱۹۳۳ء) ۱۷۰۷۰۰ مختلف فنون کے ماہرین تعلیم حاصل کر کے نکلے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

صنعت اور نقل و حرکت	۶۹۰۰۰
زراعت	۲۸۲۰۰
تعلیم عامہ	۴۰۲۰۰
طب	۲۰۵۰۰
دیگر	۱۲۸۰۰
	۱۷۰۷۰۰

دوسرے پنجسالہ پروگرام کے اختتام پر (۱۹۳۷ء) تقریباً اس سے دُگنے ماہرینِ فن پیدا ہونے کا امکان ہے۔

معاشرتی لحاظ سے ہم طالب علموں کو مندرجۂ ذیل طریقے سے تقسیم کر سکتے ہیں (۱۹۳۴-۳۳ء)

مزدور	۵۳ء۸ فیصدی
مزدوروں کے بچے	۵ء۸ 〃
کسان مزدور	۸ء۳ 〃
کسان جو کھیتوں کے مالک ہیں	۱ء۹ 〃
ملازم	۱۴ء۶ 〃
انجنیئرنگ اور کاریگر	۷ء۶ 〃
دیگر	۶ء۰ 〃

اور مضامین کے لحاظ سے جن مختلف اداروں میں داخل ہُوئے، ان کی تفصیل یہ ہے:-

۱۹۳۴-۳۳ء	صنعتی ادارے	زراعتی	اقتصادی	تعلیمی	طبی
مزدور اور کاریگر	۶۴ء۶	۳۷ء۱۱	۴۶ء۰	۲۹ء۸	۴۰ء۹
کسان	۷ء۸	۳۴ء۴	۹ء۲	۲۴ء۹	۲۱ء۳
ملازمین	۲۴ء۱	۲۷ء۰	۴۵ء۳	۳۴ء۸	۳۸ء۳

اِن مدارس میں عورتوں کا داخلہ بھی بہت بڑھ گیا ہے :-

	۱۹۲۸ء	۱۹۳۳ء
عورتوں کی تعداد	۲۳،۱ فیصدی	۳۳ فیصدی

۱۹۳۳ء میں عورتوں کی تعداد مختلف اعلیٰ (صنعتی) مدارس میں مندرجۂ ذیل طریقے پر تقسیم کی جاسکتی ہے :-

	طبّی	تعلیمی	اقتصادی	صنعتی	زراعتی
عورتوں کی تعداد	۱۷،۴	۴۹،۳	۲۴،۹	۱۹،۸	۳۰،۶ فیصدی

لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہیے۔ روسی مدبّرین نے ملک کی ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے مدارس کو صرف صنعتی رجحان دینے کے بجائے اُن کو تقریبًا بالکل صنعتی مدارس میں تبدیل کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی عام لبرل (Liberal) تعلیم پست ہوگئی۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم کی وفاقی کمیٹی نے ۲۸ فروری ۱۹۳۴ء میں یہ بیان دیا: "ہمارے طالبعلموں کا موجودہ تعلیمی معیار (اگرچہ سیاسی حیثیت سے سرمایہ دار ملکوں کی نسبت بہت بڑھا ہوا ہے)۔ چند کوتاہیوں کی وجہ سے (مثلاً تاریخ، ادبیات اور فنون لطیفہ کے مضامین سے بالکل بے پروائی) بہت کم ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے . . ." اس خرابی کو رفع کرنے کے لیے اُنھوں نے تجویز کی کہ ہر اعلیٰ مدرسے کے ساتھ ایک کلچرل یونیورسٹی (University of culture) ہونی چاہیے، جس میں ادبیات، تاریخ اور فنون لطیفہ وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مضامین کی خواندگی اختیاری ہے اور ہفتے میں دو یا تین گھنٹے سے زیادہ وقت اس پر خرچ نہیں ہوتا۔

(باقی آئندہ)

ہائی اسکولوں میں اُردو معلم کی مشکلات اور اُن کا حل

از

مولانا فرحان صاحب چنگیزی

اُردو کے اس ترقی یافتہ دور میں جدھر دیکھو ہائی اسکولوں کے طلبہ کے متعلق اُردو کی کمزوری کی شکایت ہے اور بجا۔ جب یہ مان لیا جائے کہ واقعی عام طلبہ اُردو میں کمزور ہوتے ہیں، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وُہ ہر مضمون میں کمزور ہوتے ہیں، کیونکہ اگر انھیں اپنی زبان نہیں آتی، تو دوسری زبان صحیح طور پر ہرگز حاصل نہیں کر سکتے۔ اب وُہ عربی فارسی ہو یا انگریزی اور فرانسیسی۔ دوسری زبانوں سے قطع نظر تاریخ، جغرافیہ، حساب غرض کوئی مضمون بھی ایسا نہیں جان سکتے، جیسا حق ہے۔ گو اس پر بحث کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ اہلِ علم کا مسلمہ ہے، لیکن مثال کے طور پر کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں :۔

اُردو نہیں آتی تو :۔

۱۔ ریاضی کا عبارتی سوال سمجھ لینا یقینی نہیں۔ پھر، جو شخص سوال سمجھ ہی نہ سکے گا، وُہ حل کیا کریگا۔

۲۔ ممکن ہے کہ تاریخ جغرافیے میں مؤلف کا مفہوم غلط سمجھے اور غلط یاد کرے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

۳۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح سمجھ کر درست یاد کر لیا ہو، لیکن جواب صحیح ادا نہ کر سکے۔

ع قِسْ اَیُّهَا الْعَقِیْلُ عَلٰی هٰذِهِ الْقِیَاس

ایک طرف تو قوم کا یہ مطالبہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم اپنی زبان میں ہو۔ دوسری طرف اپنی زبان کی یہ حالت ہے۔ آخر اس کا سبب؟ اس کے اسباب بہت ہیں، جو اہلِ علم آئے دن سپردِ قلم فرماتے رہتے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک سبب یہ ہے کہ پرائمری اسکولوں میں طلبہ کی تعلیم تسلی بخش نہیں ہوتی اور ہائی اسکولوں میں سلیبس یہ سمجھ کر بنایا جاتا ہے کہ طلبہ مکمل چار سال پڑھ کر آتے ہیں۔ ادھر بیشتر طلبہ کی تعلیم دو سال کے اندازے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ ابتدائی دو سال کی تعلیم کا خلا، جو درمیان میں رہ جاتا ہے، کبھی برابر نہیں ہوتا اور ہر منزل پر اپنا نمایاں اثر ظاہر کرتا ہے۔

لہٰذا ذیل میں، مدت کے غور و فکر کے بعد ایک مجرّب لائحۂ عمل پیش کیا جاتا ہے، جس میں لوئر اور اپر مڈل یعنی پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے علیحدہ علیحدہ تفصیل وار نہایت مشرح طریق کار پڑھانے لکھانے کا بیان کیا گیا ہے۔ اگر محترم شرکائے کار، یعنی معلمین اُردو نے قبول فرمایا اور ہیڈ ماسٹر صاحبان نے عمل کی اجازت دیدی، تو یقین واثق ہے کہ اُردو میں طلبہ کی عام کمزوری کی شکایت ضرور بالضرور رفع ہو جائیگی اور معلمین و متعلمین دونوں کامران و نیک نام ہونگے۔

یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بادی النظر میں یہ تجویز ناقابلِ عمل معلوم ہوتی ہے، لیکن غور سے ثابت ہو جاتا ہے کہ تمام شرائط پوری ہو جانے پر زنہار ایسا نہیں۔ یہ تجویز، تجویز ہی نہیں، ایک مجرب طریق کار ہے، جو ابتدا میں ضرور تکلیف کا موجب ہوتا ہے، مگر جلد ہی کامیابی مقصود کلفت کو مسرت و راحت میں تبدیل کر دیتی ہے اور کچھ مدت بعد فی الواقع کام میں نہایت سہولت و آسانی ہو جاتی ہے۔

پانچویں جماعت۔ حاشا اس مضمون سے مقصود پرائمری کے اساتذہ کی کوتاہیاں بیان

کرنا نہیں، نہ اس محل پہ نظامِ تعلیم کے نقائص ہی گنوانا منظور ہیں۔ غرض تو صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ پانچویں جماعت میں معلّم اُردو کو کیا کیا دقّتیں پیش آتی ہیں، پرائمری پاس کر لینے والے طلبہ میں کیا کیا کمزوریاں ہوتی ہیں اور اُن کا اثر کہاں تک اور کب تک رہتا ہے اور موجودہ نظامِ تعلیم کو مدِ نظر رکھ کر اُن کا حل کیا ہو سکتا ہے۔

کسی چیز کی کمی کا اندازہ اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے، جبکہ پہلے اس کا صحیح معیار معلوم ہو اور ہم جانتے ہوں کہ ہمیں اس اس چیز کی، اس اس پہلو سے، اس اس قدر ضرورت ہے۔ لہٰذا لازم ہوا کہ پہلے یہ بیان کیا جائے کہ آیا پانچویں میں داخل ہونے والے طلبہ سے ہم کس لیاقت کی توقع رکھتے ہیں۔

اس کے لیے سب سے سہل تدبیر یہ ہے کہ ہم اُس سہ ماہی امتحان کا معیار تحریر کر دیں، جو طلبہ کے داخلے کے صرف تین ماہ بعد ہوتا ہے۔

اس سہ ماہی امتحان میں طلبہ سے املا لکھوایا جاتا ہے، قراءت کرائی جاتی ہے اور ایک تحریری پرچہ ہوتا ہے، جس میں نظم و نثر کا مفہوم سلیس اُردو زبان میں لکھنے کو کہا جاتا ہے، الفاظ کے معنی دریافت کیے جاتے ہیں، اسماے واحد کی جمع اور اس کے برعکس لکھنے کی فرمائش ہوتی ہے اور پھر ایک عرضی یا خط یا دونوں تحریر کرائے جاتے ہیں۔ اکثر اسکولوں میں اس سے زیادہ ہی ہوتا ہے، کم کسی میں بھی نہیں ہوتا، ہم نے کم سے کم پیش کیا ہے۔

اب آپ کو ضرورت کا احساس ہو گیا، تو طلبہ کی حالت سماعت فرمائیے۔ یہ بلا مبالغہ حقیقت ہے کہ فی صدی اسّی الفاظ کا تلفظ غلط کرتے ہیں اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ سہ حرفی متحرک الاوسط کو ساکن الاوسط اور ساکن الاوسط کو متحرک نہ پڑھیں، یعنی، غَلَطْ کو غَلْط اور وَقْتْ کو وَکَتْ نہ کہیں۔ اکثر 'ژ' کو 'ی'، 'غ' کو 'گ'، اور 'خ' کو 'کھ' پڑھتے ہیں۔ لکھنے کی

یہ صورت ہے کہ املا تو کجا، طلبہ ایک پیرا، بلکہ ایک سطر صحیح نقل نہیں کر سکتے۔ اِلَّا مَاشَآءَ اللہ۔ جو اَلنَّادِرُ کَالمَعدُوم کے حکم میں ہیں۔

دیکھو اور لکھو کے اصول کی کارفرمائی کا اثر ہے کہ بچے یہ نہیں جانتے کہ لفظ کہاں سے شروع اور کہاں ختم کیا جائے۔ مثلاً لفظِ 'کا'، کوئی مرکز سے شروع کر کے الف پر ختم کرتا ہے، تو کوئی الف کے انتہا سے آغاز کر کے مرکز کی ابتدا پر اختتام کرتا ہے۔ شوشوں اور دندانوں سے تو کوئی غرض ہی نہیں۔ نیچے اوپر جتنے حرفوں کے نقطے دیدیے، اُتنے ہی ہو گئے۔ مثلاً مُجتنِب لکھنا ہے، تو اس طرح 'مختب' لکھ دیا اور نہیں کو 'نہیں' لکھنا، تو کوئی بات ہی نہیں، نہایت عام ہے۔

اب فرمائیے کہ اس قلیل مدّت میں معلّم کیا کرے۔ تلفظ درست کرائے۔ لکھنا سکھائے۔ املا درست کرائے۔ الفاظ کے معنی یاد کرائے، گرامر پڑھائے۔ نظم پڑھنے کا سلیقہ بتائے یا نظم و نثر کا مفہوم لکھنا۔ جائے غور ہے کہ جو بچّہ نقل نہیں کر سکتا وہ نظم و نثر کا مطلب، خود ساختہ سلیس عبارت میں، کیونکر تحریر کر سکتا ہے۔ پھر مدّت تو ملاحظہ ہو، تین مہینے! جو کہنے کو تو تین ہیں، حقیقۃً زیادہ سے زیادہ دو ہوتے ہیں، اس لیے کہ کم سے کم اپریل کا مہینہ تو داخلے، تقسیم فریق اور سامانِ نوشت و خواند ہی مہیا کرنے میں گزر جاتا ہے۔

مئی میں معلّم دیکھنا شروع کرتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور نیا معلّم تو حقیقت معلوم کر کے دست پاچہ ہو جاتا ہے کہ صرف دو ماہ میں ان نوگرفتار پرندوں کو، جنھوں نے قاعدے قانون سے مانوسی تو کیسی، ابھی اس قفس میں پھڑکنا بھی نہیں چھوڑا، اس قدر کورس کیونکر پورا کرا دیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کی یہ حالت اور تدریس کی یہ کثرت کہ کم سے کم سو صفحے تو صرف کتاب ہی کے پڑھانا ہیں، وُہ بھی اس طرح کہ وُہ ان کا مطلب بیان کر سکیں۔ بیان کرنا بھی زبانی

ہو، تو کسی نہ کسی طرح رٹانے کی سعی کی جائے، یہاں تو لکھنا ہے اور یہ لکھنا قطعاً جانتے ہی نہیں۔

اب ہوتا یہ ہے کہ "نزلہ برعضوِ ضعیف میریزد" ماسٹر صاحب جھنجلا جھنجلا کر اُن ننھی جانوں کو کوٹنا شروع کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وُہ غذا، جو اُن کے حلق سے اترنا ہی محال ہے، کسی نہ کسی طرح نگلوا کر ہضم بھی کرا دیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ طلبہ پریشان معلّم حیران یہ اُن سے متنفر وہ اِن سے بیزار۔ طَلَبُ الْکُلِّ فَوْتُ الْکُل۔ ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ سب کچھ بتا دینے کی سعی میں کچھ بھی نہیں آتا اور لڑکے فیل ہو جاتے ہیں۔ یہ تلخ تجربہ آئندہ کے لیے سبق آموز ہوتا ہے اور معلّم پاس کرانے کے راستے تلاش کرتا ہے یا دو تین سال میں خود پا لیتا ہے یا کسی باراں دیدہ سے اُسی سال حاصل کر لیتا ہے۔

اب اُسے اس سے کچھ بحث نہیں رہتی کہ طلبہ کو کچھ آتا ہے یا نہیں۔ وُہ صرف اس فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح ایک معقول تعداد پاس کرا کے اپنی بلا دوسرے کے سر ڈالے۔ آگے بھی یہی سلسلہ جاری رہتا ہے تا آں کہ بچے دسویں پاس کر کے اسکول چھوڑ دیتے ہیں، مگر ان کی حالت قابلِ رحم ہی رہتی ہے اور اُن طلبہ کے سوا، جنھیں آگے بڑھ کے خود توجہ ہو، نہ تلفظ درست ہوتا ہے، نہ املا اور کتابت کا تو ذکر ہی نہیں۔ ہم کثرت سے بڑے بڑے لائق ایم، اے دیکھتے ہیں، جن کے شوشے اور دندانے ہمیشہ غلط ہی ہوتے ہیں۔

پہلے تو بیچارے اُردو معلّم کی سنتا کون ہے اور کوئی سُنے بھی تو نظامِ تعلیم فوراً بدل جانا ناممکن ہے۔ ادھر پرائمری اسکولوں پر کچھ بس نہیں۔ لہٰذا بحث یہ ہے کہ مذکورۂ بالا موجودہ مشکلات سے کس طرح عہدہ برآ ہونا ممکن ہے اور ممکن ہے بھی یا نہیں؟

ممکن ہے بشرطیکہ:

۱- ہائی اسکولوں کے ہمارے تمام بھائی، یعنی، معلمین اُردو متحد ہو جائیں اور اس کا بار صرف پانچویں جماعت کے اُستاد کے کندھے پر نہ چھوڑیں، بلکہ یہ بوجھ مل کر تھوڑا تھوڑا بانٹ لیں۔

۲- ہیڈ ماسٹر صاحبان اپنے اپنے اسکول میں پانچویں جماعت کے لیے مفصلہٗ تجویز منظور فرمائیں :-

(ا) درسی کتاب کے پورے سال میں زیادہ سے زیادہ سو صفحے پڑھائے جائیں

(ب) پہلی سہ ماہی میں کتاب کا صرف تیس صفحے میں امتحان ہو، وُہ بھی زبانی تحریری امتحان دوسری سہ ماہی سے شروع ہو۔ البتّہ املا پہلی ہی سہ ماہی میں جائے۔

(ج) خوشخطی کا امتحان علٰحدہ ہو، املے میں شامل نہ کیا جائے۔

(د) جو لڑکا املے میں فیل ہو، اُسے فیل سمجھا جائے اور شوشے دندانے کی کمی بیشی جوڑ پیوند کی غلطی ضرور غلطی شمار کی جائے۔

(ہ) گرامر بالکل نہ پڑھائی جائے۔ ہاں، نہایت آسان سادے جملوں میں خالی جگہ پُر کرائی جائے، جس سے واحد و جمع اور مذکّر و مؤنّث میں فعل فاعل کی مطابقت کا احساس پیدا ہو جائے۔ مڈل تک کی گرامر چھٹی، ساتویں اور آٹھویں میں تقسیم کر دی جائے۔

(ز) اورل، یعنی، زبانی امتحان لینے والے کو نمبر دیتے وقت تلفّظ خاص طور پر خیال رکھنا ضروری قرار دیا جائے۔

۳- ہمارے محترم بھائی، یعنی، اُردو کے معلّمینِ جماعتِ پنجم مندرجۂ ذیل طریقِ کار پر

عمل فرمائیں :۔

(ا) سب سے پہلے تمام طلبہ کے نام اپنی نوٹ بک میں درج کر لیجیے، مگر ایک ایک صفحے پر ایک ایک بچّے کا نام ہو تاکہ آئندہ آپ کیفیت درج کرسکیں۔

(ب) طلبہ سے املا لکھوائیے، لیکن خیال رہے کہ بچّہ کوئی ناجائز وسیلہ اختیار نہ کرسکے۔ اس کے لیے جتنی احتیاطیں ضروری ہوں، سب برتیے۔ بہتر ہو کہ طلبا کو کامل طور پر یقین دلا دیجیے کہ وُہ بالکل اطمینان سے بغیر ناجائز وسیلے کے لکھیں، انھیں غلطی پر کسی قسم کی ادنیٰ سرزنش بھی نہیں کی جائیگی۔ احتیاط سے کاپیاں دیکھیے اور طلبہ کی کیفیت درج کر لیجیے۔

(ج) ایک سطر نقل کرائیے اور کہہ دیجیے کہ نہایت اطمینان سے ہاتھ روک کے بہت خوشخط لکھو اور پھر یہ کیفیت بھی درج کر لیجیے۔

(د) ہر لڑکے سے باری باری قراءت کرائیے اور درمیان میں رکنے اٹکنے پر شاباش! گھبراؤ نہیں وغیرہ کہہ کہہ کر حوصلہ افزائی کیجیے غرض اس کے متعلق بھی اطمینان کر کے اپنی رائے درج کر لیجیے۔

(ہ) اب علیٰ قدر مراتب نسبتہً کمزور طلبہ آگے اور ہوشیار پیچھے بٹھا کر ہر ایک کی جگہ معین کر دیجیے۔

(و) لیجیے کام شروع کیجیے۔ کتاب کا ابتدا میں چند روز صرف ایک پیراگراف پڑھائیے اور یاد رہے کہ صفحے ڈیڑھ صفحے سے زیادہ کبھی بھی نہ پڑھائیے۔ طریق یہ ہو کہ پہلے اکثر طلبہ سے قراءت کرائیے۔ ان اکثر میں کمزور سب آجائیں گو ابتدا ہوشیار ہی طلبہ سے کرانا چاہیے۔ تلفظ درست کرائیے۔ اگر کسی بچے سے کوئی لفظ ادا نہ

ہو سکے، تو مسکرا کر محبت سے، اُسے اپنے پاس بلائیے، لفظ کے سلیبل سلیبل الگ الگ کر کے کہلوائیے، اپنے آلاتِ صوت کی طرف توجہ دلائیے اور پانسات دفعہ ادا کرا کے واپس بھیج دیجیے۔ عسیر التلفظ الفاظ کی مہارنی کرائیے۔ غرض ہر طرح اطمینان کر لیجیے کہ قراءت درست ہوگئی۔ اس میں وقت کی کچھ فکر نہ کیجیے۔ کوئی پروا نہیں، اگر ایک سبق دو تین روز میں مکمل ہو۔ آئندہ چل کر اس تاخیر کا بدل ہو جائیگا اور یہ سبق چار سبقوں سے زیادہ اثر کریگا۔ آپ کا مقصود کتاب ختم کرانا نہیں، بلکہ طلبہ میں پڑھنے کا مادہ پیدا کرنا ہے۔

(ز) جب قراءت درست ہو جائے، تو طلبہ سے کہیے کہ اپنی اپنی کتاب میں اُن الفاظ کے نیچے نہایت احتیاط اور صفائی سے پنسل کا خط کھینچ دو، جن کے معنی تمھیں نہ آتے ہوں۔ جب لڑکے یہ کام ختم کر لیں، تو بعض کمزور طلبہ کی کتابیں لے کر دیکھیے اور جہاں شبہ ہو بچے سے اُس لفظ کے معنی پوچھیے۔ اگر نہ بتا سکے، تو نرمی سے کہیے: "بیٹا تمھیں اس لفظ کے معنی نہیں آتے تھے، تو تم نے اس کے نیچے نشان کیوں نہ کیا۔ یہ بات بُری ہے۔ اس سے تمھیں بہت نقصان پہنچیگا اور لفظوں کے معنی نہ معلوم ہو سکیں گے۔" پھر اُس لفظ کے نیچے خط کھنچوا دیجیے۔

(ح) جس وقت یہ کام بھی ہو جائے، تو طلبہ سے کہیے کہ جن الفاظ کے نیچے تم نے خط کھینچا ہے، وُہ نہایت صفائی سے بہت خوشخط، دیکھ دیکھ کر، صحیح اپنی اپنی معنوں کی کاپی پر نقل کر لو۔ جب بچے یہ کام ختم کر لیں، تو حکم دیجیے کہ ایک مرتبہ نہایت احتیاط سے لفظ لفظ کو پھر جانچ لو کہ آیا تم نے صحیح نقل کر لیے ہیں۔ آخر میں آپ خود بعض کمزور طلبہ کی کاپیاں جانچیے اور غلطی ہو، تو نرمی سے سمجھا کر درست کرا دیجیے۔ جب

الفاظ لکھنے کی طرف سے خاطر جمع ہو جائے، تو تختۂ سیاہ پر الفاظ کے معانی خوشخط لکھیے اور طلبہ سے کہیے کہ وہ آپ کی طرف متوجہ رہیں اور لکھنے کا ڈھنگ ذہن نشین کریں۔ سب الفاظ کے معنی لکھ کر بچّوں کو حکم دیجیے کہ اپنی اپنی کاپیوں پر نقل کریں اور آپ اس عرصے میں پھر کر نگرانی کیجیے۔ اگر کوئی بچہ غلط طریقے پر لکھ رہا ہو، تو اُسے روک کر شفقت سے سمجھائیے، لکھ کر دکھائیے اور اس لفظ کو پانسات مرتبہ لکھائیے۔

(ط) اب وقت آیا کہ آپ اس پیرے کا مطلب بتائیں اور مفہوم ذہن نشین کرا کے اکثر طلبہ سے پوچھیں، مگر پھر عرض ہے کہ ان اکثر میں کمزور سب آجائیں، گو ابتدا اس کی بھی ہوشیار ہی طلبہ سے کی جائے، بلکہ پہلے ایک دفعہ خود بیان کیجیے۔ پھر ہوشیار طلبہ سے شروع کر کے علیٰ قدر مراتب اُوپر سے نیچے کو اُترتے جائیے۔ کمزور طلبہ کو جہاں ضرورت ہو، خود یا بھروسے کے قابل ہوشیار لڑکے کے ذریعے مدد دیجیے۔ اسی طرح پیرا پیرا کر کے جب تمام سبق ختم ہو جائے، تو پورے سبق کا مختصر مفہوم اُن کے اپنے الفاظ میں زبانی دریافت کیجیے اور جہاں ضرورت ہو، امداد کیجیے۔ قوت بیان پر زور دیجیے اور مطلب اچھی طرح ذہن نشین کرائیے۔

لیجیے سبق مکمل ہو گیا۔ اس طرح چار پانچ سبق تیار کرانے کے بعد مشکل الفاظ پر نشان لگانے اور اُنھیں لکھنے کا کام گھر کے لیے دیا جائے، لیکن یاد رہے کہ یہ کام نہایت اہم ہے، سخت نگرانی کر کے اس میں طلبہ کو بہت اچھی طرح ٹرینڈ کرنا چاہیے۔ بچّوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے اور معلم کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کام محنت کا ہے مگر محنت کے بغیر قوم تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتی۔ جوں جوں وقت گزریگا، طلبہ میں قوت پیدا ہوتی جائیگی اور معلّم کو سہولت۔

اب سب سے زیادہ اہم کام، یعنی لکھانے کا آئندہ مضمون میں طریق کار پیش کیا جائیگا۔

تعلیم اپنے جدید مفہوم میں

از

محمد شریف صاحب، ہیڈ ماسٹر، مڈل اسکول بلٹر وال

اگر ہم کسی غیر تعلیم یافتہ شخص سے دریافت کریں کہ تم اپنے بیٹے کو مدرسے کیوں بھیج رہے ہو؟ تو بالعموم وہ یہی جواب دیگا کہ پڑھ لکھ کر روزگار پر لگ جائے، یعنی اُسے کوئی نوکری مل جائے، جس سے یہ بآسانی اپنی روزی کما سکے۔ بلاشبہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ احسن طریق سے روزی پیدا کرے، کمائے، خود کھائے اور اپنے اہل و عیال کو کھلائے۔ انسانی زندگی کے مقاصدِ مہمہ میں سے ایک مقصد روزی پیدا کرنا بھی ہے، لیکن بہرحال یہ ایک جزوی مقصد ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل اسی پر منحصر نہیں، کیونکہ فرض کرلو کہ ایک شخص روزی کماتا ہے، اسے روزگار کے وسائل میسر ہیں، اپنی اور اپنے متعلقین کی پرورش کے لیے اسے سلیقہ اور فہم حاصل نہیں۔ اصلاحِ نفس، تہذیبِ منزل اور سیاستِ مدن سے، جو حکما کے نزدیک اہم ضروریاتِ تمدن و معاشرتِ انسانی ہیں، واقف نہیں۔ ان حالات میں باوصف اس کے کہ وہ روزی کما رہا ہے اور احسن طریق سے اپنی اور اپنے متعلقین کی پرورش کر رہا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے انسانی زندگی کے مقاصد کی تکمیل کر لی اُس کی تعلیم ناقص ہے کیونکہ اُس نے صرف جزوی مقصد کی تکمیل کے لیے رہنمائی کی ہے۔ ملک و قوم کے لیے وہ مفید شہری نہیں بنا۔ اخلاقی اعتبار سے اس کی پستیاں بلندیوں سے آشنا نہیں ہوئیں، اس لیے ظاہر ہے کہ روزی کمانا اور اس میں کمال حاصل کر لینا تعلیم کا ایک مقصد تو ضرور ہے، لیکن اُسے کسی صورت میں کافی نہیں کہا جا سکتا۔

اب پرائمری یا مڈل اسکولز کے معلمین سے پوچھو کہ تم کن مقاصد کو مدِّ نظر رکھ کر تعلیم دے رہے ہو اور تعلیم سے تمھاری غرض و غایت اور تمھارا مقصد کیا ہے، تو ان کی اکثریت یہی جواب دے گی کہ ہمارا مقصد امتحان پاس کرانا ہے۔ ہم نے تمام سال لڑکے کو تعلیم دی۔ نصابِ تعلیم پر اُسے عبور ہو گیا اور امتحان میں شامل ہو کر اُس نے اچھے نمبر حاصل کر کے کامیابی حاصل کر لی، تو ہمارا مقصد پورا ہو گیا اور طالب علم اور اُس کے سرپرستوں کے نزدیک بھی ہم کسی نکوہش کے سزاوار نہیں ٹھیرے۔ بلاشبہ تعلیم کا ایک یہ بھی مقصد ہے کہ طلبہ کے دماغ میں ضروری معلومات کا کافی ذخیرہ جمع ہو، وہ مضامینِ تعلیمی سے آشنا ہوں، لیکن اگر اس مقصد کے حصول کے لیے طالب علم نے شب و روز کتب بینی میں صرف کر دیے۔ اس کی نظر کمزور، کمر ٹیڑھی اور دماغ معطل ہو گیا، تو گو زندگی کا ایک مقصد پورا ہو گیا لیکن وہ شخص، جس کے دماغ میں مختلف ممالک کے دریاؤں، خلیجوں، بحیروں، جھیلوں اور شہروں کی فہرستیں محفوظ ہیں، جو تاریخ عالم کے مشہور بادشاہوں کے سنین پیدائش و جلوس اور وفات حفظ کیے ہوئے ہے، جسے سائنس، شہریت اور حفظِ صحت کے اصول و مبادیات ازبر ہیں، لیکن اُس کی اپنی صحت مخدوش ہے، وہ سوسائٹی کے لیے باوجود کافی معلومات رکھنے کے مفید نہیں ہو سکتا۔ اس نے بلاشبہ تعلیم کا ایک مقصد، جو معلمین اور اُس کے سرپرستوں نے تجویز کیا تھا، پورا کر لیا، لیکن یہ بھی ایک جزوی مقصد ہے اور بہر حال ناکافی، کیونکہ ہیئت اجتماعیہ کو ایک ایسے انسائیکلوپیڈیا انسان کی ضرورت نہیں، جس کا دماغ مختلف مضامینِ تعلیمی کی فہرستوں کے حفظ کی وجہ سے معطل اور لاطائل ہو کر رہ گیا ہو۔ بالفاظِ دیگر روزی کمانا بھی ایک ناکافی مقصدِ تعلیم ہے اور معلومات مہیّا کرنا بھی تکمیل نہیں۔ پہلا عامل ہے، لیکن اس میں عقل، سلیقہ اور غور و فکر مفقود۔ دوسرا عالم ہے لیکن ہمیشہ غور و فکر میں مبتلا۔

اس کے عزائم پست، قویٰ کمزور اور ولولے سرد ہیں۔ ایک تیسرا شخص ہے، جو بڑا شہ زور ہے۔ جسمانی اعتبار سے پہلوان ہے، لیکن اپنی جسمانی طاقت کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جنگ و جدال اور فتنہ و فساد کو اپنی زندگی کا مقصد جانتا ہے۔ اس میں انسانیت مفقود ہے، اس لیے اپنے اور ہمارے لیے وہ بھی کسی کام کا نہیں۔ بلاشبہ جسم کی حفاظت و صحت ایک اہم ضرورتِ انسانی ہے، لیکن یہ بھی زندگی کا ایک ناکافی مقصد ہے۔ زندگی اسی سے عبارت نہیں کہ پہلوانی ہو اور آدمیت مفقود۔ سر ہربرٹ سپنسر نے سچ کہا ہے کہ "تعلیم کامل زندگی کی تیاری ہے۔" ملٹن زیادہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ تعلیم "عبارت ہے، اُس قابلیت سے، جس سے انسان اپنی زندگی کے جملہ فرائض متعلقہ امن و جنگ، صداقت، انصاف اور خوش اسلوبی سے ادا کر سکے اور اس کی قوتِ ارادی اس درجہ مستحکم ہو جائے کہ جذباتِ نفسانی کے طوفان اسے متزلزل نہ کر سکیں۔"

بنابریں تعلیم کائناتِ انسانیت کے لیے مایہ ناز اخلاق کا منبع، تمدن و معاشرت کا حل، عقل کا صیقل اور جسم کی صحت کا ذریعہ متصور ہے۔ اس سے ایک انسان کی اخلاقی و ذہنی اور جسمانی تربیت مکمل ہو جاتی ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آج جبکہ موجودہ نظامِ تعلیم کو تقریباً ایک صدی ہو رہی ہے، ہم ان مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر دیانت، صفائی اور راست بازی سے کام لیا جائے، تو ہمیں اعتراف کرنا پڑیگا کہ ہم ابھی تک ان مقاصد کے حصول میں ناکام رہے ہیں۔

کیا یہ صحیح نہیں کہ آج پرائمری، مڈل اور میٹرک کا فارغ التحصیل طالب علم صحیح طور پر خط نہیں لکھ سکتا۔ اپنا مافی الضمیر واضح نہیں کر سکتا۔ رسید نہیں لکھ سکتا۔ دستاویز نہیں پڑھ سکتا۔ محکمۂ نقول سے آئی ہوئی نقل کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں سے

آئے ہوئے سمن وغیرہ کا فہم نہیں رکھتا۔ کھیت کو ناپ کر اس کے چارے کی قیمت نہیں نکال سکتا۔ اسے اپنے لیے کرتے اور پاجامے کا کپڑا لینا ہو، تو بسا اوقات وہ دکان دار کی حساب دانی پر یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ہے ذہنی تربیت اور عقلی کام کا نتیجہ، جس پر نظام و نصابِ تعلیم، انسپکٹر صاحبان اور مدرسین کی تمام تر توجہ صرف ہو رہی ہے اور موجودہ زمانے میں زیادہ زور اسی پر دیا جا رہا ہے کہ تمام مضامینِ تعلیم طلبہ کو اچھی طرح حفظ ہونے چاہییں اور دورِ حاضرہ میں تو عقلی پہلو کو اس درجہ مدِّ نظر رکھا جاتا ہے کہ ہر سبق خواہ وہ کسی مضمون سے متعلق ہو، استدلال اور علّت و معلول کی روشنی میں پڑھایا جاتا ہے اور ہمارے موجودہ طرزِ تعلیم کو بھی فلسفے کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مثلاً مبتدی بچّوں کو اُردو پڑھانے کے طریقوں پر غور کرو۔ آج تک ہم اس کا معقول طرزِ تعلیم نہیں نکال سکے۔ کوئی کہتا ہے: "طریقِ بین و گو اچھا ہے"۔ کوئی طریقِ الصوت کی ثنا خوانی کرنے میں مصروف ہے۔ طریقِ حکایت۔ موگا میتھڈ۔ پروجیکٹ میتھڈ۔ شنید و گفت اور تہجّی وغیرہ کے متعلق اپنے اپنے استدلال پیش کیے جاتے ہیں اور آخر جب کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا، تو کہہ دیتے ہیں کہ تمام طریق استعمال کر لو۔ درحالیکہ جب ایک طریق سے پچاس ساٹھ برس تک تعلیم ہوتی رہی اور اس کی ناکامی کے متعلق کوئی شکایت نہیں پائی گئی، تو اتنی کاوش میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس سے پہلے اس موضوع پر کافی بحث کر چکا ہوں اور میرا وہ مضمون اسی پنجاب ایجوکیشنل جرنل میں شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔ اس کا اعادہ تحصیلِ حاصل کے مترادف ہے۔ میں اس موقع پر آپ کی توجہ کا انعطاف ضمناً ایک اعتراض کی طرف کرانا چاہتا ہوں، جو طریقِ تہجّی پر کیا جاتا ہے کہ جب ہم طالبِ علم کو "اب" پڑھاتے ہیں، تو "الف زبر ب"

"اب" یہ کیوں کہیں۔ جبکہ "اب" بذاتہٖ دو آوازوں کا مجموعہ ہے اور "الف" اکیلا ہی بصورت تجزیہ تین آوازیں رکھتا ہے اور "ب" دو "الف زبر ب" کی جگہ کیوں نہ طالب علم کو "اب" ہی کا تصور دلایا جائے، کیونکہ لفظ "اب" کی آواز مختصر ہے اور اس کے اجزا کی آوازیں زیادہ ہیں۔ پھر یہیں پر اکتفا نہیں۔ بعض تو کہتے ہیں، بھلا "سین" کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ "س" کیوں نہ کہا جائے۔ بعض اصحاب کہتے ہیں، بچہ گھر میں مرکبات بولنا آتا ہے۔ مرکبات ہی پہلے کیوں نہ سکھائے جائیں اور پھر مفردات پر لے آئیں۔ یہ سب استدلال درست، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ان دلائل پر عمل کر کے آج تک کوئی معقول طریق تعلیم کیوں نہیں نکال سکے۔ طریق تہجی سے پڑھانے والوں کو شکایت نہ رہی۔ طالب علم نے نہ کہا کہ میں مرکبات سیکھ کر آیا ہوں۔ اس لیے میری تعلیم ان سے شروع کرو۔ بفرضِ محال اگر مبتدی بچوں کے دماغ میں طریق ہائے تعلیم کے متعلق ایسے شبہات پیدا ہو سکتے ہیں اور ان کی روشنی میں آپ یہ تمام استدلال کر رہے ہیں، تو اگر طالبعلم آپ سے یہ کہدے کہ "الم" کو "ل" کیوں کہتے ہیں اور "نون" کو "ن" کیوں؟ تو آپ کیا جواب دینگے؟ سوائے اس کے کہ ایسا ہی کہتے ہیں اور شروع ہی سے فرض کر لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ جب انسان بولتا ہے، تو آلاتِ صوت کو خاص خاص قسم کی حرکات سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر کام کی بنیاد استدلال اور تجزیہ پر ہے، تو چاہیے کہ بولنا سکھانے سے پہلے انسان کے بچے کو آلاتِ صوت کی حرکات اور ان کے اسباب و علل کا علم ہو، لیکن بغیر اس علم کے وہ بولتا ہے اور بولنا سیکھ جاتا ہے اور بالعموم تمام عمر وہ اس فلسفے پر غور نہیں کرتا کہ بولنے میں زبان اور دیگر عضلات کو کون کون سی اور کس کس قسم کی حرکات کرنی پڑتی ہیں اور ہم کیسے اور کیوں کر بولتے ہیں۔

اس تمام بحث سے مقصود یہ ہے کہ بچوں کی عمر، قوائے دماغی اور استعداد کو پیشِ نظر

رکھتے ہوئے بہت دشوار ہے کہ ان کے ابتدائی طریق تعلیم کی بنیاد فلسفہ و دلائل پر رکھی جائے، بلکہ ابتدا میں ان کی طبعی محرکات سے فائدہ اٹھانا چاہیے کہ انسان کا بچہ فطرۃً نقال واقع ہوا ہے، وہ ابتدا میں کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کے بجائے نقل کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ نہیں پوچھتا کہ منہ سے کیوں کھاتے ہیں، ناک سے کیوں نہیں کھاتے، بلکہ دیکھ کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ بولنا چلنا سیکھ جاتا ہے۔ دوسرے فطرۃً بچے کا حافظہ ابتدا میں زیادہ تیز ہوتا ہے، اس لیے اسے ہر بات کو فلسفے سے سمجھانے کے بجائے یاد کرا دینا آسان ہے اور طبعی محرکات کی روشنی میں طریق تہجی ہی ایک کامیاب طریق ہے۔ گو دلائل کی روشنی میں اس میں ہزار نقص نکالے جائیں، لیکن جہاں تک تجربے اور عمل کا تعلق ہے معلّمین حضرات مجھ سے متفق ہونگے کہ نسبتہً یہ طریق آسان، سہل اور موزوں طریقِ تعلیم ہے۔

جب صرف اس طریقِ تعلیم سے مبتدی بچوں کو پڑھایا جاتا اور دیگر طریقوں کے تجربے پر وقت کا نقصان نہیں کیا جاتا تھا۔ اس وقت تھوڑے ہی عرصے میں پڑھنے کی جو قابلیت پیدا ہو جاتی تھی، آج طالب علم میں اس کا فقدان نظر آ رہا ہے۔

علاوہ ازیں املا اور خوشخطی بھی ان جدید طریقہ ہائے تعلیم سے روز بروز معرض زوال میں ہے، چونکہ حافظے سے کام لینا چھوڑ دیا گیا ہے، اس لیے ہمارے طالب علموں کی قوتِ حفظ کمزور ہو رہی ہے اور آج ہماری اپنی یہ کیفیت ہے کہ بغیر ڈائری پر نوٹ کیے کوئی بات یاد ہی نہیں رکھ سکتے اور اس کے لیے کئی قسم کی ڈائریاں اور نوٹ بکیں رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور قدرت کے اس قانون کو فراموش کر رہے ہیں کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائے، وہ کمزور ہوتی جاتی ہے اور آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہر قوت سے حسبِ استعداد کام لیا جائے کہ شروع میں جب حافظہ تیز ہو اور قوائے

عقلیہ کمزور تو حافظے سے کام لینا چاہیے اور جوانی میں جب قوائے عقلیہ نسبتاً تیز ہو جائیں تو ان کو استعمال کیا جائے۔ آئے دن نئے نئے طریقہ ہائے تعلیم نے ہمارے سادے اور ارزاں طریق تعلیم کو بھی پریشان کر دیا ہے اور میرا یہ کہنا ایک حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اب تک کوئی ایک طریقہ بھی کامیاب نہیں کہا جا سکتا اور معاف فرمائیے اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ محنت اور استقلال سے ایک نکمی بات میں بھی اثر پیدا کیا جا سکتا ہے اور یہی وہ جنس ہے، جس کا ہمارے بازار میں قحط نظر آرہا ہے۔ اس لیے یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ ہم نے کسی ایک طریق کو بھی کامیاب بنانے کی کوشش نہیں کی، ورنہ کیوں آج ہندوستان کے کسی ایک صوبے کے مبتدیوں کے طریقہ ہائے تعلیم میں یکسانیت نہیں پائی جاتی اور ابھی تک یہ خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہوتا چلا جارہا ہے۔

ہماری ذہنی تربیت اور عقلی تعلیم کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم کسی موزوں، مناسب اور معقول طریقِ تعلیم پر کاربند نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہر روز مغرب کے مفکرینِ تعلیم کی کتب پڑھ کر آئے دن نئے نئے طریق نکال رہے ہیں اور تجربے کر رہے ہیں، اگر عمل اور نتیجہ دیکھا جائے، تو اب تک ہم کسی مضمون کے طریقِ تعلیم پر مطمئن نہیں ہو سکے اور اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پرانے طریقِ تعلیم نے، جس قسم کے قابل انسان تھوڑے ہی عرصے میں پیدا کر دیے ہیں، آج باوصف اس کے کہ ذرائع معلومات، ازدیادِ واقفیت، تجربات اور پریس کی وجہ سے بہت سی آسانیاں میسر ہیں، ترقی کی وہ رفتار نہیں رہی۔ دراصل قوتِ غور و فکر، استقلال اور محنت کی کمی کی وجہ سے ہماری ذہنی اور دماغی تعلیم کمزور ہو رہی ہے اور اب بعض مفکرینِ تعلیم تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے ابتدائی مدارس میں معیار اور نصابِ تعلیم طلبہ کی استعداد سے بہت بلند ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ پرائمری کلاسز میں حساب کا جس قدر کورس ہے، طلبہ کے دماغ اس کے فہم سے قاصر ہیں۔ ایک جماعت مثلاً دوم میں ایک سادہ سوال

دے دو، تو بہت سے طالب علم حل کر لیں گے، لیکن اگر روزمرہ سے وابستہ کر کے بیان کر دو، تو ایک چوتھائی طالب علم بھی نہ نکال سکیں گے، یعنی، طالب علم لاکھوں کروڑوں کی ضرب تو دے سکتا ہے، لیکن اگر اس پوچھا جائے کہ تمھارے قمیص کو ½۲ گز کپڑا ½۳ ر گز کا لگا ہے اور ۲ ر درزی کو دیے ہیں، خرچ کتنا ہوا؟ طالب علم حیران و ششدر رہ جائیگا اور اس کا استاد $\frac{5}{2} \times \frac{7}{2} = \frac{35}{4} = 8\frac{3}{4} + 2 = 10\frac{3}{4}$ یعنی، پونے گیارہ آنے کا عمل اپنے ذہن میں کرتا رہیگا۔

اسی طرح دیگر جماعتوں کے طالب علم صرف کتابی تعلیم پر وقت ضائع کر رہے ہیں اور ان کی قابلیت کے فقدان سے بعض حضرات یہ نتیجہ نکال رہے ہیں کہ معیارِ تعلیم بلند ہے، اسے کم کرنا چاہیے، یعنی، جماعت دوم کے حساب کے کورس کو چہارم تک لیجایا جائے اور اسے بافہم بنانے کی کوشش کی جائے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عمل بھی کیا گیا اور کورس کو آسان اور مختصر بھی بنا دیا گیا، تو دس بیس سال کے بعد نتائج کی مایوسی اسی درجے پر آجائیگی، کیونکہ دیکھنے والے نے یہ دیکھ لیا کہ طلبہ تعلیم میں کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں، لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی علت کیا ہے۔ اس کے لیے دیگر حالات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے تھا۔ مثلاً ایک ہی قابلیت کے دو استاد ہیں۔ ان کے زیرِ تعلیم ایک ہی قابلیت کے طلبہ کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک میں بیس طالب علم ہیں، دوسری میں چالیس۔ تو بیس والا نسبتہً بہتر نتائج دکھا سکیگا۔ اِنھیں دونوں اساتذہ کی تنخواہیں کم و بیش ہیں۔ ایک کو چالیس روپے ملتے ہیں اور سوائے اپنی ذات کے اور کسی کی کفالت کا بار نہیں ہے۔ دوسرے کو بیس روپے ملتے ہیں اور وہ دس آدمیوں کے کنبے کے مصارف کی برداشت کا ذمّے دار ہے، تو لازماً دوسرا مدرس تعلیم کی طرف کم توجہ دے سکیگا، کیونکہ اس کی تو نماز بھی "چہ خورد بامدام فرزندم" کی خیالی رٹ ہو کر رہ جائیگی۔ علیٰ ہذالقیاس ایک اُستاد محنتی ہے، دوسرا غافل۔ ایک کے پاس ایسے طلبہ کی کثرت ہے، جن کے ماحول تعلیمی ہیں۔ دوسرے

کے پاس ایسے طلبہ زیادہ تعداد میں ہیں، جن کی تربیت جاہلانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ غرضکہ موجودہ تعلیمی زوال کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لینا کہ معیارِ تعلیم بلند ہے، نصابِ تعلیم استعداد طلبہ کے مطابق نہیں، اس لیے اسے اور کم اور پست کر دینا تعلیم کو اور زیادہ کمزور اور بے اثر بنا دینا۔ اس کے بجائے کوشش کرنا ہوگی کہ علاقے کے ماحول کے رنگ میں موجودہ تعلیم کو رنگین کر دیا جائے۔ عام ضروریاتِ روزمرّہ جن سے ایک طالب علم اور عام انسانوں کو تعلق اور معاملہ پڑتا ہے نصابِ تعلیم اور طریقہ ہائے تعلیم کو اس کے مطابق بنایا جائے۔ ہماری موجودہ تعلیم میں یہ سب سے بڑا نقص ہے کہ وُہ یکسر کتابی ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہمارا فارغ التحصیل طالب علم ایک علمی انسان تو کہلا سکتا ہے، جسے تعلیم پر عبور حاصل ہو، تو تعجب نہیں، لیکن بحیثیت ایک عملی انسان کے وُہ بہت کم کامیاب ہوتا ہے، کیونکہ ہمارا نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم عملی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں بیکاری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ جب تک عملی طور پر ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ہمارے طلبہ میں پیدا نہ ہوگی، ان کی تعلیم عمل کے رنگ میں رنگین نہ ہوگی، وہ کام کرنے کو ذلّت سمجھیں گے اس وقت تک ہم تعلیم یافتہ ہو کر جاہلوں سے بدتر رہیں گے، کیا کبھی آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ ملک میں بیکاری کیوں بڑھ رہی ہے۔ اس کی نشو و نما کا آغاز بھی ہمارے مدارس ہی سے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے تمام افراد کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک کماتا ہے اور پانچ کھاتے ہیں۔ وُہ اس طرح کہ اسکولوں کا موجودہ طالب علم اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو ذلّت سمجھ رہا ہے۔ نصابِ تعلیم اس قسم کا مرتب ہو چکا ہے، جو اعضا اور قوائے جسمانی پر بے جا بار ہو کر رہ گیا ہے۔ اوّل تو اب اپنی خوشی سے لوگ اپنے بچّوں کو مدرسے بھیجتے ہی نہیں، لیکن اگر وُہ ایسا کرتے بھی ہیں، تو آپ کسی شخص سے اس کے لڑکے کی تعلیمی کمزوری کی شکایت کر کے دیکھ لیجیے۔ وُہ آپ کو جواب دیگا، ہم تو خارج از اوقاتِ مدرسہ اسے کوئی کام نہیں بتاتے۔ بالفاظِ

دیگر بچے کو اپاہج، ناکارہ اور بزدل بنانے میں اس کے سرپرست اور معلمین میں ایک ایسا اشتراکِ عمل پایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ ہندوستان آئندہ کی نسل کے لیے بے حد خطرناک ہے اور اگر ہمارے طلبہ کے سرپرست انھیں کام بتائیں، تو وہ بالعموم یہی کہتے ہیں کہ ہم اسکول کے طالب علم ہیں۔ اگر کام کرانا تھا، تو اسکول میں کیوں داخل کرایا۔ برخلاف اس کے ترقی یافتہ ممالک میں حالات اس کے برعکس ہیں۔

آج امریکہ بلحاظ تموّل، ایجادات، ترقی اور تعلیم کے تمام ممالک عالم سے سبقت لے گیا ہے۔ مصروفیتِ کار کا یہ عالم ہے کہ وہاں آپ کو ایک متنفس بھی ایسا نظر نہ آئیگا، جو اپنے اوقات کو بے کار صرف کر رہا ہو۔ وہاں اس سے زیادہ معیوب اور ندامت خیز حرکت کوئی نہیں ہوسکتی کہ ایک شخص اپنی خوراک اور ضروریات کا بار دوسرے پر ڈالے۔ وہاں ہر شخص اپنے فرائض کو محسوس کرتا اور اپنی فردیت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہاں بڑے سے بڑے آدمی کا لڑکا باوصف اپنے باپ کے تموّل اور ذاتی وجاہت کے اپنے اخراجات کو خود پیدا کرتا ہے، چنانچہ وہاں کے طالب علم خارج از اوقاتِ مدرسہ معمولی ملازموں کی طرح کام کر کے مزدوری حاصل کرتے ہیں۔

فراغت کے اوقات

از

میرزا مقبول بیگ صاحب بدخشانی، بی اے، ایس اے وی

دنیا میں صنعت و حرفت عروج و ترقی کی طرف تیز تیز قدم اُٹھا رہی ہے۔ محنت میں کفایت پیدا کرنے والی نئی نئی مشینیں اور کلیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ اشیا وسیع پیمانے پر تیار کی جا رہی ہیں۔ اِس لیے اب ہمارے پیشِ نظر یہ سوال ہے کہ جو تھوڑا بہت وقت ہماری فراغت کا ہوتا ہے، اس کو کیونکر مصرف میں لایا جائے۔ یہ سوال آئے دن بہت اہم ہوتا جا رہا ہے۔ جوں جوں مشین کی قوتوں اور حرکتوں میں اضافہ ہوتا ہے، اس سوال کی اہمیت بہت بڑھتی جاتی ہے۔ گھر کا کام کاج کرنے والی محترم خاتون امور خانہ داری میں مشین کو خادمہ سے زیادہ مدد و معاون سمجھتی ہے۔ گوشت اور پوست کی تربیت یافتہ خادمہ سے لوہے کی بنی ہوئی خادمہ کو زیادہ مخلص، زیادہ کارآمد اور زیادہ معتمد خیال کرتی ہے۔ خادمہ صبح و شام کا اکثر و بیشتر حصّہ چکّی پیسے جب کہیں ایک گھر کی روٹی پکتی ہے، لیکن اگر یہی کام ایک مشین کے سپرد کیا جائے، تو چند لمحے کی حرکت سے اتنا آٹا پس جاتا ہے کہ سارے کنبے کو تیس دن کے لیے کافی ہو۔ کپڑوں کی سلائی کو لیجیے، یہ گھر بھر کی کتنی بڑی ضرورت ہے۔ کون ہے، جو اس سے بے نیاز ہو، لیکن مشین کے ذریعے سارے قبیلے کے کپڑے چند گھنٹے میں سی لیے جاتے ہیں۔ خوش قطع بھی ہوتے ہیں اور محنت بھی کم لگتی ہے۔ یہی کام اگر ہاتھ سے شروع کریں، تو ہفتوں میں بھی نہیں نبٹتا۔ یہ سلائی تکمیل پا لے، تو سعی و احتیاط کے باوجود ایسی نہیں ہوتی کہ نظر میں جچے۔ محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے —— گویا مشین ایک ایسی ایجاد ہے، جس سے ہم کام لیں، تو بہت سا وقت اور بہت سی محنت بچ جاتی ہے اور کام بھی اچھا ہوتا ہے۔

اب ہمارے پیشِ نظر یہ مسئلہ ہے کہ اس بچے ہوئے وقت اور اس بچی ہوئی محنت کو ٹھکانے کیونکر لگایا جائے۔ اس سے زیادہ مفید اور زیادہ یقینی کام کیسے لیے جائیں۔ اس مسئلے کا حل عصر حاضر کے اُستاد کو پیش کرنا ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر اُستاد ہی کو روشنی ڈالنا ہے اور اسی کو ایسی تجویزیں پیش کرنا ہیں کہ اس وقت اور محنت کی تنظیم کس طور پر کی جائے اور ان سے بہتر کام کیسے لیے جائیں۔ گویا ہمارے اُستاد کو ایسا لائحۂ عمل پیش کرنا ہے، جو ہمارے جسم و افکار کو زیادہ مفید کاموں میں لگا سکے۔

ہندوستان میں اوسط درجے کے بچّے کی زندگی حد درجہ مایوس کُن ہے۔ بہت دیر میں بستر سے اُٹھتا ہے۔ آنکھیں مَلتے مَلتے ناشتے کے ضروری فرض کو انجام دیتا ہے اور مدرسے پہنچ جاتا ہے۔ تدریس کا وقت جوں توں ختم کر کے واپس ہولیتا ہے۔ گھر پہنچ کر کچھ مدرسے کا کام بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ شہر کی شاہراہوں اور گاؤں کی گلیوں میں ہمجولیوں کے ساتھ چل پھر کر وقت گزار دیتا ہے۔ سُست ہے، عافیت کوش ہے، محنت سے جی چُراتا ہے۔ آوارگی سے مانوس ہے۔ یہ صرف اس لیے کہ اس کے وقت کا بیشتر حصّہ بدقسمتی سے "فارغ" سمجھا جاتا ہے۔ فارغ وقت سے ہماری مراد اس وقت سے ہے، جب اس کی مسلسل مصروفیت کے لیے کوئی مفید شغل نہ ہو۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ طالب علم کی یہ تضیع اوقات، ہمارے تعلیمی لائحۂ عمل اور طریقِ تعلیم کی راہ میں بہت بڑی روک ہے۔ وقت اس بات کا مقتضی ہے کہ ماہرینِ تعلیم اور ہمارے اُستاد یک جہتی سے اس طرف متوجہ ہوں اور تضیع اوقات کے سدِّباب کے لیے وسائل سوچیں۔

بڑی مصیبت ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے مدارس میں تعلیمی نصاب کے ماسوا بہت تھوڑے مشاغل ایسے ہیں، جن میں حصّہ لے کر طلبہ اپنی حیات و حرکت کو منظم کر سکیں۔ بیشتر مدارس آپ کو

ایسے بھی نظر آئیں گے، جو صرف تجارتی اغراض کی وجہ سے قائم ہیں، اس لیے ایک اوسط درجے کے طالب علم کی ذات اور شخصیت کی نشو و ارتقا صحیح طور پر نہیں ہو سکتی۔ یہی بچے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ بچے جوان ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔ ان کے شعور کے زاویے تنگ، ان کے نظریے محدود ہوتے ہیں۔ یہ ایسی تلخ حقیقت ہے، جس سے کوئی سمجھدار انکار نہیں کر سکتا۔

فراغت کے وقتوں کا اگر کوئی مصرف نہ ہو، تو اس سے متعدد خطرات پیدا ہو سکتے ہیں ان کو دُور کرنے کے لیے ایک ہوشمند اُستاد نہ صرف یہ کہ طلبہ کے دلوں میں کھیل اور تفریح کا شوق اور کام کی باقاعدگی کا احساس پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شخصی اور جماعتی شغل کا ذوق بھی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً مختلف ممالک کے مختلف عہد کے ٹکٹ جمع کرنا، سکے اکھٹا کرنا وغیرہ ایسے مشاغل ہیں، جن کا ہمارے مروجہ تعلیمی نصاب کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں، لیکن ان مشاغل کا ذوق اگر بچوں کے دلوں میں پیدا کیا جائے، تو اس سے تاریخی اور علمی اعتبار سے طالب علم بہت استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اُستاد بچوں کو ایسے اسباب بہم پہنچاتا ہے، جس سے وہ مختلف قسم کی ثانوی صنعتوں میں حصّہ لے سکیں۔

مدارس کے روزمرہ میں ایسا کوئی انتظام نہیں، جس کے ذریعے بچوں میں جستجو اور تحقیق کا مادہ پیدا کر سکیں۔ ایک مستعد اُستاد مختلف قسم کی علمی اور عملی مجلسیں قائم کر کے اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ ایسی مجلسیں رشد و ہدایت کا موجب بھی ہوتی ہیں اور شغل و تفریح کا سبب بھی۔ اس لیے طلبہ ان میں بڑی سرگرمی اور انہماک سے حصّہ لیتے ہیں۔ بحرِ منجمد شمالی کے برفستان کے سفر میں کپتان سکاٹ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ فراغت کے اوقات کا ضرور کوئی اچھا مصرف ہونا چاہیے۔ اپنے بچے کی تعلیم کا اُسے خیال آیا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے "اگر ہو سکے، تو بچے کے دل میں قدرتی تاریخ کا ذوق پیدا کیجیے۔ یہ کھیل تفریح سے زیادہ کارآمد ہے،

بعض مدارس میں رائج بھی ہے۔"

ہمارے مدارس میں طالب علم، جو کچھ حاصل کرتا ہے، وہ اس سے کہیں کم ہوتا ہے، جو اُسے درحقیقت حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس وہ بہت سی ایسی باتیں بھی سیکھ لیتا ہے، جن کی عملی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ بچے شغل و تفریح کے کام میں آزادانہ طور پر وقت صرف کرتے ہیں۔ بیشتر طالب علم شغل میں بھی کچھ سیکھ لیتے ہیں، جو وہ اپنی جماعت کے کام کاج میں سیکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مشغلوں میں حصّہ لینے سے طالب علم کے رجحانِ طبع کا پتہ چل جاتا ہے، جس کا اس کے بغیر معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو اپنی راہِ مقصود اپنے سامنے نظر آنے لگتی ہے، جس پر وُہ کامیابی کے ساتھ گامزن ہو جاتا ہے۔ اکثر ہم نے دیکھا ہے کہ بعض بچّوں کا رجحان علم طب کی طرف ہوتا ہے، لیکن ان سے وکالت کا نصاب ختم کرا دیا جاتا ہے۔ بعض کا رجحان انجنیرنگ کی طرف ہوتا ہے، لیکن اُنھیں محکمۂ تعلیم میں داخل کر دیا جاتا ہے ـــــ ایسے حالات میں بچّوں کی کامیابی معلوم۔

ہمیں ہر ممکن سعی کرنا چاہیے کہ طالب علم کے ذوق کا زاویہ وسیع ہو۔ ہمارے طالب علم کو یہ شوق تو ہوتا ہے کہ شب و روز کی اندھا دھند محنت سے تعلیمی وظیفے حاصل کر لیں یا کامیاب ہونے کے قابل ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ امتحان میں کامیاب ہونے کا مقصد کم و بیش پورا ہوتا رہتا ہے، لیکن صرف امتحان میں کامیاب ہو جانا تعلیمی زندگی کا مقصد نہیں۔ مقصد اس کے علاوہ اور بھی ہوتا ہے، جس سے وُہ بہت دُور جا پڑتے ہیں۔ اگر فارغ اوقات کے مشاغل کا شوق پیدا کر دیا جائے، تو وُہ کمی بھی پوری کی جا سکتی ہے۔

ماہرینِ تعلیم کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ فراغت کے اوقات کا صحیح استعمال بتانا اُستاد کے اہم ترین فرائض میں ہے۔ اُستاد اگر اس فرض کو پوری طرح سے انجام دے سکے، تو

اس کا اثر، جو طالب علم کی شخصیت پر پڑتا ہے، ظاہر اور واضح ہے، لیکن اس کی زندگی پر اس کا بالواسطہ اثر اس سے بھی زیادہ اور خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ فراغت کے مشاغل انسان کو زیادہ بہتر انسان اور شہری کو زیادہ کامیاب شہری بنا دیتے ہیں۔ یہی نہیں کہ ان سے انسان زیادہ چابکدست ہو جاتا ہے اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی ضروریات آپ پوری کرے، بلکہ ان سے کام کرنے کی قوت اور انفرادیت حرکت میں آتی ہے اور اس طرح انسان کی شخصیت کامل، جو اَن گنت پہلوؤں کو حاوی ہوتی ہے، اچھی طرح سے تربیت اور پرورش پاتی ہے اور یہی صحیح روح ہے ہماری تعلیم کی۔ اس میں کیا شک ہے کہ تعلیم کتابوں کو پڑھ لینے ہی کا نام نہیں، بلکہ اس کا تعلق انسانی نشو و ارتقا سے ہے۔ تعلیم کا اوّلین مقصد زندگی کی تربیت ہے۔ ہمیں ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں کے اچھے سے اچھے مدرسے کی تعلیم بھی حقیقی مقصد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

عصرِ حاضر کی انسانی زندگی، دورِ سابق کی انسانی زندگی سے زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا مدرسہ اور اُستاد، طالب علم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ کریں۔ اب بجائے اس کے کہ ایک طالب علم کو اس کے ذہنی اور جسمانی نشو و ارتقا کے لیے کتابیں اور کھیل مہیا کر دیے جائیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کی فطرت کے متعلق غور کیا جائے۔ اس کی خواہش اور ذوق کو مقدم سمجھا جائے اور ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ بچوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کا صحیح استعمال اور درست تربیت ہو سکے، جس کو اب تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

اعلیٰ درجے کے مدرسے میں یہی نہیں کہ اچھے اچھے کمرے اور عمدہ سا کھیل کا میدان ہو، بلکہ اس مدرسے میں سائنس کے عمل و تجربے کے لیے کیمیاوی معمل، کارگاہیں، جمنیزیم، تالاب،

لیکچر ہال، میوزیم، آرٹ اور موسیقی کے کمرے ہونا چاہییں اور ان کے علاوہ دیگر ایسی اشیا بھی، جو مدرسے میں تعلیم پانے والے اور بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبہ کے لیے ضروری ہوں، ستم یہ ہے کہ جہاں کہیں یہ چیزیں میسّر ہیں، ان سے پورا پورا استفادہ نہیں کیا جاتا۔

ہندوستان جیسے مفلس ملک میں فراغت کے اوقات کو مصروف رکھنے کے لیے ایک بہت عمدہ اور کامیاب طریق یہ ہے کہ مفید گھریلو دستکاریاں سیکھی جائیں۔ مثلاً شہتوت کی شاخوں سے ٹوکریاں تیار کرنا۔ بچّوں کے لیے سیاہی اور کھلونے وغیرہ بنانا، جلدیں باندھنا وغیرہم۔ طالبات کے لیے رومال اور نکٹائیاں وغیرہ بنانا، کشیدہ کاری، رفوگری، کھجور کے پتّوں کی ٹوکریاں اور پنکھے وغیرہ بنانا، بڑیاں توڑنا، ازاربند بننا وغیرہم۔ ایسی دستکاریاں طالب علم کی مالی ضرورتوں کو بھی پورا کریںگی اور اس کے فراغت کے وقتوں کا بہترین استعمال ہوسکیگا۔ شہری طلبا کی نسبت دیہات کے طلبہ کا وقت زیادہ فارغ ہوتا ہے، ان کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی دستکاریاں سیکھنا اور بھی زیادہ مفید ہے۔ وہ طلبہ جن کے ہاں حالات زیادہ مساعد ہوں، پھل دار درختوں کی نگرانی، شہد کی مکھیوں کی پرورش، ریشم کے کیڑوں کی نگہداشت، مرغی خانہ اور باغبانی کے فن سیکھ سکتے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے زمینداروں کے بچّوں کے لیے اجناس کی حفاظت اور کاشتکاری کے جدید طریقوں کا علم بھی بہت مفید ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم ختم ہوئی، تو ضرورت وقت کے موافق چند ایسے مشاغل بہت سے مدارس میں داخل کیے گئے، جن سے تعلیم کو یقیناً بہت فائدہ ہوا۔ اسکاؤٹنگ کی تحریک اپنی نوعیت میں بڑی اہم ہے اور فراغت کے اوقات میں طلبہ کو مصروف رکھنے کا بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہ جدید علمی تحریک یقیناً ہماری سعی و جہد کی مستحق ہے۔ یہ تحریک بنفسِ خود بھی بہت مفید ہے اور اس سے طلبہ کے متعدد مفاد بھی وابستہ ہیں۔ اسکاؤٹنگ کی بنیاد ایسے اصول اخلاق پر رکھی گئی ہے، جو ہمیں ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد کی

خاطر بُھلا دینے کا درس دیتا ہے۔ ہماری موجودہ تعلیم، جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، محض علم
میں ہماری دماغی صلاحیتوں کو منہمک رکھتی ہے۔ اخلاق کی تہذیب، حسیات کی تربیت،
فنون و صنائع کی ترویج کا ہماری تعلیم میں کوئی حصہ نہیں۔ انسان کی یہ بہت بڑی ضرورت
اسکاؤٹنگ کے ذریعے پوری کر دی گئی ہیں۔ یہ تحریک سرتاسر جسم، دماغ اور اخلاق کی تر
کی تحریک ہے۔ اس سے جسم بنتے ہیں، دماغ بنتے ہیں، سیرتیں بنتی ہیں۔ ہمارے یہی بچے
ہونگے۔ اس لیے اگر ان کی تربیت اچھی ہوئی، تو یقیناً یہ تربیت ملک و قوم کی صلاح و فلا
کا موجب ہوگی۔ یہ وطنی تحریک ہے، اس کو ہم خدمت وطن کا نام بھی دے سکتے ہیں اور
نوع انسان کے لیے یقیناً بہت مفید ہے۔ اس لحاظ سے اسکاؤٹنگ کو ہمارے مدرسے میں بہ
اہم جگہ حاصل ہے۔ یہ مشغلہ گھر سے باہر انجام پذیر ہوتا ہے۔ اب ہم ایسے مشاغل کا ذکر کرتے ہ
جو گھر کے اندر یا اسکول کے کمروں میں ہوتے ہیں۔ یہ بھی طلبا کے لیے بہت مفید ہیں۔ مثلاً اسکو
کے علمی اور ادبی رسالے میں مضمون دینا، رسالے کی ترتیب و اشاعت، جمناسٹک، کلب ک
ممبری جس میں گتکا، مکّہ بازی اور پٹے بازی وغیرہ سکھائے جاتے ہوں۔ لکچر دینا، گانے کی مجلس
میں شرکت کرنا، کیمرے سے تصویریں بنانا، رنگ بھرنا، شعر کہنا، نقاشی وغیرہ فنون مدرسے
کے طلبہ کے لیے بیحد مفید ہیں۔ مدارس میں، جو مشاغل جاری ہیں، ان میں بھی انفرادی اور جماعتی
حیثیت سے حصہ لیا جا سکتا ہے۔ بیشتر مدارس میں مباحثے کی مجلسیں قائم ہیں۔ ان کے زیر اہتمام
سال بھر، مختلف وقتوں میں جلسے ہوتے رہتے ہیں، جن میں علمی و ادبی مناظرے ہوتے ہیں۔ ادبی
بزمیں قائم ہیں، جہاں وقتاً فوقتاً مشاعرے ہوتے ہیں۔ پیپر پڑھے جاتے ہیں۔ کتابوں کے حسن و
قبح پر بحث ہوتی ہے اور بہت سی چھپی ہوئی ادبی حقیقتیں منصۂ شہود پر آ جاتی ہیں۔ اچھے اچھے
ادیبوں کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کی ترویج و ترقی کے لیے سوسائٹیاں

قائم ہیں۔ ان میں علم طبیعی سے تعلق رکھنے والی بھی ہیں اور علم النفس سے تعلق رکھنے والی بھی۔ اقتصادیات سے بحث کرنے والی بھی ہیں اور فلکیات سے بحث کرنے والی بھی۔ کہیں کہیں موسیقی اور ڈرامے کی سبھائیں بھی قائم ہیں۔

ان کے علاوہ بہت سی مختلف قسم کی دستکاریاں ہیں، جو طلبہ کے لیے نہایت ہی گراں قدر مصروفیتیں ہیں، اس لیے فوری توجہ کی محتاج ہیں۔ ان صنعتوں میں بعض ایسی ہیں جن کے لیے طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے لیے قلیل عرصہ کافی ہوتا ہے۔ ڈلیاں وغیرہ بنانے کا کام، لکڑی کا کام، دھات کی کھدائی چمڑے کا کام۔ برتن سازی، جلد سازی، صابون سازی وغیرہ مشاغل ایسے ہیں کہ ان سے آمدنی بھی اچھی خاصی ہوسکتی ہے اور فراغت کا وقت بھی مفید اور اصلاحی کاموں میں بسر کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا علم ہو، عمل کی قوت ہو، نظام اور رہنمائی کی استطاعت ہو اور جگہ کی گنجائش، کیونکہ بعض صنعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کے لیے ایسے کمروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو صرف انھیں صنعتوں کے لیے مخصوص ہوں۔ ہمارے مدارس میں ڈرائنگ کا کام، ماڈل سازی، شخصی اور جماعتی موسیقی، آرکیسٹرا کی مشق اور بینڈ باجہ رائج ہو رہے ہیں۔ دیہاتی رقص ہندوستان کے بعض حصّوں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ جاری کیا جارہا ہے۔ حال ہی میں انڈین سول سروس کے ایک ممتاز رکن نے، جو بنگال کیشن کے مندوبین میں سے ہیں، دیہاتی رقص کی ہمّت افزائی کی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رقص بنگال کی نوجوان خواتین کے لیے بالعموم اور مدرسے کی طالبات کے لیے بالخصوص فارغ اوقات کا بہترین مشغلہ ہیں۔

یہاں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام مشاغل کے لیے وقت کہاں سے آئیگا اور فارغ اوقات کی تنظیم کیونکر ہوگی؟ جواب سادہ ہے۔ صبح کا شگفتہ اور تازہ وقت مدرسے کے

کام کے لیے وقف کر دیا جائے۔ پچھلے پہر کا وقت کھیل تفریح اور دوسرے تمام مشاغل کے
کھیل کا بدل، گھر سے باہر کے مشاغل کو قرار دیا جائے۔ طلبا کو اختیار ہونا چاہیے کہ ان میں جو
اپنے لیے انتخاب کر لیں۔ ان کھلاڑیوں کے لیے کھیل لازمی قرار دیا جائے، جو کسی صنعتی یا فنی
پسند نہیں کرتے، مختلف مشاغل اور مجلسوں کے لیے اوقات کا تعین کر دیا جائے، جن کی پابندی
کے لیے لازمی ہو۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مشاغل ہماری تعلیم کا نہایت ضروری حصّہ ہیں۔ ان کو
کے اختیار میں نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر طالب علم کے فراغت کے اوقات کو پورا پورا مصرو
نہ کیا جائیگا، تو وہ ان سے اپنے منشا کے مطابق کام لیگا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے مشاغ
کام غیر مفید اور مضرت رساں ہوں۔

گراموفون، تعلیمی فلمیں اور ریڈیو ہندوستانی حالات میں طالب علم کے لیے بہت ضرو
اور مفید مشاغل ہیں۔ یورپ اور اس سے بڑھ کر امریکہ میں تعلیم و تدریس نے جو ترقی کی ہے، اا
میں ہر سہ ایجاد کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ گراموفون کے ریکارڈ زبان سیکھنے میں مدد دے سکتے ہیں
انگریزی ہی کو لیجیے اس کا لکھنا اور بولنا ہمارے لیے ضروریاتِ زندگی سے ہو گیا ہے، لیکن اس
کے سیکھنے میں بڑی دقّت تلفّظ کی ہے، جو کسی حد تک انگریزی کے ریکارڈوں کے ذریعے آسان
ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی ریکارڈ بھی اگر علم صوت کے اصول پر تیار کیے جائیں، تو اُردو اور
دیگر زبانوں کا تلفظ درست کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

موجودہ وقت میں تعلیم ایک مستقل آرٹ کے درجے کو پہنچ چکی ہے، اس کو عروج و ترقی
کی منزل پر پہنچانے میں تعلیمی فلموں کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، علم النفس، حیاتیات اور
علم الاصنام کی تدریس کو تعلیمی فلمیں بہت کامیاب بنا سکتی ہیں۔

ریڈیو بیسویں صدی کی ایک انقلاب آفریں ایجاد ہے۔ ہر صبح وشام دہلی، پشاور، کلکتہ، بمبئی، ڈیرہ دون اور لاہور سے نہایت اعلیٰ موسیقی کا پروگرام براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے، جس سے بچوں میں فن لطیف کی قوت بیدار ہوتی ہے۔ ہمارے طلبا میں اخبار کے مطالعے کا شوق افسوسناک حد تک کم ہے، جس سے وہ ملکی سیاسیات سے بالکل کورے رہتے ہیں، دوسرے ممالک کا ذکر بجائے خود، انھیں یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ خود ان کے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ریڈیو کے ذریعے صبح وشام کی ملکی اور سمندر پار کی خبریں نہایت شستہ اور آسان ہندوستانی میں براڈ کاسٹ کی جاتی ہیں۔ یہ خبریں سُن کر بچوں کو سیاست سے لگاؤ ہو جاتا ہے اور معلومات بھی بہم پہنچتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے بچوں کا تلفظ بھی درست کیا جا سکتا ہے۔ اب تو ریڈیو ہواؤں کی لہروں کے ذریعے فصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکیگی اور کسان کی پیداوار میں تگنا چوگنا اضافہ ہو سکیگا۔ دیہات سدھار کی سکیم کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت کی طرف سے بعض بعض دیہات میں ریڈیو کی مشینیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ اس سے دیہات کے طالب علموں کے لیے بھی آسانی ہو گئی ہے۔ اُستاد کو اپنا فرض جاننا چاہیے کہ طلبا کو ریڈیو سنائے۔ اوسط درجے کا ریڈیو سیٹ اڑھائی تین سو روپے میں مل جاتا ہے اور اگر دو اڑھائی گھنٹے روزانہ ریڈیو کا پروگرام سنایا جائے، تو دو تین روپے ماہوار سے زائد خرچ نہیں آتا۔ اچھے گراموفون اور فلموں پر زیادہ خرچ ہوتا ہے، لیکن جہاں تک ریڈیو کا تعلق ہے، وہ ہمارے فراغت کے اوقات کے لیے ارزاں قیمت کا نہایت ہی مفید اور دلنواز مشغلہ ہے۔

مقاصدِ تعلیم

از

سیّد اختر احسن صاحب، بی اے، بی ٹی،

پہلا انسان، جس نے دنیا میں تعلیم کی داغ بیل ڈالی اور جس نے پہلے پہل دُنیا کے سامنے باقاعدہ نظامِ تعلیم پیش کیا، حکیم افلاطون تھا۔ گو اُس نے بہت کچھ سقراط سے سیکھا، مگر دراصل بانیِ درس و تدریس وہی ہُوا ہے۔ اس کے ذیل کے الفاظ تعلیم کی نسبت ملاحظہ ہوں:-

"تعلیم کا مدعا نیکی کی طرف پہنچانا ہے، جو ہر فردِ بشر کی بھلائی اور سلطنت کی سلامتی کے لیے لازمی ہے۔ اس کا مقصدِ عظیم یہ ہے کہ انسان اپنے خالقِ حقیقی کے ساتھ اپنا تعلق سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ اس کے ذریعے سے دنیا کی مُدنی زندگی میں توازن قائم ہو جائے۔"

آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ سماج کا ہر رکن بغیر کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے خوشی اور اطمینانِ قلب حاصل کر سکے۔ اُس کے بعد ارسطو اس نظریے پر قائم رہا۔

پہلی صدی عیسوی میں کوینٹیلان اپنے زمانے کا اُستاد بلکہ اُستادِ اوّل رہا ہے۔ اُس کے خیال میں تعلیم کا مقصد صرف اخلاق کا درست رکھنا ہے۔ یہی وہ ہستی تھی، جس نے سب سے اوّل اہلِ عالم پر واضح کیا کہ بچّوں کو جماعت میں تعلیم دی جائے۔ شرط یہ لگائی کہ مدرس سراپا نیکی اور مجسّم فرشتہ ہو۔ سولھویں صدی عیسوی میں عیسائی مبلغین سرچشمۂ علم و ہنر تھے۔ گو اُن کا عندیہ دنیا میں وس احکامِ ربّانی پھیلانا تھا، لیکن اگر ہم اُن کے سب سے بڑے عالم لیولا کی پیتر پر نظر ڈالیں، تو پتہ چلیگا کہ وہ تعلیم کے ذریعے سے انسان کو مکمل طور پر فرمانبردار اور نیک کردار

بناکر خدا سے ملانا چاہتا تھا۔ سترھویں صدی میں قمینناس بہت بڑا ماہر تعلیم گزرا ہے۔ یہ عالم موجودہ زمانے کے تعلیمی دستور العمل کے ایک بڑے حصّے کا بانی ہُوا ہے۔ اس کا مقصد وحید تعلیم کو بالکل عام کر دینا تھا، بدیں وجہ کہ جہالت بدی کا باعث ہوتی ہے۔ سترھویں صدی کے آخر میں جان لاک جس نے انگلستان کے مدارس میں انقلاب پیدا کیا، تعلیم کا مدعا یہ بیان کرتا ہے کہ شریف آدمی تعلیم کے ذریعے پیدا کیے جائیں۔ وہ شریف آدمی ذیل کی خوبیوں کے حامل ہوں :۔

جسم توانا ہو، اخلاق پسندیدہ ہوں۔ ذہن رسا ہو تاکہ وُہ ہر مسئلے کے نیک و بد کی بخوبی جانچ پڑتال کرسکیں۔ یہی انگریز ماہر تعلیم ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ بچوں کو مدرسے میں داخل نہ کرو، کیونکہ مدرسوں میں وُہ دوسرے بچّوں کے ساتھ مل جل کر یا مدرس کی نقل کر کے بُری عادات کے حامل بن جائیں گے۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں روسو ایک بہت بڑا ماہر تعلیم ہُوا ہے۔ اس فاضل نے دنیا بھر کے معلمین کے خیالات میں انقلاب پیدا کردیا۔ اس نے طالب علم کی زندگی کے چار حصّے کیے۔

(ا) پانچ سال کی عمر تک بچے کے جسم کی نشوونما کی جائے۔ (ب) پانچ سال سے بارہ سال تک بچّے کو زیادہ تر کھیل کود میں لگایا جائے تاکہ اُس کی صحت درست اور جسمانی نشوونما مکمل ہوجائے۔ بدیں وجہ کہ اچّھا جسم اچھے اخلاق کا باعث ہوتا ہے اور کمزور جسم اخلاقی تباہی کا موجب۔ (ج) بارہ سے بیس سال تک بچّے کو اخلاقی تعلیم دی جائے اور اس کو سماج کے لیے تیار کیا جائے تاکہ وہ خود زندگی بسر کرنے کے قابل ہو۔ دیانتدار ہو اور دوسروں کے حقوق کی تعظیم کرنے والا ہو۔ (د) بیس سال کے بعد اُسے سفر کے لیے روانہ کیا جائے تاکہ وُہ دنیاوی تجربہ حاصل کرے اور مکمل طور پر پختہ ہوجائے۔

اسی صدی کے وسط میں پیسٹے لازی ایک جیّد معلم ہُوا، جس نے ہمیں بتلایا کہ تعلیم ایک

عمل ارتقائی ہے۔ نیکی اور اچھے اخلاق کے بیج بچے کے اندر موجود ہیں تعلیم کا فرض اولین
کہ ان کو مکمل طور پر ترقی دی جائے۔ ہربارٹ، جس نے تعلیم کی بحیثیت فن کے تکمیل کی ا
کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا، مقصدِ تعلیم بڑے زور کے ساتھ 'اخلاق' کی تربیت بیان کرتا ہے۔
جو کنڈرگارٹن کا بانی ہوا، یہ پیش کرتا ہے کہ خدا کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ انسان اس کے جلو
عکس ہے۔ انسان بذاتِ خود نیک ہے، مگر بیرونی اثرات اس کے آئینۂ نفس کو مکدّر کر دیتے
تعلیم کا مدّعا یہ ہے کہ انسان کو اپنی ہستی اور اُس ذات والا کی شان کا سمجھنے والا بنایا جائے۔

بیسویں صدی کی ماہرۂ تعلیم ڈاکٹر مانٹےسیری علم و تعلیم کا مطلب یہ بیان کرتی ہے
اس کے ذریعے سے مُدنی، یعنی، سوشل خرابیوں کا قلع قمع کیا جائے اور طلبہ کی عادات و خصا
کو پسندیدہ اور باقاعدہ بنایا جائے۔

ناظرین نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مغربی ماہرینِ تعلیم نے تعلیم کا مقصد محض تربیتِ اخلاق
رکھا ہے مشرقی مصلحین اور درس و تدریس کے نظریے پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان
میں اُستاد کی حیثیت گُرو کی ہوتی تھی اور گُرو اپنے ششوں کے لیے مجسّم نمونۂ اخلاق ہوتا تھا۔ و
یہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ سکھشا کی قیمت لی جائے، ہاں ششں اگر چاہتے، تو اپنے اخلاص کے
اظہار کے لیے کچھ نذر نیاز پیش کر دیتے تھے۔ گُرو کا قول و فعل اُس کی تعلیم کا عکس ہوتا تھا۔
برہم چاری بنانے کی رسم محض اخلاق کو درست کرنے کے لیے ہوتی تھی۔ اس نظامِ تعلیم میں فقط
یہی نقص تھا کہ یہ لوگ تعلیم کو عام کر دینے کے سخت مخالف تھے۔

مسلمانوں نے سب سے اوّل تعلیم کو عام کر دینے کا فیصلہ کیا۔ بانیٔ اسلامؐ نے حکم دیا کہ
علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ آنحضرتؐ نے عملاً اس
حکم کو قائم کیا۔ جنگِ بدر میں، جو مخالفین قیدی بن کر پیش ہوئے، اُن کے لیے اعلان کر دیا گیا کہ جو

ان میں سے کسی مسلم کو پڑھنا سکھا دیگا، اُسے فوری رہائی حاصل ہوجائیگی۔ چنانچہ بیسیوں قیدی، جنھوں نے مسلمانوں پر سخت مظالم کیے تھے، محض علم سکھلانے کی بدولت آزاد کر دیے گئے۔ آپ نے علم کو خدا کے پہچاننے کا ذریعہ بتلایا۔ اہلِ مغرب نے آپ کی تقلید کی اور علم کو عام کرنے کا اعلان کیا۔

بس اولین مقصدِ تعلیم تربیتِ اخلاق ہے۔

روٹی کمانا۔ حال ہی میں بعض حضرات نے اس امر پر بہت زور دیا ہے کہ تعلیم کا سب سے بڑا فرض متعلم کو روٹی کمانے کے قابل بنانا ہے تاکہ وُہ دُنیا میں اطمینان سے زندگی بسر کر سکے۔ بادی النظر میں یہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ جب تک انسان اپنا اور اپنے کُنبے کا پیٹ پالنے کے قابل نہ ہو، اُس کا دُنیا میں رہنا ہی محال ہے۔ لیکن نظر دوررس بتلائیگی کہ آدمی اور اس کا روزی کما کر زندگی بسر کرنا لازم وملزوم ہیں۔ ہر ذی روح مجبور ہے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی بوجہ احسن پرورش کر سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا، تو اُس کو دنیا ومافیہا سے رخصت ہونا پڑیگا۔ ہر جاندار کے لیے خواہ وُہ انسان ہو یا حیوان قوت لایموت کا حاصل کرنا لابدی ہے، لیکن ہر روز مشاہدے میں آتا ہے کہ بیل بکری وغیرہ انسان کی بہ نسبت بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ اگر آدمی ایک وقت سیر آدھ سیر کھائے، تو وہ بیسیوں سیر چٹ کر جاتے ہیں، تو پھر اِس مقصد کو تعلیم کے لیے مختص کر دینا انسان وحیوان کو ایک کر دینا ہے، بلکہ حیوان کو انسان پر ترجیح دینا ہے، کیونکہ حیوان کی زندگی کا منشا تو فقط کھانا پینا اور مست ہوجانا ہے۔ اگر منتہائے تعلیم یہ گردانا جائے کہ متعلم فقط روٹی کمانے کے قابل ہوجائے، تو فی الحقیقت تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ذرا افریقہ کی مردم خوار آبادی پر نظر ڈالیں۔ ایک ڈاکو اور چور کی زندگی کو نظرِ تعمق سے دیکھیں۔ پھر بتلائیں کہ آیا یہ سب روٹی کماتے ہیں یا نہیں۔ زندگی اپنے اصول

کے مطابق طرب و نشاط سے گزارتے ہیں یا نہیں۔ اس بات کا جواب یقیناً اثبات میں ہوگا۔
پھر فرمائیے کہ اُنھوں نے کونسی درسگاہ میں تعلیم پائی اور کس معلّم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔
روٹی کمانا لازمی ہے۔ مگر ذوق کا یہ شعر پیشِ نظر ہو ؎

سعادت مند ہو کر جی کہ بعد از مرگ عالم میں ہُما کے بال کا مصرف بجز افسر نہیں دیکھا

بعض علما کا خیال ہے کہ مدعائے تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کو اس قابل بنادے کہ وُہ اپنا فاضل وقت اچھّے شغل میں گزار سکے۔ ایک شخص نوکری سے فارغ ہو کر آیا ہے یا مزدوری کر کے واپس آیا ہے یا تجارت، زراعت وغیرہ سے اس کو فرصت ملی ہے۔ وُہ بجائے اس کے کہ اپنے وقت کو خرافات میں گزارے، اُسے چاہیئے کہ وُہ اپنے آپ کو کسی کتاب یا اخبار کے مطالعے یا کسی نیک کام میں مشغول کرے۔

درحقیقت اس کو مقصد قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ مقصدِ اوّل کے حاصل کرنے کا یہ ایک ذریعہ ہے۔

مہذب انسان بنانا۔ بہت سے فاضلین کی یہ رائے ہے کہ تعلیم کا نصب العین متعلم کو بندۂ تہذیب اور فیشن کا دلدادہ بنانا ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ صرف اُسے اچھے کپڑے پہننا اور رواج کے مطابق زندگی بسر کرنا آجائے، تو یقیناً یہ معانی غلط ہونگے۔ بدیں وجہ کہ صرف کسی شخص کا لباسِ فاخرہ پہن لینا اور تصنّع کی گفتگو کر لینا اُسے انسان نہیں بنا سکتا۔ جیسا کہ آجکل اکثر بار ایسے صاحبان سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اگر ذرا اُن کے اندرونی حالات اور اصلی عادات سے آپ واقف ہو جائیں، تو آپ ملاحظہ کرینگے کہ وہ انسان نما بھیڑیے ہیں۔ اگر اس کا مفہوم یہ ہو کہ اُن کی عادات کو درست کیا جائے، تو بلا شک و شبہ یہ مقصد نمبر اوّل کا جز قرار دیا جائیگا۔

ذہن و نفس کی تربیت۔ یعنی متعلم اس قابل ہو جائے کہ وُہ فصیح و بلیغ مقرر ہو سکے۔

اس نظریے کے حامی انقلاب یورپ سے پہلے قرونِ وسطیٰ کے عالم تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لیے اُس کے خیالات قابلِ مطالعہ ہیں تاکہ اُس کا ذہن ترقی کرتا جائے۔ قدیم بزرگوں کے اقوال رُومی و یونانی کتابوں میں پنہاں ہیں۔ اسی لیے پرانے علم و ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان کا مقصدِ اوّلیں یہ تھا کہ طلبہ کو پرانی کتب کا کیڑا بنایا جائے۔

اگر زندگی کا مقصد یہی قرار دیا جائے کہ کسی شخص کو منطقی و مناظر ہی بنا دیا جائے تو وہ میدان مناظرہ کا تو ضرور شہسوار ہوگا، مگر عملی زندگی میں کورا۔ ہر عالم تسلیم کرتا ہے کہ پرانے بزرگوں کے اقوال کا مطالعہ نہایت ضروری ہے تاکہ ہم اُن کے نقش قدم پر چل سکیں، لیکن فقط مناظرہ کرنے کیلئے کتب کی جانچ پڑتال کرنا تعلیم کے مقصد کو ادھورا رکھیگا۔ ایسے شخص کا فرض ہونا چاہیے عملاً زندگی بسر کر کے دکھلائے۔ جو اقوال بزرگان ماضی کے اُس نے پڑھے ہیں، اُن پر عمل پیرا ہو۔ دوسروں کے لیے مشعلِ ہدایت بنے نہ کہ یہ انسان حیوان ہے یا حیوان انسان ہے وغیرہ مباحث ہی میں قیمتی وقت گزار دے۔ اس لیے یہ مقصد بھی نمبر اوّل کے حصول کے لیے بڑا زبردست حربہ ہے۔

گزشتہ صفحات پر جو بحث کی گئی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مقصدِ تعلیم یہ ہے کہ متعلم کو نیک بنایا جائے تاکہ اُس کے اخلاق پسندیدہ اور اطوار حمیدہ ہوں۔ دُنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ آبرو کے ساتھ روٹی کما سکے۔ مشاہیرِ عالم کی زندگی سے واقف ہو کر خود بھی اُن کے نقش قدم پر گامزن ہو۔ اپنے ماحول سے واقف ہو اور قوم کا قابل فخر اور مفید رکن بن سکے۔ (کاپی رائٹ)

۵۴

اُستاد کا بہترین دوست

از

بھارت بندھو صاحب شرما، بی اے، بی ٹی

شاید ہی کوئی اُستاد ہوگا، جو اپنے دل میں انسپکٹر کے لیے سچی محبت رکھتا ہو۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان اُس شخص کو خیر مقدم نہیں کہہ سکتا، جس کا کام صرف اُسے زیادہ محنت کرنے کے لیے مجبور کرنا ہو۔ خواہ انسپکٹر کتنا ہی مہربان ہو اور اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے۔ ہم یہ تو جانتے ہی ہیں کہ اُسے اُستاد کے کام پر اپنا فیصلہ سُنانا ہے اور مناسب نکتہ چینی بھی کرنا ہے۔ ایسے اشخاص بہت ہی کم تعداد میں ہونگے، جو فراخدلی سے اس نکتہ چینی کو سُنتے اور اپنے نقائص کو دُور کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہوں۔ یہاں یہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ اس وجہ سے اساتذہ اُن کی بابت اس قسم کا خیال کرتے ہیں کہ وہ زمانہ قدیم میں اُن کے ممتحن تھے یا اُن کے انسپکٹری کے فرائض کی وجہ سے۔ ایامِ گزشتہ میں اُستاد کی تنخواہ کا بڑھنا یا گھٹنا صرف انسپکٹر کے فیصلے پر مبنی تھا۔ آجکل کے طریقہ معائنہ سے اتنا خوفزدہ ہونا اور انسپکٹر کی آمد سے تھرتھرانا بالکل بے معنی ہے۔

شروع شروع میں اُستاد اور انسپکٹر کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے۔ سب سے پہلے ۱۸۳۹ء میں (یعنی اسکولوں کو سرکاری امداد جاری ہونے کے چھے سال بعد) دو انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ ان کا فرض اسکولوں کو ٹھوس کام کرکے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنا تھا۔ اس وقت اُنھیں مدارس کے انتظام اور اندرونی معاملات میں مطلقاً کوئی دخل نہ تھا۔ وہ صرف اصل واقعات فراہم کرکے

معائنے کی رپورٹ کے ساتھ کونسل کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا کرتے تھے۔ وہ طلبہ کی بہتری سے متعلقہ معاملات پر مناسب غور کر کے اپنی رپورٹ میں نئی نئی تجاویز پیش کیا کرتے تھے۔ یہ تجاویز نئی ضروری تھیں کہ ان کے عمل درآمد سے انگریزی تعلیم کا نقطۂ نگاہ بہت حد تک بدل گیا۔ سول سروس کے اعلیٰ گریڈ کو حاصل کرنے اور تنظیم کا جوش و خروش ہونے کی وجہ سے ان انسپکٹران نے ۱۸۳۹ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان باقاعدہ معائنے کا طریقہ رائج کر دیا۔ اس کی بابت میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے لکھا کہ

"انسپکٹر کے معائنے کے وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی آمد کا مدعا مدارس کو روحانی اور دماغی ترقی دینا ہے۔ اس ترقی میں اسے استاد اور طالب علم کا پورا پورا تعاون حاصل تھا۔ طلبہ معلمین یہ کوشش کرتے تھے کہ اسکول کو بہتر بنانے کے لیے انسپکٹر کے قیمتی خیالات سے مستفید ہو سکیں۔ یہی وجہ اُن کے تعاون کی تھی۔"

۱۸۶۲ء کے ترمیم شدہ قوانین کے جاری ہونے سے اس باہمی تعاون کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن تعلیم کو اصل معنوں میں مفید بنانے کے لیے یہ قرار پایا کہ آئندہ استاد کی ترقی اُس کے امتحانات کے نتائج پر مبنی ہوگی۔ اس تبدیلی کی سخت مخالفت ہوئی، کیونکہ اب بیچارہ اُستاد انسپکٹر معائنہ کے رحم پر پڑ گیا تھا۔ اس مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ آئندہ آٹھ سال سے زائد طلبہ کا امتحان لیا جانا قرار پایا۔ لیکن ایک تہائی سرکاری امداد طلبہ کی اوسط حاضری پر ملنے لگی، یعنی اُن کے امتحانات کے نتائج پر اب دو تہائی سرکاری امداد بند کر دی گئی۔ مخالفت تو اب بھی جاری رہی اور اس مخالفت میں میتھیو آرنلڈ، لارڈ سالسبری وغیرہ اصحاب نے نمایاں حصہ لیا مگر اُستاد کو نتیجۂ امتحان پر سرکاری امداد (گو اب دو تہائی تھی) ملنے کا سلسلہ اور ۳۶ برس تک جاری رہا۔

محکمۂ تعلیم کی نظروں میں یہ طریقہ معائنہ پہلے ہی کی طرح تھا، مگر ہم بخوبی جان سکتے ہیں کہ کس طرح معائنے کے بنیادی اصول کو تبدیل کر دیا گیا۔ اب باہمی تعاون کی جگہ امتحانات اور اُستاد کی ترقی و تنزّل نے لے لی۔ انسپکٹر کی معائنہ کی اصل سپرٹ کس طرح قائم رہ سکتی ہے، جبکہ طلبہ کو ایک قطار میں کھڑا کیا جائے اور اُنھیں اُسے سلام کرنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اس طرح بیچارے انسپکٹر کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے جب طالب علم پڑھ رہا ہے، تو انسپکٹر حساب کے سوالات دیکھ رہا ہے۔ گویا پڑھائی کی طرف اُس کا پورا پورا دھیان نہیں۔ ان امتحانات کا اثر طلبہ پر بھی خاطر خواہ نہیں ہوتا۔ اسلیے اس سلسلے کو تبدیل کرنے کا خیال ہوا کیونکہ ان امتحانات میں اُستاد اور انسپکٹر شانہ بشانہ کام کرنے کے بجائے مخالفین کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اُستاد اپنے کام کو تسلّی بخش دکھانے کیلئے ہر طرح سے طلبہ پر بوجھ ڈالتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے (خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز) اُسے خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسپکٹر بھی تعلیمی قوانین پر عملدرآمد کرنے کی وجہ سے کسی نئے طریقے کو اختیار کرنے سے ہچکچاتا ہے۔

ان تمام نقائص کو مدِّنظر رکھتے ہُوے، ۱۸۹۸ء میں محکمۂ تعلیم کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ آئندہ کسی اسکول کے معائنے کے وقت انسپکٹر اس بات کا دھیان رکھیگا کہ معلّمین تعلیم دینے کے لیے مناسب طریقے استعمال کرتے رہے ہیں یا نہیں۔ اُس کا ہر ایک سوال اس بات کو جاننے کے لیے ہوگا کہ اُستاد کا طریقۂ تعلیم کس حد تک کامیاب رہا ہے، لیکن ان ہدایات پر عمل پیرا ہونا آسان بات نہ تھی، کیونکہ گزشتہ ۳۶ سال کی عادات کو بدلنا قدرے مشکل تھا۔ چنانچہ انسپکٹر اپنے خاص طریقے" (Method) پر زور دینے لگا۔ خواہ اُستاد کا طریقہ اُس سے بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اپنا کام تسلی بخش لکھوانے کے لیے اُستاد انسپکٹر کے طریقے کو بلاسوچے سمجھے اختیار کرنے لگے۔ گویا وہ انسپکٹر کے طریقے

کے غلام ہو گئے اور اپنی سوچ سمجھ کی طاقت کو کھو بیٹھے ۔ بہت سے معلمین انسپکٹر کی آمد سے چند روز ہی پہلے اُس کے "طریقے" میں طلبا کو مشق کرانے لگے ۔ اب بلا اطلاع معائنہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا (جسے ہم Surprise Visit کہتے ہیں ۔ لیکن اُستاد صاحبان نے اس کی پُر زور مخالفت کی ۔ حیرانی ہے کہ انسپکٹر کی اس آمد کو ناپسند کیوں کیا جاتا ہے ۔ انسپکٹر سکول کے اصل کام کو دیکھنا چاہتا ہے اور یہ جاننے کا خواہشمند ہے کہ اُستاد کا اپنا "طریقہ" کس حد تک کامیاب رہا ہے ۔ اس لیے بغیر اطلاع دیے سکول کا معائنہ کرنے میں ہرج ہی کیا ہے ۔ وہ اس بات پر اپنی رائے کا اظہار تبھی کر سکتا ہے ، جبکہ اس کی آمد ویسی ہی پسندیدہ ہو ، جیسی کہ اُستاد کے کسی دوست یا طالب علم کے والدین کی ۔ پھر بھی اُس کی آمد کی خبر آناً فاناً سکول کے ہر گوشے میں پھیل جاتی ہے اور ایسی کوئی بھی جماعت نہیں ہوتی کہ جہاں اس قلیل وقت میں کچھ نہ کچھ تیاری نہیں کی جاتی ۔

یہ طریقہ اُس وقت تک جاری رہیگا ، جب تک کہ اُستاد صاحبان کے دماغ سے یہ بات نہیں نکل جاتی کہ انسپکٹر کی خواہش صرف اُن کے کام میں نقائص کا نکالنا ہے اور اُس کا کام صرف اُن کے خلاف بُرے ریمارکس لکھنے کا ہے ۔ بہت اغلب ہے کہ بہت سے اُستاد انسپکٹر کے تسلی بخش یا ناتسلی بخش ریمارکس کو بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ اپنے ذاتی تجربے سے انسپکٹر کو علم ہوتا ہے کہ بچوں پر اُستاد صاحبان کی تعلیم کا کیا اثر ہوتا ہے ۔ اس لیے اُن کے ریمارکس کو کُلی طور پر پڑھنا چاہیے نہ کہ فرداً فرداً ۔ چونکہ اُسے سیکڑوں مدارس کا معائنہ کرنا ہوتا ہے ، اس لیے وہ خاص طور پر ریمارکس تبھی دیتا ہے ، جبکہ وُہ کوئی خاص اچھی یا بُری بات دیکھتا ہے ۔ اوّل اپنے تجربے اور اپنی پوزیشن کی وجہ سے وُہ اُستاد صاحبان کی نسبت نئے "طریقوں" سے زیادہ واقف ہوتا ہے ۔ دُوم اُسے اس بات

کا بھی دھیان رکھنا ہے کہ پبلک کا روپیہ ٹھیک طور پر خرچ کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اِنھیں دو باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اُسے اُستاد کے خلاف لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے ریمارکس ذاتی عناد پر مبنی نہیں ہوتے اور نہ ہونے ہی چاہییں۔

اُس کی شکایت صرف یہ ہے کہ اُستاد اسے ایسا دوست خیال نہیں کرتا، جو کہ ہمیشہ اُس کے "طریقے" اور "نتائج" کو بہتر دیکھنے کا خواہاں ہے اور جو تعلیمی درسگاہوں اور منتظمین کے ساتھ ملنے جلنے کی وجہ سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوئے، اُسے بہتر راستہ دکھا سکتا ہے۔

("ٹائمز" لنڈن سے ترجمہ کیا گیا)

اشتہار

نوٹ ترمیم

آئینِ شہریت مع قوانینِ صحت

جسے حال ہی میں محکمہ تعلیم نے بذریعہ سرکلر نمبر $\frac{8\ 4909}{14 \cdot 4 \cdot 37}$ تمام مڈل کی جماعتوں کے لئے مقرر فرمایا ہے۔

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان مڈل سکولز و لوئر مڈل مدارس پر واضح ہو کہ سال گزشتہ اس مضمون کے متعلق جو محکمہ نے منظور کی تھیں، وہ سب ایک سال کے لئے تھیں اور ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کے بعد وہ سب نامنظور ہوگئی ہیں۔ اس لیئے اب سال گزشتہ کی منظوری پر کوئی کتاب رائج نہیں ہوسکتی۔

یہ کتاب جس کی منظوری محکمہ نے ۱۴۔ اپریل ۱۹۳۷ء کو دی ہے، شہریت و حفظِ صحت کی اس اسکیم کے عین مطابق ہے، جو محکمہ نے مڈل کلاسز کے لیے منظور فرمائی ہے۔ اس کتاب میں اس مضمون کے ہر موضوع پر مفصل واقفیت دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور جدید اصطلاحات کے متعلق ضروری امور بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسے قابل اور تجربہ کار مصنفین نے اُردو اور انگریزی کی ان تمام کتب کو مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے، جو اب تک چھپ چکی ہیں۔

کتاب کی زبان سلیس، دلچسپ اور مؤثر ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہترین ہے۔

نوٹ:۔ اگر کوئی شخص آپ کو کسی ایسی کتاب کے رائج کرنے کے متعلق کہے۔ جس پر ۱۹۳۷ء کے سرکلر نمبر کا جواز نہیں ہے، تو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ رائج نہ ہو کیونکہ وہ منظور شدہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس منظور شدہ کتاب کو رائج فرمائیں گے، تو ہم بہت شکر گزار ہوں گے۔

المشتہان

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

اشتہار

سلسلہ پرشین ریڈرز

مصنفہ

مولوی محمد شفیع صاحب ایم، اے فیلو پنجاب یونیورسٹی

ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب بموجب چٹھی ۱۹۵۸ اسی مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء

فارسی کی پہلی کتاب ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	قیمت ۳ آنے ۱ پائی
فارسی کی دوسری کتاب ۔۔ ۔۔ ۔۔	〃 ۳ 〃 ۱۰ 〃
فارسی کی تیسری کتاب ۔۔ ۔۔ ۔۔	〃 ۳ 〃 ۱۱ 〃

موجودہ کتابوں میں گرامر کے تحت زبان سکھانے کی نمایاں کوشش نہیں کی گئی۔ لڑکے زبان و گرامر کی علٰحدگی سے نقصان اٹھا رہے تھے۔ ہم نے ان کی تلافی کی مناسب کوشش کی ہے۔

سابقہ کتابوں میں انتخاب مضامین و عبارات کے وقت جماعتوں کے ذہنی ارتقا اور اُن کی علمی قابلیت کا پورا خیال نہیں رکھا گیا۔ ان کتابوں میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور زبان سلیس آسان استعمال کی گئی ہے۔ اس امر کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ جملے چھوٹے چھوٹے ہوں تاکہ عبارت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

ہر سبق کے آخر میں مختلف مشقیں دیگر گرامر اور کمپوزیشن کی مشق کی عملی موقع اور مواد مہیا کیا گیا ہے۔

فارسی میں ترجمہ کرانے کے لئے اسی قسم کے جملے دیے گئے ہیں، جن میں کتابی الفاظ کی ہلکی سی تبدیل شدہ صورت ترجمے میں بہت ہی مد و معاون ہو سکتی ہے۔

فارسی میں گفتگو سکھانے کے لئے مکالمہ و گفتگو کے اسباق دیے گئے ہیں تاکہ اس طرح طلبہ اس طرز گفتگو سے قدرے واقفیت حاصل کر سکیں۔

تیسری کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی شان یہ ہے کہ ہر ایک سبق اور ہر ایک کہانی کا خلاصہ اور تجویز عنوان کی صورت میں طلبہ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۴)	دسمبر ۱۹۳۷ء	نمبر (۳)

فہرستِ مضامین

۱

ایڈیٹوریل

طوفانِ نوح کو ہزاروں غالباً لاکھوں سال ہو گئے، لیکن آج تک اس کی تباہ کاریاں ضرب المثل ہیں۔ بہار میں زلزلہ آیا، ہزاروں گھر برباد ہو گئے۔ ہندوستان کے چپے چپے میں اس کا ماتم منایا گیا۔ اس کے چند سال بعد کوئٹے میں زلزلہ آیا۔ اس کی داستانِ غم اب تک ہماری آنکھوں سے خراجِ اشک لیتی ہے۔ مٹ جانے والوں کو ہم رو رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک کوشش تعمیر بھی جاری ہے۔ بہار کے تباہ شدہ علاقوں میں بستیاں پھر بس چکی ہیں۔ کوئٹہ پھر آباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مرجانے والوں کی جگہ اور مخلوق وہاں پہنچ پہنچ کر آباد ہوتی جا رہی ہے۔ ویرانے میں پھر شہر بنایا جا رہا ہے اور علم و عقل کی مدد سے اب وُہ تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں کہ اگر زلزلہ پھر آئے، تو بربادی اور تباہی اتنی نہ ہو، جتنی پہلے ہو چکی ہے۔

آج دنیا کی سماج میں بھی زلزلے پر زلزلہ آ رہا ہے۔ سرمایہ دار، بندۂ مزدور کو ہر طرح بہلا پھسلا رہا ہے اور مزدور ببانگِ دہل کہہ رہا ہے کہ مجھے تمہاری تہذیب، تمہاری شائستگی، تمہاری فنونِ لطیفہ سے دلچسپی، تمہارا سرمایۂ علم و ادب کچھ نہیں چاہیے۔ مَیں صرف کپڑا چاہتا ہوں کہ تن ڈھک جائے۔ رزق چاہتا ہوں کہ پیٹ بھر جائے۔ سر پر چھت چاہتا ہوں کہ جسم کو نگار کرنے والی سرد ہوا اور سموم سے محفوظ رہ سکوں۔ سرمایہ دار وعدہ کرتا ہے کہ محنت کر یہ سب کچھ مل جائیگا۔ مزدور کہتا ہے کہ میرا صدیوں کا تجربہ ہے کہ صرف اتنا ہی دو گے کہ مَیں فاقے سے مر نہ جاؤں تاکہ تمہاری غلامی کے لیے زندہ رہوں اور بس، لیکن مَیں اپنا حصّہ چاہتا ہوں۔ یہ سرمایہ دار اور مزدور کا سماجی زلزلہ آج دنیا کے ہر ملک کو تباہ کیے ڈال رہا ہے۔

۲

طوفانِ نوح کیوں آیا؟ بہار کا زلزلہ کیوں آیا؟ کوئٹے کا زلزلہ کیوں آیا؟ پہلی بات حیطۂ تاریخ و سائنس سے باہر ہے۔ آخری دو کے متعلق سائنسداں بیشمار وجوہات پیش کرتے ہیں۔ مجھے اور آپ کو یہ دماغ اور فرصت نہیں کہ ان وجوہات پر بالتفصیل غور کریں۔ البتہ ہم یہ جانتے اور سمجھ سکتے ہیں کہ قوانینِ قدرت کے ماتحت، نظامِ قدرت میں تبدیلیاں برپا ہوگئیں اور ہرچند کہ علم انسانی بے انتہا وسیع ہوگیا ہے، لیکن ابھی قدرت کے پورے کارخانے پر اسے اقتدار حاصل نہیں۔ البتہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ دنیا میں سماجی زلزلہ کیوں آرہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سماجی زلزلے کا باعث اقتصادی پہاڑوں کا تبدیلِ مقام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ طبقۂ "بارکش" میں حدّت اور گرمی بہت بڑھ گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جنگِ عظیم کے جوالامکھی کے پھٹ جانے سے یہ سب قیامت برپا ہوئی۔ شاید یہ سب باتیں مل جُل کر ذمے دار ہیں، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ سماجی زلزلے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دنیا کا نظامِ تعلیم اور جمہوریت دست و گریباں ہیں۔

جمہوریت کیا ہے؟ کوئی نہیں بتا سکتا کہ جمہوریت کیا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ آج کچھ اور کہتے ہیں، کل کچھ اور کہتے تھے۔ ہمارا معہود ذہنی ہر شے کے متعلق بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی ہر چیز خود بدلتی رہتی ہے۔ ہر چیز ترقی کرتے کرتے کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ یا پست ہوتے ہوتے نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ سماج کا ایک مظاہرہ اس کی زندگی ہے اور وہ بھی تبدیل پذیر ہے۔ اس لیے جمہوریت بھی تبدیل پذیر ہے۔ یہ 'تعلیم' کا کام ہے کہ جمہور کی نبض دیکھتی رہے، لیکن تعلیم نے اپنے آپ میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی اور موجودہ سماجی زلزلہ بہت حد تک اسی لاعلمی کے باعث ہے۔ جب تک ہمارا نظامِ تعلیم سماجی تاثرات کو سمجھنے سے قاصر رہیگا اور جب تک ہمارا نظامِ تعلیم قاصر رہنے کے باعث ہر نئے دَور میں پیدا ہونے

والی نئی نئی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل نہ بنے گا، سماج میں یُوں ہی زلزلے آتے رہینگے۔

ضرورت یہ ہے کہ فرد کو اس کے مختصر ماحول میں پرورش پلنے دیا جائے اور سماج اُنھیں افراد کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق ایک جمہوریہ تیار کرے۔ اس ہم آہنگی کے لیے ضرورت ہے کہ فرد اور سماج میں اس طرح تعلق پیدا کر دیا جائے کہ ہماری نوخیز نسلیں ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں سماج کی نبض دیکھنا سیکھ لیں۔ بیشک آج کل مدارس میں سماجی زندگی کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ پڑھایا جاتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کی معلومات پر کتابیں شریک درس و نصاب ہیں، لیکن یہ کوشش نہیں کی جاتی کہ علم و عمل کو یکجا کر دیں۔ ہمارے ہندوستانی مدارس کا تو مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ "تودۂ علم" طلبا کے دماغ میں ٹھونس دیا جائے۔ وہ وقت دُور نہیں، جب ہماری صوبجاتی حکومتیں تعلیم کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو جائیں اور پھر امریکہ، روس، جرمنی اور اٹلی کے نظریۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم سے مفید اور مناسب اجزا جمع کر کے ایک مناسب تر اور مفید تر مرکب تیار کر لیں، لیکن ہم مدرسین اس بات کے انتظار میں معطل نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم فرداً فرداً اپنی اپنی استعداد اور مواقع کے مطابق کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیں تاکہ جب اس "نژادِ نو" کا وقت آئے، تو ہم اس کے خیر مقدم کے لیے تیار ہوں۔

اس ضمن میں اس وقت صرف ایک تجویز پیش کی جاتی ہے اور یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیا جائے۔

ہر مدرس اپنے طالب علموں کے ذہن نشین کر دے کہ سماج اور ملک کی بہبود اسی میں ہے کہ "خاندان" سے انتہائی محبت کی جائے اور خاندان کے ہر فرد اور متعلقین سے وہ سلوک کیا جائے کہ ہر شخص اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اقتصادی بہتری اور فلاح حاصل کر سکے۔ اس کا

یہ مقصد نہیں کہ کسی فرد کو جبلات روشنکر سعمست روگ بنا دیا جائے، بلکہ یہ کہ مدد کرکے اسے کسب معاش کا اہل بنا دیا جائے۔

ہر مدرس اپنے اپنے حلقے کی پیداوار اور صنعت و حرفت کا عمیق مطالعہ کرنے اور پھر کسی ایک صنعت یا حرفت کے متعلق اپنے مدرسے میں صرف طلبا ہی کو نہیں، بلکہ اُن کے والدین کو بھی وُہ ذرائع اور وسائل بتلائے، جن کی بدولت اس حلقے کی اقتصادی بہبود ہو سکے۔

تعلیم بالغاں کے متعلق ابھی تک ہندوستان میں کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہوا، لیکن جس وقت تک یہ انتظام ہو، ہم لوگ بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔ اس لیے ہر مدرس کو انفرادی طور پر یہ انتظام کر لینا چاہیے کہ وہ ایک سال کے دَوران میں کم از کم دس بالغوں کو خواندہ بنادیگا۔

پنجاب ایجوکیشنل جرنل کا ادارۂ تحریر ناظرین مجلہ سے درخواست کرتا ہے کہ وُہ اس موضوعِ ثلاثہ پر اظہارِ رائے فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعتوں میں ان اہم مسائل پر ایسی روشنی ڈالی جا سکے، جو ایک قابلِ عمل نظام کار پیدا کرنے کی اہل ہو۔

۵

ابتدائی تعلیم

از

صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم، ایم اے، بی ٹی

اس وقت جس قدر مسائل محکمۂ تعلیم کے پیشِ نظر ہیں، اُن میں غالباً پرائمری یا ابتدائی تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ جس طرح ایک عظیم الشان عمارت کی تعمیر کے لیے اس کی بنیادوں کا صحیح اور مستحکم ہونا ایک لازمی امر ہے، اسی طرح تعلیم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لیے اس کی ابتدائی حالت کا درست ہونا ازبس ضروری ہے۔ ابتدائی تعلیم کی حیثیت ایک بنیاد کی ہے۔ اگر بنیاد درست نہ ہو، تو بمصداق شعر؂

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ساری عمارت ٹیڑھی اور نادرست ہوگی۔ نفسیات کے ماہرین نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ فنِ تعلیم کے عالموں نے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں اس پر بہت کچھ لے دے کی ہے۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہو سکا۔ ننھے بچّوں کی تعلیم بظاہر جس قدر آسان نظر آتی ہے، اسی قدر پیچیدہ اور دقت طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم کسی ایک قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

بچے کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہو یا گھر پر، اس تعلیم کا آغاز کب ہو اور کس طرح، لازمی ہو یا غیر لازمی، اس کے اخراجات پبلک برداشت کرے یا حکومت، نصابِ تعلیم کی

نوعیت کیا ہو، یہ سب کے سب مسائل ابھی زیرِ غور ہیں۔ پھر ہر ملک کے جغرافیائی، اقتصادی اور معاشری حالات اور ہر قوم کی سیاسی و تمدنی ضروریات، ان مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہیں۔ ہندوستان کی حالت دوسرے ممالک سے بہت مختلف ہے۔ ہندوستان دیہاتی ملک ہے، دیہاتی زندگی کی ضروریات شہری زندگی کی ضروریات سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، زراعت پیشہ لوگوں کے مشاغل بڑے مختصر اور سادہ ہوتے ہیں، کھیتی باڑی کرنا اور کھیتی باڑی سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد اطمینان سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ایک دیہاتی کی زندگی کا اہم مقصد ہے۔ اس کی تمام تر توجہ اسی کام میں لگی ہوتی ہے اور وُہ اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ اس کے لیے بچّے کا لکھا پڑھا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ وُہ اکثر حالتوں میں اپنے بچّے کو چار سال کے لیے بھی، جو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں، اپنے سے جُدا کرنے کو کاروباری حیثیت سے نقصان دہ خیال کرتا ہے، اس لیے کہ ایک دیہاتی بچّہ خواہ وہ کتنا ہی کم عمر کیوں نہ ہو، ماں باپ کا دست و بازو ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ماں باپ کے دوش بدوش رہ کر ہل نہیں چلا سکتا، مگر گائے بیل کی حفاظت کرنا، گھر سے باپ کے لیے کھانا لے کر کھیت پر جانا، شام کو بیلوں کو چارہ ڈالنا، یہ سب کام اس کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ پھر ایسی حالت میں ایک باپ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا بچہ اس مفید خدمت کو چھوڑ کر مدرسے میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرے خصوصاً اس وقت کہ اُسے تعلیم کے صحیح مقاصد کا پتہ نہیں اور وُہ شہری لڑکوں کو زیورِ علم سے آراستہ ہو کر بے کار پھرتے ہُوئے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا بچّہ بھی اُن کی طرح عضوِ معطّل بن کر نہ رہ جائے یا اپنا آبائی اور مفید پیشہ چھوڑ کر ملازمت کے درپے نہ ہو۔

خیال کیجیے کہ جب حالات یہ ہوں، تو دیہات میں ابتدائی تعلیم کا مسئلہ کس طرح

پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بچّے کے اسکول جانے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ وُہ گھر کی محدود دُنیا سے نکل کر مدرسے کی آزاد فضا میں پھر سکتا ہے، بول سکتا ہے، اپنے رفیقوں اور دوستوں کا آزادانہ انتخاب کر سکتا ہے۔ یہ تمام صرف اس کی دلچسپی کا باعث ہیں، بلکہ اس کی صحت اور اس کی ذہنی نشو و نما کے لیے بھی مفید ہیں، لیکن اس کا اطلاق ایک دیہاتی بچّے پر کس طرح ہو سکتا ہے جس کی زندگی پہلے ہی ایک آزاد فضا کی عادی ہے۔ وُہ بچپن ہی سے کھلی ہوا میں رہتا ہے، اپنا وقت دلچسپ اور مفید طریق پر گزارتا ہے۔ اِدھر اُدھر گھومنا، جانوروں کی رکھوالی کرنا، ہل چلانا، بیج بونا، فصل کاٹنا، گھاس پھوس جمع کرنا، یہ سب اس کے مشغلے ہیں اور ایسے مشغلے کہ اُن کی دلچسپیاں کبھی کم نہیں ہوتیں۔ ایسے بچّے کے لیے اسکول کی فضا کس قدر غیر دلچسپ ہوگی، کیونکہ ایک طرف تو اس کی روزمرّہ زندگی سے مختلف ہے اور دوسری طرف تنگ اور محدود۔ شہری بچّے کے لیے مدرسے کی تعلیم کا وقت جس قدر تفریحی عناصر اپنے اندر رکھتا ہے، اسی قدر دیہاتی بچّے کے لیے کوفت کا موجب ہوگا۔

غور کیجیے کہ جہاں بچّوں کی زندگی تعلیمی فضا کے اس قدر منافی ہو، جہاں باپ کا مقصدِ حیات محض روزی کمانا ہو اور روزی کمانے کے وسائل میں وسعت و سہولت پیدا کرنے کو تضییع اوقات خیال کیا جائے، جہاں مائیں اَن پڑھ ہوں اور علم کے نور سے بے بہرہ، وہاں تعلیم کو صحیح طریق پر رائج کرنا کس قدر مشکل ہے۔

اِن حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے وسائل اختیار کیے جائیں، جن سے مدرسے کی فضا اور تعلیمی نصاب بچّوں کی زندگی کے عام مسلک سے زیادہ قریب اور زیادہ موافق ہو جائے۔ دیہات میں اگر مدرسے کی فضا گاؤں کی آزادانہ فضا کا مقابلہ نہ کر سکے، تو اتنا

ہو کہ وہاں کا ماحول گھر کے ماحول سے ملتا جلتا ہو تاکہ بچوں کی زندگی تعلیم کے بوجھ کو ذرا بھی محسوس نہ کرے۔

قدیم زمانے میں رواج تھا کہ ایک گاؤں یا قصبے کے بچے اور بچیاں ایک ہی جگہ تعلیم پاتے تھے۔ مسجد کے متصل ایک حجرہ یا مولوی جی کا مکان ہوتا تھا، جہاں بچے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اُستاد کے علاوہ اُستانی جی بھی درس دیتی تھیں اور بچے اور بچیوں کا کام نہ صرف پڑھنا ہوتا، بلکہ وہ مولوی صاحب کی خدمت گزاری اور اُستانی جی کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا اپنا فرض اوّلیں سمجھتے تھے۔ خود بچوں کے والدین اس فرض کی بجاآوری کو اپنے لیے سعادت خیال کرتے تھے۔ اس طرح یہ تعلیم و تربیت کا دور محبت و سعادت کا دور متصور ہوتا تھا۔ آج اگرچہ اس قدیم رسم کو کلی طور پر رواج دینا ناممکنات سے ہے، تاہم اس کے اہم اور مفید پہلوؤں کو دوبارہ تازہ کیا جا سکتا ہے۔ شہری زندگی میں یہ چیز شاید اتنی کارآمد نہ ہو، لیکن دیہاتی زندگی میں اس کا وجود یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ مدرسے کھولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی، لیکن اس سلسلے میں ایک اور اہم چیز کو فراموش کرنا نہیں چاہیے اور وہ یہ کہ ایسے مدارس کے لیے ایسی معلمات بھی مہیا کی جائیں، جو اپنے خاوندوں سے مل کر اس کام کو سرانجام دیں۔ دیہات میں، جہاں تعلیم بالغاں پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے اور نائٹ اسکول کھولے جا رہے ہیں اور زرِ کثیر صرف کیا جا رہا ہے، وہاں اس کام کو بھی پروگرام میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اوّل اوّل ایسی استانیوں کی تعلیم و تربیت میں بعض مشکلات کا سامنا ہوگا، لیکن بعدازاں اس میں سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔ بہت ممکن ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی ایسے خاندان یا تو دیہات کے اندر ہی پیدا ہو جائیں یا شہر سے گاؤں میں جا کر آباد ہوں، جن کا پیشہ ہی نسلاً بعد نسلٍ درس و تدریس ہو۔

ایسے نظام تعلیم کا ایک اور فائدہ بھی ہے۔ شہروں میں ابتدائی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ایک ہی نصاب مقرر کر دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں، لیکن دیہات میں ان دونوں کی زندگی ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ اس کے لیے بظاہر ایک ہی مدرسے میں رہ کر ایک ہی نصاب سے مستفید ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پس اگر ایسی فضا پیدا کر دی جائے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، تو یقیناً یہ مشکل بھی بڑی حد تک حل ہو جائیگی۔ البتہ اس کے لیے ایک جدید طرز کے نصاب کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے نصاب کا، جو دیہاتی زندگی کا اچھا خاصا مرقع ہو اور جو نہ صرف بچوں کو ان کی آئندہ زندگی کے لیے تیار کرے، بلکہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی زندگی کے نصب العین کے مختلف عناصر میں یگانگت پیدا کر سکے اور ان کی زندگی میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ میدانِ عمل میں کسی قسم کے تصادم کا خدشہ باقی نہ رہے۔

ایسے نصابِ تعلیم کو وضع کرتے وقت حسبِ ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا:-

اوّل بچوں کی جسمانی اور ذہنی ضروریات، وہ ضروریات جو گھر میں پوری نہیں ہو سکتیں۔

(۲) بچوں کے کھیل کود کا انتظام، یعنی ایسی تفریحیں، جو ماحول اور دیہاتی زندگی کے لیے مفید ہوں۔

(۳) ضروری نگرانی اور نگہداشت، یعنی اُستاد کا کام محض تعلیم ہی نہ ہو، بلکہ صحیح تربیت بھی ہو اور یہ تربیت ایسی ہو کہ بچے اپنی زندگی کے اصول فرائض کو نہ بھولیں، بلکہ اس تعلیم کو اپنی زندگی کے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھیں۔

(۴) ایسی تعلیم کے لیے تمام ایسے وسائل مہیا کیے جائیں، جو بچوں کے لیے تعلیم کے

حصول میں آسانیاں پیدا کریں، یہاں تک کہ اس بارے میں انوٹی سی مالی مشکلات نہ کرنا پڑے، کیونکہ اس وقت دیہات میں بالخصوص تعلیم کو ایک بھاری اقتصادی بوجھ کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں چھوٹی سے چھوٹی رقم خرچ کرنا بھی اسراف کا مترادف جانا ہے۔

(۵) ایسے مدارس کے لیے بہترین معلم مہیا کیے جائیں، جو ضروری تعلیمی تکمیل علاوہ فنِ تعلیم سے بھی آگاہ ہوں۔ ایسے معلموں کو ثانوی مدارس کے معلموں کے مقابل مالی فیاضیوں سے بھی نوازنا بہت ضروری ہے، ورنہ ان لوگوں کی مالی مشکلات فرائض بجاآوری میں حائل ہوتی ہیں۔ ایک بھوکا انسان، خواہ وہ کتنا ہی فرض شناس کیوں نہ بھوک سے تنگ آکر بسا اوقات غیر محسوس طریقے پر اپنے فرائض کو بھول جاتا ہے۔ تجربہ شاہد ہیں کہ موجودہ حالات میں یہ مسئلہ بڑی حد تک ابتدائی تعلیم کی راہ میں حائل ہے، لیے جب تک معلم کی ذہنی حالت درست نہ ہو، اس سے کسی بڑے نصب العین کی رکھنا عبث ہے۔

فرانس کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد صاحب، ڈار، ایم اے، بی ٹی

فرانس کا موجودہ نظام صدیوں کی کشمکش کا نتیجہ ہے اور یہی وہ ملک ہے، جہاں موجودہ دور کا پہلا ماہرِ تعلیم جان جاک روسو پیدا ہوا۔ مدت تک فرانس میں فرقۂ یعقوبی نے تعلیمی معاملات میں پورا تسلط جمائے رکھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کافی عرصے تک تعلیم بالکل زمانۂ وسطیٰ کے مطابق دی جاتی رہی۔ اُن کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف ایسے افراد پیدا کرنا تھا، جو حکومت اور مذہب کے خواہ وہ دونوں اپنی حقیقی شکل سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہو چکے ہوں، پورے پورے فرمانبردار ہوں، لیکن موجودہ دور کے آغاز ہی سے اس دقیانوسی نظام کے خلاف مختلف اشخاص نے احتجاج شروع کیا۔ جن میں سے سب سے پہلے ڈیکاسٹ تھا اور بعد میں روسو۔ اس کے علاوہ اور لوگوں نے اس کو بدل ڈالنے کے لیے پوری پوری ہمت دکھائی۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۶ء کے قوانین سے تمام ملک میں جبری اور مفت تعلیم رائج ہو گئی۔ ان تمام کوششوں کا ایک خاصہ یہ تھا کہ ان کی رُو سے تمام تعلیمی نظام مذہبی اداروں کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے قبضے میں چلا گیا۔ اس تقسیم کار سے اگرچہ تعلیم کو بڑا فائدہ حاصل ہوا، مگر مذہبی گروہ نے اپنی روایتی تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اس کی مخالفت شروع کی، جس کے بُرے نتائج مدارس میں طلبا کی غیر حاضری کی شکل میں عیاں ہوئے۔ سرکاری اور مذہبی مدارس کی کشمکش اس وقت بھی ختم نہیں ہوئی اور ان تمام نقصانات کے باوجود

جو ایسے تصادم کا لازمی نتیجہ ہیں، حکومت نے ابھی تک کوئی ایسا عملی اقدام نہیں کیا جس سے پادریوں کے جاہلانہ اعتراضات بند ہو سکیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب دین و سیاست کو جدا کر دیا گیا، تو مذہبی مدارس بند کر دیے گئے تھے، لیکن اُس وقت وہ غیر مذہبی رنگ میں دوبارہ کھولے جا رہے ہیں اور یہ جنگ ابھی جاری ہے۔

فرانس کا رقبہ تقریباً ۲۱۲۶۵۹ مربع میل ہے اور کل آبادی چار کروڑ ایک لاکھ ہے۔ (ہندوستان کی کل آبادی ۳۱ کروڑ ۸ لاکھ ہے)۔ اگرچہ فرانس کا تعلیمی نظام بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ یورپ کے تمام لاطینی ممالک نے اس کی پیروی کی ہے، جس کو ہم مختصراً مرکزی کہہ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۷۶۳ء عیسوی میں اس اصول کو تسلیم کیا گیا اور بغاوت فرانس کے دوران میں تمام مصنفین نے اس کی حمایت کی، لیکن درحقیقت یہ نظام صرف نپولین کے دور (۱۸۰۸ء) میں تکمیل تک پہنچا اور اس کی حکمت عملی میں فرقہ یسوعی کے چند اصولوں کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ جس طرح یہ گروہ فوجی اصول کے مطابق ایک سردار کے ماتحت تھا، اسی طرح تمام نظامِ تعلیم نپولین کے خیال کے مطابق ایک افسر اعلیٰ کے ماتحت ہونا چاہیے۔ جس کو شہنشاہ بلا واسطہ مقرر کرے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: "میری خواہش ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے، جو اس حیثیت میں یسوعی نہ ہو کہ اس کا سردار اعلیٰ پائے تخت روم میں رہتا ہے، بلکہ اس حیثیت میں کہ اس کا مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہو۔ اس تعلیم کے سلسلے کو قائم کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ملک کی سیاسی راہنمائی کی جا سکے"۔ سیاسی راہنمائی کا مطلب وہی ہے، جس کے ماتحت آج کل جرمنی اور اطالیہ اپنے بچوں کو خاص قسم کے اصولوں کی تعلیم دے رہے ہیں اور جن کی نشر و اشاعت کے بغیر شاید یہ سیاسی نظام پائدار نہ ثابت ہوں۔ چنانچہ ملک کو ستائیس مراکز تعلیم (اکیڈیمی۔ اقدمیہ) میں تقسیم کیا گیا۔ ان کا انتظام بالکل یکساں تھا اور

سب کے سب پیرس کے مرکزی دفتر کے ماتحت تھے، جس کا افسرِ اعلیٰ بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتا تھا، لیکن ایک حیثیت میں یہ مرکزیت مکمل نہ تھی۔ ۱۸۰۲ء کے قانون کے مطابق ابتدائی تعلیم عیسائی (خاص کر رومی عیسائی) انجمنوں اور مقامی بلدیات کے سپرد کر دی گئی اور اسی طرح مالی معاملات میں بھی یہ مرکزیت صرف ثانوی اور اعلیٰ تعلیم تک محدود تھی۔ اس نظام میں نپولین نے بہت اچھی طرح یعقوبی اصول اور فرانسیسی روایات کو ملا دیا۔ بعد کی اصلاحات نے اس میں صرف سطحی تبدیلیاں کیں، یعنی، اقدمیات کی مقامی تقسیم میں تبدیلی اور افسرِ اعلیٰ کی جگہ وزیر تعلیمات نے لے لی۔ باقی سب نظامِ تعلیم تقریباً وہی ہے۔

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ہم فرانس کو ۱۸ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جن کو اصطلاحاً اقدمیہ کہتے ہیں۔ الجیریا اگرچہ فرانس کا اپنا حصہ نہیں، لیکن تعلیم کے لحاظ سے فرانس میں شامل ہے اور وہاں کی تعلیم کا انتظام محکمۂ نوآبادیات کے بجائے وزیر تعلیمات کے سپرد ہے۔ ان حصوں میں سے ہر ایک میں ایک جامعہ ہے۔ جس پر ایک افسرِ اعلیٰ (ریکٹر۔متولی) وزیر کی طرف سے نمائندے کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے، جو اقدمیہ کا صدر ہونے کے علاوہ جامعہ صدر کے بھی فرائض سرانجام دیتا ہے۔ پھر ہر اقدمیہ تین یا چار چھوٹے حصوں پر منقسم ہے، جن کو "محکمہ جات" کہتے ہیں اور ہر محکمے میں مدارس ثانوی کی ایک خاص تعداد کم از کم ہونی لازمی ہے۔ متولّی اپنے علاقوں کے تمام تعلیمی اداروں کا افسرِ مطلق ہے اور تمام مدارس ابتدائی سے لے کر جامعہ تک اس کے زیرِ نگرانی ہیں۔ اس کے ماتحت ہر محکمے کے لیے ایک علیحدہ مہتمم (انسپکٹر) ہے، جو مدارس ثانویہ کا معائنہ کرتا ہے۔ ان کے علاوہ مدارس ابتدائی کے معائنے کے لیے علیحدہ مہتمم ہوتے ہیں۔ متولی اور مہتموں کے کام کا معائنہ صدر مہتمم (انسپکٹر جنرل) کے سپرد ہے، جس کا تقرر ہر اقدمیہ میں وزیرِ اعظم کرتا ہے۔ متولی اقدمیہ کی تعلیمی حالت کا اور صدر مہتمم اس کے انتظامی حصے کا ذمے دار ہے۔

اس کے علاوہ وزیر تعلیم کے ماتحت کئی مجلسیں بھی کام کرتی ہیں، جن کا زیادہ تر فرض محض رائے دینا ہے۔ سب سے پہلے ایک تعلیم عامہ کی مجلس اعلیٰ ہے، جس میں منتخب اور نامزد اراکین دونوں ہوتے ہیں اور یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ ان منتخب شدہ اراکین میں سے ۱۰ ثانوی مدارس کے اور ۶ ابتدائی مدارس کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ یہ مجلس نصاب، امتحانات اور کتابوں کے متعلق رائے دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اپیلوں کا فیصلہ بھی کرتی ہے اور ابتدائی تعلیم اور جامعہ کی مجالس کے فیصلے کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ نئے کالجوں کے قائم کرنے اور مختلف جامعات میں مختلف ملازمتوں کی تبدیلیوں کا فیصلہ بھی اسی کے ذمّے ہے۔

اقدمیہ کے ہر محکمے میں ایک افسرِ اعلیٰ ہوتا ہے، جسے پریفکٹ (Perfect) کہتے ہیں، جو اس محکمے کی مجلس تعلیم کا صدر ہوتا ہے اور ابتدائی تعلیم اس کے سپرد ہوتی ہے۔ اس کا تقرر وزیر داخلہ کی سفارش سے صدر جمہوریہ کرتا ہے۔ باوجودیکہ اس کا عرصۂ ملازمت زیادہ نہیں ہوتا، پھر بھی یہ اپنے محکمے کا سردارِ مطلق ہوتا ہے۔ اگرچہ اساتذہ کی تقرری اقدمیہ کے مہتمم کی سفارش سے ہوتی ہے، لیکن عملی طور پر اس کا فیصلہ پریفکٹ ہی کرتا ہے۔ انسپکٹر اس مجلس تعلیمی کا نائب صدر ہوتا ہے اور سب تعلیمی تحریکات کا منبع اور معاون وہی ہے۔ اس مجلس کے چودہ باقاعدہ رکن ہوتے ہیں، جن میں ابتدائی مدارس کے چار اُستاد (دو مرد اور دو عورتیں) شامل ہیں۔ یہ رکن تین سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں اور بلا تنخواہ کام کرتے ہیں۔ اگرچہ سفر خرچ ملتا ہے۔

وزارتِ تعلیم کا دفتر پانچ حصّوں میں منقسم ہے۔ مثلاً: جامعات اور اعلیٰ تعلیم، تعلیم ثانوی، ابتدائی، محکمہ حسابات و اعداد و شمار اور فنونِ لطیفہ۔ ہر حصّے کا ایک ڈائرکٹر ہے اور یہ حصّے پھر چھوٹے حصّوں میں تقسیم کیے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک کو بیورو (Bureau) کہتے ہیں۔

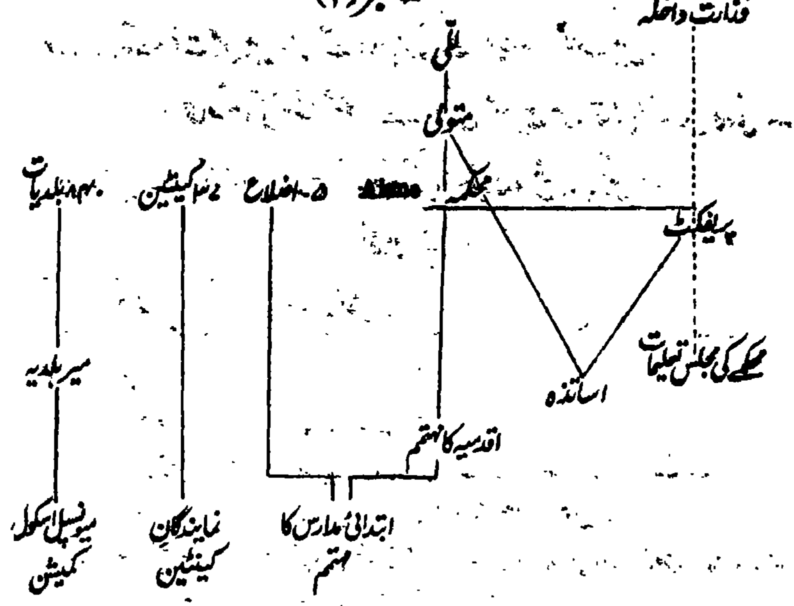
لیکن تعلیم کے مختلف شعبہ جات وزیر تعلیم کے ماتحت نہیں، بلکہ اس کے علاوہ چھے اور وزیروں کے ماتحت بھی ہیں، جن کے نظام اور بجٹ (میزانیہ) مختلف ہیں۔

یہ تمام نظام تعلیم کی مختصراً شکل ہے۔ اس کی مرکزیت میں مقامی افسروں کا کوئی حصہ نہیں۔ ذیل کے دو نقشوں سے اس نظام کی صحیح حیثیت واضح ہو جائیگی:۔

نقشہ نمبر (۱)

منتظمین	ذریعۂ تقرری	فرائض
(الف) مرکزی		
(۱) وزیر تعلیم عامہ	صدر پارلیمان	
(۲) مجلس تعلیم عامہ (۵۲ اراکین)	اکثریت منتخب شدگان	رائے دینا، انتظام کرنا اور فیصلے صادر کرنا، (متعلقہ تعلیمی علاقوں پر)
(۳) مجلس کی مستقل کمیٹی، (۱۵ اراکین)	۹ کو صدر منتخب کرتا ہے اور ۶ کو وزیر منتخب کرتا ہے	عام اجلاس ہوتے ہیں اور روزمرہ کے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔
(۴) صدر مہتمم	صدر پارلیمان	ثانوی، صنعتی اور ابتدائی مدارس کا معائنہ
(۵) ابتدائی تعلیم کا ڈائرکٹر	وزیر تعلیمات	ابتدائی مدارس کا معائنہ
(۶) پانچ بیورلو	وزیر تعلیمات	مدارس ابتدائی اور معلمی (ادنیٰ) کے اساتذہ کا تقرر اور وہاں کے انتظام، پروگرام، امتحانات، ضبط کے فرائض وار۔ ان کے علاوہ تعمیری کام اور وظائف کا بندوبست بھی ان کے سپرد ہے۔
(ب) مقامی		
(۱) متولیان (۱۷) ہر اقدمیہ کے لیے ایک۔	وزیر تعلیمات، صدر پارلیمان کے مشورے سے	اقدمیہ کے تمام تعلیمی معاملات کا افسر اعلیٰ
(۲) اقدمیے کے مہتمم (۹۹) ہر محکمے کے لیے ایک	وزیر تعلیمات	زیادہ تر ابتدائی تعلیم کے لیے۔
(۳) ابتدائی مہتممین (۵۰۰)	وزیر تعلیمات	اپنے علاقے کے تمام ابتدائی مدارس کا معائنہ
(۴) پریفکٹ	صدر پارلیمان، وزیر داخلہ کے مشورے سے	استادوں کے تقرر کے لیے متولی کے ساتھ مل کر فیصلہ کرنا، اور محکمے کی مجلس تعلیمات کا افسر اعلیٰ
(۵) مجلس تعلیمات محکمہ (۱۲ اراکین)	اکثریت منتخب شدگان	محکمے کے ابتدائی مدارس کے معائنے میں پریفکٹ کی مدد کرنا۔
(۶) میر بلدیہ	سول افسر مجلس بلدیہ	جبری حاضری کے قانون کو رائج کرنا، فنڈ اور بلدیہ کے مدارس کی کمیشن کا صدر
(۷) میونسپل اسکول کمیشن	مجلس بلدیہ	حاضری کو جبراً اور ترغیباً بڑھانا۔

نقشہ نمبر (۲)



مندرجۂ بالا نقشے میں للی (Lillie) کی اقدمیہ کے ایک محکمے Aisne کے تعلیمی نظام کی توضیح کی گئی ہے، لیکن اس بڑھتی ہوئی مرکزیت کے خلاف دو مختلف قسم کی تحریکات مختلف وجوہات اور مقاصد کو لے کر پچھلے دنوں پیدا ہوئیں۔ اُنیسویں صدی کے آخری عشرے میں چند پُرانے صوبوں نے اپنی قدیم مقامی زبانوں کو رائج کرنے کا سوال پیدا کیا۔ اُنھوں نے اپنی اپنی زبانوں کی ترویج اور نظامِ تعلیم کی مرکزیت کو کم کرنے کے لیے آواز اُٹھائی اور اپنے اپنے علاقوں کے ابتدائی مدارس میں مقامی زبانوں کے استعمال پر زور دینا شروع کیا۔ جنگِ عظیم کے بعد جب السیک لورین (Alsace-Lorraine) جن کے باشندے جرمن زبان استعمال کرتے تھے، فرانس کو واپس ملے، تو یہ تحریک اور زیادہ زور پکڑ گئی، لیکن ۱۹۲۵ء میں وزیرِ تعلیمات نے صوبائی تحریک کو دبا دیا اور اعلان کر دیا کہ سب صوبوں میں فرانسیسی زبان ہی

میں تعلیم دی جائیگی۔ صرف السیک (Alsace) کے معاملے میں یہ رعایت کی گئی کہ وہاں ابتدائی تعلیم کے پہلے دو سال میں جرمن زبان استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔ دوسری تحریک کی بنیاد محض جذباتی نہیں تھی، بلکہ ٹھوس تعلیمی اصولوں پر تھی اور اس تحریک کا مرکز "انجمن تعلیم جدید" تھی۔ اُنھوں نے اس مرکزیت کے خلاف مقامی آزادی کی حمایت شروع کی اور اس معاملے میں حق بجانب بھی تھے۔ چونکہ تعلیم کے معاملے میں مرکزی پابندی اگر ایک طرف اساتذہ کو محض بے کار بنا دیتی ہے، تو دوسری طرف بچّوں کے دماغی ارتقا پر بھی بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے، لیکن یہ احتجاج کچھ زیادہ نمایاں نتائج نہ پیدا کر سکا۔ صرف ایک معاملے میں کامیابی ہوئی، یعنی، معائنے کی سختی کم کر دی گئی اور بعض انسپکٹر طریقوں کے اختلاف کی حمایت کرنے لگے۔

مالی معاملات میں موجودہ مرکزیت کی تاریخ بھی زیادہ قدیم نہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، نپولین نے ابتدائی مدارس کو عیسائی انجمنوں اور مقامی بلدیات کے سپرد کر دیا تھا۔ سب سے پہلے جو امداد حکومت نے دی، ۱۸۳۳ء میں تھی، لیکن یہ مقامی خرچ کے مقابلے میں صفر کے برابر تھی۔ مگر ۱۸۸۹ء میں بہت سے مقامی اخراجات حکومت نے اپنے ذمے لے لیے۔ مندرجۂ ذیل نقشہ مقامی اور مرکزی اخراجات کی تقسیم کی تشریح کرتا ہے :۔

نقشہ نمبر (۳) (ابتدائی مدارس کے متعلق، رقم کروڑ فرینک میں)

سال	بلدیات	محکمہ جات	حکومت	میزان	حکومت کے خرچ کی فیصدی
۱۸۷۰	۴۲	۹	۱۱	۶۲	۱۸
۱۸۸۰	۵۷	۲۰	۳۱	۱۰۹	۲۹
۱۸۸۹	۷۲	۱۸	۹۰	۱۷۰	۴۷
۱۸۹۰	۵۷	—	۱۲۱	۱۷۸	۶۹
۱۹۰۰	۷۱	—	۱۴۷	۲۱۸	۶۸
۱۹۰۷	۹۰	—	۲۰۲	۲۹۳	۷۰

اس کے بعد نسبت تقریباً مستقل ہوگئی۔ اس وقت بلدیات صرف عمارت خریدنے یا بنانے، کمروں کے گرم رکھنے یا روشنی مہیا کرنے کے ذمے دار ہیں اور کبھی اساتذہ کی رہائش کا خرچ بھی برداشت کرتے ہیں۔ مدرسوں کا سازوسامان خریدنا اُن کے ذمے ہے اور اگر وہ مدارس میں اپنی خواہش سے نیا کام شروع کرائیں۔ مثلاً: طبی معائنہ یا کتابوں وغیرہ کا مہیا کرنا، تو یہ خرچ بھی وہ برداشت کرتے ہیں۔ ثانوی تعلیم میں تو ان بلدیات کے خرچ کی نسبت حکومت کے سو فرینک کے مقابلے میں صرف چند فرینک ہیں۔ ہر محکمے کا فرض ہے کہ مدارس معلمی (ادنیٰ) کی عمارتیں، ابتدائی انسپکٹروں کے اخراجات اور مدارس معلمی کے ڈائرکٹروں اور اقدمیہ کے انسپکٹروں کی رہائش کا خرچ برداشت کرے۔ اس کے علاوہ تمام صنعتی مدارس کو بھی زر امداد دے، لیکن ان تمام متفرق اخراجات کے باوجود بھی، حکومت کے خرچ کے مقابلے میں، ان کی نسبت بالکل معمولی ہے۔

مرکزی اور مقامی خرچ کی تقسیم اور تعلیم کے نظام کے اختلافات کا اندازہ مندرجہ ذیل نقشے سے بخوبی ہو سکتا ہے :۔

ملک	طرز نظام تعلیم	مالی امداد فیصدی مرکزی	مالی امداد فیصدی مقامی
فرانس	مرکزی	۷۷	۲۳
اطالیہ	″	۷۰	۳۰
جرمنی	غیر مرکزی	۵۰	۵۰
برطانیہ	″	۵۱	۴۹
روسی جمہوریت	″	۴۴	۵۶

فرانس میں حکومت کی طرف سے ۱۹۳۳ء میں تعلیم پر کل خرچ ۳۵۱۷۴۹۵۰۰۰ فرینک

تھا۔ یہ رقم کل میزانیہ کا ۷ فیصدی تھی۔

اس خرچ کا تناسب تعلیم کے مختلف شعبوں پر حسب ذیل تھا اور اس کے ساتھ ہی انگلستان کا تناسب بھی بتایا گیا ہے: [جزائر برطانیہ کا کل خرچ ۷۴۳۰۰۰ پونڈ تھا (۱۹۳۲ء)]

ملک	ابتدائی	ثانوی	اعلیٰ	صنعتی	دیگر
فرانس	۷۰	۱۳	۶	۶	۵
جزائر برطانیہ	۶۴	۱۳	۴	۷	۱۲

فرانس کے تعلیمی اداروں کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

(۱) ۲ سال سے ۱۳ سال کی عمر تک

(ا) ۲ سال سے ۶ سال کی عمر تک

(ب) ۶ سال سے ۱۳ سال کی عمر تک ــ ابتدائی تعلیم

(۲) بعد ابتدائی

(۳) ثانوی تعلیم

(۴) اعلیٰ تعلیم

(۵) صنعتی، حرفتی اور زراعتی تعلیم

(۶) تعلیم معلمان، اعلیٰ اور معمولی

(۱) ا۔ اس وقت بھی جبکہ پانچ یا چھے برس کے بچے کی تعلیم کا بندوبست، اپنے زمانے کے معیار کے مطابق خوب ہو چکا تھا۔ ننھے بچوں کی تعلیم و تربیت کا سوال کسی کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ یہ صرف شاید روسو، فروبل اور پسٹالوٹسی ایسے اشخاص کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عوام کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی، لیکن مختلف حکومتوں نے کافی عرصے تک اس عمر

کی تعلیم کو، جو درحقیقت تمام زندگی کا سنگِ بنیاد ہے اور جسے بجائے تعلیم کے تربیت کہنا چاہیے، اپنے مروجہ نظام میں شامل نہ کیا اور بعض بعض جگہ، تو اس کی مخالفت بھی کی گئی۔ یورپ میں سب سے پہلے اُن ملکوں نے اس کو اپنے نظامِ تعلیم کا ایک لازمی حصہ قرار دیا، جو لاطینی رومی مذہب عیسوی کے پیرو تھے۔ ان میں بلجیم اور فرانس پیش پیش ہیں۔ بلجیم نے ان مدارس کو اپنے نظامِ تعلیم میں ۱۸۳۳ء عیسوی میں شامل کیا اور فرانس نے ۱۸۳۷ء عیسوی میں ان مدارس کو مالی امداد دینی شروع کی۔ مندرجۂ ذیل اعداد سے ان مدارس کی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے :۔

	۱۸۳۶ء	۱۸۳۷ء	۱۸۵۰ء	۱۸۸۳ء
کل تعداد مدارس	۶۴	۲۶۲	۱۷۳۵	۵۳۸۰
بچّوں کی تعداد	-	-	۱۶۰۲۴۴	۶۷۹۰۸۵

۱۸۸۱ء میں ان مدارس نے بہت ترقی کی اور اس کے بعد ان مدارس میں بہت کچھ نمایاں تبدیلی رُونما ہُوئی، جس کے بعد یہ بدستور اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اس وقت یہ مدارس دو قسم کے ہیں۔ (۱) کنڈرگارٹن، جو تقریباً تمام شہروں میں پائے جاتے ہیں اور علیحدہ مدرسوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر مدرسہ ایک عورت افسر کے ماتحت ہے۔ یہاں بچے دو اور پانچ سال کے درمیان داخل ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ عورتیں، جو مختلف کارخانوں وغیرہ میں کام کرتی ہیں، اپنے ننھے بچّوں کو یہاں چھوڑ جاتی ہیں۔ ان مدارس میں دوپہر کا کھانا اور کپڑے بچوں کو مفت ملتے ہیں۔ اس رعایت کے دو مختلف اثرات ہیں۔ بعض لوگ تو اپنے بچّوں کو باقاعدہ ان مدارس میں بھیجتے ہیں تاکہ ان کو عمدہ کھانا مہیّا ہو سکے، لیکن بعض آدمی ان مدرسوں سے پرہیز کرتے ہیں، کیونکہ وُہ اپنے بچّوں کو خیرات پر پالنا پسند نہیں کرتے۔ ایسے اشخاص کے لیے دوسری قسم کے مدارس مہیّا کیے گئے ہیں۔ (۲) یہ مدارس عام طور پر ابتدائی مدارس کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں، جن میں تین سے

لیکر چھے سال تک کے بچے داخل ہوتے ہیں۔ اِن مدارس میں کھانا وغیرہ نہیں ملتا۔

اِن دونوں قسم میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد تین سے چھے سال کی عمر کے کل بچوں کی تعداد کا ۵۲ فیصدی ہے۔

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ یورپ کے مختلف ممالک میں ایسے مدارس میں کتنے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں :-

ملک	بچوں کی تعداد	عمر	آبادی کا حصہ	اخراجات کا تناسب	سال
فرانس	۹۴۶۵۱۴	۶-۳	۵۵	۵۲ فیصدی حکومت، ۸ فیصدی رومن عیسائی انجمنیں	۱۹۳۳
جرمنی	۴۲۱۹۵۵	۶-۳	۱۴	چوتھائی بلدیات، تین چوتھائی عوام کا چندہ حکومت کی طرف سے کوئی امداد نہیں	۱۹۳۱
روس	۱۳۱۸۱۶۹	۸-۳	۱۰	حکومت	۱۹۳۴
انگلستان	۶۴۲۸۶۲	۶-۳	۳۶	حکومت کی طرف سے زر امداد مقامی	۱۹۳۴

مقابلہ کرتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ لازمی تعلیم کی عمر فرانس میں انگلستان، جرمنی اور دیگر ممالک سے ایک سال بعد شروع ہوتی ہے۔

(ب) جب بچہ چھے سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ تو ابتدائی مدرسے میں حاضری لازم ہو جاتی ہے۔ اس وقت والدین کے لیے چار راستے ہیں، جن میں سے وہ کوئی ایک اختیار کر سکتے ہیں۔ (۱) بچہ مدارس عام (سرکاری) میں داخل کیا جا سکتا ہے اور اکثریت بچوں کی انھیں مدارس میں داخل ہوتی ہے۔ (۲) خانگی مدارس۔ تقریباً کل بچوں کی جو تعلیمی عمر کو پہنچ چکے ہوں، چوتھائی تعداد ان میں داخل ہوتی ہے۔ (۳) تقریباً تمام ثانوی مدارس میں ابتدائی جماعتیں ہوتی ہیں اور بعض والدین شروع ہی سے اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیج دیتے ہیں۔ بعض والدین اپنے بچوں کو مدارس عام میں چھے سے نو یا دس برس کی عمر تک بھیجتے ہیں اور پھر اس کے بعد مدارس ثانوی کے ابتدائی درجا

میں داخل کرا دیتے ہیں۔ (۴) بچوں کو گھر میں اپنے طور پر تعلیم دینے کی بھی اجازت ہے، لیکن ایسے بچوں کی تعداد بہت کم ہے، کیونکہ ایسا انتظام صرف امراء ہی تک محدود ہے۔ ایسے بچوں کی تعداد صرف ایک فیصدی ہے۔ قانون کے مطابق ایسے بچوں کا سالانہ امتحان ہوتا ہے تاکہ ان کی ترقی کا صحیح اندازہ ہو سکے، لیکن درحقیقت اس پر سختی سے عملدرآمد نہیں ہوتا۔

ذیل کے نقشے میں صرف ابتدائی تعلیم کی تقسیم دکھائی گئی ہے:-

نقشہ نمبر (۴)

عمر	عام مدارس، جن میں تقریباً کل بچوں کا تین چوتھائی حصہ تعلیم پاتا ہے۔	خانگی مدارس، جن میں ایک چوتھائی حصہ تعلیم پاتا ہے	گھر کی تعلیم، جس سے صرف ایک فیصدی طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔
۲ - ۶	کنڈرگارٹن مدارس جہاں کھانا وغیرہ مفت ملتا ہے کنڈرگارٹن مدارس جہاں کوئی چیز مفت نہیں ملتی		
۶ ۷ ۸ ۹	ابتدائی درجہ		
۹ ۱۰ ۱۱	وسطانی درجہ		
۱۲ ۱۳	اعلیٰ درجہ (ابتدائی سند)		

ابتدائی تعلیم فرانس میں لازمی اور مفت ہے اور اس کی مدت ۶ سے ۱۳ برس کی عمر ہے۔ انگلستان اور جرمنی میں یہ مدت ۱۴ برس تک ہے۔ ابتدائی تعلیم تین مختلف درجوں میں منقسم ہے۔ دیکھو نقشہ نمبر ۴۔ (۱) ابتدائی درجہ، ۵ سے ۹ برس تک۔ (۲) وسطانی درجہ، ۹ سے ۱۱ برس تک اور (۳) اعلیٰ درجہ ۱۲ سے لیکر ۱۳ برس کی عمر تک۔ ابتدائی درجے میں اخلاق، حساب، پڑھائی، لکھائی، ڈرائنگ، گانا، اصول شہریت اور کچھ تھوڑی سی تاریخ اور جغرافیہ۔ وسطانی درجے میں تقریباً وہی مضامین ہیں، صرف ذرا اونچے معیار کے مطابق پڑھائے جاتے ہیں۔ علوم طبیعیات،

ابتداعت اور دستی کام زائد کیے جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اعلیٰ درجہ جس کا مقصد زبانی اور تحریری امتحان کی تیاری ہوتی ہے، جس کے بعد سند مل جاتی ہے۔ نصاب کے تعین کرنے میں تھوڑی سی آزادی دی جاتی ہے تاکہ مضامین کو ماحول کے مطابق بنایا جا سکے۔ دیہاتوں میں لڑکے اور لڑکیاں اکھٹے پڑھتے ہیں، لیکن شہروں میں جہاں بچّوں کی تعداد کافی ہوتی ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس علیحدہ ہوتے ہیں۔

نقشہ نمبر (۵) لازمی اور مفت تعلیم کے متعلق

ملک	قانون لازمی تعلیم	موجودہ تعلیمی عمر	مفت ابتدائی تعلیم کا نفاذ	مدارس ثانوی
انگلستان	۱۸۷۰	۵ - ۱۴	۱۸۹۱	۴۰ فیصدی
فرانس	۱۸۸۲	۶ - ۱۳	۱۸۸۱	مفت تعلیم دی جانے کی آہستہ آہستہ کوشش کی جا رہی ہے۔

ابتدائی تعلیم کے خاتمے پر انگلستان کے نظام کے خلاف فرانس میں ایک امتحان منعقد ہوتا ہے۔ تحریری امتحان میں فرانسیسی انشاپردازی، تاریخ اور جغرافیہ شامل ہیں۔ انہیں مضمونوں میں ایک زبانی امتحان بھی ہوتا ہے اور گانے اور جسمانی ورزش کا بھی امتحان لیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے، بچے گیارہ برس کی عمر میں بھی اس امتحان میں شامل ہو سکتے تھے، لیکن اب بارہ برس کی عمر کم از کم مقرر کر دی گئی ہے۔ بچوں کی کافی تعداد اس رعایت سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ چنانچہ لازمی تعلیم کی آخری عمر اگرچہ قانوناً ۱۳ سال ہے، لیکن عملاً بارہ سال ہے اور پبلک مدارس کے طلبہ میں سے ۵۰ فیصدی اسی عمر میں امتحان میں بیٹھتے ہیں اور ان میں سے تقریباً ۸۰ فیصدی پاس ہو جاتے ہیں۔

نظامِ تعلیم کی کامیابی کا معیار کسی حد تک بچّوں کی باقاعدہ حاضری سے ہو سکتا ہے،

لیکن اس معاملے میں فرانس دیگر ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ مدرسے کھلنے سے پندرہ دن پہلے، والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہر کے بلدیے کے صدر کو اطلاع دیں کہ وُہ اپنے بچّوں کو کہاں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ جب بچہ اپنی تعلیمی عمر ختم کر لے، تو اُس کی اطلاع بھی صدر بلدیہ کو دینی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تشریح کرنی ہوتی ہے کہ بچّوں کی آئندہ تعلیم کا کیا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اُن بچّوں کے لیے جو گھروں پر تعلیم پاتے ہیں، لازمی ہے کہ وُہ ہر سال اُن مضامین کا امتحان دیں، جن کی تعلیم مدرسوں میں دی جاتی ہے۔

بچّوں کی غیر حاضری کی ذمّے داری والدین پر ہے اور بچّوں کو غیر حاضر رکھنے کے لیے وجوہات بیان کرنی ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے قانون نے ایک مجلس مقرر کی ہے، جس میں بلدیے کے منتخب اراکین ہوتے ہیں اور اس کا صدر یا تو خود صدر بلدیہ ہوتا ہے یا کوئی دوسرا آدمی، جس کو وہ نامزد کرے۔ یہ مجلس اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ اس کے اراکین، شہر کے باشندوں کو ترغیب دیتے رہیں کہ وُہ اپنے بچّوں کو باقاعدہ مدرسوں میں بھیجتے رہیں اور بے وجہ غیر حاضری کے لیے کیسی سزائیں مقرر ہیں۔

اس قانون کے فوری نتائج تو تسلّی بخش تھے، چنانچہ ۱۸۸۲-۸۳ء کے تعلیمی آغاز میں غیر حاضری کے واقعات بہت تھوڑے تھے، لیکن یہ فائدہ صرف وقتی تھا اور اس وقت سب سے زیادہ نقص فرانس کے تعلیمی انتظام میں یہی ہے کہ ابھی تک اس کا کلّی انسداد نہیں کیا گیا۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو مجلس اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مقرر کی گئی ہے، وہ اس کام کو نباہنے کے سراسر ناقابل ہے۔ مجلس کے اراکین یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وُہ غیر حاضر بچّوں کے والدین کو سزا دے کر ناراض کریں، کیونکہ اُنھیں کے ووٹوں پر اُن کی کامیابی کا سارا دار و مدار ہوتا ہے۔ ابتدائی انسپکٹر بھی، جو اس مجلس کا رکن ہوتا ہے، اپنے ضلع کی تمام ایسی مجالس کے معاملات میں پوری

ی حصّہ نہیں لے سکتا۔

اِس نقص کی کئی وجوہ ہیں۔ زراعتی علاقوں میں، چونکہ کھیتوں میں مزدور عام طور پر مہیّا
ں ہو سکتے، اس لیے فصلوں کے زمانے میں لڑکے وہیں کام کرتے ہیں اور والدین نومبر کے
ط سے پہلے بچّوں کو مدرسوں میں نہیں بھیجتے اور جون کے ختم ہونے سے پہلے ہی مدرسے سے
ل لیتے ہیں۔ بعض والدین غریبی کی وجہ سے بچّوں کو مدرسے میں نہیں بھیجتے، کیونکہ وہ باقاعدہ
س اور کھانا مہیّا نہیں کر سکتے اور اس لیے یہ تمام بچّے گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرتے
ہتے ہیں یا کسی کسان کے پاس تھوڑی سی رقم پر کام کرنے کے لیے بھیج دیے جاتے ہیں۔ لیکن
ی کے علاوہ ایک خطرناک وجہ اور بھی ہے۔ ملک میں دو قسم کے ابتدائی مدارس ہیں۔ ایک
رکاری اور دوسرے جو مذہبی اداروں کے ماتحت ہیں۔ حکومت نے بہت کوشش کی کہ مذہبی
رس کی زندگی ختم کر دی جائے، لیکن دوسری طرف مذہبی مدارس کے کارپرداز سرکاری مدارس کے
نص لوگوں میں پھیلانے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ اساتذہ عام طور پر انسپکٹروں کے پاس
ے شہر کے پادری کے خلاف شکایت کرتے رہتے ہیں کہ غیر حاضری کی زیادہ تر ذمّے داری اس پر
ئد ہوتی ہے۔ بعض دفعہ وُہ ایسے وقت درس شروع کرتا ہے کہ بچے مدرسہ چھوڑ کر چلے جاتے
ں۔ کئی جگہ مذہبی انجمنیں موجود ہیں، جو اس شرط پر کئی خاندانوں کو مفت کھانا اور کپڑے دیتی
ں کہ وُہ اپنے بچّوں کو سرکاری پبلک مدرسوں سے اُٹھا کر مذہبی مدرسوں میں داخل کرا دیں۔
ن شکایات کے باوجود حکومت نے ابھی تک کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا، جس سے یہ نقص
ر ہو جانے کا امکان ہو۔

ذیل کے نقشے سے اُن بچّوں کی تعداد کا پتہ چلتا ہے، جو سرکاری اور مذہبی مدارس
ں تعلیم پاتے ہیں:۔

نقشہ نمبر(۶)

ابتدائی تعلیم ۱۳ برس کی عمر تک

عمر	سرکاری مدارس		مذہبی مدارس		اندھے گونگے اور بہروں کے لیے مدارس
	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں	
۲ - ۵ برس	۴۳۰۳۳۵	۴۰۹۴۸۲	۷۷۳۴۵	۱۰۶۴۴۶	۳۷۹ لڑکے اور ۲۶۴
۶-۱۳ برس	۱۹۴۲۰۸۷	۱۸۳۳۵۵۹	۲۴۲۹۰۶	۴۸۴۱۵۲	لڑکیاں۔(تمام عمر کے)

(باقی آئندہ)

منصوبی طریق تعلیم

از

مرزا مقبول بیگ صاحب بدخشانی، بی اے

(گزشتہ سے پیوستہ)

موگہ اسکول کی تعلیم و تدریس منصوبی طریق کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ بتایا جائیگا کہ موگے کا طریق تعلیم کس طرح انسانی زندگی کے ساتھ بلاواسطہ تعلق رکھتا ہے اور اس کا نصاب کیسے بچوں کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہے اور اسکول کا کام کیونکر بچوں کے لیے دلچسپیوں کا موجب ہے۔ اس مضمون میں رسالہ نیو ایجوکیشن کے ایک مضمون "موگہ طریق تعلیم" سے استفادہ کیا گیا ہے، جس کا شکریے کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے۔

موگے کو اب اس قدر شہرت حاصل ہو چکی ہے کہ وہ اب کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ بہت سے دوسرے مشن اداروں کی طرح موگہ مشن اسکول بھی تعلیم کے میدان میں نمایاں کام کر رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس کے خاص نتائج کا تذکرہ کیا جائے، اس کے عام کوائف کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ موگا مشن اسکول کو دیہاتی مدرسوں کی تربیت گاہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ گرانڈ ٹرنک روڈ پر شہر کی باہر ہوئے بہت دور واقع ہے۔ یہ اسکول چالیس ایکڑ رقبہ زمین کو محیط ہے۔ جن میں پینتیس ایکڑ رقبہ زیر کاشت ہے۔ زمین کی غور و پرداخت لڑکے خود ہی کرتے ہیں۔ اسکول میں آٹھویں ورنیکلر مڈل تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک جے، وی

کلاس بھی اس کے ساتھ ملحق ہے۔ یہ ایک اقامتی ادارہ ہے، جہاں دو سو پچاس طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ موگے کے مضافات کے لڑکے بھی داخل ہوتے ہیں، اس لیے انھیں بعض حالات میں باہر رہنے کی بھی اجازت ہوتی ہے، لیکن وہ دن کا بیشتر حصّہ اسکول ہی میں گزارتے ہیں۔

اسکول میں بڑی اہم بات آپ ایک یہ دیکھیں گے کہ یہاں کوئی بھنگی، چپراسی، چوکیدار غرض کہ کوئی کمین موجود نہیں ہے۔ سارے کام طلبہ خود انجام دیتے ہیں۔ اسکول اور بورڈنگ کے کمرے خود جھاڑتے پونچھتے ہیں۔ روٹی آپ پکاتے ہیں۔ کپڑے آپ دھوتے ہیں۔ اسکول کی ڈاک کا انتظام بھی خود کرتے ہیں۔ وہی ڈاک خانے سے جا کر ڈاک لاتے ہیں اور اساتذہ اور طلبہ میں تقسیم بھی وہی کرتے ہیں اور جو خطوط بھیجنا ہوں، وُہ بھی طلبا ہی لے کر جاتے ہیں۔ یہ کام سب طالب علم باری باری سرانجام دیتے ہیں۔ اسکول کی ایک پنچایت ہوتی ہے۔ ہر مہینے کے شروع میں یہ پنچایت مختلف طلبا کو مختلف فرائض سپرد کر دیتی ہے۔ یہ پنچایت طلبا ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں پانچویں سے لے کر آٹھویں جماعت تک کے نمائندے شامل ہوتے ہیں۔

ہر نمائندے کو کچن، حفظانِ صحت، بیماروں کی تیمارداری وغیرہ کے فرائض سپرد کیے جاتے ہیں۔ مہینے کی آخری تاریخ کو یہ پنچایت ایک جلسہ کرتی ہے اور گزشتہ مہینے کے کام کاج پر غور کرتی ہے۔ ہر نمائندے سے کہا جاتا ہے کہ اپنی اپنی رپورٹ پیش کریں۔ جب رپورٹیں پیش ہو چکتی ہیں، تو پنچایت دوسرے مہینے کے لیے کام نمائندوں کے سپرد کر دیتی ہے۔

پنچایتوں کے اجلاسوں میں ایک خاص بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس میں سٹاف کا کوئی رکن ان کی رہنمائی کے لیے شمولیت نہیں کرتا۔ یہ تمام کام طلبا خود ہی کرتے ہیں۔ پرائمری سے مڈل تک کے نمائندے اور بے، وی، کے نمائندے باہمی تعاون سے ان اداروں کو چلاتے ہیں۔

طلبا اپنے حق رائے دہی کو بڑی قابلیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور مجلسوں میں بڑی

گرمجوشی سے شریک ہوتے ہیں۔ پنچایت بھی انتخاب کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے۔ ہر سال جدید انتخاب ہوتے ہیں۔ اسکول کے اساتذہ اور طلبہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ گوشوارے بنانے میں صرف کرتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں اسکول کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ اس ادارے میں "اپنی مدد آپ کرو" کا لائحۂ عمل جاری ہے۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، یہ اسکول چالیس ایکڑ رقبہ زمین کو محیط ہے۔ جن میں پینتیس ایکڑ رقبہ زیر کاشت ہے۔ ان میں تین ایکڑ طلبہ کے ذاتی قطعات ہیں۔ چوتھی جماعت اور اس سے اُوپر کی جماعتوں کے طالبعلموں کے علیحدہ علیحدہ قطعے ہوتے ہیں۔ ان میں وُہ بیج بوتے ہیں اور سرمایہ بہم پہنچانے کی خاطر پیداوار کو فروخت کر دیتے ہیں۔ ان قطعوں کی نگہداشت صرف وہی طلبہ کرتے ہیں، جو ان کے مالک ہوں۔ اسکول کی طرف سے یہ قطعات چھے مہینے کے لیے بارہ آنے کے برائے نام مالکانہ پر طلبہ کو ملتے ہیں۔ آبیانہ اور مالیہ بھی انھیں بارہ آنوں میں شامل ہوتا ہے۔ طلبہ اپنے لیے آپ بیج اور پود وغیرہ خریدتے ہیں۔ صرف سبزی ترکاری ہی ان کا ذریعہ آمدنی نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ آمدنی کے اور بھی ذرائع ہوتے ہیں: مثلاً اسکول کے کھیتوں میں کام کرنا۔ اسکول کے دوسرے کام کرنا، اسٹاف کے اراکین اور ان کے ملاقاتیوں یا سیاحوں کے لیے شخصی طور پر کام کرنا۔ (ٹینس کے بال اُٹھانا، پیغام لے کر جانا اور دیگر متفرق کام) طلبہ کو مقررہ نرخوں کے مطابق معاوضہ مل جاتا ہے۔ مختلف جماعتوں کے لیے یہ نرخ مختلف ہیں اور یہ نرخ ایک پائی فی گھنٹہ سے تین پائی فی گھنٹہ تک ہوتے ہیں۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو یہ طالب علم اپنی اپنی نوٹ بُک پیش کر دیتے ہیں۔ ان میں اُن لوگوں کا نام درج ہوتا ہے، جنھوں نے ان سے کام کرایا ہو۔ کام کی نوعیت اور تفصیل بھی ان میں لکھ دی جاتی ہے۔ بعد ازاں انھیں معین نرخوں کے موافق

معاوضہ مل جاتا ہے۔ طلبہ گوشوارے بناتے ہیں اور اساتذہ ان کے حسابات پر نظر ثانی کر دیتے ہیں
پہلی تاریخ دن بھر یہی کام ہوتا ہے۔ اس دن اسکول کا ایک عام جلسہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ پنچایت
اس میں اپنی رپورٹ پیش کر دیتی ہے اور مہینہ بھر کے لیے فرائض تقسیم کر دیتی ہے۔

دوسری بات جو خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، وہ کنڈر گارٹن ہے۔ کنڈر گارٹن کا
انتظام ایک اُستانی کے ہاتھ میں ہے اور ساڑھے تین سال سے پانچ سال تک کے بچے اس کلاس
میں داخل کیے جاتے ہیں۔ امسال اس جماعت میں بیس طالب علم ہیں۔ یہ جماعت ایک علیحدہ
مقام پر ہے اور اسکول سے کافی فاصلے پر۔ ایک کمرہ ہے، جس کے دونوں طرف ایک برآمدہ ہے
کمرے میں ایک بڑا سا جنگلہ بھی ہے، اس میں لڑکوں کے شغل کے لیے ریت اور مٹی کے ڈھیر لگے
رہتے ہیں۔ کمرے میں کھلونے اِدھر اُدھر پڑے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تین پہیوں والی سائیکلیں
ہاتھ گاڑیاں وغیرہ اشیا اِدھر اُدھر نظر آتی ہیں۔ دیواروں پر رنگدار تصویریں بھی آویزاں ہوتی ہیں۔
یہ تصویریں طلبا کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔ کمرے کے اندر ایک گھاس کا تودہ بھی ہے۔ الماریوں
کے خانوں میں پُرانے اخبار دھرے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کاغذوں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔
میز پر برش، گھلے ہوئے رنگ، قینچیاں، پنسلیں اور ان کے علاوہ اور بہت سی اشیا پڑی
رہتی ہیں، جو دن بھر کے شغل و تفریح میں کام آتی ہیں۔ کنڈر گارٹن جماعت میں ڈھائی گھنٹے کام
ہوتا ہے۔ سرما میں اسکول کا کام نو بجے شروع ہو جاتا ہے اور ساڑھے گیارہ بجے تک ہوتا رہتا
ہے۔ پہلا نصف گھنٹہ یا زائد آزادانہ عمل و حرکت کا ہوتا ہے۔ طالب علم خوشی خوشی آتے ہیں
اور کام کرنے لگتے ہیں۔ بعض ان میں سائیکلوں پر سوار ہو کر گراؤنڈ کا چکر کاٹنے میں مصروف ہو
جاتے ہیں۔ بعض کھلونے لے کر کھیلنے لگتے ہیں۔ بعض اپنے اپنے برش لے کر اپنے خیالات کے
مطابق تصویریں بنانے لگتے ہیں۔ بعض پُرانے اخبار سے تصویریں کاٹتے ہیں۔ اُستاد ساتھ ساتھ

طلبا کی حوصلہ افزائی کیے جاتے ہیں۔ دس بجے اُستاد گھنٹہ بجا دیتا ہے اور سب بچے کمرے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر طالب علم اپنے لیے ایک ایک چٹائی کا ٹکڑا زمین پر بچھا لیتا ہے اور سب کے سب ایک حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُستاد اُن کے سامنے ہو بیٹھتا ہے اور مختصری دُعا اُردو زبان میں پڑھنے لگتا ہے۔ پھر سب لڑکے ایک آواز میں اسے گانے لگتے ہیں۔ دُعا کے خاتمے پر اُستاد حاضری لیتا ہے۔ اس کے فوراً بعد طلبا کے لباس کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ صفائی کا ایک چارٹ دیوار پر آویزاں ہوتا ہے۔ اس کے اُوپر طلبا کے نام لکھے ہوتے ہیں اُستاد ایک طالب علم کو ساری جماعت کے سامنے کھڑے ہونے کا حکم دیتا ہے اور باقی طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کے لباس کی ہیئت پر غور کریں۔ اِس طرح سب لڑکے باری باری کھڑے ہوتے ہیں اور دوسرے ان کے ملبوسات پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ لڑکے نہایت متانت سے ایک دوسرے کے لباس کا معائنہ کرتے ہیں اور بے رو و رعایت اس کے صاف ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ جو طلبہ صفائی کے معیار پر پورے اُتریں اور ان کے پاس صاف رومال بھی ہوں، تو چارٹ میں ان کے نام کے ساتھ صفائی کا نشان لگا دیا جاتا ہے، جو طلبا صفائی کے معیار پر پورے نہیں اُترتے، ان کے نام کے ساتھ ایک مخالف نشان درج کیا جاتا ہے۔ اگر کسی طالب علم نے صاف ستھرے کپڑے تو پہن رکھے ہیں، لیکن رومال اس کے پاس نہیں، تو اس کے نام کے ساتھ بھی وہی مخالف نشان درج کیا جاتا ہے۔ لباس کا معائنہ ہر روز ہوتا ہے۔ چارٹ مہینہ بھر دیوار پر آویزاں رہتا ہے۔ دوسرے مہینے کے شروع میں یہ چارٹ بدل لیا جاتا ہے۔ ہر طالب علم اچھی طرح سے جان لے سکتا ہے کہ مہینہ بھر وہ کتنی مرتبہ ستھرے لباس میں آیا اور کتنی مرتبہ میلے لباس میں۔ اس جانچ سے بچوں میں چھوٹی عمر سے ہی صفائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں بڑی ہی مفید اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ اتنی عمر کے

بچے کو رومال رکھنے کی عادت ڈال دی جائے تو طالب علم اور اُستاد دونوں کے لیے یکساں ہے۔ عام پرائمری مدارس کے حالات کا اندازہ کریں، تو ہمیں یہ معلوم کرکے دکھ سا ہوتا ہے کہ طلبہ میں صفائی کا احساس سرے سے ہے ہی نہیں۔ صفائی کی جانچ چند منٹ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُستاد طالب علم سے کوئی کہانی سُنانے کو کہتا ہے، جو اُس نے گھر یا اسکول میں مطالعہ کی ہو۔ اس اثنا میں اُستاد خود بھی دلچسپ کہانیاں سناتا رہتا ہے۔ یہ داستان گوئی کا گھنٹہ ختم ہو چکتا ہے تو اُستاد بچوں کو کھلی جگھوں میں لے جاتا ہے، وہاں پہنچ کر بچے اپنی اپنی دل لگی کے کھیل کھیلنے لگتے ہیں۔ گیت بھی گاتے ہیں۔ اُستاد خود بھی ان کی نغمہ طرازیوں میں شریک ہوتا ہے۔ خود بھی گاتا ہے۔ گیت یا کھیل کا کوئی حصّہ جہاں جہاں وُہ بھولتے ہیں بتاتا بھی ہے۔ اس گھنٹے میں محنت بھی خاصی ہو جاتی ہے، اس لیے اس کے بعد آرام کا گھنٹہ ہوتا ہے۔ لڑکے اپنی اپنی چٹائیوں پر آکر دراز ہو جاتے ہیں۔ ہونٹ بھی بند کر لیتے ہیں اور آنکھیں بھی اور سکون و راحت کے عالم میں پڑے رہتے ہیں۔ کوئی طالب علم کانا پھوسی کا ارادہ کرے یا کانا پھوسی کرنے لگے، تو اُس کا ہمسایہ اسے جگہ سے اُٹھا دے سکتا ہے۔ کوئی شریر بچہ اگر اپنی ضد پر اڑا رہے، تو اُسے سزا کے طور پر کمرے کے کونے میں کھڑا ہو جانے کا حکم ملتا ہے اور دوسرے نہایت عافیت کے ساتھ لیٹے رہتے ہیں۔ بچوں کو ورزش کے بعد آرام ملتا ہے۔ ان کے لیے یہ آرام گویا اجتماع میں خاموش رہنے کی تربیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کا گھنٹہ تصویر بنانے کا ہوتا ہے۔ بچے اپنی چھوٹی چھوٹی میزیں اُٹھا کر برآمدے میں جا رکھتے ہیں۔ کاغذ اور رنگ اُنھیں دے دیے جاتے ہیں۔ اور اُنھیں یہ اختیار ہوتا ہے کہ جو تصویر جی میں آئے بنائیں۔ تصویر چاہے کسی کہانی سے متعلق ہو چاہے خیالی ہو۔ یہ تصویر بنانے والے کے ذوق اور ارادے پر منحصر ہے۔

کچھ عرصے تک یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے بعد قطعات زمین کو صاف کرنے، کیے

میں جھاڑو دینے، عمارت کے سامنے سے کاغذوں کے ٹکڑے اور پتے اُٹھانے کا کام شروع ہوتا ہے۔ کنڈرگارٹن جماعت میں بچّوں کا کام یہی ہوتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے اپنی محنت ختم کر کے بچے اسکول سے واپس ہو لیتے ہیں۔

طریقِ تدریس پرائمری اور مڈل کی جماعتوں کے طریقِ تدریس کے متعلق دو ایک اہم امور کا ذکر کیا جائیگا۔ اسکول میں "پڑھنا" ابجد کے 'واسطے' سے نہیں سکھایا جاتا، یعنی، الف، بے، ج کا درس نہیں دیا جاتا، بلکہ شروع ہی سے اُنھیں فقروں کے ذریعے سے پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ فقرے کہانی یا تصویر سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایک تصویر، جس میں طالب علم کے مشاہدے کے ساتھ تعلق رکھنے والی اشیا یا منظر ہوں، اُسے دکھائی جاتی ہیں اور پھر اس سے دریافت کیا جاتا ہے، اس تصویر میں تم کیا کیا دیکھتے ہو؟ تصویر عام طور سے ایسی ہوتی ہے کہ اس میں جو کچھ ہو، وہ بچّہ ایک ہی فقرے میں کہہ دے سکے۔ مثلاً: "یہ برکت ہے"۔ "یہ برکت کا گھر ہے"۔ "برکت کی مُرغی انڈا دیتی ہے"۔ "برکت انڈا کھاتا ہے" وغیرہ۔ پھر بچّے کو ایک دوسرا چارٹ دیا جاتا ہے۔ اس میں جس مضمون کی تصویر دی ہو، اس مضمون کا فقرہ نیچے چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح بہت سی تصویریں اس کی نظر سے گزرتی ہیں، جن میں بچّوں کے دیکھے ہوئے گھروں کے منظر، اشیا اور حیوانوں کی تصویریں کھنچی ہوتی ہیں اور ان سے متعلق فقرے بھی نیچے لکھے ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بچے ان فقروں کا تصویروں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ پھر اس منزل کے بعد دوسری منزل آتی ہے۔ تصویریں نظر کے سامنے سے ہٹالی جاتی ہیں اور صرف فقرے کاغذ پر لکھ دیے جاتے ہیں۔ بچّے ان فقروں کو پڑھنے اور سمجھنے لگتے ہیں۔ پھر ایسے فقرے بھی لکھے جاتے ہیں، جن میں ایک ایک یا دو دو الفاظ مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ طالب علم میں الفاظ پہچاننے کی صلاحیت پیدا

ہوجائے۔ وہی فقرے اُستاد تختۂ سیاہ پر لکھ دیتا ہے اور وہی فقرے ان کی پرائمر میں موجود ہوتے ہیں۔ خاکی رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹوں پر سادے اور سہل فقرے لکھ دیے ہیں اور بچّوں کو دے دیے جاتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ خاص خاص چٹیں نکالیں کے بعد اُنھیں اور چٹیں دی جاتی ہیں، ان پر فقروں کے بجائے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کی مدد سے فقرے بنانے ہوتے ہیں۔ بچّوں کی اُردو تدریس گویا اس طور سے ہو تدریس کے اس طریق میں یہ خوبی ہے کہ بچے ایسے متن سے پڑھنا شروع کریں، جو کوئی معنی رکھتا ہو الف، بے، ج کی طرح معنی سے خالی نہ ہو۔ بچّوں کے نزدیک الف، بے، ج، د کے معنی نہیں ہوتے۔ "یہ برکت کا گھر ہے"۔ "برکت کی مرغی انڈا دیتی ہے"۔ "برکت انڈا کھاتا ہے" "انڈا سفید ہے" اور اس قسم کے دوسرے فقرے اپنے اندر معنی رکھتے ہیں اور ایسے معنی کو بھاتے ہیں۔ بچّوں کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان فقروں کو پڑھ لیں اور زبانی ایک دوسرے سے کہنے سننے لگیں۔ اس صورت سے زبانی اظہار کا اچھا خاصہ استعمال ہونے لگتا ہے۔ اس طریق تعلیم میں ایک اور بات یہ بھی ہے کہ "لفظ" پیشتر اس کے کہ تحریر میں آنے والے ذریعۂ الفاظ میں آجائیں، بولنے والے ذریعۂ الفاظ میں آنے چاہییں۔ اس طرح بچّے ایک خیال کو زبانی سُنا دیتے ہیں، جو بعد میں اُنھیں کاغذ پر لکھا ہوا ملتا ہے ایک لفظ سُنتا ہے۔ یہ لفظ اس کے بولنے والے الفاظ کے ذخیرے میں شامل ہوتا ہے۔ پھر لفظ کو وُہ کاغذ پر سے پڑھتا ہے۔ بعد میں وہ اسی لفظ کو خود لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طریق کی مختصر سی تاویل گویا یہ ہے۔ موگے کے اسکول میں ایسی پرائمروں کے ذریعے سے تعلیم شروع کرائی جاتی ہے، جو خاص اسی غرض کے لیے تیار کی گئی ہیں۔ یہ پرائمریں دلچسپ بھی ہوتی ہیں ان میں کھیل اور تفریح کے موضوع بھی ہوتے ہیں۔ طلبہ مختلف تصویروں میں مختلف رنگ بھرتے

انھیں قینچی سے کاٹ لیتے ہیں اور ان فقروں کے ساتھ ٹانک دیتے ہیں، جو ان تصویروں سے متعلق ہوں۔ پہلے سال سہل سی کہانیاں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ کہانیاں مشکل ہوں اور اُنھیں بار بار دہرایا جائے۔ "خاموش مطالعہ" اور "بلند آواز کا مطالعہ" بچے شروع ہی میں سیکھ جاتے ہیں۔ بچے ایسے کام میں یقیناً فرحت محسوس کرتے ہیں اور خوشی خوشی نئی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ یہ باتیں الف، بے، ج، د کی تدریس میں کہاں ملینگی!

موگہ اسکول میں مختلف مضامین کی تدریس کے طریق مختلف ہوتے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کی تفصیلات بیان کر دینا مشکل بات ہے۔ ان کے نصاب میں دوسرے مضامین کے علاوہ کاروباری لین دین بھی شامل ہوتا ہے۔ اسکول کا مطمح نظر یہ ہے کہ طالب علم پوری طرح سے تیار ہو کر دیہات میں کام کر سکیں، اِس لیے نصاب میں دیہات کے بعض ضروری شعبوں کی تربیت بھی شامل کر دی گئی ہے۔ پہلی سے تیسری جماعت تک ہاتھوں کا استعمال بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔ بچے تصویریں بناتے ہیں۔ مٹی کے ماڈل تیار کرتے ہیں۔ وصلی[1] کے نمونے بناتے ہیں۔ بُننا سیکھتے ہیں اور کاغذ وغیرہ کاٹنے کا علم ہوتا ہے۔ چوتھی سے اُوپر کی جماعتوں میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ ایک نہ ایک آرٹ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھیں اس آرٹ کے مبادیات میں عملی تربیت دی جاتی ہے۔ جوتا بنانا چوتھی جماعت کے طلبہ کو سکھایا جاتا ہے اور کپڑے سینا پانچویں کے طلبہ کو۔ بڑھئی کا کام چھٹی کے طالب علم کو۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے اپنے اپنے مذاق کے موافق ان میں سے ایک کو انتخاب کر لیتے ہیں اور اسی میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ جے وی کی جماعت کو جلد سازی اور درزی کا کام سکھایا جاتا ہے۔

ان امور کے علاوہ ایک خاص طریق بھی ہے، جو اس اسکول میں رائج اور بہت مشہور ہے۔ اسے پراجیکٹ یا منصوبی طریق تعلیم کہتے ہیں۔ اس طریق کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن

[1] پنجابی میں گتّا کہتے ہیں۔

موگے کے لوگ ڈاکٹر کلپیٹرک کی تعریف کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، ذیل کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے:۔

"منصوبہ ایک مکمل مسئلے کا نام ہے، جسے بچے کو قدرتی حالات میں اپنے ولی رجحان اور ذاتی فہم وادراک سے حل کرنا ہوتا ہے۔" اس طریق تعلیم کی وضاحت کے لیے ذیل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

موگے کے نصاب خاص میں جو موگہ اسکول میں اکتوبر ۱۹۳۵ء سے دسمبر ۱۹۳۵ء تک جاری رہا، اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹروں کو ایک ماہ تک ایک گھنٹہ روز کے لیے اسکول میں تدریس کی مشق کرنے کا اتفاق ہوا۔ موگے اسکول کی چوتھی جماعت تین گروہوں میں منقسم تھی۔ ان طالب علموں کو انسپکٹروں کے تین گروہ تعلیم دیتے تھے۔ بچوں کو کامل اختیار تھا کہ اپنے لیے جو کام چاہیں انتخاب کرلیں۔ پہلے گروہ کے لیے انسپکٹروں کے گروہ نے تصویروں کے دو سٹ تیار کیے، جو مختلف ذرائع رسل ورسائل اور مختلف عمارتوں پر مشتمل تھے۔ منصوبی کام کے گھنٹے میں یہ چارٹ کمرے کے ایک طرف کی دیوار پر لٹکا دیے جاتے تھے۔ نمونے بنانے کیلیے مٹی، برش اور رنگ تصویر کشی کیلیے، وصلی، لکڑی، کیلیں اور اوزاروں کا ایک سٹ ایک کونے میں رکھے تھے۔ کتابیں اور تصویر دار رسالے دوسری طرف ترتیب کے ساتھ رکھے تھے تاکہ ان کے پیش نظر طلبا اپنے لیے خود کوئی کام تجویز کرلیں، جو ان کے لیے دلچسپی کا موجب ہوسکے۔ اُستاد جب طلبا کو اکھٹا ہونے کا مقصد بتا چکتا تھا، تو وہ فوراً ہی دلچسپی اور شوق کے ساتھ مختلف کونوں کو دوڑ پڑتے تھے اور تصویروں اور کتابوں کے مطالعے میں خوشی خوشی وقت گزارتے۔ اُستاد ان کے ساتھ ساتھ چلتا اور بعض بعض مقامات پر مختلف باتوں کے متعلق تھوڑی بہت گفتگو کرکے ان کی خواہش دریافت میں اضافہ کردیتا۔ بچے اکثر "کیوں" اور "کس طرح" سے غذر بپا کردیتے۔

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ طلبا اپنی خواہشِ دریافت کی تسکین کے لیے کس درجہ بیتاب ہیں۔ کچھ وقت جب اس مفید مشغلے میں گزر جاتا، تو اُستاد ان سب طلبا کو اکٹھا کرتا اور اُن سے دریافت کرتا کہ جماعت کے کام کے لیے کوئی موضوع تجویز کریں۔

ذیل کی فہرست ظاہر کرتی ہے کہ ان کے مشاغل میں کس قدر تنوع پایا جاتا ہے۔ ہر طالب علم یہ بھی بتاتا تھا کہ جو مشغلہ اس نے تجویز کیا ہے، اس کے لیے اس کے پاس کیا دلائل ہیں :۔

۱۔ کھیتی باڑی کے اوزار بنانا۔

۲۔ ہل کا پھار بنانا۔

۳۔ کچّی اینٹوں سے خدا کا گھر بنانا۔

۴۔ وصلی سے خدا کے گھر کا نمونہ تیار کرنا۔

۵۔ خدا کے گھر کو آراستہ کرنا۔

۶۔ مسیحیت کے متعلق کوئی ڈراما تیار کرنا۔

۷۔ کچّا مکان بنانا۔

۸۔ تصویروں کا مرقع تیار کرنا۔

۹۔ کرسمس کی تقریب پر پھول بنانا۔

۱۰۔ ڈاکٹر ہارپر کے بنگلے کا معائنہ کرنا۔

۱۱۔ کیلنڈر تیار کرنا۔

۱۲۔ ریلوے کے متعلق معلومات حاصل کرنا۔

۱۳۔ طیاروں کے متعلق علم حاصل کرنا۔

۱۴- گھروں کی تصویریں بنانا۔

۱۵- دخانی جہازوں کے متعلق واقفیت پیدا کرنا۔

اِن تمام موضوعات پر فرداً فرداً بحث وتمحیص بھی ہوتی ہے۔ بعض اچھی باتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اُستاد ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ طلبا کی خواہش دریافت کو ابھارے اور ہر ممکن مدد دیتا ہے کہ وُہ ذاتی اظہار خوبی کے ساتھ کر سکیں۔ منطقی دلیل کو ترقی دینے کے لیے پھر اُستاد جماعت کی مدد سے وسعت بھی دے دیتا ہے۔ اس سے طلبا کو مشق ہوتی ہے کہ اپنے علم میں خاص نظم وترتیب پیدا کرلیں۔ انجام کار ذیل کے چار موضوعات تیار کیے گئے:-

۱- کھیتی باڑی کے اوزار۔

۲- مکانات۔

۳- ذرائع رسل ورسائل۔

۴- ڈراما۔

اِن موضوعات کے حسن وقبح پر بحث ہوئی۔ اُستاد نے ہوشیاری سے طلبا کو رضامند کر لیا کہ خفیہ طور پر اپنی اپنی رائے دیں۔ مسز ہار پر صدر تھیں۔ آرا شماری کا نتیجہ حسبِ ذیل تھا:-

کھیتی باڑی کے اوزار	۱
مکانات	۲
ڈراما	۳
ذرائع رسل ورسائل	۳

اس کے بعد پھر ڈرامے اور ذرائع رسل ورسائل کے تصفیے کے لیے آرا شماری ہوئی

اور ڈرامے کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اس صورت میں اکثریت کے سامنے جُھک جانے کی اخلاقی اہمیت بھی بچّوں کو معلوم ہو گئی۔

بچّوں کو ہاتھ کے کام میں مشق دلانے کے لیے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ڈرامے کی کہانی جو اُنھوں نے اپنے لیے انتخاب کر لی ہے، رنگوں کے ذریعے ظاہر کریں۔ گویا ہاتھ سے ڈرامے کے متن کی تصویریں بنائیں۔ جب تصویردار کہانیوں کے حسن و قبح پر بحث ہو چکی، تو جماعت نے فیصلہ کیا کہ ڈراما حضرت یوسف کی مشہور کہانی کے متعلق ہونا چاہیے۔

ڈرامے کے انتخاب نے طلبا میں ایک نئی روح پھونک دی۔ لائبریری کی طرف دوڑنے لگے کہ وہ کتابیں نکلوائیں، جو اُنھیں حضرت یوسف کی زندگی کی تفصیلات سے آگاہ کر سکیں۔ "بائیبل" تصویردار بائیبل کی کہانیوں کی کتاب"۔ "بچوں کی بائیبل" اور رسائل کی اوراق گردانی شروع کر دی تاکہ اُنھیں کافی معلومات مہیا ہو سکیں۔ جماعت کی معاونت سے کہانی کا خاکہ تیار کیا گیا۔ ڈراما لکھنے کا کام تین دن تک اسکول کے اوقات میں جاری رہا۔ ڈرامے کے منظر لکھنے کیلیے اسکول کے اوقات کے علاوہ بھی کام ہوتا تھا۔ اُستاد کی رہنمائی میں ترمیم و تنسیخ کے بعد ڈراما تیار ہو گیا۔ جماعت میں ڈرامے کی بار بار مشق کی گئی تاکہ معلوم ہو سکے کہ خاص خاص تمثیل کے لیے کون کون سے ایکٹر موزوں ہوں گے۔ ایک دن ایک گرمجوش طالب علم نے مشورہ دیا کہ ڈراما سارے مدرسے کے سامنے کھیلا جائے۔ اس کا یہ مشورہ سب نے پسند کیا۔ طلبا نے پس منظر کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ طلبا کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان میں سے ہر ایک اُستاد کی رہنمائی میں منظر تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ملبوسات کے معاملے پر کافی عرصہ بحث و تمحیص ہوئی اور ضروری لباس خرید لیے گئے۔ ڈراما اسکول کے طلبا اور گاؤں کے لوگوں کے سامنے کھیلا گیا اور طلبا کو اس میں بہت کامیابی ہوئی۔ ناظرین بہت محظوظ ہوے۔

پنجاب کے اسکولوں میں تدریس تاریخ

از

لالہ بشن داس صاحب ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہمارے اسکولوں میں جو درسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ بہت حد تک صحیح حالات کو ہم سے پوشیدہ رکھتی ہیں۔ تاریخ کی تعلیم کا مدعا لڑکوں کو اپنے بزرگوں کے خلاف نفرت سکھلانا نہیں بلکہ ان کی عزت کرنا سکھلانا ہے۔ ہمارے بزرگ کم عقل نہیں تھے۔ جو لوگ ویدوں، شاستروں اور اُپنشدوں کے مصنف ہو سکتے ہیں یا شیرشاہ جیسے منتظم ہو سکتے ہیں، ان کو معمولی انسان سمجھنا غلطی ہے۔ اگر ہمارے طلبا یہ پڑھتے ہیں کہ ریل، تار، ریڈیو وغیرہ ہندوستان میں اب ہی رائج ہوئے ہیں، تو انھیں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ دنیا کے کسی ملک میں بھی آج سے سو سال پہلے ان چیزوں کا وجود نہیں تھا۔ یہ اُنیسویں یا بیسویں صدی کی ایجاد ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ان کا ہندوستان میں عدم وجود ہمارے قدیم بادشاہوں کی ناقابلیت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی تاریخ کے ساتھ دُنیا کی تاریخ کا کچھ کچھ ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

اب ہم مدرس کے ایک اور اہم فرض کو لیتے ہیں اور وہ ہے طلبا میں تاریخی کتب کے عام مطالعے کا مذاق پیدا کرنا۔ ایک دن میں نے دسویں جماعت کے چند طلبا سے دریافت کیا کہ تم اپنا تاریخ کا سبق کس طرح یاد کرتے ہو۔ اس پر جو دو چار دلچسپ جواب مجھے ملے، وہ ذیل میں درج ہیں:-

۱۔ ایک سبق کو اپنی کتاب سے پڑھ کر اس سبق کے متعلق دوسری کتابوں کو پڑھتا ہوں۔ مشکل الفاظ کے معانی لغات سے دیکھ لیتا ہوں اور پھر ہر ایک پیراگراف کو مختصر طور پر لکھ لیتا ہوں۔

۲۔ ہر ایک پیراگراف یا صفحے کو پڑھ کر اس کو اختصار کے ساتھ قلمبند کر لیتا ہوں اور پھر ایک ایک بات یا واقعے پر اپنے دل میں بحث کرتا ہوں۔ ازاں بعد سارے حالات پھر کتاب سے پڑھتا ہوں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ سب کچھ ذہن نشین ہو گیا ہے یا نہیں۔ شہروں اور دیگر مقامات کو اٹلس سے دیکھ لیتا ہوں۔

۳۔ اپنے آپ کو اس بادشاہ یا جرنیل کی جگہ فرض کر لیتا ہوں، جس کا ذکر پڑھ رہا ہوتا ہوں اور پھر سب حالات کا نقشہ اپنے دل میں باندھتا ہوں۔ شہروں اور علاقوں کا محل وقوع اٹلس میں دیکھ لیتا ہوں ..... وغیرہ وغیرہ۔

مدرس کا کام ہے کہ وہ اپنے اسکول یا چند دیگر تعلیمی اداروں کے متعلمین سے ان کے تاریخی کتب کے مطالعے کے طریقوں کو غور سے سنے اور پھر اپنے فرض کو پہچانے اور اپنے طلبا میں مطالعہ کرنے کے اچھے طریقے پیدا کرے اور ان کو مفید مطلب نصائح دے۔ مثلاً

طالب علم کو چاہیے کہ اپنے مطالعے کے لیے خاص وقت اور خاص جگہ مقرر کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس جگہ مکمل خاموشی طاری ہو، لیکن شور یا دخل اندازی کا کم ہونا ضروری ہے۔ معمولی شور میں بیٹھ کر پڑھنے کی عادت سی پڑ جاتی ہے اور خلل انداز نہیں ہوتا۔ لاہور کے باغات میں ہزاروں طلبا مطالعے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک سے بے شمار موٹریں گزرتی رہتی ہیں، لیکن انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا کی قوت ارادی مستقل ہو، لیکن ایسا نہ ہو کہ دس منٹ پڑھ کر پھر اِدھر اُدھر کی باتیں سننے لگے اور پانچ منٹ پڑھ کر اس کی توجہ منتشر ہو جائے۔ لازمی ہے کہ تاریخ کے سبق کے وقت طالب علم نفس

مضمون سے بخوبی واقف ہو۔ جب تک مسافر کو منزلِ مقصود ہی کا علم نہ ہو، آگے بڑھنا فضول ہے۔ اس کے بعد طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اپنی کتاب میں دیے ہُوئے ضروری حالات سے اچھی طرح واقف ہو جائے۔ بعض نہایت ضروری سطروں کے نیچے نشان لگا لینا بہت مفید ہوتا ہے۔ بعض طلبا یہ غلطی کرتے ہیں کہ لکیریں کھینچ کھینچ کر صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح خاص ضروری حصّوں کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ واضح رہے کہ صرف انھیں سطروں کو مخصوص کیا جائے، جو نہایت ضروری ہوں۔ اس کے بعد کتاب بند کر کے ان حالات کو خود ہی یاد کرنے یا دہرانے کی کوشش ہونی چاہیے اور پھر اصلی کتاب سے مقابلہ کیا جائے۔ جب سبق اچھی طرح یاد ہو جائے، تو دوستوں کے ساتھ اس کے متعلق بات چیت کرنی چاہیے۔ خیالات کو ذہن نشین کرنے کے لیے اعادہ نہایت ضروری ہے۔ بعض دفعہ جب طالب علم فارغ ہو، تو پڑھے ہُوئے سبق کو ذہن میں پھر دُہرانے کی کوشش کرے۔ واقعات کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق یاد رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اُستاد کا فرض ہے کہ تاریخ کے واقعات کا آپس میں تعلق ظاہر کرے۔ مثلاً ہرش کا حال پڑھاتے وقت اس امر کا ذکر کیا جائے کہ اس کے عہد ۶۲۲ء میں حضرت محمدؐ صاحب نے ہجرت کی تھی۔ جس سے سنِ ہجری شروع ہوا اور مسلمانوں کی طاقت بڑھنی شروع ہُوئی۔

مدرس کو چاہیے کہ وُہ دورانِ تعلیم میں تاریخ کو اس انداز سے نہ پیش کرے کہ ہندو، مسلمان، سکھ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔ ہمارا کام نفرت پھیلانا نہیں۔ محبت بڑھانا ہے۔ ہندو یا سکھ بچے بعض مسلمان بادشاہوں کے نام نہاد مظالم کی داستان سُن کر اپنے مسلمان دوستوں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اوّل تو اب کئی ایسی داستانیں غلط ثابت ہو رہی ہیں۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب کے متعلق ایک بہت ضخیم کتاب لکھی ہے اور اُس نے

یق سے ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے بہت سے الزامات بےبنیاد ہیں۔ تاہم اس میں
م نہیں کہ اس زمانے میں یا اس سے پیشتر دنیا کے ہر حصے میں مذہب کے نام پر اکثر مظالم ہوتے
ے۔ یورپ میں عیسائیوں کے دو فرقے ایک دوسرے کے کٹر دشمن تھے۔ رومن کیتھولکس لوگوں
بشیر بندشیں تھیں، جو آخر ۱۸۲۹ء میں ہی دور ہوئیں۔ میرے خیال میں مدرس کا فرض ہے کہ وہ
یسے واقعات مذہبی تعصب کی رنگت دے کر پیش کرنے کے بجائے ایک پولیٹکل چال کی شکل
ے کر پیش کرے۔ گویا ہندوستان میں بعض مسلمان بادشاہوں کی سختیاں مذہبی تعصب پر مبنی
تھیں، بلکہ بعض پولیٹکل اغراض کو مدِّنظر رکھ کر کی گئی تھیں اور کسی حد تک یہ ہے بھی درست۔

انگلستان کی تاریخ پڑھاتے وقت وقتاً فوقتاً ہندوستان کی اس وقت کی حالت کا ذکر
رنا ضروری ہے اور بعض دفعہ تو ایسا مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً آسٹروی تخت نشینی کی جنگ،
فت سالہ جنگ وغیرہ کا حال آپ ہندوستان کا حوالہ دیے بغیر نہیں پڑھا سکتے۔ تاریخی
اقعات کو ایک دوسرے سے جوڑنا اور انھیں ایک لڑی میں پرونا چاہیے۔ مثلاً طلبا کو یہ امر
ہن نشین کرنا چاہیے کہ آسٹروی تخت نشینی کی جنگ، جنگ ہفت سالہ، امریکہ کی جنگ آزادی
ر انقلاب فرانس وغیرہ میں ایک گہرا تعلق ہے اور ممکن ہے کہ اگر پہلا واقعہ نہ ہوتا، تو دوسرے
ہی ظہور میں نہ آتے۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ سے کوئی مثال لیں۔ شاہ جہاں تخت نشین
وا۔ اس وقت کی ملک کی حالت نے اس کو جنگ کرنے پر مجبور کیا۔ باقی وقت اس کا امن
سے گزرا۔ جہاں امن ہے، وہاں خوشحالی ہے۔ رعایا خوشحال ہو، تو شاہی خزانہ بھی پُر ہوتا ہے۔
ی وجہ تھی کہ شاہ جہان نے اپنے عہد میں بے شمار عمارتیں کھڑی کر دیں۔ طلبا کو چاہیے کہ وہ
اقعات کو ایک دوسرے سے ملا کر مطالعہ کریں اور اُستادوں کو لازم ہے کہ دورانِ تعلیم میں واقعات
کے باہمی تعلقات کو واضح کریں۔ اس طرح سے بچوں کو سب باتیں آسانی سے یاد رہ سکیں گی۔

بچے کو شروع میں ہی تاریخ کا شوق پیدا کرنے کے لیے دلچسپ طرز میں لکھی ہوئی سوانح عمریاں پڑھائی جائیں، لیکن ان کی عبارت نہایت سادی ہونی چاہیے۔ کئی اصحاب نے بچوں کے لیے رامائن اور مہابھارت کو آسان عبارت میں لکھا ہے۔ ہر ایک طالب علم جو پانچویں یا چھٹی میں پڑھتا ہو، ان کو آسانی سے پڑھ سکتا ہے اور اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو یہ بچے ان کہانیوں کو رات کے وقت اپنے بھائیوں اور بہنوں کو بڑے شوق سے سناتے ہیں۔ اسی طرح بابر، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان وغیرہ کی سوانح عمریاں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں بکتی ہیں۔ بچوں میں تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایسی کتب ان کے ہاتھوں میں دینی چاہییں۔ ایسی کئی ایک سوانح عمریوں کی ابھی بہت ضرورت ہے۔ حفیظ صاحب جالندھری نے ایک منظوم کتاب "ہمارا ہندوستان" لکھ کر اُردو علم ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ نہایت دلکش کتاب ہے۔ پانچویں جماعت کا لڑکا اس کو بخوبی پڑھ سکتا ہے، بلکہ بڑے شوق سے بار بار پڑھتا ہے۔ اگر ایسی کتب اسکولوں کی کلاس لائبریریوں میں رکھی جائیں، تو طلبا ان سے بہت مستفید ہو سکتے ہیں۔ انگریزی میں بھی چند ایک ایسی کتابیں مل سکتی ہیں۔ رائے صاحب لالہ سوہن لال کی کتابیں The story of India ہر سہ حصص بہت آسان عبارت میں اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہیں اور واقعات کا تعلق نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ High roads to History بھی اچھی خاصی کتابیں ہیں۔ اس قسم کے لٹریچر کی ابھی بہت ضرورت ہے۔ اسکولوں کی لائبریریوں کے لیے ایسی کتب منظور کی جانی چاہییں۔ علاوہ ازیں مدارس میں ہسٹاریکل کلبیں یعنی تاریخی انجمنیں قائم کی جائیں اور ان میں بعض طلبا کو تاریخی مضامین پڑھ کر سنانے کا شوق دلوایا جائے یا کم از کم ہفتہ وار ادبی بزموں میں تاریخ کو خاص جگہ دینی چاہیے یعنی لڑکے اپنے اپنے گاؤں کے متعلق اپنے بزرگوں سے سُنے سنائے

حالات کو جمع کر کے اور ان کو تاریخی جامہ پہنا کر سنا سکتے ہیں یا کسی علاقے کے تاریخی قصوں کو اکٹھا کر کے سنا سکتے ہیں۔ مختلف مقامات پر بعض مندروں، مسجدوں، گوردواروں، مقبروں یا تالابوں کے بنائے جانے کی تاریخ سنائی جا سکتی ہے۔ ایسے مقبروں یا سادھوں کے ساتھ قدیم بزرگوں کی بزرگی ظاہر کرنے والے کئی قصے مشہور ہوتے ہیں۔ ایسے قصے طلبا کے دل میں گزشتہ زمانے کے حالات کا شوق پیدا کرتے ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ میرے دادا مجھے ملتان کے دیوان ساون مل اور دیوان مول راج اور موخر الذکر کے ماموں گنگارام کا قصہ سنایا کرتے تھے اور محاصرۂ ملتان کے وقت گنگارام کی نالائقی کا ذکر کیا کرتے۔ اگرچہ میں نے کسی کتاب میں آج تک اس واقعے کو اس رنگ میں نہیں پڑھا، تاہم ایسی باتوں نے دماغ کو تاریخی واقعات کو سننے اور ان کے یاد رکھنے کے لیے ضرور تیار کیا۔

اس کے علاوہ Debates میں بھی تاریخی مضامین ہی رکھے جا سکتے ہیں اور شہری و دیہاتی زندگی کے مقابلے کے بجائے مندرجۂ ذیل قسم کے مضامین کم دلچسپ اور غیر مفید نہ ہونگے:۔

ا۔ مغلیہ خاندان کے زوال میں مرہٹوں نے زیادہ حصہ لیا یا سکھوں نے۔

ب۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم کرنے کا سہرا کلائیو کے سر پہ ہے یا ولزلی کے سر پہ۔

ج۔ اشوک اور اکبر میں سے کون سا بادشاہ زیادہ کامیاب تصور ہو سکتا ہے۔

د۔ پارلیمنٹ چارلس اوّل کو روپیہ نہ مہیا کرنے میں حق بجانب تھی یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یا ذیل کی قسم کے مضامین طلبہ کی قوت متخیلہ پیدا کرنے میں بہت ممد ہوتے ہیں:۔

ا۔ اگر شیر شاہ دس سال تک اور زندہ رہتا . . . .

ب۔ اگر ملکہ الزبتھ شادی کر لیتی . . . .

ج۔ اگر جنگ کریمیا میں اہلِ روس کو فتح نصیب ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وغیرہ وغیرہ ۔

ایسے مضامین میں طلبا کو ان خیالی واقعات کو قلمبند کرنا ہوتا ہے، جو ان حالات میں رونما ہوتے ۔ کافی مطالعے کے بعد قوت متخیلہ کی مدد سے اپنے مضمون کو حوالۂ قلم کرنا ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی مشق غیر معمولی طور پر فائدہ بخش ثابت ہو سکتی ہے ۔

طلبا میں تاریخ یاد کرنے کا ایک بہت اعلیٰ طریقہ ہے اور یہ طریقہ تقریباً ہر ایک مضمون میں برتا جا سکتا ہے ۔ جماعت دو گروپوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ پھر سب لڑکوں کو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس ہفتے کے اندر اندر تم فلاں حصہ مثلاً خاندان غلامان وغیرہ یاد کرلو ۔ ہفتے کے بعد ایک پیریڈ میں ان دونوں ٹولیوں کا مقابلہ کر لیا جاتا ہے ۔ ٹیچر خود ان کا جج ہوتا ہے اور اپنی نوٹ بک میں ان کو نمبر دیتا جاتا ہے ۔ شروع کرنے کے لیے ا گروپ کا کوئی لڑکا ب گروپ کے کسی لڑکے سے کوئی سوال پوچھتا ہے ۔ اگر وہ اس کا جواب دے دے، تو اس کو دس نمبر دیے جاتے ہیں، ورنہ اُسی گروپ کا دوسرا لڑکا صحیح جواب دے کر پانچ نمبر حاصل کر سکتا ہے ۔ اگر وہ بھی جواب نہ دے، تو تیسرا لڑکا جواب دے کر صرف تین نمبر حاصل کر سکتا ہے ۔ اسی طرح پھر دوسرے گروپ کا کوئی لڑکا پہلے گروپ کے لڑکوں سے سوال پوچھتا ہے اور بہ طرزِ سابق نمبر دیے جاتے ہیں ۔ اگر پہلا لڑکا جواب نہ دے سکے، تو باقی کے نمبر پوچھنے والے گروپ کو مل جاتے ہیں ۔ اس طرح چار پانچ سوالات کے بعد نمبر جمع کر لیے جاتے ہیں ۔ مقابلے کی وجہ سے سارا پیریڈ دلچسپی قائم رہتی ہے ۔ تاریخ بھی یاد ہو جاتی ہے اور چونکہ سوال پوچھنے والا عام طور پر کمزور لڑکوں سے ہی سوال پوچھتا ہے ۔ اس لیے ہوشیار لڑکے اپنے گروپ کے کمزور لڑکوں کی مدد کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی وجہ سے ان کے نمبر کم نہ ہو جائیں ۔ یہاں تک کہ ذرا سے فارغ وقت میں بھی وہ اُس کو تاریخی واقعات بتاتے رہتے ہیں ۔

روسی بچے کی تعلیم

از

فیاض الدین صاحب، ایم اے، بی ٹی

زارِ روس کے دورِ سلطنت میں ملک کی تعلیمی حالت بہت پست تھی۔ جیسا کہ آگے جا کر وضاحت سے بتایا جائیگا کہ ملک کی حکمت عملی کا مقصد ملک کو جاہل ہی رکھنے میں مضمر تھا۔ عوام کی غربت اور جہالت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ بڑے بڑے زمیندار رؤسا اور اُمرا غریبوں کا خون چوستے تھے اور تعلیم بھی اُنھیں کے طبقے تک محدود تھی۔ ملک کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ حکومت کو بغاوت کا ہر وقت خدشہ رہتا تھا اور وہ اسی لیے لوگوں کو تعلیم دینے سے احتراز کرتی تھی۔ صرف اُن معدودے چند کو تعلیم دی جاتی تھی، جن کی کم از کم تعداد حکومت کے کام چلانے کے لیے ضروری اور لابدی ہو۔ اسی وجہ سے متعدد وزرائے تعلیم کی کوشش یہی رہی کہ جہاں تک اور جب تک ممکن ہو سکے جاہل رکھا جائے۔ چنانچہ ۱۸۴۳ء میں شِشکو[۱] نے، جو اس وقت روس کا وزیرِ تعلیم تھا، اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ "تعلیم نمک کی مانند ہے، جسے نہایت اندازے سے استعمال کرنا چاہیے۔ کیونکہ عام لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے سے بجائے فائدے کے نقصان کا زیادہ احتمال ہے اور پھر ڈیلی گوو[۲] نے، جو ۱۸۹۰ء میں وزیرِ تعلیم تھا، بہت سے قوانین نافذ کیے، جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ یہودیوں اور غربا کے بچّوں کو تعلیمِ ثانوی اور اعلیٰ سے قطعی طور پر بے بہرہ رکھا جائے۔ ان قوانین کا مقصد بقول اُس کے یہ تھا کہ کوچبانوں، نانبائیوں، خادموں، دھوبیوں، چھوٹے چھوٹے دوکانداروں وغیرہم

۱؎ Shishkov　　　۲؎ Delianov

کے بچوں کو کسی طرح ثانوی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی موقع مل ہی نہ سکے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع میں بھی کے پی پوبی ڈونس ٹیو[1] نے جو زار کے خاص رفقا کار میں شمار ہوتا تھا، اس بات کا اعلان کیا کہ جہاں تک کسانوں کے بچوں کا تعلق ہے۔ اُنھیں سرے سے جاہل رکھا جائے، کیونکہ تعلیم حاصل کرنے سے اُنھیں اپنے آبائی پیشے سے نفرت ہو جائیگی۔

اس لیے اس امر سے ہمیں اظہار تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ انقلاب روس کے وقت اکتوبر ۱۹۱۷ء میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد محض ۲۶ فیصدی تھی اور روس کی ۱۵ کروڑ آبادی میں سے یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طلبا اور طالبات کی تعداد محض ایک لاکھ بیس ہزار تھی اس کے برعکس جب انقلاب روس کے خداوند صاحب اقتدار ہوئے اور ملک کی حالت بہتر ہوئی، تو سب سے اول اُنھوں نے اپنی توجہ مسئلۂ تعلیم کی طرف منعطف کی، کیونکہ لینن اور سٹیلن دونوں کا عقیدہ تھا کہ اشتراک کو کامیاب بنانے کے لیے عوام کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ لینن نے مرنے سے چند سال پیشتر "تمدنی انقلاب روس[2]" کی بنا رکھی، کیونکہ اُسے یقین تھا کہ Socialism کو صحیح معنوں میں کامیاب بنانے کے لیے لوگوں کی ذہنی اور تعلیمی سطح بہت بلند ہونا چاہیے۔ چنانچہ لینن لکھتا ہے کہ دراصل ہمارے ملک میں سیاسی اور سماجی انقلابات تمدنی انقلاب کے پیش خیمہ تھے اور ابھی تمدنی انقلاب کی تکمیل باقی ہے"۔ وہ تمدنی انقلاب جس کے متعلق کسی وقت لینن نے یہ لکھا تھا، آج کل روس میں اپنے پورے شباب پر ہے۔ عوام لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑوں کی تعداد میں تعلیم کے زیور سے مزین ہو چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ اُسی ذوق شوق اور شدت سے جاری ہے۔ کنڈرگارٹن

لے K.P. Pobedonostsev کے Cultural Revolution of Russia

ابتدائی اور ثانوی مدارس میں آج کل چار کروڑ کے قریب بچے تعلیم پا رہے ہیں اور اس کے علاوہ تین کروڑ سے زیادہ بالغوں نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ گویا روس کی نصف سے زیادہ آبادی اس وقت تعلیم پا رہی ہے۔ حکومت کے ملازموں کا بیشتر حصہ اپنی تعلیمی سطح بلند کرنے میں مشغول ہے اور ہر ممکن طریقے سے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر تعلیم حاصل کی جا رہی ہے۔ پچھلے چار سال کے عرصے میں جہالت کو دور کرنے کے سلسلے میں ۵ کروڑ سے زیادہ نوجوان اور بوڑھے روس کے مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکل چکے ہیں۔

مدرسے سے قبل کی تعلیم[a]

سنہ ۱۹۲۵ء کے اوائل میں بچوں اور ماؤں کی تعلیم اور تحفظ کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی تھی قطع نظر اور امور کے انجمن ہٰذا کو پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی تعلیم اور تربیت کے لیے سودمند طریقے تحریر کرنا تھے۔ چنانچہ بہت کچھ غور و خوض کے بعد انجمن اس نتیجے پہنچی کہ وہ طریقے جن میں یکجہتی اور باہم اتفاق سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے بہترین ہوں گے۔ دراصل یکجہتی اور اتفاق ان دو لفظوں میں روس کی تعلیمی ترقی کا راز مضمر ہے اور اس کو حاصل کرنا ہی روسی اُستادوں کا منتہائے مقصد ہے۔

چنانچہ چھوٹے بچوں اور ماؤں کے تحفظ اور اُن کی نگہداشت اور پرورش کے لیے اُس انجمن نے کئی ادارے قائم کیے۔ عام طور پر یہ ادارے تین قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں، یعنی ظاہر، مخفی اور مخلوط قسموں کے ادارے۔

(۱) پہلی قسم یعنی ظاہر قسم کے ادارے وہ ہیں، جہاں دودھ پیتے بچوں اور اُن کی ماؤں کی پوری پوری رکھوالی کی جاتی ہے۔

[a] Pre-school Education.

(ب) دوسری قسم، یعنی مخفی ادارے وہ ہیں، جہاں ہونے والی ماؤں کی
کی جاتی ہے تاکہ صحت مند بچے پیدا ہوں۔ مائیں بچہ پیدا ہونے سے دو یا اڑھائی ما
اداروں میں داخل کر لی جاتی ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے دو ماہ بعد تک یہاں قیام کر
(ج) تیسری قسم، وہ ہے جہاں کارخانوں میں کام کرنے والی ماؤں کی نگہ
کی جاتی ہے اور ان کے اوقاتِ کار میں اُن کے بچوں کی نگہداشت بھی کی جاتی ہے۔
ہیں بچے عموماً دس سے بارہ گھنٹے تک روزانہ گزارتے ہیں، لیکن اس نوع میں ایسے ا
بھی ہیں، جو چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں اور بچوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ایسے اد
تعداد سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں شہری حلقوں میں ان کی تعداد
کے قریب تھی اور دیہاتی حلقوں میں ۴۱،۰۰۰ کے قریب، لیکن ۱۹۳۲ء میں ان
۴۰۰، ۲۸۶ اور ۴۳۵،۰۰۰ کے قریب ہو گئی۔ ان اداروں میں جہاں تک تعلیم کا
ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بچے کو کچھ نہ کچھ سکھایا جائے۔ دنیا کے ہر ملک
چھوٹی عمر کے بچوں کو تعلیم دینے کے طریقوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور روس
تعلیم شب و روز اس تجسس میں ہیں کہ کس طرح چھوٹی عمر کے بچوں کو تعلیم دینے کے
اور سہل ترین طریقے ایجاد کر سکیں۔

چند سال ہوئے کہ تین سے پانچ سال تک کے بچوں کی تعداد ان ادارو
ایک لاکھ کے قریب تھی، لیکن ۱۹۲۷ء میں ان کی تعداد چار لاکھ کے قریب ہو گئی
میں ۵ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ آج کل ایسے بچوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے
اداروں کا مقصد یہ ہے کہ سب روسی بچے ان اداروں سے استفادہ کر سکیں۔ دوسر
میں روس میں نہ صرف ابتدائی تعلیم جبری ہے، بلکہ اب ابتدائی تعلیم سے قبل کی تعلیم

ہو گئی ہے۔

اسکول میں داخل ہونے سے قبل کے اداروں میں عام طور پر کنڈرگارٹن اور مختلف کھیلوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ بچّے کی، اُس کی ماں کی غیر حاضری میں، نہ صرف نگہداشت ہو سکے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اُس کی تعلیم بھی ہوتی رہے۔ یہ تعلیم تین حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

(ا) پہلے حصّے میں وُہ طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، جن سے بچّے کو پوری طرح اس بات کا احساس ہو جائے کہ وُہ ایک بہت بڑی جماعت کا فرد ہے اور اُسے اپنے بہن بھائیوں میں مل جُل کر خوشی خوشی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے ابھی سے جسمانی محنت کا عادی بنانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے اور مزید برآں کوشش کی جاتی ہے کہ بچّے کو آرٹ اور موسیقی کو سمجھنے اور اُن سے حظ اُٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

(ب) حفظانِ صحت کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔

(ج) انقلابِ روس کی سالگرہ منانے کے تعلق میں سب رسومات سکھائی جاتی ہیں۔ اِنسان کی اقتصادی اور سیاسی برابری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مانٹےسوری[1] اور فروبل[2] کے طریقوں سے مدد لی جاتی ہے۔

ننّھے بچّوں کے گھر

یہ ایک نئی قسم کے ادارے ہیں، جو محض روس کی ایجاد ہیں۔ ان میں حکومت کی طرف سے نرسیں، ڈاکٹر اور اُستاد مقرر ہیں، جو بچّوں کو پالتے ہیں۔ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے

---

[1] Montessori. [2] Froebel.

کہ یہ ادارے ایک بہترین زندگی کا جز بن سکیں۔ فی الحال صرف ایسے بچوں کو یہاں داخل کیا گیا ہے، جن کے والدین موجود نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ ان اداروں میں کسی دن سب بچے داخل ہو سکیں

منصوبی طریق تعلیم[۱]

حال ہی میں روس میں امریکہ کا منصوبی طریقہ تعلیم بہت بڑے پیمانے پر نافذ کیا گیا ہے روسی ماہرین تعلیم کا خیال تھا کہ بچوں کو بہت سے ایسے منصوبوں کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ جن سے بچہ ملت، قوم اور سوسایٹی کا ایک بہترین فرد بن سکے اور اُسے اس بات کا کلی طور پر احساس دلا دیا جائے کہ اُسے اپنے آپ کو ملت کے بہت بڑے سمندر میں غرق کر دینا ہے، لیکن پیشتر اس کے کہ وُہ اسی سمندر میں غرق ہو، اُسے اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کر دے۔ علاوہ ازیں بچے ان منصوبوں کی تکمیل کے دوران ہی میں اپنے اپنے مضمون کے متعلق تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن ۱۹۳۱ء میں حکومت نے اس طریق تعلیم کو سخت ناپسند کیا اور اب منصوبی طریق تعلیم کو روس کے کسی اسکول میں کوئی جگہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچے کو اب ایسے طریق تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا ہے، جس سے وُہ سوسایٹی کا بہترین فرد بن سکے، نہیں، بلکہ اس غرض کے لیے اور طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، جو بچے کی تعلیم میں کسی طرح حارج نہ ہوں۔ منصوبی طریق تعلیم میں روسی ماہرین کے نزدیک ایک بہت بڑا نقص یہ تھا کہ اس سے بچے کی تعلیم پوری طرح نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس کی راہ میں کئی قسم کی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ روس والوں نے اب منصوبی طریقے کے بجائے اور کئی طریقے وضع کر لیے ہیں۔ مثال کے طور پر دیہاتی طلبا کو جن کی عمر دس اور بارہ برس کے درمیان ہوتی ہے، دودھ دوہنا اور ناپنا سکھایا جاتا ہے۔ ان بچوں کو دس

---

[۱] Project Method.

یں سکے گروہ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور تجربے کے طور پر دو تین گائیں ان کے سپرد کر دی جاتی یں۔ اس کے علاوہ اسکول میں زراعتی نمائش منعقد کی جاتی ہے تاکہ بچوں کو زراعت کے ختلف شعبوں کے متعلق ذاتی واقفیت ہو جائے۔

روسی اسکولوں میں ایک امتیازِ خصوصی یہ ہے کہ ہر بچے کو خدمتِ عامہ کے لیے صحیح معنوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ روسی اشتراک کے نظام کا راز خدمتِ عامہ میں مضمر ہے۔ ہر جماعت میں بچوں کو آٹھ آٹھ دس دس کے گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر گروہ کو یک خاص خدمت کا ذمّے دار قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک گروہ کو اسکول کی صفائی کی خدمت سپرد کر دی جاتی ہے اور اُس گروہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود اسکول کھلنے سے پیشتر اور اسکول کے بعد اسکول کو صاف کرے۔ دوسرا گروہ کھانا پکائے اور تقسیم کرے اور برتنوں اور چمچوں کو سنبھال کر رکھے۔ ہر ایک گروہ میں ایک لڑکا سردار چنا جاتا ہے جو اپنے اُستاد سے ہدایتیں لیتا ہے اور وہی اپنے کارکنوں کی طرف سے جواب دہی کا ذمّے دار ہوتا ہے۔ سردار کا انتخاب تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد ہوتا رہتا ہے تاکہ سب لڑکوں کو اس خدمت کا موقع مل جائے۔

مقرّرہ نصاب

اسکول میں درس دینے کے متعلق اساتذہ کو ضروری ہدایات سوویٹ روس کے محکمۂ تعلیم کی کونسل وقتاً فوقتاً جاری کرتی رہتی ہے اور وہی نصاب بھی بناتی ہے۔ ذیل میں چار سالہ پرائمری کورس درج کیا جاتا ہے:۔

شہری پرائمری اسکول کا کورس

(ہفتے میں چھے دن)

گھنٹوں کی تعداد

مضمون	سالِ یکم	سالِ دوم	سالِ سوم	سالِ چہارم
روسی زبان	۶	۶	۵	۵
حساب	۵	۵	۵	۵
سائنس	۲	۲	۲	۳
علمِ معاشرت	۲	۲	۲	۲
جغرافیہ	-	-	۲	۲
Manual work.	۲	۲	۳	۳
غیر زبان	-	-	-	۳
جسمانی ورزش	۱	۱	۱	۱
آرٹ	۱	۱	۱	۱
موسیقی	۱	۱	۱	۱
	۲۰	۲۰	۲۲	۲۵

دیہاتی علاقے کے ابتدائی مدرسون کا نصاب شہری مدرسوں کے نصاب کی نسبت مختلف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اوّل الذکر مدرسوں میں ریاضی اور آرٹ کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

دوسرے درجے کے ثانوی اسکولوں کا نصاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے لیکن قبل ازیں اس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے درجے کے ثانوی مدرسے ابھی تک روس میں جاری نہیں کیے گئے۔

ثانوی اسکولوں کا نصاب

مضمون	سالِ پنجم	سال ششم	سالِ ہفتم
روسی زبان اور ادب	۵	۴	۴
غیر زبان	۲	۲	۲
تاریخ	۲	۲	۳
Socialogy.	۱	۱	×
جغرافیہ	۲	۲	۱
ریاضی	۵	۴	۴
فزیکس	۲	۳	۳
BIOLOGY.	۲	۲	۲
علمِ کیمیا	—	۲	۲
Manual work.	۵	۴	۵
MENSURATION.	—	۱	۱
ڈرائنگ	۱	۱	۱
موسیقی	۱	۱	۱
ورزش	۲	۱	۱
	۳۰	۳۰	۳۱

اس کے علاوہ ثانوی درجے کے طلبا کو سیاسیات، اقتصادیات اور علم اخلاق کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ روسی ثانوی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ سماج کا بہترین فرد بن سکے اور

اس لیے اُسے صرف اُن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے، جن کی تدریس سے بچہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے۔

مدرسے کا نظام

مدرسے کے نظام کی ذمّہ داری مدرسین اور اسکول کے منیجر پر مشترکہ طور پر عائد ہوتی ہے۔ مدرسے کا نظام شدّت سے قائم رکھا جاتا ہے اور کسی بچّے کا کوئی فعل، جو مدرسے کے آئین کے خلاف ہو، برداشت نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کی پوری پوری سزا دی جاتی ہے۔ بعض اوقات بچّے کو کچھ عرصے کے لیے نکال دیا جاتا ہے، لیکن جسمانی سزا، جو زار کے زمانے میں رائج تھی، کسی حالت میں بھی نہیں دی جاتی۔ اس کے علاوہ نظام قائم رکھنے کیلیے بچّوں کی اپنی کمیٹیاں بھی قائم ہیں، جو قصوروار شریر بچّوں کے لیے سزا تجویز کرتی ہیں۔ باوجودیکہ بچّوں کو کسی قسم کی کوئی جسمانی سزا نہیں دی جاتی، تاہم زار کے زمانے کے اسکولوں کی بہ نسبت آج کل بچّوں کی تربیت بہت زیادہ اچھی ہے، پھر بھی نظام پورے طور پر قائم رکھا جاتا ہے۔

روس میں ابتدائی تعلیم لازمی اور جبری ہے۔ کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی اور اس پر مستزاد یہ کہ کتابیں اور خوراک بھی حکومت کی طرف سے مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ بچّوں کو وظائف بھی دیے جاتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی قطعی مفت ہے۔ کسی زمانے میں صرف اُن بچّوں کو تعلیمِ اعلیٰ سے زبردستی روکا جاتا تھا، جن کے والدین زار کے زمانے میں اُمرا اور بڑے بڑے زمیندار تھے۔ یہ ظلم محض انتقامی جذبے کے ماتحت روا رکھا گیا تھا۔ اب اس قسم کی کوئی روک کسی بچّے کے لیے نہیں۔

تعلیمِ اعلیٰ کو مقبول بنانے کی غرض سے اسّی فیصدی طلبا اور طالبات کو حکومت
طرف سے وظائف دیے جاتے ہیں۔ اُن میں بیشتر شادی شدہ ہیں۔ اُن کا اور اُن کے
ی بچوں کا سب خرچ دورانِ تعلیم میں حکومت دیتی ہے۔
۱۶ برس کی عمر تک سب بچے، لڑکے لڑکیاں ایک ہی قسم کی تعلیم حاصل کرتے
ں۔ کتابیں، مضامین اور کورس سب کے لیے ایک ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی تعلیم ہر
سٹیج میں مخلوط ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مذہب کے خلاف روسی اسکولوں میں ایک زبردست
اد شروع کیا گیا تھا، لیکن اب جہاں تک درسگاہوں کا تعلق ہے یہ جہاد بند کر دیا گیا ہے۔
۔ اب تو یہ حالت ہے کہ اگر اساتذہ کو کسی طالب علم کے متعلق شک بھی پیدا ہو جائے کہ
فلاں مذہب کا پیرو ہے، تو اُس کے خلاف تعزیری احکام جاری نہیں کیے جاتے۔
رچہ کچھ عرصہ پہلے یہ ایک طالب علم کے لیے بہت بڑا جرم تھا۔ روس میں صرف وُہ افعال
نوع ہیں، جن سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہو کہ وُہ قومی اور ملّی نقطۂ نگاہ سے مضر ثابت ہونگے
س میں بچے کے ہر فعل کو مستحسن یا بُرا تصور کرنے کے لیے قوم کی کسوٹی ہے۔ پس استفادۂ
، ایک معیار مقرر کر لیا گیا ہے، جو فعل اُس معیار پر پورا اُترے، وہ مستحسن ہے،
نہ قابلِ سرزنش۔

سینما کے ذریعے تعلیم

روس میں آجکل سینما کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ دراصل تعلیم کو اس
ے میں عام کرنے کا ایک ذریعہ سینما بھی تھا۔ اب کوشش یہ کی جارہی ہے کہ ٹریننگ
ع سے جو اُستاد فارغ ہو کر نکلے، وہ سینما کے آلے کو پوری طرح کام میں لا سکے اور اُسے

تعلیمی فلموں کے متعلق سب کچھ ضروری ہدایات دی جاتی ہیں۔

لیکن روس میں تعلیمی فلم اُستاد کا بدل نہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فلم اُستاد کا بدل ہو بھی نہیں سکتا۔ اُستاد پہلے درس دیتا ہے اور اس کے بعد اُس خاص سبق کے متعلق شاگردوں کو فلم بھی دکھا دیتا ہے۔ خاص کر تاریخ جغرافیہ اور فنِ ڈرامہ کے سکھانے کے لیے فلم سے بہت مدد لی جاتی ہے۔

جس سرعت سے روس نے تعلیم کو عام کیا ہے۔ حیرت انگیز ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد صرف ۸۰ لاکھ کے قریب تھی، لیکن آج اُن کی تعداد کئی کروڑ ہے۔

سررشتہ تعلیم پنجاب

ورنیکلر فائنل و مڈل اسکول امتحان ۱۹۳۸ء

نقشہ تقسیم اوقات

(تنبیہ: جمعے کے روز دوسرا پرچہ ۱½ کے بجائے ۲ بجے شروع ہوگا)

تاریخ	مضمون	وقت از	وقت تا
۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء بدھ	اردو، ہندی، پنجابی: پرچہ ا " " " : پرچہ ب	۱۰ ۱½	۱۲½ ۴
۲۷ جنوری ۱۹۳۸ء جمعرات	ریاضی: پرچہ ا (حساب) " : پرچہ ب (الجبرا، جیومیٹری)	۱۰ ۱½	۱۲½ ۴
۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء جمعہ	تاریخ جغرافیہ: پرچہ ا (تاریخ) " " : پرچہ ب (جغرافیہ)	۱۰ ۲	۱۲ ۴
۲۹ جنوری ۱۹۳۸ء ہفتہ	انگریزی، دیہاتی سائنس[1]: پرچہ ا " " " : پرچہ ب	۱۰ ۱½	۱۲½ ۴
۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء پیر	عربی، فارسی، سنسکرت شہریت و حفظان صحت	۱۰ ۱½	۱۲½ ۴
یکم فروری ۱۹۳۸ء منگل	ابتدائی سائنس: تحریری پرچہ " " : عملی پرچہ نمبر ۱ [2]	۱۰ ۱½	۱۲ ۰۰
۲ فروری ۱۹۳۸ء بدھ	ابتدائی سائنس: عملی پرچہ نمبر ۲ [2]	۱۰	۰۰
۳ فروری ۱۹۳۸ء جمعرات	اردو، ہندی، پنجابی (دوسری ورنیکلر)	۱۰ ۱½	۱۲½ ۴
۴ فروری ۱۹۳۸ء جمعہ	ڈرائنگ پرچہ ا (اشیا: Object) پرچہ ب (ہندسی: Geometrical)	۱۰ ۲	۱۲ ۴

[1] دیہاتی سائنس کے عملی امتحان کی تاریخ و وقت و مقام کی اطلاع ہر ایک مدرسے کو ممتحن براہ راست بھیج دیگا اور یہ امتحان ۲۵ جنوری ۱۹۳۸ء سے پہلے پہلے ختم ہو جائیگا۔

[2] اگر جملہ امیدواروں کا عملی امتحان منگل کے روز ختم نہ ہوسکا۔ تو باقی امیدواروں کا امتحان بدھ کے روز عملی پرچہ نمبر ۲ میں لیا جائیگا۔

ڈبلیو، ایچ، ایف، آرمسٹرانگ
ڈائرکٹر، سررشتہ تعلیم پنجاب

لاہور،
۱۵ نومبر ۱۹۳۷ء

اشتہار

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴/۱۱ پائی	۲۰	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ سوم	۷/
			۲۱	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳/۹ پائی
۲	″ دوسری ″	۱/۶ ″	۲۲	″ ″ ″ دوم	۲/۳ ″
۳	″ تیسری ″	۶/۷ ″	۲۳	قصص ہند حصہ اوّل	۳/۲ ″
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶/	۲۴	″ ″ ″ دوم	۲/۸ ″
۵	″ ″ دوم	۵/	۲۵	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱/
۶	″ ″ سوم	۷/	۲۶	حسینہ اور وحشی	۱/۵ ″
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲/	۲۷	شہزادہ مہربان	۲/۶ ″
۸	″ ″ دوم	۳/۷ پائی	۲۸	راما سیتا	۱/۱۰ ″
۹	″ ″ سوم	۳/۱۱ ″	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر رلیا رام	۳/
۱۰	″ ″ چہارم	زیر طبع	۳۰	دروپدی	۱/۸ ″
۱۱	″ ″ پنجم		۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴/۶ ″
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲/۹ پائی	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید	۴/
۱۳	″ ″ نمبر ۲	۳/۱۰ ″	۳۳	راجہ اشوک	۵/
۱۴	″ ″ نمبر ۳	۲/۵ ″	۳۴	مہارانا پرتاپ	۲/۱ ″
۱۵	انوار سہیلی کے انمول موتی	۲۹/۸ ″	۳۵	شہاب الدین شاہجہان	۲/۱۰ ″
	″ ″ حصہ ۱ ″ ″		۳۶	شیر شاہ سوری	۲/۱۱ ″
۱۶	″ ″ حصہ ۲ ″ ″	۴/۱۰ ″	۳۷	نصیر الدین ہمایوں . . .	۲/۱۰ ″
۱۷	″ ″ حصہ ۳ ″ ″	۲/۵ ″	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر . .	۲/۹ ″
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اوّل	۷/۷ ″	۳۹	نورالدین جہانگیر . . .	۲/۳ ″
۱۹	″ ″ ″ حصہ سوم	۸/۱۱ ″	۴۰	شہاب الدین غوری . . .	۲/۸ ″

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی . .	۲/۱۱ پائی	۶۶	بہادر شہزادہ	۲/۱ پائی
۴۲	فیروزالدین تغلق . .	۳/	۶۷	جوتی موتی	۲/۱۰ "
۴۳	امیر تیمور	۲/۷ "	۶۸	جواہرات کا خزانہ	۳/۷ "
۴۴	پرتھوی راج	۲/۸ "	۶۹	پھوا اور خزانہ ہما باتصویر	۲/
۴۵	محمود غزنوی	۲/۶ "	۷۰	علی بابا اور چالیس چور	۴/
۴۶	مصر کی داستان . . .	۳/	۷۱	علاؤالدین و عجیب وغریب لیمپ	۴/۶ "
۴۷	جاپان کی کہانی	۴/			
۴۸	چین کی کہانی . . .	۳/۶ "	۷۲	ملا دو پیازے کا سفر	۳/
۴۹	مستورات چین وجاپان	۴/	۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳/
۵۰	ایران کی کہانی	۲/			
۵۱	ایشیائی روم	۲/۷ "	۷۴	نیشاپور کا سوداگر . . .	۲/۱۱ "
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲/۸ "	۷۵	پرستان کا موچی . . .	۳/
۵۳	لنکا	۱/۱۱ "	۷۶	سندباد جہازی . . .	۳/
۵۴	بصرہ وبغداد	۵/	۷۷	چاندی کی کنجی . .	۳/
۵۵	یونان	۲/	۷۸	سلک جواہر نمبرا (حکمرانی کاگر)	۲/۶ "
۵۶	تین سوال	۲/۷ "	۷۹	" نمبر۲ (اوج وپستی)	۱/۱۱ "
۵۷	امرت ورشا	۳/۱۰ "	۸۰	" " نمبر۳ (شہید الفت)	۱/۶ "
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبرا داؤد بادشاہ	۲/۶ "	۸۱	سلک جواہر - مرد میدان	۱/۶ "
			۸۲	" " نیک وبد	۱/۹ "
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳/۹ "	۸۳	" " عیب وہنر	۱/۴ "
			۸۴	" " جہاں گرد	۱/۶ "
۶۰	" " دوم "	۴/۵ "	۸۵	" " جواب باصواب	۱/۱۰ "
۶۱	خوفناک خواب	۲/	۸۶	" " سخاوت کی انتہا	۱/۲ "
۶۲	ہیرا لال	۲/۶ "	۸۷	" حسن تدبیر	۱/۳ "
۶۳	دولت کی پٹاری . . .	۲/۱ "	۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت	۱/۳ "
۶۴	سادھو کی جھکی	۲/			
۶۵	نیلا باز	۲/۱۱ "	۸۹	ڈرامہ غم خوار عالم .	۱/۷ "

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۴) | فروری ۱۹۳۸ء | نمبر (۵)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

حال ہی میں علیگڈھ یونیورسٹی نے اپنے سالانہ اجلاس پر لارڈ لوتھین صاحب کو کونوکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر لارڈ موصوف نے اور گرانقدر ہدایات کے دوران میں فرمایا کہ آجکل دنیا میں سائنس حیرت انگیز ترقی کر رہی ہے اور اس ترقی میں دنیا کے مختلف دارالعلوموں نے نمایاں حصہ لیا ہے، لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ جہاں انسان نے قدرت کی طاقتوں پر تسلط جمایا اور اُن کو اپنے فوائد کے لیے استعمال کیا، وہاں مذہب کے عمیق سمندر میں آجکل اس قدر غوطہ زن نہیں ہوتا، جتنا چاہیے۔ دراصل دیکھا جائے، تو موجودہ تہذیب مذہب کی اتنی ہی مرہونِ منت ہے، جتنی سائنس کی۔ اس لیے ہر دارالعلوم کے لیے لازمی ہے کہ وُہ سائنس کے حقائق کے ساتھ ساتھ مذہب کی حقیقتوں کی چہرہ کشائی میں بھی پورا پورا حصہ لے۔

ہم لارڈ لوتھین صاحب کی رائے سے متفق ہیں کہ شروع زمانے سے لیکر جبکہ دنیا توہمات کے اندھیرے میں پریشان پھر رہی تھی، آجکل کے زمانے تک مذہب نے انسان کے لیے ایک مشعل کا کام کیا ہے۔ سائنس تو ابھی تک صرف مادی ہی دنیا کے خزانوں کی کھوج میں لگی ہے، لیکن مذہب نے ان روحانی رازوں کا پتہ لگایا ہے، جن کا تعلق ہماری موجودہ اور آئندہ کی زندگی سے ہے۔ لیکن جس وقت لارڈ لوتھین صاحب علی گڈھ یونیورسٹی سے اور اس کے ذریعے دیگر دارالعلوموں سے اپیل کرتے ہیں کہ ان کے لیے مذہبی حقائق کی اشاعت بھی اتنی ضروری ہے جتنی سائنس کے علوم کی، تو اس وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشاعت کیسے کیجا سکتی ہے۔

جہانتک ہمارے ملک کا تعلق ہے جبتک یہاں ہندووں اور اُن کے بعد مسلمانوں کی سلطنت رہی مذہب تعلیم کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا تھا۔ ہر پاٹ شالا اور مکتب میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کا درجہ بہت اونچا گنا جاتا تھا، لیکن جس وقت یہاں یورپین قومیں آئیں، اس وقت حالات

مختلف ہو گئے۔ چونکہ حکمرانوں اور رعایا کے مذاہب میں اختلاف تھا، اس لیے سوال پیدا ہوا کہ کس مذہب کی تعلیم دی جائے۔ قدرتی طور پر ہمارے نئے حکمرانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی مذہب کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں انگلستان، فرانس، ڈنمارک، پرتگال اور دیگر یورپین ممالک سے عیسائی پادری یہاں آئے اور انھوں نے جنوبی ہندوستان کے مختلف مقامات پر تبلیغ کی خاطر درسگاہیں کھولیں جن میں سے مشہور زیگن بالگ، گرنڈلر اور شوارز پادریوں کے اسکول تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی شروع شروع میں عیسائی مذہب کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیتی رہی اور جو لوگ اس کام میں مشغول تھے، ان کی مالی طور پر مدد بھی کرتی رہی، لیکن جب اس کے مقبوضات بہت وسیع ہو گئے، اور ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آ گئی، تو اُس نے اپنی مذہبی اشاعت کی پالیسی کو ترک کر دیا، کیونکہ اُس کی ہندو اور مسلمان رعایا کے دل میں اس بات کا خوف پیدا ہو گیا تھا کہ کمپنی ان کے مذہب پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔ تب سے لے کر آج تک انگریزی حکومت کی پالیسی لگاتار یہی رہی ہے کہ ملک کے کسی مذہب میں بھی مداخلت نہ کی جائے۔ اس پالیسی کی موجودگی میں یہ ضروری تھا کہ تعلیمی درسگاہوں میں جو سرکار کے زیر سایہ پرورش پائیں، مذہبی تعلیم کا چرچا بالکل نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔

سیاسی نقطۂ نگاہ سے انگریزی حکومت کا یہ عمل بالکل درست تھا، کیونکہ تجربے سے ثابت ہو چکا تھا کہ رعایا کے مذاہب میں دخل اندازی کرنا ایسا ہی مضر ہے جیسا کہ کسی بارود کی میگزین کو دیا سلائی دکھانا۔ لیکن اس سے ملک کو یہ نقصان ہوا کہ لوگ مذہب کے ان اسباق سے بے بہرہ رہنے لگے، جو پہلے اُن کی اخلاقی زندگی کا منبع تھے۔ اس کا نتیجہ قیاس سے معلوم کرنا مشکل نہیں۔ ۱۸۱۱ء میں جب اس پالیسی کا آغاز ہی ہوا تھا، لارڈ مینٹو نے ڈائرکٹرز کو لکھا تھا کہ ملک میں جرائم بہت بڑھ رہے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو کسی قسم کی مذہبی و اخلاقی تعلیم نہیں دی جاتی۔ گو ہماری پالیسی مذہب کے متعلق غیر جانبداری کی ہے، لیکن ہمیں اپنی

رعایا کی اخلاقی تعلیم کے واسطے کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ملک میں بھی چند ایسے اشخاص پیدا ہوگئے، جنھوں نے اس اہم امر کی طرف سرکار کو توجہ دلائی چنانچہ ۱۸۴۰ء کے بعد حکومت نے اخلاقی تعلیم کو رائج کیا، لیکن ساتھ ہی اس بات کا اعلان کر دیا کہ چونکہ اس ملک کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ اخلاقی تعلیم مذہب کا ایک جزو قرار دی جائے۔ اس لیے اسے محکمہ جات تعلیم ایک علٰحدہ مضمون یعنی فلسفہ اخلاق کے طور پر رائج کرینگے۔ ۱۸۵۴ء میں ووڈ صاحب کے ڈسپیچ (Wood's Despatch) میں مذہبی و اخلاقی تعلیم کا کہیں علٰحدہ ذکر نہیں آتا، کیونکہ اس وقت حکومت کا یہ خیال ہوگیا تھا کہ اگر طلبہ کو دماغی تعلیم باقاعدہ دی جائے، تو اخلاقی تعلیم خود بخود آجاتی ہے۔ دونوں کا منشا یکساں ہے۔ اس وقت سے اب تک یہی پالیسی چلی آتی ہے۔ سرکاری مدارس میں اخلاقی تعلیم کا کوئی علٰحدہ بندوبست نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے سکول کی فضا یا سائنس اور آرٹس کی دماغی تعلیم ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر صاحب کی یونیورسٹی کمیشن نے اس بات کی سفارش کی کہ مدارس میں اخلاقی تعلیم کا علٰحدہ انتظام کیا جائے اور وہ ایک ایسی کتاب کے ذریعے ہو، جس میں انسانی فرائض کا ذکر ہو۔ اس کے علاوہ کالجوں میں پرنسپل یا پروفیسر صاحبان طلبہ کے ان کے فرائض پر لیکچر بھی دیا کریں، لیکن اس سفارش کو گورنمنٹ نے منظور نہ کیا اور اپنی پالیسی وہی رکھی، جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز میں ہندوستان کی مختلف اقوام نے محسوس کیا کہ طلبا کو مذہبی سچائیوں سے محروم رکھنا گویا انھیں ہندوستان کی تہذیب سے بے بہرہ رکھنا ہے۔ اس خیال کی لہر اتنے زور سے اٹھی کہ ملک کے مختلف حصوں میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دیگر اقوام نے یکے بعد دیگرے اسکول اور کالج کھولنے شروع کیے۔ آجکل جو ہم اپنے چاروں طرف اتنے ڈی اے وی، اسلامیہ، سناتن دھرم، خالصہ، دیو سماج، جین وغیرہ تعلیم گاہیں دیکھتے ہیں، انھیں اسی خیال کا عکس سمجھنا چاہیے۔ جہاں تک دماغی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور مذہبی بالا تعلیم گاہوں کا نصاب تعلیم ایک ہی ہے، لیکن مذہبی و اخلاقی تعلیم یہ اپنے اپنے ڈھنگ پر دیتی ہیں۔ ہم اگلے مضمون میں اس بات پر بحث کرینگے کہ یہ تعلیم گاہیں اصلی اخلاقی تعلیم دینے میں کہاں تک کامیاب ہوئیں اور اگر نہیں ہوئیں تو کیوں۔

ذہانت اور اُس کی پیمائش

از

اے ایچ جمیل علوی، ممبر برٹش سائیکولاجیکل سوسائٹی،

(۱) انفرادی آزمائشیں

"جسمانی ساخت کے تبائن یا اختلافات تو انسان نے کسی نہ کسی طرح مشاہدہ کر لیے، مگر ذہنیاتی اختلافات کے احصا میں بہت دشواریاں پیش آئیں۔ حتیٰ کہ ایسے مرحلوں سے بھی دوچار ہونا پڑا کہ اگر مفکرین اس کوشش سے ہاتھ اُٹھا لیتے، تو بیجا نہ ہوتا۔ تاہم ان کی ہمت کی بے ساختہ تعریف کرنی پڑتی ہے کہ انھوں نے ایسے اہم اور نازک مسئلے کو بھی اپنی نگاہ کی گہرائیوں سے دُور رکھنا پسند نہ کیا اور برابر کامیابی کی جدوجہد میں معروف رہے۔ جو لوگ سائنٹفک رسالے یا علمی جرائد اور کتب کے مطالعے سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، اُنھیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ مغرب کے مفکرین کیسی سرگرمی کے ساتھ اس خصوصیت میں پیہم وقفِ عمل ہیں۔"

"سائنس"

ذہنی اختلافات کے متعلق سب سے زیادہ ضروری تحقیق ذہنی پیمائشوں کی ایجاد ہے۔ اس اہم ایجاد کا سہرا فرانس کے محققین کے سر ہے۔ ۱۹۰۴ء میں وزارتِ تعلیمات فرانس نے طلبہ کے اذہان کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک مجلس مقرر کی، جو ماہرینِ نفسیات، اطبا اور علما وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اس مجلس کے ایک مقتدر رکن فرانس کے مشہور و معروف ماہرِ نفسیات الفرڈ بینے[1]

[1] Alfred Binet. ۱۲۹۲

تھے۔ بینے اس وقت سوربون کی فعلیاتی نفسیات کے معمل کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ اس مجلس کی تحقیقات کے نتائج کی اشاعت سے وزارتِ تعلیم پر اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہُوا کہ باوجود خلاف ذہنیات کے بچّوں میں مجموعۃً ایسی قوتیں موجود ہیں، جن سے ان کے طبعی یا غیر طبعی ہونے کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر بینے نے طامس سیمون[1] کے ساتھ مل کر بچّوں کے ذہنی حالات کی صحیح صحیح پیمائش کے لیے ایک میٹری پیمانۂ ذہانت تیار کیا اور ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ آزمائشوں کا یہ پیمانہ طلبہ اور اساتذہ کے لیے اُمید سے بڑھ کر مفید ثابت ہُوا۔ ۱۹۰۸ء میں کچھ تغیّر و تبدل کے بعد یہی آزمائشوں کی فہرست دوبارہ شائع کی، لیکن ان آزمائشوں کے متعدد استعمال سے چند ایک خامیاں نظر آئیں اور ڈاکٹر موصوف نے یہ محسوس کیا کہ اس فہرست میں ابھی ترمیم کی گنجائش موجود ہے۔ اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہُوئے، بینے نے اپنی بے وقت وفات سے تھوڑا عرصہ قبل یعنی ۱۹۱۱ء میں اکیلے ہی آزمائشوں کی فہرست میں آخری ترمیم کی۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بینے اور سیمون کی فہرست کی نشوونما زمانے کی ذہنی پیمائش کی بنیاد ہے۔ بینے کا پیمانہ محض تاریخی لحاظ سے ہی دلچسپی کا مرکز نہیں پچیس سال کی متواتر تنقید، بحث اور تجربات کے بعد اب یہ پیمانہ انسانی اذہان کو طبعی یا غیر طبعی گردانے کے لیے ایک بہترین آلۂ کار خیال کیا جاتا ہے۔ اس پیمانے کی آخری اشاعت کے بعد دس سال سے بھی کم عرصے کے دوران میں یہ پیمانہ امریکہ، کنیڈا، انگلستان، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جنوبی افریقہ، جرمنی سوئٹزرلینڈ، اطالیہ، روس، چین اور ہندوستان میں استعمال ہونے لگا۔ اسی عرصے میں اس کے تراجم جاپانی اور ترکی زبان میں بھی کیے گئے۔ یہ ہر دلعزیزی ان آزمائشوں کے مفید ہونے کا مدلّل اور واضح ثبوت ہے۔

---

[1] Thomas. Simon.

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بینے کی آزمائشوں کے پیمانے کی حقیقت کیا ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں بینے نے ایسی آزمائشیں کیسے مقرر کیں؟ اس کا جواب ہمیں تجربی نفسیات کے ایک اہم انکشاف میں ملیگا۔ یعنی بچوں کے طبعی یا غیر طبعی ہونے کا انحصار مختلف جبلّی عکسوں[1] پر ہے۔ کئی سال کی متواتر ان تھک کوششوں سے ماہرینِ نفسیات نے متعدد تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ایک مخصوص عمر کے طبعی بچّے کے لیے چند مخصوص عکسوں کی موجودگی ضروری ہے۔ یہی دریافت فی الحقیقت بینے اور سیموں کے پیمانے کی ابتدا تھی۔ بینے سے پہلے بھی ذہانت کی پیمائش کا پیمانہ موجود تھا، لیکن اس کی بنیاد تجرباتی اصولوں پر نہ ہونے کے باعث اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس پیمانے کے متعلق بینے کا اعتراض یہ تھا کہ ایسی آزمائشیں اعلیٰ ذہنی قوتوں کے متعلق نہیں۔ بینے اس بات پر مصر تھے کہ ہمیں صحیح صحیح پیمائش کے لیے اعلیٰ ذہنی قوتوں، مثلاً سوچ بچار، تخیلات وغیرہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ ذہانت ان کے نزدیک قوت فیصلہ اور عقلِ سلیم وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ذہانت کا واقفیت عامہ سے، جو مدرسوں میں حاصل کی جاتی ہے، کچھ تعلق نہیں۔ گو ذہین بچّہ واقفیت عامہ سے بہت زیادہ بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

بینے نے ذہانت کے تجزیے کی مطلق کوشش نہ کی اور یہی ان کے پیمانے کا ایک اہم نقص ہے، کیونکہ ذہانت کے مختلف عناصر کو جانچنا بہت ہی ضروری ہے۔ بینے کا نظریہ یہ ہے کہ ذہانت کی پیمائش اس کے مجموعی اثرات مثلاً توجہ، تخیلات، سوچ بچار اور قوت فیصلہ وغیرہ سے ہی کی جا سکتی ہے۔ ان کا پہلا پیمانہ تیس خاص الخاص سوالات یا مسائل پر مشتمل تھا۔ سوالات بتدریج اختتام کی جانب مشکل ہوتے جاتے تھے۔ یہ پیمانہ دو صد طبعی بچّوں پر تجربہ کرنے کے بعد معیاری قرار دیا گیا تھا۔ پیمانے کے سوالات کی گروہ بندی عمر کے مطابق

---

[1] Reflexes.

نہ تھی۔ انھوں نے محض اندازہ ہی لگایا تھا کہ فلاں عمر کے بچّے کو اتنے سوالات کا صحیح صحیح جواب دینے کے قابل ہو جانا چاہیے۔ ۱۹۰۸ء کی ترمیم میں ان آزمائشوں کو پہلی مرتبہ مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ پیمانہ تین سے تیرہ سال کی عمر کے لیے مخصوص تھا۔ ہر ایک عمر کے لیے ۴ سے ۸ سوال تک مخصوص تھے۔ جب کسی آزمائش کو کسی مخصوص عمر کے گروہ کے بچّے ۲/۳ سے لے کر ۳/۴ تک کی تعداد میں حل کر لیتے، تو بینے اس آزمائش کو اس عمر کے لیے مخصوص کر دیتے۔ مثلاً اگر کسی آزمائش میں پانچ سال کی عمر کے گروہ کے تمام یا تقریباً تمام بچّے فیل ہو جاتے، تو اس آزمائش کو اس گروہ کے لیے زیادہ مشکل خیال کیا جاتا، لیکن اگر آزمائش میں دس سال کی عمر کے گروہ کے تقریباً تمام بچّے کامیاب ہو جاتے، تو اس آزمائش کو اس گروہ کے لیے زیادہ آسان خیال کیا جاتا۔ بینے کے نزدیک آزمائش مخصوص کرنے کی تعداد تمام گروہ کے بجائے ۳/۴ تک ہونی چاہیے۔

۱۹۰۸ء کا پیمانہ چند لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپ ہے، کیونکہ اس کی ترتیب میں پہلی مرتبہ "ذہنی عمر" کا تصور قائم کیا گیا ہے۔ بچّے کی ذہنی عمر کا انحصار ان آزمائشوں کی تعداد پر تھا، جن کو مخصوص عمر کا بچّہ حل کرنے میں کامیاب ہوتا۔ اگر کوئی بچّہ ان تمام آزمائشوں میں کامیاب ہو جاتا، جو ۸ سال کی عمر کے لیے مخصوص تھیں، تو اس کی ذہنی عمر ۸ سال قرار دی جاتی۔ اگر اس کی طبیعی عمر ۵ سال ہوتی، تو وہ اپنی عمر کے لحاظ سے ۳ سال ذہنی عمر میں فائق خیال کیا جاتا، لیکن اگر اس کی طبیعی عمر ۱۰ سال ہوتی، تو اُسے ۲ سال اپنی مخصوص عمر سے پیچھے خیال کیا جاتا۔ ذہنی عمر کا یہ تصوّر بعد میں از حد مفید ثابت ہُوا۔

۱۹۱۱ء کا پیمانہ، جو تین سال کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا، مندرجۂ ذیل ہے:۔

عمر ۳ سال : ۱۔ ناک، آنکھ اور منہ کی طرف اشارہ کرنا۔

۲۔ دو تک ہندسے (مثلاً ۲۱۔ ۳۸) دُہرا سکنا۔

۳۔ تصویر میں مختلف اشیا کو گن سکنا۔

۴۔ خاندانی نام بتا سکنا۔

۵۔ چھ الفاظ کا فقرہ دہرا سکنا۔

عمر ۴ سال : ۱۔ اپنی صنف بتا سکنا۔

۲۔ قفل، چابی اور چاقو کا نام بتا سکنا۔

۳۔ تصویر میں مختلف اشیا کو گن سکنا۔

۴۔ چار ہندسے دہرا سکنا۔

۵۔ دو خطوں کا مقابلہ کر سکنا۔

عمر ۵ سال : ۱۔ دو وزنوں کا مقابلہ کرنا۔

۲۔ ایک مربع کی شکل دیکھ کر اس کی نقل اُتار سکنا۔

۳۔ دس الفاظ کا فقرہ دہرا سکنا۔

۴۔ چار سکوں کو گن سکنا۔

۵۔ مستطیل کے دو برابر حصوں کو یکجا کر سکنا۔

عمر ۶ سال : ۱۔ صبح اور شام کے متعلق آگاہ ہونا۔

۲۔ عام اشیا کی تعریف۔

۳۔ ہیرے کی شکل کی نقل اُتار سکنا۔

۴۔ ۱۳ سکّے گن سکنا۔

۵۔ بُری اور اچھی اشکال میں تمیز کر سکنا۔

عمر ۷ سال : ۱- بائیں ہاتھ اور دائیں کان کی پہچان۔
۲- تصویر کی توضیح۔
۳- تین لکھے ہوئے دیے ہوئے احکام کی پیروی۔
۴- چھے مختلف سکوں کی قیمت بتانا۔
۵- چار اصلی رنگوں کا نام بتانا۔

عمر ۸ سال : ۱- دو اشکال کی نقل حافظے کی مدد سے اُتارنا۔
۲- بیس سے ایک کی طرف گننا۔
۳- تصاویر کے مٹے ہوئے عناصر معلوم کرنا۔
۴- دن کا نام اور تاریخ بتانا۔
۵- پانچ ہندسے دہرا سکنا۔

عمر ۹ سال : ۱- بیس سکوں میں سے کسی زیادہ قیمتی سکے کی ریزگاری دینا۔
۲- عام اشیا کی تعریف۔
۳- تمام مختلف اقسام کے سکوں کو پہچاننا۔
۴- سال کے مہینوں کے نام جاننا۔
۵- چند آسان سوالات کا جواب۔

عمر ۱۰ سال : ۱- پانچ مختلف وزنوں کے ہم شکل ڈبوں کو ترتیب میں رکھنا۔
۲- چند اشکال کی حافظے کی مدد سے نقل کرنا۔
۳- چند مہمل فقروں پر تنقید۔
۴- چند مشکل سوالات کا جواب۔

۵- تین دیے ہوئے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ دو فقروں میں استعمال کرنا۔

عمر ۱۲ سال: ۱- اشارات کی مطابقت۔

۲- تین الفاظ کو ایک ہی فقرے میں استعمال کرنا۔

۳- تین منٹ میں ساٹھ الفاظ بتانا۔

۴- چند الفاظ کی تعریف۔

۵- ایک اُلٹے فقرے سے مطلب نکالنا۔

عمر ۱۵ سال: ۱- سات ہندسوں کو دہرانا۔

۲- ایک لفظ کے تین مترادف تلاش کرنا۔

۳- ۲۶ الفاظ کے فقرے کو دہرانا۔

۴- تصاویر پر تنقید۔

۵- چند حقائق کی تشریح۔

بالغ: ۱- کاغذ کاٹنے کی آزمائش۔

۲- تخیل کی مدد سے ایک مستطیل کو ایک خاص حالت میں رکھنا۔

۳- دو دو اصطلاحات میں فرق کر سکنا۔

۴- پریزیڈنٹ اور بادشاہ میں فرق۔

۵- ایک پیرے کا مطلب اپنے الفاظ میں بیان کرنا۔

بینے کے اس پیمانے پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ بچے کی کامیابی کا انحصار اس کی جبلی لیاقت کے بجائے اس کے علم اور معاشری ماحول پر ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ خاندان کا بچہ غریب خاندان کی نسبت زیادہ نمبر حاصل کرے گا۔

ماہرینِ نفسیات اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بچے کے علم پر ماحول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر بینے کی یہی آزمائشیں لاہور کے کسی اعلیٰ خاندان کے کسی ایسے لڑکے کو دی جائیں، جس کی پرورش کسی ایسے گاؤں میں ہوئی ہو، جو تہذیب و تمدّن سے کوسوں دُور ہے، تو وُہ ضعیف العقل قرار دیا جائیگا۔ اس لحاظ سے ہم گاؤں کے طلبہ کا شہر کے طلبہ سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بعض علما نے حال ہی میں اس موضوع پر تجربات کیے ہیں۔ ان سب نے یہی نتیجہ برآمد کیا ہے کہ ماحول کا علمی لیاقت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ کالوَن (۱۹۲۲ء) نے بوسٹن شہر کے امیر اور غریب دونوں طبقوں پر تجربات کرنے کے بعد معلوم کیا ہے کہ امیروں کے بچے غریبوں سے تقریباً دو سال ذہنی عمر میں فوقیت رکھتے ہیں۔ سرل برٹ نے، جو انگلستان کے مشہور عالمِ نفسیات ہیں، لندن کے امیر اور غریب دونوں طبقوں پر تجربہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا ہے کہ بینے کے پیمانے میں امیر خاندان کے بچے زیادہ نمبر حاصل کرتے ہیں۔ بینے خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے کہ ان کی آزمائشیں ایسی جبلّی لیاقت کی، جو ماحول کے اثر سے آزاد ہو، پیمائش نہیں کرتیں۔ اس لیے انھوں نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ دو بچوں کی ذہنی عمر کا مقابلہ صرف اسی صورت میں ہی کیا جا سکتا ہے، جبکہ ان کی تعلیم اور ان کا ماحول قریب قریب ایک ہی جیسا ہو۔ ان تمام شرائط کی موجودگی میں دو بچوں کی لیاقت کا بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت بخوبی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بینے کی آزمائشیں اس مقصد پر مبنی تھیں کہ مخصوص شعبے کی تعلیم کے اثر کو حتی الامکان بہت ہی کم کر دیا جائے۔ اس لیے اگر تمدّن اور ماحول کا اثر کچھ اتنا زیادہ نہیں، تو ذہنی عمر کا اندازہ حقیقت کے قریب ترین ہوگا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آزمائشوں کے جواب میں زبان دانی کا، وہ واضح طور پر تحصیلی ملکہ ہے، بہت زیادہ دخل ہے، لیکن اس پیمانے میں ایسی آزمائشیں

---

۱ Instinctive ability ۲ Cyril Burt

بھی موجود ہیں، جو جبلّی لیاقت یعنی ذہانت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً تفکّر اور قوتِ فیصلہ وغیرہ کی آزمائش۔ مختصراً اگرچہ بینے کے پیمانے میں زباندانی کو کافی دخل ہے، لیکن پھر بھی اس کی مدد سے مستعدی، چُستی اور جبلّی لیاقت کا تقریباً صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس پیمانے پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کرداری نقائص مثلاً کاہلی، تند مزاجی اور غیر طبعی صنفی عادات پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا۔ اس کے علاوہ ان آزمائشوں سے یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ فلاں بچّہ کون سے خاص شعبے میں اپنا نام پیدا کر سکتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ اعتراض اتنا معقول نہیں۔ بینے کا مقصد ذہانت عمومی کو معلوم کرنا تھا، نہ کہ کردار یا سیرت کا تجزیہ کرنا یا خاص خاص ملکوں کا دریافت کرنا۔ اگرچہ اس پیمانے کا استعمال بہت ہی محدود ہے، لیکن پھر بھی ذہنی عمر کا تصوّر مختلف شعبوں بالخصوص جذباتی نقائص اور جرموں کی دریافت میں بہت ہی ضروری ہے۔ نفسیات نے اب اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی ہے کہ کند ذہنی اور جرم اور فحاشی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ علاوہ ازیں ذہنی عمر کے تصوّر کے بغیر کرداری نقائص پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

بینے کی آزمائشوں میں ایک اہم خامی یہ ہے کہ ان سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ معمول کون سے علوم میں اچھا ہے اور کون سے علوم میں کمزور ہے۔ عملی طور پر بچّے کے ذہنی خارج قسمت کے متعلق اندازہ لگانے کی نسبت یہ معلوم کرنا زیادہ ضروری اور مفید ہے کہ وُہ فلاں علم مثلاً علمِ ہندسہ یا ادب میں اوسط سے گرا ہُوا ہے یا نسبتہً زیادہ ذہین ہے، کیونکہ اس جانچ کے بعد اسے اس مخصوص شعبے میں تعلیم جاری رکھنے کی ہدایت دی جا سکتی ہے۔ نفسیات کا عالم اپنے حاصل شدہ نتائج کا غور و خوض سے مطالعہ کرنا اپنے پر فرض قرار دیگا، کیونکہ وُہ صرف اسی صورت میں خاص نشو و نما یا خاص خامی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ بعض اوقات

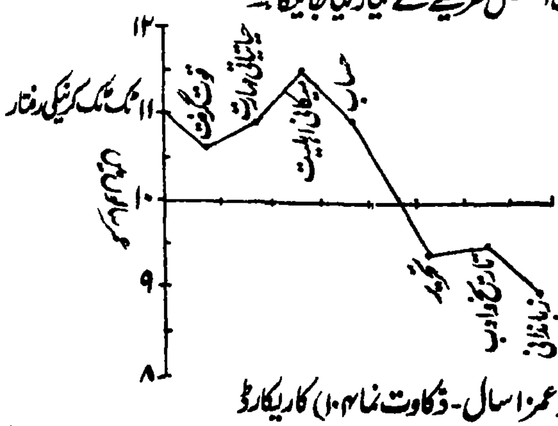
وُہ محض ذہنی عمر پر ہی اکتفا نہ کریگا، بلکہ اس تصویر کے ساتھ چند مخصوص آزمائشوں کا، جن سے حافظے، سوچ بچار اور تحصیل کا پتہ چلتا ہے، اضافہ کریگا۔ اِن مخصوص آزمائشوں کے نتائج "نفسی نگار"[۱] کی صورت میں ثبت کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی، ایک ایسا چارٹ جس میں امتحان دینے والے کے مختلف ریکارڈ ایسے نقطوں سے ظاہر کیے جاتے ہیں، جو اس کی عمر کے گروہ کے اوسط خط سے اوپر نیچے لگائے گئے ہوں۔ اس طرح صرف ایک نگاہ ڈالنے سے پتا چل جاتا ہے کہ وُہ کون سے مضامین میں کمزور ہے اور کون سے مضامین میں ہوشیار ہے۔

مندرجۂ ذیل نقشہ اِس "نفسی نگار" کو واضح کرتا ہے :۔

ا۔ ف۔ عمر دس سال (ذہانت نما ۱۰۴)

	ٹک ٹک کی رفتار	قوت کی گرفت	حیاتیاتی مہارت	میکانی اہلیت	حساب	تحریر	تاریخ و ادب	زباندانی
ا۔ف کا ریکارڈ	۱۶۵	۱۷۰۵	۱۷۵۰	۲۸	۱۲۴	۶۴	۸	۵
عمر کی مطابقت	۱۱	۱۰٫۶	۱۱	۱۱٫۶	۱۱	۹٫۵	۹٫۶	۹٫۱

اس کا چارٹ اِس طریقے سے تیار کیا جائیگا :۔



شکل نمبر۱ - ا۔ف (عمر ۱۰ سال۔ ذکاوت نما ۱۰۴) کا ریکارڈ

[۱] Prychograph.

اِس چارٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ا۔ف اپنی عمر کے لحاظ سے طبیعی قوت میں فوقیت رکھتا ہے۔ حساب اور میکانی لیاقت میں بھی ہوشیار ہے، لیکن محاورات کا استعمال، تاریخ، ادب اور پڑھنے میں کمزور ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لڑکا اس شعبے میں خاص ترقی کر سکتا ہے۔ جس میں جسمانی طاقت، ریاضی اور میکانی علوم کا دخل ہو۔

بینے اور سیمون کے پیمانے کے متعلق مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیمانے سے حاصل شدہ نتائج اس وقت اور صرف اس وقت قابلِ تسلیم ہو سکتے ہیں، جبکہ طلبہ طبعی ماحول سے تعلق رکھیں اور انھیں اپنی زبان پر کافی عبور حاصل ہو، جہاں تک ممکن ہو سکے، طالب علم کی ذاتی زندگی، طبّی یادداشت اور معاشری حالات وغیرہ کو نظر انداز نہ کریں۔ مدرسے کے دوران کی عادات اور کھیل کود کو ضرور ثبت کریں۔ اس طریقے سے یہ آزمائشیں امید سے بڑھ کر مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

انگریزی زبان کی تدریس میں ہندوستانی کا تعلق

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، بی اے

غیر ملکی زبان سیکھنے کے لیے مختلف لوگوں کے مختلف نظریے ہیں۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ اگر بچے کو غیر ملکی زبان سکھانا مقصود ہو، تو اُسے ایسے ماحول میں رکھنا چاہیے اور ایسا ماحول اس کے گرد پیدا کرنا چاہیے، جہاں صرف وہی غیر ملکی زبان بولی جاتی ہو۔ ہندوستانی طالب علم کی مثال لیجیے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس کے لیے انگریزی سُننے اور سمجھنے کے جتنے زیادہ مواقع اور جتنے زیادہ امکانات پیدا کر دیے جائیں گے، اتنی زیادہ اسے انگریزی زبان میں دسترس حاصل ہوگی۔ وہ طالب علم جس کے گرد و پیش، گھر کی خادمہ سے ماں باپ، بھائی بہن، خویش و اقارب سب کے سب انگریزی بولی بولتے سنائی دیں اور دن اور رات کے بیشتر اوقات اسی گفت و شنید میں گزر جائیں، تو یقیناً وہ بہت جلد، آسانی کے ساتھ اور اچھی طرح سے انگریزی بولی سیکھ جائیگا ——— لیکن ہندوستان میں کتنے خوش بخت گھرانے ایسے ہونگے، جہاں بچّوں کو اس نوع کا ماحول میسّر آ سکے۔

دوسرے ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے بچّوں کو انگریزی زبان کے علاوہ اور بھی بہت سے مضمونوں کی تعلیم حاصل کرنا ہے اور یہ مضامین بھی تعلیمی اعتبار سے اتنے ہی اہم ہیں، جتنی انگریزی زبان کی تعلیم اہم خیال کی جاتی ہے۔ ان مضامین کو ثانوی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان مضامین میں ہندوستانی زبان کی تعلیم بھی ہے۔ ہندوستانی زبان کی عزت اب بڑی

حد تک ہندوستانیوں کے دلوں میں جاگزین ہو چکی ہے۔ یہ زبان بھی اب لوگوں کے ذہن و افکار کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تبدیلیاں کرتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی ساری قوموں کی توجہ زبان کے مسئلے پر لگی ہوئی ہے۔ قوموں کی اصلاح و بہبود کا زیادہ تر انحصار ملک کی اپنی زبان پر ہوتا ہے، اس لیے اس زبان کو بڑی اہمیت اور اس پر بہت توجہ دی جا رہی ہے۔

انگریزی زبان کو ہمارے مدارس میں اب اگر بڑا درجہ حاصل ہے، تو ہندوستانی زبان کی اہمیت بھی عیاں ہے۔ اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اولین حیثیت کس کی ہے اور ثانوی حیثیت کس کی۔ اب تو ہمارے پیشِ نظر سوال یہ ہے کہ ان میں تعاون کیسے پیدا کیا جائے۔ ان میں یگانگت کس صورت سے قائم کی جائے کہ بچوں کے دماغوں میں صلاحیت بھی پیدا ہو جائے اور یہ زبانیں بھی سیکھ جائیں، لیکن یہاں بچوں کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں کچھ اختلاف سا پیدا ہو گیا ہے۔ بیشتر حضرات کی یہ رائے ہے کہ اگر تدریس کے وقت ہندوستانی زبان پر زور دیا گیا، تو نہ صرف یہ کہ انگریزی کی قوتِ اظہار کو نقصان پہنچیگا، بلکہ اس کی راہ میں بڑی بڑی دشواریاں پیدا ہو جائینگی۔ بچے سہولت کے ساتھ جلد انگریزی بولی نہیں سیکھ سکیں گے۔ ان کے تخیل، ان کی قوتِ استدراک، ان کی قوتِ اظہار کی نشو و ارتقا پورے طور سے نہیں ہو سکیگی۔ بہر حال یہ دو مختلف نظریے ہیں اور متنہیانہ۔

ان دونوں نظریوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، تو ہم یہ کہیں گے کہ انگریزی کی تدریس میں جہاں تک ہمارے نصاب اور ہمارے مدرسے کو تعلق ہے، ہندوستانی زبان بالواسطہ یا بلاواسطہ گویا ہر لحاظ سے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دو چیزوں میں اس حد تک خوش گوار ربط قائم کر دیا جائے کہ ایک کا اثر دوسری پہ ہو، تو لازماً اگر ایک کو ترقی ہوگی، تو دوسری اس ترقی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیگی، یقیناً اس کا معیار بھی ساتھ ساتھ اونچا ہوتا

رہیگا۔ یہی حال زبانوں کا بھی ہے۔ اگر انگریزی اور ہندوستانی زبانیں ہمارے طریقِ تعلیم میں اچھی طرح سے مربوط ہوجائیں، تو ایک کی ترقی کا اثر قدرتی طور سے دوسری پر پڑے گا۔ ہندوستانی زبان کو اگر ترقی ہُوئی، تو انگریزی کو بھی فروغ ہوگا۔ اس صورت سے یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہوجائینگی۔ وہ تمام قوتیں، جو ہندوستانی زبان کی تدریس کی اصلاح میں استعمال کی جائیں گی، وُہی قوتیں انگریزی زبان کی تدریس میں بھی برابر کا اثر رکھینگی۔

انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے باہمی ربط اور علاقے کے متعلق مسٹر وی کے بنرجی نے بڑی سرگرم تحقیق کی ہے۔ آپ نے بڑے غور و انہماک کے ساتھ ان دونوں زبانوں کی تدریجی تعلیم کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی تحقیق کی بنا صرف سو طلبا پر محدود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ طالب علم کی اپنی زبان اچھی ہو، تو انگریزی زبان بھی اچھی طرح سے آئیگی۔ مسٹر بنرجی نے ایک سو طلبا کے نتائج سے اندازہ کیا کہ ان میں باون طلبا انگریزی میں ناکام رہے۔ دس ایسے تھے، جو ہندوستانی زبانوں میں فیل ہُوئے، لیکن انگریزی میں کامیاب ہُوئے۔ ان دس طلبا میں صرف ایک ایسا تھا، جو انگریزی میں اچھے نمبروں پر کامیاب ہوا۔ دوسرے طلبا کے انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے نمبروں کا تفاوت کوئی نمایاں نہیں تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر ہندوستانی زبان کی تدریس میں زیادہ توجہ دی جائے، تو انگریزی کی تدریس پر بھی اچھا اثر پڑیگا۔

بچّے کی ابتدائی زندگی کے چند سال ایسے ہوتے ہیں، جب ان کی قوتِ فکر بڑی تیزی کے ساتھ کام کرتی ہے۔ ان کے سیکھنے اور حاصل کرنے کی بنیاد یہیں سے قائم ہوتی ہے۔ اس وقت انھیں جس قسم کی عادتیں ڈال دی جائینگی، زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہینگی۔ ہمارے مدارس میں تعلیم ہندوستانی میں شروع ہوتی ہے۔ اب ہمیں اس زمانے میں بچوں

کو ایسی عادتیں ڈالنا ہیں، جو سن شعور تک پہنچنے تک ان کے لیے ننگ و عار کا موجب نہ
بلکہ شرف و افتخار کا سبب ہوں۔ اب اگر ہندوستانی کی جماعت کے کمرے میں اس قسم کی
ڈالنے کے اسباب مہیا ہو سکیں، تو یہی عادتیں بچوں کی انگریزی کی تدریس میں بھی مع
ثابت ہونگی۔

تلفظ۔ بچے کی تدریس کے سلسلے میں اولین عادت تلفظ کی ہے۔ الفاظ کے ظاہری محا
کا اثر کسی زبان کے ادب پر بھی بہت پڑتا ہے۔ الفاظ اگر بچے کے ذہن سے خاص اصو
کے ماتحت ڈھلے ہوئے نکلیں اور خوبصورتی کے ساتھ ادا ہوں، تو اس کی بول چال بھرا
ہوگی اور اس کا یہ نتیجہ بھی ہوگا کہ بچے کے ذہن میں زبان کی صلاحیت کا احساس پیدا ہو
اس احساس سے دوسری زبان کی صلاحیت کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ مشکل تو ذوق
پیدا کرنے کی ہے۔ ذوق پیدا ہو جائے، تو اسے آپ جس شکل میں ڈھالنا چاہیں ڈھال سکتے

جو طالب علم ا زبر اَ کی قوت کو جانتا ہے اور ا مد آ کی آواز کو پہچانتا ہے اور ان
فرق میں تمیز بھی کر سکتا ہے، اس کے لیے "اے" کی مختلف صورتوں میں تمیز کرنا بھی آس
ہو جا سکتا ہے۔ یہی حال ث، سین، ق، ک، ا اور عین وغیرہم کا ہے۔ بچے کے ذہن
اگر ہندوستانی الفاظ کے اعراب و حرکات و صوت کا ذوق پیدا کر دیا جائے، تو انگریزی زبا
کی یہ مشکل بڑی آسانی کے ساتھ طے ہو سکتی ہے۔

قوتِ بیان۔ دوسری عادت اظہارِ بیان کی ہے۔ اگر بچہ اپنے مافی الضمیر کو ہندوستا
بولی میں صاف اور واضح طور پر ادا کر سکتا ہے، تو وہ انگریزی میں بھی اپنے مافی الضمیر کو سہول
کے ساتھ ادا کر سکیگا۔ طالب علم کو ایک کہانی یا قصہ سنا دیا جائے۔ پھر اس سے کہا جائے
تم اس کہانی کو اپنے الفاظ میں بیان کرو۔ طالب علم کی قوتِ بیان کی تربیت اگر اچھی طرح

ہوئی ہے، تو وہ بہتر طریق پر اس کہانی کو ادا کرسکیگا۔ ہمارے بچوں کی قوت بیان کی تربیت کا ذریعہ ہندوستانی زبان ہے اور اگر اپنی زبان کے ذریعے اس قوت کی پوری پوری نشوو ارتقا ہو چکی، تو انگریزی بولی میں کسی مضمون کو ادا کرتے وقت بچوں کو دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔ اکثر و بیشتر یہ حقیقت ہمارے دیکھنے میں آئی ہے کہ بچوں کے دماغ میں خیالات تو ہوتے ہیں، لیکن وہ انھیں خوش اسلوبی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے۔

یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ بچے کے ہاتھ میں قلم دے دیا جائے، تو وہ لکھ تو لیتا ہے، لیکن خیالات نہ ہونے کے باعث اس کا مضمون اچھا نہیں ہوتا، تو گویا قوت بیان اور قوتِ خیال کی تربیت کے لیے ہم ہندوستانی زبان سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ استفادہ ہی نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان دونوں قوتوں کی تربیت کا ذریعہ ہی صرف ہندوستانی زبان ہے۔ اس سے ہندوستانی زبان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے بھی کہ طلبا کو ہندوستانی زبان سیکھنا ہے اور اس لیے بھی کہ اُنھیں انگریزی بولی بولنا اور لکھنا ہے۔

اس سے اب ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جہاں تک بچے کے تلفظ، اظہارِ بیان، قوتِ خیال کا تعلق ہے، ہندوستانی کے معلّم اور انگریزی کے معلّم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان کا پورا پورا ساتھ ہی ایک طالب علم کو کامیاب طالب علم بنا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی جماعت کے ہندوستانی اور انگریزی کے معلّم تدریس کے شروع میں ہی اگر تبادلۂ خیالات کر لیں اور مضمون نویسی کی مشق کے لیے مضامین کی ایک ہی فہرست تیار کر لیں، تو اس سے بڑی آسانی ہو سکتی ہے۔ قدرتی طور پر چونکہ بچے کو اُردو میں مضمون لکھنا آسان ہوگا، اس لیے ایک خاص مضمون ہندوستانی زبان میں لکھوا لیا جائے۔ اس سے ہفتے عشرے کے بعد

وہی مضمون انگریزی میں لکھوایا جائے۔ اس طرح یہ شکایت دُور ہو جائیگی کہ بچّوں کے انگریزی کے مضمون میں خیالات نہیں ہوتے۔ یہی مضمون اگر بچّے کو پہلے انگریزی میں لکھوایا جائے، تو اُسے دوگونہ مشکلات کا سامنا ہوگا، خیالات کی ترتیب اور زبان کی درستی لیکن اگر یہی خیالات اپنی زبان کی وساطت سے بچّوں کے ذہن نشین ہو جائیں، تو غیر ملکی زبان میں ان کا اظہار نسبتہً آسان ہو جائیگا اور تعلیم کا مقصد بوجہ احسن تکمیل پاتا رہیگا۔

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بچّوں کے مضامین ربط سے بے نیاز، معنی سے معرّا، خیالات سے محروم نظر آتے ہیں، لیکن اگر انھیں مضامین کے لیے ہندوستانی میں زمین تیار کر دی جائے، تو تحریر کا یہ عیب دور ہو سکتا ہے۔ اس صورت سے انگریزی کی ہیئت تو بہت کچھ مختلف ہو جائیگی، لیکن اس کی راہ کی مشکلات یقیناً دور ہو جائیں گی۔ انگریزی کی تدریس ہندوستانی کی نسبت بھی زیادہ سہل ہو جائیگی اور انگریزی کے معلم کا کام بہت کچھ ہلکا ہو جائیگا اور وہ بغیر کسی کھٹکے کے تمامتر توجہ انگریزی کی اصلاح کی طرف لگا سکیگا۔

زبانی کمپوزیشن اور بول چال ۔ ہندوستانی زبان نہ صرف یہ کہ انگریزی زبان کی مضمون نگاری کے لیے زمین تیار کرتی ہے، بلکہ زبانی کمپوزیشن میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے بچّے اوّل اوّل اپنی زبان میں گفتگو کرنا سیکھتے ہیں۔ اگر انھیں صحت الفاظ کی عادت شروع میں ہی ڈال دی جائے اور وہ اثنائے گفتگو میں صحیح اور غلط کی تمیز کر سکیں، تو یقیناً انگریزی بول چال کے وقت کی متعدد پریشانیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی کی تدریس کے وقت صحت الفاظ کا خیال نہ رکھا جائے، تو انگریزی کے اُستاد کو ایک گونہ کوفت اُٹھانی پڑتی ہے۔

بچّوں کو ہر نئی چیز کے سیکھنے کی تڑپ ہوتی ہے۔ اگر ابتدا میں ہی ہندوستانی

زبان کے معلم انھیں بحث و مناظرہ، مکالمہ اور فسانہ گوئی کی مشق وغیرہ ان کی اپنی زبان میں کراتے رہیں، تو طلبا اس فن کو انگریزی زبان میں حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوسکتے ہیں۔ یہی چیز اگر انگریزی کے معلّم کو شروع سے کرنا پڑے، تو اس کی بے بسی ظاہر ہے۔

مطالعے کی عادت۔ لڑکپن کی عادات کا اثر عالم پیری تک بھی قائم رہتا ہے۔ بچوں کے دل و دماغ بڑی سرعت کے ساتھ اثر قبول کرتے ہیں اور یہ اثرات ہوتے بھی بہت دیرپا ہیں۔ جس بچّے کی طبیعت شروع سے ہی مطالعے سے گریز کرتی ہے، وہ طالب علمی کی ختم مدت تک گریز ہی کرتی رہتی ہے۔ آپ ایک مرتبہ کتب بینی کا ذوق پیدا کردیں، ترقی یہ خود بخود پاتا جائیگا۔ ذوق کی یہ تربیت ہندوستانی کتابوں کے مطالعے تک ہی محدود نہ رہیگی، بلکہ دوسری زبانوں کے مطالعے کا انہماک بھی بڑی شدّ و مد کے ساتھ ہوگا۔ زبان کا غیر ملکی ہونا اس کے مطالعے کے راستے میں روک نہیں ہوگا۔

نئی باتوں کا علم ہونا چاہیے، زبان کوئی سی ہو۔ اگر ہندوستانی زبان پڑھاتے وقت کتب بینی کا شوق بچّوں کو نہیں دلایا جائیگا، تو یہ کام انگریزی کے معلّم کو دوسرا انجام دینا ہوگا اور اس کے لیے طلبا کو مطالعے کا شوق دلانا دشوار ہو جائیگا۔ اکثر انگریزی کے معلمین کو شکایت ہوتی ہے کہ طلبا کو مطالعے کا شوق نہیں۔ کتابیں لائبریریوں میں بند پڑی رہتی ہیں۔ ذوقِ مطالعہ کے فقدان کا سبب ایک یہ بتایا جاتا ہے کہ غیر درسی کتابیں بچّوں کے لیے مشکل بھی ہوتی ہیں اور صبر آزما بھی، لہٰذا بچے توجہ اور محویت کے ساتھ انھیں نہیں پڑھ سکتے۔ مطالعے کی مشکلات سے ان کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں۔ یہ صحیح بھی ہے اور غیر صحیح بھی۔ غیر صحیح اس لیے ہے کہ بچّوں کے ذوق مطالعہ کی اگر تربیت پورے طور سے ہو چکی ہو، تو الفاظ و فقرات کی بڑی سے بڑی مشکل بھی بچّوں کی دلکشی نہیں کرسکتی۔ کتابیں

مشکل تو ہوتی ہیں، لیکن دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور معلومات سے بھی لبریز ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذوق پیدا ہو اور ذوق کی پرورش صحیح طور سے ہو۔ ہندوستانی کی تدریس میں اگر مطالعے کی خواہش طالب علم کے دل میں پیدا نہ ہو سکے، تو ڈر ہے کہ یہ خواہش کبھی پیدا نہ ہو سکیگی، تو گویا انگریزی کے معلمین کو ہندوستانی زبان کے اساتذہ کا یہاں بھی دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

ہندوستانی زبان کے یہ احسانات انگریزی کی تدریس پر بالواسطہ تھے۔ انگریزی کی تعلیم دیتے وقت بلاواسطہ بھی ہندوستانی سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ گریمر ہی کا مسئلہ لیجیے، کتنا خشک مضمون ہے۔ ہم نے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے سنا ہے کہ گریمر کے مبادیات ہمیں ابھی تک معلوم نہیں اور ان کے معلوم ہونے کی توقع بھی نہیں "من ندانم فاعلاتن فاعلات" کے مصداق وہ صحیح انگریزی لکھ بول تو لیتے ہیں، لیکن گریمر کے اصول و مبادی سے شناسا نہیں ہوتے۔ ہمارا انگریزی کا معلم جب بچوں کو انگریزی پڑھانا شروع کرتا ہے، تو الاماں پکار اُٹھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ گریمر کی تدریس کے لیے تنہا اس کی سعی و کاوش کافی نہیں۔ یہ کیوں؟ —— اس لیے کہ ایسی جگہ پر دیوار کی تعمیر کرنا پڑتی ہے، جہاں پہلے کوئی بنیاد نہ تھی اور تھی بھی، تو نہایت کمزور، خام اور ناقابل ذکر۔ یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ گریمر کی رسم افتتاح انگریزی کے معلم کے ہاتھوں سے ہوگی۔ اگر بچے کو شروع میں گریمر کے مبادیات سے روشناس کرا دیا جائے، تو وہ یقیناً اس قابل ہو جائیں گے کہ فقروں میں سے اسم، فعل، ضمیر، صفت کی تعریفیں کر سکیں، بغیر اس کے کہ انھیں ان کی تعریفیں زبانی حفظ کرا دی جائیں۔ اس صورت میں انگریزی معلم کا کام نصف ختم ہو جاتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اسے گریمر کی ابجد پڑھائے، وہ گریمر کی دیوار کی تعمیر ہندوستانی گریمر

کی بنیاد پڑ جائیگا۔ ہندوستانی کے اسم، فعل، حرف وغیرہ کے مرادف الفاظ بتا دیگا اور آسانی کے ساتھ اس کے کام کی تکمیل ہوتی جائیگی اور وہ اپنی توجہ گریمر کے ان مقامات پر دیگا، جو ہندوستانی گریمر سے مختلف ہوں۔

گریمر اور محاورے کے ذکر میں اگر ہندوستانی گریمر اور محاورے کو پیشِ نظر رکھا جائے، ان کا مقابلہ کیا جائے اور ان کے باہمی فرق کو ظاہر کیا جائے، ان کے اختلاف کو پرکھا جائے تو طلبا کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ اگر طلبا کو ہندوستانی کی گریمر کا اچھی طرح سے علم ہو جائے، تو اُسے بلا دقّت انگریزی کی گریمر سے ملا لیا جا سکتا ہے۔ اضافت کا مسئلہ لیجیے، "چاند کی روشنی" ایک مرکب ہے۔ اِس میں 'کی' اضافت کی علامت ہے۔ چاند مضاف الیہ ہے اور روشنی مضاف ہے۔ اس قسم کے مرکب کے متعلق اگر طلبا کو گرنمر کا قاعدہ معلوم ہو، تو مرکب "لائٹ آف دی مون" سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ اسے اضافت کا علم ہو چکا ہے۔ اب مرکّب اضافی کا وجود کسی زبان میں نظر آئے، طلبا آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ فرق ان میں اس قدر ہے، ہندوستانی زبان میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے لیکن انگریزی میں مضاف پہلے آتا ہے، .. .. اس مرکب کو ایک دوسرے طریق سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے، مثلاً "زید کا کتا" یہ مرکّب اضافی ہے، اسے ہم انگریزی میں "دی ڈاگ آف زید" لکھیں گے، لیکن ہم اسے ایک دوسرے قانون کے ماتحت "زیدز ڈاگ" بھی لکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں انگریزی مرکّب میں مضاف الیہ پہلے آیا ہے اور مضاف بعد میں اضافت کا کام 'S' نے دیا ہے، تو گویا اس صورت سے مقابلہ کرنے اور فرق و امتیاز بتانے سے گریمر کا خشک مسئلہ بڑی حد تک دلچسپ اور آسان ہو سکتا ہے۔ سوالیہ فقرے کی ترکیب کا جہاں تک تعلق ہے، ہندوستانی فقرے کی ترتیب کے

اصول بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ ہندوستانی اور انگریزی کے سوالیہ فقرے اگر پیشِ نظر رکھے جائیں، تو انگریزی کے سوالیہ فقرے کی ترکیب بڑی آسانی کے ساتھ بچوّں کے فہم میں آجاتی ہے۔ یہ ابتدائی سی مثالیں تھیں، لیکن یہ اصول ہر جگہ پر صادق آتا ہے۔ اگر انگریزی کا معلّم ہندوستانی کی گریمر کی فہرست بوقتِ تدریس اپنے پیشِ نظر رکھے، تو اُس کا گریمر کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے اور طلبا کو بھی سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

ان متذکرہ امور سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی کو انگریزی کے ساتھ بڑا قریب کا تعلق ہے۔ ہندوستانی نصاب انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ انگریزی کے معلّم کو ایک بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ ایک موضوع کے دو سبق ایک ساتھ نہ پڑھائے جائیں۔ مثالاً اگر ہندوستانی کا معلّم ' اسم صفت ' کا حال پڑھا رہا ہے، تو انگریزی کے معلّم کو نہیں چاہیے کہ وہ اسم صفت کا حال پڑھانا شروع کر دے۔ اسے لازم ہے کہ ' اسم صفت ' کا سبق اس سے چند دنوں کے بعد دے، ورنہ بچّے کے قوتِ خیال کی ترقی کے رک جانے کا امکان ہے۔

حال ہی میں " طریق بلاواسطہ "[۱] کے ذریعے انگریزی کی تعلیم دینے پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ اس طریق تعلیم کی رُو سے انگریزی کی تدریس میں ہندوستانی حروف کا استعمال جائز نہیں سمجھا جاتا۔ اس طریقِ تعلیم کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ ایک مضمون کی تعلیم اسی مضمون کی وساطت سے ہونی چاہیے۔ مثالاً اگر انگریزی کی تعلیم بچوّں کو دلانا ہے، تو ایسا ہونا چاہیے کہ جس کمرے میں انگریزی کی تعلیم دی جا رہی ہو، اس میں کسی دوسری زبان کا تذکرہ نہ آئے۔ فرض کیجیے آپ کو " نارنگی " پر درس دینا ہے۔ انگریزی اس کے لیے " اورنج " ہے، آپ " اورنج " کے لیے ہندوستانی زبان کا مرادف لفظ " نارنگی " بتا کر رہائی نہیں پا سکتے۔ طریقِ

۱۳۱۲ ؎ Direct Method.

بلاواسطہ کی روسے آپ کو چاہیے کہ نارنگی لائیں اور انگریزی ہی میں بتائیں "یہ نارنگی ہے" "جوس" کے لیے آپ یہ نہیں کہیں گے، اسے ہندوستانی زبان میں "رس" کہتے ہیں۔ آپ نارنگی کی ایک قاش سے رس نچوڑ کر بتائیں گے "یہ رس ہے" علیٰ ہٰذا القیاس چھلکا، بیج اور قاش کے متعلق بھی۔ یہ طریقِ تعلیم یقیناً مفید اور قابلِ ستائش ہے اور براہِ راست طالب علم کے تخیل سے تعلق رکھتا ہے، لیکن طالب علم کی ساری تدریس اس طریقِ بلاواسطہ کی وساطت سے نہیں کی جاسکتی۔ بہت سی باتیں ہیں، جو تشنہ رہ جاتی ہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ جہاں تک ممکن ہو، انگریزی کی تدریس میں طریقِ بلاواسطہ ہی کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے، بالخصوص اس وقت جبکہ تشریح مطالب میں وقت کے ضائع ہونے کا احتمال نہ ہو اور کسی غلط فہمی کی گنجائش بھی نہ ہو۔ مڈل اور ہائی کی جماعتوں میں یہ طریق استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن جب انگریزی الفاظ کے مقابلے میں ہندوستانی الفاظ کے بتانے میں زیادہ آسانی ہو اور وقت کی بھی بچت ہو، تو ہندوستانی کے الفاظ ضرور استعمال کرانا چاہیں۔ مڈل کی جماعتوں کا ذکر ہی کیا، ہائی کی جماعتوں میں بھی ایسے فقرات اور محاورات وغیرہ آتے ہیں کہ ان کا انگریزی زبان میں تشریح کرنا قریب قریب ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہندوستانی زبان کے الفاظ کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔

ہمارے ہاں کے اسکولوں میں عام طور سے مشکل الفاظ کے معنی بتادیے جاتے ہیں اور فقرے کا ترجمہ بھی ہندوستانی میں کرادیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس طریقِ تدریس کے خلاف بہت کچھ کہتے ہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ ترجمے کا عنصر زیادہ نہ بڑھایا جائے، تو یہ مشق بھی سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

اگر انگریزی کے سبق کے متعلق یہ دیکھنا مقصود ہو کہ بچے اسے اچھی طرح سے سمجھے

ہیں کہ نہیں۔ اُنھوں نے اس سے پورے طور سے استفادہ کیا ہے یا نہیں، تو وہ ہندوستانی زبان ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ انگریزی کے فقرات کا ہندوستانی میں ترجمہ کرایا جائے، تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔ اس طرح طلبا کو فعلوں کی مختلف اقسام سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لیے وُہ فقرات کی بناوٹ کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں، تو گویا یہ ترجمہ ایک خاص خیال واضح طور سے پیش کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

ہمارا مقصد یہاں لفظ بہ لفظ ترجمے سے نہیں، بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ خیال پورا پورا ادا ہو جائے۔ ہندوستانی زبان خیال بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے بغیر خیالات کا بہم پہنچنا بہت مشکل ہے۔ انگریزی سے ہندوستانی میں ویسے بھی اگر ترجمے کی مشق کرائی جائے، تو بہت مفید ہوتی ہے، لیکن یہ عام طور سے چھوٹی جماعتوں میں کام آتا ہے۔ اگر انگریزی کے چند فقرے وُہ لکھیں اور پھر ان کا ترجمہ بھی خود کریں، تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے معقول ہے یا نہیں۔ اس سے بچّوں میں صحت اور غلطی کا امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ ترجمے کے ذریعے عبارت کی درستی یا نادرستی کا علم اسی طرح سے ہو جاتا ہے، جیسے ریاضی کے سوال کا ہم پرکھ کر اندازہ کرتے ہیں کہ درست ہے یا غلط۔

ہندوستانی زبان کے استعمال کے متعلق کوئی خاص اصول و قواعد وضع نہیں کیے جا سکتے۔ البتّہ جب ہندوستانی زبان کا استعمال سمجھیں، تو اُسے بے دریغ استعمال کرنا چاہیے۔ اگر ہندوستانی کا استعمال بچّوں کی ذہنی اور زبانی ترقّی میں حائل ثابت ہو، تو اُسے استعمال نہ کرنا چاہیے، لیکن یہ وہم ہمیں ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ انگریزی کی تدریس میں ہندوستانی زبانوں کا ذکر نہ آئے۔ ہمیں چاہیے کہ غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں جو طریق ہمیں زیادہ مدد دے سکے، شوق سے استعمال کریں۔ ۱۳۱۴

مدرسوں میں فنونِ لطیفہ کی تعلیم

از

میرزا سجاد حسین، مسلم یونیورسٹی، ٹریننگ کالج

اس میں کیا امور حارج ہیں

حصّۂ اوّل

ہمارے مدارس میں جو فنونِ لطیفہ کا فقدان ہے وُہ قارئینِ کرام سے مخفی نہیں۔ لہٰذا ہم نے تہیّہ کیا ہے کہ اس رسالے کے ذریعے صدا بلند کرکے ارباب حل وعقد کو اس کمی کے پورا کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس ضرورت کے لیے ملک کے ماہرینِ فنونِ لطیفہ کی خدمت میں استدعا کرکے وعدے لیے گئے ہیں کہ وُہ اپنے اپنے خاص فن پر مقالات تحریر فرما کر ملک کی اس خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، جس کا آغاز میرزا سجاد حسین (مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج) کے ذیل کے مقالے سے کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ مصوّری کا مادّہ ہر انسان میں کم وبیش موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں عوام خصوصًا اور تعلیمی اداروں میں اسسٹنٹ ماسٹر سے لیکر ہیڈ ماسٹر تک عمومًا ایک سیدھی لکیر بھی بغیر کسی آلے کی مدد کے نہیں کھینچ سکتے۔ حالانکہ یورپ میں جوانوں کا تو ذکر نہیں، چھوٹے بچّے بھی مانی و بہزاد کے کان کاٹتے ہیں۔ کیا وُہ قدرت کی طرف سے اُن عناصر سے جن کی مدد سے فنونِ لطیفہ ترتیب پاتے ہیں، بہ نسبت ہندوستانیوں کے زیادہ بہرہ یاب ہیں؟ تجربہ اس کا جواب نفی

میں دیتا ہے۔ پھر آخر ہندوستانیوں میں اس خامی کا سبب کیا ہے؟ مَیں چاہتا ہوں کہ جو معمولی واقفیت مَیں نے اس بارے میں حاصل کی ہے اُس کا اظہار چند سطور میں کر دوں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بچّہ ماں کی گود سے لےکر مدرسے تک ایسے ماحول میں تربیت پاتا ہے، جہاں فنونِ لطیفہ کے ساتھ پرلے درجے کی ستم ظریفی برتی جاتی ہے۔ بعض بچّے ایسے ہوتے ہیں، جن کے ضمیر میں فنونِ لطیفہ کا رجحان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اُن میں ادراک اس شدومد کے ساتھ ہوتا ہے کہ باوجود دقتّوں کے پے در پے حامل ہونے کے وُہ اس کا اظہار عملی طریقے سے کیے بغیر نہیں رہتے۔ کہیں لاعلمی سدِّ راہ ہوتی ہے اور کہیں مذہب۔ اہلِ اسلام میں فنِ مصوّری کی بعض ساختوں کے ساتھ کافی بیزاری برتی جاتی ہے۔ کہیں ماں بچّے کو دھمکی دیتی ہے کہ موذی اللہ میاں کے یہاں تجھے اس تصویر میں جان ڈالنا پڑے گی (یہ آپ بیتی ہے) کہیں خدائی فوجدار کفر کا فتویٰ دینے پر تلے ہُوے ہیں۔ مگر بچّہ ہے کہ جہاں اُسے موقع ملا، اُس نے اپنے ننّھے ہاتھوں سے قدرت کی کاریگری کی نقّالی شروع کر دی۔ اس آئے دن کی تو تو مَیں مَیں سے اس بیچارے کے جوش اور ولولے میں ایک گونہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ لیجیے اس غریب فن کا سلسلہ گھر کی تعلیم و تربیت کے اثر سے تو اس طرح منقطع ہُوا۔ اب خدا خدا کر کے بچّے کے مدرسے میں داخل ہونے کا زمانہ آیا۔ وہاں اُس کو علاوہ مادری زبان انگریزی اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم کے مصوّری یا بزبان انگریزی ڈرائنگ کی تعلیم بھی دی جانے لگی، لیکن آخرالذکر فن کا طرزِ تعلیم ایسا نکمّا ثابت ہُوا کہ خدا کی پناہ۔ اور نکمّا کیوں نہ ثابت ہوتا، ڈرائنگ ماسٹر صاحب جو ابھی ابھی دو سال کی تعلیم کے بعد ڈرائنگ ماسٹری کی سند حاصل کر کے اسکول میں وارد ہُوے تھے اور جو بزعمِ خود فوٹو پر آڑی اور کھڑی لکیروں کا جال بنا کر اس سے بڑے پیمانے پر پنسل سے تصویر بنا سکتے تھے، انھیں حضرت کے سپرد تو یہ بچّہ اور دوسرے چھوٹے

بچّے تھے۔اس وقت مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ولایت میں ایک ضعیف العمر مشہور مصوّر مرضِ موت میں مبتلا تھے۔لوگ جو اُن کی عیادت کے لیے اُن کے پاس گئے،انھوں نے دیکھا کہ وُہ کفِ افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ اب جبکہ مجھ میں قلم پکڑنے کی تمیز آئی،اس وقت مَیں دنیا سے جُدا ہو رہا ہوں۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔یہاں کے باوا آدم ہی نرالے ہیں۔غضب تو یہ ہے کہ خداوندانِ محکمۂ تعلیم جو خود کو فنونِ لطیفہ کا مدعی گردانتے ہیں، وہی ان ڈرائنگ ماسٹر حضرات کے معرضِ وجود میں آنے کا باعث ہُوئے ہیں۔زبان کی تعلیم کے لیے چھوٹے سے چھوٹے درجے میں بی اے اور ایم اے مدرس قائم کیے جائیں اور فنِ مصوّری کی تعلیم جس کو لوگ عمر کا زیادہ حصّہ صرف کرکے حاصل کر سکتے ہیں،ایسے اناڑیوں کے سپرد کی جائے،جن کو پنسل پکڑنے کی بھی تمیز نہ ہو۔لوگ اعتراض کرینگے کہ اکثر ڈرائنگ ماسٹر غیر معمولی قابلیت رکھتے ہیں۔مَیں کہتا ہوں، سیکڑوں ڈرائنگ ماسٹروں میں اگر ایک ماہرِ فن ہوا،تو اُس کے ہونے سے نفسِ مسئلہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ مدرسوں میں ڈرائنگ کی تعلیم کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ڈرائنگ ماسٹر کی مثال مدرسے میں ایسی ہے،جیسی اندھوں میں کانے کے راجہ ہونے کی۔یہ واقعہ ہے کہ اسسٹنٹ ماسٹر سے لے کر ہیڈ ماسٹر تک اس فن میں نابلد،محض ڈرائنگ ماسٹر صاحب اپنے درجے کے خود مختار حکمران۔وُہ سیاہ کریں یا سفید ہیڈ ماسٹر صاحب کو بجز آمنّا و صدّقنا کہنے کے اور چارۂ کار نہیں۔اگر ہیڈ ماسٹر کو کبھی نکتہ چینی کرنے کی جراءت بھی ہُوئی ہے،تو ناواقفیت کی بدولت غلط ثابت ہُوئی ہے۔ڈرائنگ ماسٹر کی آنکھوں کے سامنے طالب علم پٹری کی مدد سے سیدھی لکیریں اور پرکار کی مدد سے دائرے کھینچا کرتے ہیں۔چونکہ ڈرائنگ ماسٹر میں یہ قدرت نہیں ہوتی کہ وُہ براہِ راست مختلف چیزوں کی شکلیں کاغذ پر یا بلیک بورڈ پر آزادانہ کھینچ کر طالب علم کو سمجھائے،اس لیے وُہ اُن کی اس غلط کارروائی سے

چشم پوشی کرتا ہے۔ اگر زیادہ جرأت سے کام لیا، تو کتابوں میں جو شکلیں چھپی ہوئی ہیں، اُن کی نقل کروا دی، خواہ وہ غلط ہو یا صحیح۔ ہر چیز کو سامنے رکھ کر براہ راست بنانے کی قابلیت جبکہ ماسٹر میں نہیں ہوتی، تو بچارے طالب علم صحیح اصول سے کس طرح واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اوائل عمر میں انسان علم و فن حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ جوں جوں سن زیادہ ہوتا جاتا ہے، دوں دوں یہ قابلیت کم ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ طالب علمی کا زمانہ اِن غلط کارروائیوں کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے عموماً ہندوستانی اس فن سے محروم رہ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے ہر فعل سے بد مذاقی کا ثبوت ملتا ہے۔ اُن کے کام بسا اوقات بھدّے اور بھونڈے طریقے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں ہے۔ مَیں آگے چل کر ثابت کرونگا کہ مَیں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا ہوں۔

کہتے ہیں کہ ماں کی گود میں جو سبق بچّے کو ملتا ہے، اُس کی بیشتر جھلک اُس کی آئندہ زندگی کے کارناموں میں پائی جاتی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری عورتیں فنونِ لطیفہ سے مردوں سے بھی زیادہ محروم رکھی جاتی ہیں۔ بہت عرصے تک تو ان بے چاریوں کے لیے کوئی تعلیمی ادارہ ہی نہیں تھا۔ فی زمانناً اگر خاص خاص مقامات پر ادارے قائم کیے گئے ہیں، تو اُن میں معدودے چند ہی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں اور وُہ بھی ذی مقدور گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ غریب خاندانوں کی لڑکیاں اب بھی کس مپری کے عالم میں ہیں۔ مذکورۂ بالا تعلیم گاہوں میں لڑکیوں کا بدقسمتی سے اُن بدنام کنندۂ نکو نامے چند ڈرائنگ ماسٹروں سے سابقہ پڑتا ہے اور نتیجہ وہی ہوتا ہے، جو لڑکوں کا۔ یہ امر متفقہ طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ صنفِ نازک فنونِ لطیفہ خصوصاً مصوّری میں باریکیوں کا عملی طریقے سے اظہار کرنے کی اہلیت بہ نسبت مردوں کے زیادہ رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مردوں کو ضروریاتِ زندگی کے فراہم کرنے کے لیے ہاتھوں سے مختلف

قسم کے کام لینے پڑتے ہیں۔ مثلاً وزن اُٹھانا پڑتا ہے۔ ہاتھوں سے وزنی چیز کھینچنا پڑتی ہے اور اسی قسم کے دیگر محنت کے کام کرنے پڑتے ہیں، اس وجہ سے اُن کی اُنگلیوں میں اتنا قدرتی لوچ باقی نہیں رہتا، جتنا عورتوں کی انگلیوں میں۔ صنفِ نازک کے لوچدار اور نازک ہاتھ اگر باریک کام کے عادی بنا دیے جاتے ہیں، تو غضب ڈھاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ہندوستان میں شاید ہی کوئی عورت ڈرائنگ ماسٹری کے فرائض انجام دیتی ہو، ورنہ جہاں دیکھیے مرد ہی ڈرائنگ ماسٹر ہوتے ہیں۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ چھوٹے بچوں کو دُہرا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ ماں کی ناواقفیت کی بدولت گھر کی تعلیم سے محروم ہوئے۔ ماسٹر کے نالائق ہونے کی وجہ سے اسکول سے نامراد واپس ہوئے۔ لڑکیاں دورانِ تعلیم میں اور تکمیل تعلیم کے بعد بھی ڈرائنگ تو درکنار فرائض خانہ داری بوجہ احسن انجام نہیں دے سکتیں۔ معمولی لباس کی قطع و برید اُنھیں نہیں آتی۔ اسی طرح اور ہزاروں قسم کی کشیدہ کاریاں، جو ترقی یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ہاتھوں سے انجام پاتی ہیں، یہ تقریباً اُن سب سے محروم ہیں۔ اگر معدودے چند عورتیں واقف ہوئیں، تو وُہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہندوستان میں لوگ تقریباً ۹۵ فیصدی غریب ہیں۔ ان گھرانوں میں اگر عورتیں دستکار ہوں، تو اخراجات میں کافی بچت ہو سکتی ہے۔ ذی مقدور گھرانوں میں بچت اور کفایت کے لحاظ سے نہیں، بلکہ بطور شغل کے دستکاری اختیار کی جا سکتی ہے۔ یہ سب باتیں خوبی کے ساتھ اُسی وقت انجام پا سکتی ہیں، جبکہ نگاہیں تلی ہوئی ہوں۔ ہاتھ سدھے ہوئے ہوں اور صبر و تحمل پر بھی قبضہ ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے کے ڈرائنگ ماسٹر طالب علموں میں یہ سب صفتیں پیدا ہی نہیں کر سکتے، کیونکہ اُن سے وُہ خود بے بہرہ ہیں۔ جب تک اعلیٰ قابلیت رکھنے والے آرٹ ماسٹر کام کرنا نہ شروع کریں گے، اُس وقت تک یہی خلط مبحث قائم رہیگا۔

یورپ کے مدرسوں میں ڈرائنگ ماسٹر تجربہ کار مصور ہوتے ہیں۔ فی زمانا ہندوستان میں کئی آرٹ اسکول قائم ہیں۔ ان میں سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں مصور فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ اگر محکمۂ تعلیم ڈرائنگ ماسٹر کا گریڈ اسکول کے دیگر ماسٹروں کے برابر کر دے، تو ان مصوروں میں سے بہت سے حضرات بخوشی اپنی خدمات تعلیمی اداروں میں پیش کریں۔ پھر تو فضا ہی بدل جائے۔ طالب علم بجائے کتابوں میں چھپی ہوئی شکلوں کی نقل کرنے کے براہِ راست قدرتی مناظر کا سماں کھینچیں اور جب دنیوی زندگی میں قدم رکھیں، تو اُن کے ہاتھوں کام ایسی خوبی کے ساتھ انجام پائیں کہ دیگر ممالک کے لوگ دیکھ کے رشک کریں۔ اُن میں بہت سے ایسے ہوں، جو خود کو بہترین مصور ثابت کریں۔

حافظہ

از

بنظ ہوشیارپوری، ایم اے، ایڈیٹر "ادبی دنیا" اسسٹنٹ سکرٹری انجمن اُردو پنجاب

(گزشتہ سے پیوستہ)

۶۔ "حافظے" کو تیز کرنے کے مصنوعی گُر

حافظے کو تیز کرنے کے بہت سے مصنوعی طریقے ہیں، جن میں سے بعض تو عام ہیں اور
ن پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور کسی خاص قیمت پر بتائے جاتے ہیں اور ان سے ہم یاد رکھنے کے
ں چیزوں پر غور و فکر کرنے کے باقاعدہ اور ترتیب وار طریقے سیکھ سکتے ہیں۔ ان نظاموں کو
میل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایک مقبول عام نظام میں سے دو مثالیں میرا
لب واضح کر دینگی۔ یہ حروفِ ابجد اور ان کی عددی مقداروں کا نظام ہے اور اعداد اور تاریخیں
رکھنے کا بہت آسان ذریعہ ہے :۔

۱۔ ہمایوں بادشاہ[له] کے انتقال کا ذکر کسی شاعر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ہمایوں بادشاہ
م اُفتاد"۔ اس مصرع کے حروف کے اعداد جمع کیے جائیں، تو ۹۶۲ بنتے ہیں اور یہی (۹۶۲
ری) "ہمایوں" کے انتقال کا سال ہے۔ "از بام اُفتاد" کے الفاظ انتقال کی وجہ بھی بیان کر رہے ہیں۔

۲۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری چشم و چراغ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے انتقال
متعلق ایک شاعر نے یہ قطعہ لکھا ہے :۔

ہ مصنّف نے انگریزی حروفِ تہجّی سے اسی قسم کی مثالیں پیش کی ہیں، جس کی توضیح اُردو میں نہیں ہو سکتی۔
(مترجم)

سراج دیں بو ظفر شہنشاہ سُوئے جنت ہُوا روانہ
مئے مسّرت سے جس کے باعث چھلک رہا تھا ایاغِ دہلی
۱۲۵۳ھ
"چراغِ دہلی" جلوس کا سال ہے سو اب بھی مطابق اس کے
۱۲۷۹ھ
سروشِ غیبی نے سالِ رحلت کہا "بجھا ہے چراغِ دہلی"
۲۶

یہ قطعہ مندرجۂ ذیل تین باتوں پر روشنی ڈالتا ہے :-

(۱) ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم ۱۲۵۳ھ ہجری میں تخت نشین ہُوے، کیونکہ "چراغِ دہلی" کے یہی اعداد ہیں اور آپ اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

(۲) انھوں نے ۱۲۷۹ھ ہجری میں انتقال کیا۔ یہ اعداد "بجھا ہے چراغ دہلی" سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۳) "بجھا ہے" کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۲۶ برس حکومت کی۔

گویا وُہ شخص جو حروف کی عددی مقدار سے واقف ہو "بجھا ہے چراغِ دہلی" کے ذریعے پادشاہِ مغفور کے سالِ تخت نشینی و سالِ وفات کی تاریخیں اور ان کی تخت نشینی کی مدت نہایت آسانی سے یاد رکھ سکتا ہے۔

لیکن اس قسم کی مثالوں میں مناسب الفاظ کی تلاش کی بے انتہا دقّت کے علاوہ یہ نقص بھی ہے کہ یہ تاریخیں یاد رکھنے کا نہایت معمولی اور مصنوعی طریقہ ہے۔ اس کے برعکس ایک مؤرخ کا طریق بدرجہا بہتر ہے۔ اُس کے ذہن میں پہلے ہی بہت سی مشہور ترین تاریخیں موجود ہوتی ہیں۔ وُہ واقعات کے تاریخی تسلسل سے واقف ہوتا ہے اور عقلی طریقے سے کسی خاص واقعے کی تاریخ کا تعین عام طور پر اس سے پہلے اس کے ہم عصر اور اس کے بعد ہونے والے واقعات کی مدد سے کرتا ہے۔ حافظے کے بناوٹی قاعدے جو غور و فکر کے ایسے غیر عقلی طریقوں پر زور دیتے

ہیں، کسی نظام کے صرف نمایاں ترین اجزا کو یاد رکھنے کے لیے ہی کارآمد ہو سکتے ہیں یا ان کے ذریعے سے فقط وہ باتیں یاد رکھی جا سکتی ہیں، جو الگ تھلگ حیثیت رکھتی ہیں اور جن کا ہمارے باقی خیالات کے ساتھ کوئی عقلی تعلق نہیں ہوتا۔

۷۔ "رٹنا" کیوں بُرا ہے؟

اب یہ بات واضح ہے کہ "رٹنا" تعلیم کا اس قدر ناقص طریقہ کیوں ہے۔ "رٹنے" کا مُدعا یہ ہے کہ کسی بات کو اس کے اظہار یا آزمائش کے وقت سے عین پہلے شدید ذہنی اور توجہ سے دلنشین کیا جائے، لیکن اس طرح یاد کی ہوئی بات "متلازمات" پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس اگر اُسی بات کو کچھ دنوں کے وقفے کے بعد مختلف حالات اور اوقات میں آہستہ یا بلند آواز سے پڑھا جائے۔ اکثر اوقات اُس کا حوالہ دینے کے علاوہ دوسری باتوں سے اُسے مربوط کیا جائے، تو وُہ ذہنی ترکیب کا ایک جزو بن جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے شاگردوں کو کسی چیز کے ساتھ دائمی لگاؤ پیدا کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے "رٹنے" میں کوئی نقص نہیں۔ اگر مطلوبہ نتائج پیدا کر سکے، تو یہ تعلیم کا بہترین طریقہ ہو سکتا ہے، کیونکہ اس پر بہت کم وقت صرف ہوتا ہے، لیکن یہ ایسے نتائج پیدا نہیں کرتا۔ ذرا بڑی عمر کے شاگردوں کو آسانی سے اس کی وجہ سمجھائی جا سکتی ہے۔ جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ عام خیال کہ "حافظہ" ایسی صلاحیت کا نام ہے، جو مشق سے بہتر بنائی جا سکتی ہے، سراسر غلط ہے۔ جہاں تک کسی خاص قسم کے امور کا تعلق ہے، اُن میں مشق کرنے سے بڑی حد تک "حافظہ" بہتر بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ جب کبھی ذہن میں کوئی نئی بات آئیگی، اُسے پہلے ہی اپنی جیسی اور باتیں وہاں نظر آئینگی، جن کی وجہ سے اس کے یاد رہنے کا امکان مضبوط ہو جائیگا، لیکن

دوسری قسم کے امور اس رعایت سے محروم ہونگے اور جب تک پہلی قسم کے امور کی طر
میں بھی کافی مشق نہ ہوگی، ہمارا "حافظہ" غیر منظم اور ناقابلِ اعتبار رہیگا، کیونکہ جیسا کہ ہم
ہیں، ایک مقررہ وقت کے بعد یہ ہمارے ذہن سے محو ہو جائیں گے۔ لیکن پھر بھی عام
اس قسم کی باتیں سُننے میں آتی ہیں کہ "بچپن کے زمانے میں مجھ پر بڑا ظلم ہُوا۔ اُستاد وا
میرے حافظے کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ اگر وہ اسکول کے زمانے ہی میں مجھے ہر بات
یاد کرنے کی عادت ڈالتے، تو میں ہر اُس چیز کو جو میں پڑھتا یا سُنتا ہوں، اتنی جلدی
نہ جایا کرتا۔" یہ سخت غلطی ہے۔ ایک قسم کے اشعار یاد کرنے سے صرف دوسری قسم
یاد کرنا آسان ہو جائیگا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی اور بات کے یاد کرنے میں بھی
سے مدد ملیگی۔ یہی حال تاریخوں کا ہے اور اسی اصول کے ماتحت علم کیمیا یا جغرافیے
باتیں بھی یاد رکھی جاسکتی ہیں۔ اُمید ہے کہ اب اس امر کے متعلق مزید ثبوت کی ضرورت
ہوگی۔ اِس لیے مَیں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

۸۔ "لفظی حافظہ"

چونکہ مَیں "رٹنے" کا ذکر کر چکا ہوں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے
عملی پہلو پر ایک نظر ڈالی جائے۔ "زبانی یاد کرنے" کے قدیم طریقے کے نقائص اور تمدن
منزلوں میں اشیا کے ذریعے سبق دینے کے بے شمار فوائد کی وجہ سے مفکرینِ تعلیم ایک خ
طور پر شدید ردِ عمل کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور "زبانی یاد کرنے کو" ضرورت سے ز
نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ الفاظ او
آسان ترین و مفید ترین مواد ہیں۔ اشیا کی غیر مرئی "تمثالوں" سے قوتِ فکر کو حد سے ز

مدد ملتی ہے اور یہ الفاظ کی شکل میں پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ جُوں جُوں انسان کی عمر بڑھتی ہے، وہ "بصری تمثالوں" کے بجائے الفاظ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے لگتا ہے۔

"لفظی حافظے" میں بہم مشق اچھی تعلیم کے لیے لازمی ہے۔ اُس بے زبان اور بے بس انسان کی حالت بہت قابلِ رحم ہے، جس کا ذہن کسی بات، مقولے یا کہانی کو صحیح طور پر یاد نہیں کر سکتا اس کے برخلاف وہ انسان جو کوئی کہانی سُنانے، کسی مکالمے کے الفاظ کو حرف بہ حرف دہرانے یا کسی مقولے کو مکمل اور صحیح طور پر نقل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اپنے لیے آسانیاں اور احباب کے لیے خوش وقتی کا سامان مہیا کر سکتا ہے۔ علم کی ہر شاخ میں ایسے بے شمار دلکش، مختصر اور کارآمد بنے بنائے کلمے اور جملے ہوتے ہیں، جن میں ضروری نتائج کا نچوڑ اس خوبی سے آجاتا ہے کہ الفاظ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جو ذہن ان کو یاد رکھ سکتا ہے، وہ اعلیٰ قسم کا ذہن ہے اور اُستاد کے عزیز ترین فرائض میں ایک یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ ایسے کلمے اور جملے شاگردوں تک پہنچاتا ہے۔

لیکن "لفظی حافظے" کے طریقوں میں سے بعض مفید ہیں اور بعض غیر مفید۔ استاد اپنے شاگردوں کو بہترین طریقے میں ماہر کر کے اُن کے کام کو دلچسپ اور آسان بنا سکتا ہے۔ مگر فقروں کو تکرار سے لفظ بہ لفظ حفظ کرنا بہترین طریقہ نہیں، بلکہ اُن کا تجزیہ کر کے غور و فکر کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر یہی آخری فقرہ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ طالب علم اسے حفظ کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ فقرے کی اصلی بناوٹ سے بے نیاز ہو کر پہلے صرف اتنا یاد کرے :۔ "لفظ بہ لفظ حفظ کرنا بہترین طریقہ نہیں، بلکہ تجزیہ"۔ پھر تشریح اور تعیین کرنے والے جملے آہستہ آہستہ اس عبارت میں داخل کرنے چاہییں۔ یعنی، اب فقرہ یوں ہوگا: "فقروں کو لفظ بہ لفظ

حفظ کرنا بہترین طریقہ نہیں، بلکہ اُن کا تجزیہ کرکے غور و فکر کرنا چاہیے۔" اخیر میں فقروں کو" کے بعد "صرف تکرار سے" کے الفاظ بڑھائے جائیں، تو عبارت مکمل ہو جائیگی۔ اگر محض مصنوعی قاعدے کے بجائے اس طریقے پر عمل کیا جائے، تو نہ صرف بات اچھی طرح سمجھ میں آئیگی، بلکہ وہ بہت جلد یاد بھی ہو جائیگی۔

۹۔ حافظے کی عملی پیمائش

"دار التجربات" (لیبارٹریوں) میں کام کرنے والے ماہرینِ نفسیات نے حافظے سے معلومات میں جو اضافہ کیا ہے، اخیر میں اُن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "نفسیات طفلی" میں عملی طور پر گہری دلچسپی لینے والے ماہرین بچوں کی ابتدائی ذہنی استعدادوں کا صحیح اندازہ کر رہے ہیں اور لیبارٹریوں میں "فوری حافظے" کی پیمائش آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بچے کے سامنے ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ سیکنڈوں کے وقفے سے حروف، حروف کی آوازوں، ہندسوں اور تصویروں وغیرہ کا سلسلہ پیش کیا جائے یا انہیں وقفوں کے ساتھ اُنھیں کچھ نام سُنائے جائیں، پھر دیکھا جائے کہ وہ فوراً یا دس بیس یا ساٹھ سیکنڈ یا اس سے بھی زیادہ وقفوں سے اس فہرست کو کس حد تک صحیح اور مکمل طور پر دہرا سکتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج کی بنا پر بچوں کے لیے "حافظے" کا ایک پیمانہ مقرر کیا جا سکتا ہے اور بعض لوگ تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ بچے کی ذہنی استعداد کی جو خامی یا پختگی اس طریقے سے معلوم ہوتی ہے، اُس کے ساتھ اُستاد کو بھی اپنا برتاؤ بدلتے رہنا چاہیے۔

انسانی دماغ کی ساخت اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس کی تمام مجموعی قوتوں میں سے کسی ایک قوت کو الگ کرکے اُس کی اصلی استعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ علم

طور پر ان بے ربط اور غیر دلچسپ اشیا سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے اور بہت کم واقعات ایسے پیش آتے ہیں، جن میں کوئی عملی خوبی یا منطقیانہ نسبت نہیں ہوتی۔ روزانہ زندگی میں حافظہ ہمیشہ کسی "غرض" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم صرف وہ چیزیں یاد کرتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہو یا جو اُن چیزوں کے ساتھ مربوط ہوں جنھیں ہم یاد کرنا چاہتے ہیں اور ایک معمولی بچّہ بھی کسی چیز کے متعلق جذباتی کشش اور اُن تلازمات کی وجہ سے جن کی شکل میں وُہ اپنے تجربے کے ابتدائی مواد کو پیش کرتا ہے، بڑے مؤثر حافظے کا مالک بن سکتا ہے اور اسکول کا کام اُس بچّے کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح کر سکتا ہے، جو طوطے کی طرح "رٹنے" کے باعث جماعت میں اوّل رہتا ہے۔ (باقی آئندہ)

چنانچہ پالسن[۱] ایک مشہور ماہرِ تعلیم جرمنی کی انیسویں صدی کی تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق لکھتا ہے:۔
"انیسویں صدی میں جرمنی تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یورپ کی تمام قوموں سے گوئے سبقت لے گیا اور جرمن کی یونیورسٹیاں ہر علم کی تحقیق کے لیے خصوصاً سائنس کی تحقیق کے اعتبار سے دُنیا بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہاں طلبا اور محققین دنیا کے ہر گوشے سے آتے ہیں اور ممالک متحدہ امریکہ کی یونیورسٹیاں بھی جرمن یونیورسٹیوں کی طرز پر بنائی گئیں۔ علاوہ ازیں ابتدائی اور صنعتی تعلیم کے اعتبار سے دنیائے یورپ کے باقی ملکوں سے بہت پیش پیش ہے۔"

جرمنی کا موجودہ مشہورِ عالم نظامِ تعلیم کوئی دس بیس برس کی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ درحقیقت اس پودے کو مدتوں سے سینچا جا رہا ہے اور ملک کو اس کی آبیاری کرتے ہوئے آج کم و بیش اڑھائی سو برس کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس ملک کا موجودہ نظام بہت حد تک سترھویں اور اٹھارویں صدی کی اُن اصولی، بنیادی اور نہایت ہی اہم اصلاحات کا مرہونِ منت ہے، جو اُس زمانے کے ماہرینِ تعلیم ان دو صدیوں کے دوران میں وقتاً فوقتاً عمل میں لائے۔ چنانچہ ۱۶۱۹ء میں وائی مار[۲] کے قواعد متعلق بہ مدارس کی رُو سے بچے کے لیے ابتدائی مدارس سے فارغ التحصیل ہونا ضروری کر دیا گیا اور ابتدائی تعلیم کو ایک اہم شہری فرض قرار دیا گیا، لیکن ۱۷۱۶ء میں شاہی فرمان کی رُو سے پرشیا میں ابتدائی تعلیم کو جبری قرار دیا گیا اور ۱۷۹۴ء کے اعلان کی رُو سے پرشیا کے مدرسوں کو یونیورسٹیوں اور باقی تمام تعلیمی مرکزوں کو مجموعی طور پر حکومت کا ایک صیغہ بنا دیا گیا اور اُس وقت سے تمام تعلیمی مرکزوں کا حکومت کی طرف سے معائنہ کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ ثانوی مدرسوں کے تمام مدرسین حکومت کے افسر قرار دیے گئے اور اُن کی تنخواہ سرکاری خزانے سے دی جانے لگی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے دوران

---

۱ Paulsen ۲ School Regulations of Weimar of 1619.

میں حکومت تمام درسگاہوں پر چھاگئی۔ گویا ہر قسم کی تعلیم کا فرض بھی حکومت نے اپنے ذمے لے لیا۔ جرمنی کے بہترین لوگوں نے جن میں بیرن فان شٹائین[1]، شارن ہارسٹ[2]۔ ہارڈن برگ[3]، فشٹے[4] اور ہمبولڈٹ[5] جیسی مقتدر ہستیاں شامل تھیں محکمۂ تعلیم اور نظام تعلیم میں ضروری اصلاحات نافذ کیں۔ چنانچہ فشٹے نے امور ذیل کی طرف حکومت کی توجہ منعطف کرائی۔

(الف) تعلیم کو عام کرنا۔

(ب) افراد کی بہترین نشو و نما کرنا۔

(ج) افراد کو ایسی تعلیم دینا کہ اُن میں قومی فلاح کو انفرادی فلاح پر ترجیح دینے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

کچھ تو فشٹے کے اس تعلیمی نظریے کی وجہ سے اور کچھ ہال[6] اور گوٹنجن کی یونیورسٹیوں کے باعث جرمنی میں اُنیسویں صدی کے شروع ہی سے تعلیم کا بہت دور دورہ ہوگیا تھا۔

جرمن کی تاریخ کے تین دور

جرمنی کے بعض ماہرینِ تعلیم اُنیسویں صدی کو تعلیمی زاویۂ نگاہ سے تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

اوّل نظامِ تعلیم کی تنظیم و تکمیل کا سوال تھا۔ چنانچہ یونیورسٹیوں سے لے کر ابتدائی مدرسوں تک ہر ایک شعبے میں ضروری اصلاحات جاری کیں۔

دوم ۱۸۴۰ء سے لیکر ۱۸۶۰ء تک تعلیمی جمود اور حکومت کی طرف سے جبر و استبداد کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں آزادی اور مساوات کی رو اس حد تک پھیل گئی کہ حکومت بذاتِ خود تعلیمی ترقی کے راستے میں سدِ راہ بنی۔ حکومت کا خیال تھا کہ یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے باغیانہ خیالات کو رواج

---

[1] Baron von Stein. [2] Scharnhorst. [3] Hindenburg.
[4] Fischte. [5] Humboldt. [6] Halle and Gottingen.

دینے کا مرکز بنے ہُوئے ہیں اور ملک میں بے چینی انھیں کی وجہ سے پھیل رہی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ اداروں کے اساتذہ کو گرفتار کرکے زندان میں ڈال دیا گیا۔ طلبا کو گرفتار کرکے سزائیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ اس رجعت پسندی کی رُو سے متاثر ہو کر حکومت نے کئی ایک نہایت ہی مفید اداروں کو بھی بند کر دیا۔ دراصل یہ حکمتِ عملی اور تعلیم کے متعلق اس قدر رجعت پسندانہ رویّہ شاہِ پرشیا یا اس کی حکومت کے دیگر اراکین سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ میٹرنک جس کا ذکر اس مقالے کی پہلی قسط میں آ چکا ہے، آسٹریا کا چانسلر تھا اور آسٹریا کی تمام سلطنت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ وُہ ایک انتہا درجے کا رجعت پسند سیاست دان تھا، جسے انقلابِ فرانس نے اس قدر بد حواس کر دیا تھا کہ وہ آزادی اور مساوات کا نام تک سُننا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شاہِ پرشیا کو مجبور کر دیا کہ وُہ آسٹریا کی طرح ایک انتہائی رجعت پسند حکمتِ عملی اختیار کرے، کیونکہ بزعمِ خویش وُہ یہ سمجھتا تھا کہ نہ صرف آسٹریا بلکہ یورپ بھر کی نجات اسی میں ہے کہ اُس کی پالیسی کو اختیار کرے، لیکن جرمنی میں یہ رُو وقتی اور ہنگامی تھی اور میٹرنک کی یہ پالیسی چند بین الاقوامی وجوہ کے باعث اختیار کی گئی تھی۔ بہرکیف یہ دورِ انحطاط جرمنی کی تاریخِ تعلیم میں ایک بدنما داغ ہے۔

تیسرا دَور متحدہ جرمنی کا انتقامی دور تھا، جو ۱۸۷۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ جرمنی اپنے دو بڑے دشمنوں یعنی، آسٹریا اور فرانس کو شکست دے کر پوری طرح آزاد اور متحد ہو چکا تھا۔ اب اُسے کسی میٹرنک یا نپولین کا ڈر نہیں تھا۔ چنانچہ اس تیسرے دور میں تعلیم کو ترقی دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ جرمنی کو اپنی سی سالہ رجعت پسند پالیسی کا بھی (جو ۱۸۴۰ء سے تقریباً ۱۸۷۰ء تک رہی) ازالہ کرنا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ تعلیم کو بہترین معیار پر لانے کے لیے اپنی استطاعت سے زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا۔

اُنیسویں صدی کے پہلے چالیس سال کے دوران میں ابتدائی تعلیم میں ضروری اصلاحات

نافذ کی گئیں اور جگہ جگہ ٹریننگ کالج کھولے گئے تاکہ بچوں کی تدریس کے لیے صحیح قسم کے اساتذہ مہیا کیے جائیں، یونیورسٹیاں اور صنعتی ادارے زیادہ تعداد میں جاری کیے گئے۔

تین قسم کے ادارے

جیسا کہ جرمن قوم فطرتاً اور رسماً تین طبقوں میں منقسم تھی۔ اسی طرح اہلِ جرمن کے ادارے بھی تین طرزوں کے بنائے گئے تھے۔

اول ابتدائی مدارس جو عوام کے لیے تھے۔

دوم ثانوی مدرسے، جو متوسط طبقے کے لوگوں کے بچوں کے لیے تھے اور تیسرے اعلیٰ درجے کے مدارس جن میں اونچے طبقے کے بچوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہ تقسیم بہت شدید قسم کی تھی۔ نیچے کے طبقے کا کوئی بچہ کسی حالت میں بھی اُس مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، جو اونچے طبقے کے بچوں کے لیے مخصوص تھا اور چونکہ نیچے طبقے کے لوگوں کے بچوں کو ثانوی تعلیم سرے سے دی ہی نہیں جاتی تھی، اس لیے اُس طبقے کا کوئی بچہ کسی ثانوی مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ نیچے کے طبقے کے دس ہزار طلبا میں سے محض ایک طالب علم ابتدائی مدرسے میں جاتا تھا۔ نیچے کے طبقے کے بچوں کے لیے ۶ برس سے ۱۴ برس تک تعلیم جبری تھی، لیکن اس تعلیم کے تمام مصارف حکومت ادا کرتی تھی۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس طبقے کے بچے کو دو سال تک فوجی تعلیم دی جاتی تھی، جو جبری ہوتی تھی۔ یہ بچے اعلیٰ عہدوں کے ناقابل سمجھے جاتے تھے، کیونکہ سماجی قوانین کچھ ایسے ہی تھے۔ ہندوؤں کے ورنوں کی طرح یہ ذات پات کا مسئلہ بہت سخت تھا۔ اسی طرح ان تین مختلف قسم کے مدرسوں کے ہونے والے اُستادوں کو بھی تین مختلف قسم کے ٹریننگ کالجوں میں تعلیم دی جاتی تھی اور سماجی تعصب یہاں بھی پوری طرح کام کرتا تھا۔ نیچے کے طبقے کے بچے کاریگر یا سپاہی بنتے یا زیادہ سے زیادہ ابتدائی مدرسوں کے مدرس۔ (باقی آئندہ)

۱۳۳۲

فرانس کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد، ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ننھے بچوں کے مدارس میڈم منٹسوری اور ڈاکٹر ڈیکرولی کی ان تھک کوششوں اور تجربات نے دنیا کے سامنے تعلیم کا ایک نیا زاویہ پیش کیا اور تعلیم جدید کے ان نئے اصولوں کے ماتحت فرانس کے نظامِ تعلیم میں بھی کئی ایک تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فرانس نے کس حد تک ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں ہم ننھے بچوں کی ترقی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جہاں تعلیم کے ان نئے خیالات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ۱۸۲۶ء سے پہلے ان مدارس کا وجود بالکل مفقود تھا۔ اسی سال بچوں کی حفاظت گاہیں تعمیر کی گئیں۔ جہاں غریب والدین اپنے بچوں کو کام پر جاتے ہوئے چھوڑ جاتے تھے، لیکن ان کا ماحول کسی حالت میں بھی صحت کے لیے فائدہ مند نہ تھا۔ بعد میں ان کو مدرسے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں تین سال سے چھے سال کی عمر تک تعلیم دی جانے لگی۔ لیکن اس جگہ ان کی زندگی بالکل بے حسی میں بسر ہوتی تھی اور تعلیم صرف اسباق کے رٹنے کا نام تھا۔ مگر ۱۸۸۱ء کے بعد حالات بہت کچھ سدھر گئے۔ اس سال کے نصاب میں سب سے پہلی جگہ ابتدائی علوم کے لیے مختص کر دی گئی اور دوسرے درجے پر آرٹ اور دستی کام لیکن ۱۸۸۹ء میں اس ترتیب کو بدل دیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں بچوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر ایک استانی کی نگرانی میں رکھا گیا اور تعلیم کی جگہ تربیت نے لے لی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد تجربے نے یہ چیز ثابت کر دی کہ بچوں

کا صحیح نشوونما ان کے اپنے اعمال اور اپنی خواہشات کی آزادانہ تکمیل پر منحصر ہے اور اس لیے اس چھوٹی سی عمر میں (یعنی ۳ سے ۶ سال تک) کسی قسم کا غیر فطری بوجھ ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کے اظہار کے منافی ہے۔ اس لیے ان کے حواس خمسہ کی تربیت کے لیے بجائے زبانی تعلیم کے مادی اشیا کی مدد سے تعلیم دینے پر زور دیا گیا اور کوشش کی گئی کہ بچوں میں توجہ، مشاہدے اور سوچ بچار کی قوت پیدا کی جائے۔ ۱۹۲۱ء میں "مدرسۂ عمل" کے اصول رائج کیے گئے اور ۱۹۲۳ء میں ان مدارس میں پڑھانے والی استانیوں کی تربیت کے لیے بہترین انتظام کیا گیا اور اس سند کے بغیر کسی عورت کو ملازمت نہیں دی جاتی، لیکن اس تربیت کے باوجود کوشش کی جاتی ہے کہ ہر استانی اپنی خصوصی تکالیف اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے، آزادی سے جس طریقے کو حالات کے مطابق سمجھے استعمال کرے اور کسی مقررہ اور محدود طریقوں کی پیروی لازم نہیں۔

مدرسوں کی عمارتوں میں بھی خاص تبدیلی رونما ہو چکی ہے اور پرانے طریقوں کے اندھیرے اور مرطوب کمروں کے بجائے وسیع روشن اور مصفا کمرے تعمیر ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۹ء میں اس اصلاح کی طرف توجہ کی گئی۔ سازوسامان عام طور پر منٹسوری اصول کے مطابق ہیں، لیکن ہر استانی اپنے علاقے کی ضروریات کے مطابق ان میں تبدیلی کر سکتی ہے۔ حسی تربیت کے لیے کہیں جگہ رنگین اون کی گیندیں استعمال ہوتی ہیں۔ کہیں کاغذ کے ٹکڑے یا درختوں کے پتے۔ لسانی تربیت کے لیے کبھی گھنٹی کی آواز یا خود کسی بچے کی آواز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اخلاقی تعلیم حقیقی معنوں میں دی جاتی ہے۔ صفائی، خلق اور انتظام اوّلین فرائض شمار ہوتے ہیں۔ بچے کپڑے پہننے اور اتارنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جانوروں کی نگہداشت بھی ان کے سپرد ہے۔ کبھی کبھی استانی انھیں کہانیاں بھی سناتی ہے اور بعض دفعہ گانا گا کر ان کا دل بہلایا جاتا ہے۔ اس دوران میں

بچوں کی خاموشی ایک اہم لازمہ ہے۔ جب وُہ دیگر تمام مشاغل اور خیالات سے مُنہ پھیر کر کہانی یا گانے کے ماحول میں مدغم ہو جاتے ہیں جیسا کہ اُوپر ذکر ہو چکا ہے، ہر اُستانی اپنے طریقۂ تعلیم کے اختیار کرنے میں مختار ہوتی ہے۔ مثلاً گنتی سیکھنے کے لیے ان علاقوں میں جہاں کپڑے کے کارخانے پائے جاتے ہیں، تکلے استعمال کیے جاتے ہیں جس جگہ ربڑ کے ٹائر بنتے ہیں، وہاں ربڑ کی تختیاں اور چھلّوں سے مدد لی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف مضامین کی تعلیم کے لیے "مرکزِ ذوق" کا انتخاب بھی ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً بعض ساحلی علاقوں میں سیپ کی نگہداشت اور اُن علاقوں میں جہاں انگور کی پیداوار ہوتی ہے "انگور" ایسے مضامین سے عام تعلیم دی جاتی ہے۔

ننھے بچّوں کی تعلیم کا فرانسیسی نقطۂ نگاہ ذیل کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔ "تعلیم کا یہ درجہ باقاعدہ اصولوں پر مبنی ہے، لیکن یہ اصول جامد نہیں۔ بچّوں کی فطرت اور طبعی اقتضا کا پورا پورا لحاظ کیا جاتا ہے اور مقررہ طریقوں کی پیروی میں بچّوں کے رجحانی اختلافات کو فراموش نہیں کیا جاتا۔ روسو کی تقلید میں آزادی کی تعلیمی قوت پر عمل کیا جاتا ہے، جو درحقیقت ایک فعالی اور اثر انگیز قوت ہے، جس میں ہر اُس چیز کو معلوم کرنے کی خواہش ہے، جس سے کسی قسم کے استفادے کی اُمید ہو۔ ان مدارس نے منٹسوری خیالات کو اختیار تو کر لیا ہے، لیکن اس کے اصولوں پر پورے طور پر کاربند نہیں۔ اگرچہ نظری طور پر بچّوں کو کسی خاص مقررہ محدود سانچوں میں ڈھالنے کی ممانعت ہے، مگر عملاً اُستانیوں کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ بچّوں کو ان کے طبعی اقتضا کے مطابق نشو و نما حاصل ہو سکے۔ مثلاً منٹسوری مدارس میں بچے بٹن لگانا، جوتا پہننا اور اُتارنا، ناک صاف کرنا وغیرہ ایسے وقت سیکھتے ہیں، جب اُنھیں ان کاموں کی ضرورت یا فائدے کا احساس ہو جاتا ہے، لیکن فرانس کے دیگر مدارس میں یہ کام ابھی تک اجتماعی حیثیت میں ادا کیے جاتے ہیں، یعنی، عمر کے اس حصّے میں جبکہ اکثر بچے ایسا کام کرنے کا احساس نہیں رکھتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

یہ مشق محض کورانہ اور خارجی دباؤ کے ماتحت کی جاتی ہے۔ خواہ اُستانی اس عمل میں بچوں کو کتنا ہی متوجہ کرانے کی کوشش کیوں نہ کرے۔ عام طور پر بچوں کی کثرت تعداد بھی صحیح اصول کی پیروی میں مانع ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ستر ستر بچے ایک اُستانی اور ایک دوسری مددگار عورت کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ دستی کام کے معاملے میں دونوں قسم کے مدارس تقریباً یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ فرانسیسی مدارس میں حسی تربیت کے لیے منٹسوری کے علاوہ بنے (Binet.) اور ڈاکٹر ڈکرولی سب کے اصولوں کو استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ صحیح مقصد یہ ہے کہ اُستانیاں خود اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی معمولی قیمت کی اشیا بنا سکیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ مدارس منٹسوری مدارس کے مقابلے میں کچھ زیادہ نمایاں حیثیت نہیں رکھتے، کیونکہ مؤخر الذکر میں مشاغل بہت کثیر اور مختلف ہوتے ہیں

ان کے علاوہ فرانس کا پرانا روایتی تعصب جو دماغی نشو و نما کو بہت اہمیت دیتا ہے، ان مدارس میں رونما ہے، چنانچہ بچوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بڑی عمر کے بچے خاموش اور مؤدب بیٹھے ہُوئے لکھنا پڑھنا سیکھتے ہیں اور چھوٹی عمر کے بچے آزاد رہتے ہیں اور اسی لیے لکھنے پڑھنے کی تحریص خود بخود ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ حالانکہ منٹسوری مدارس میں ماحول کی اشیا سے متاثر ہو کر بچوں میں لکھنے پڑھنے کا احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

ابتدائی مدارس ننھے بچوں کے مدارس میں چونکہ کوئی مقررہ پروگرام اور امتحان نہیں ہوتا، اس لیے وہاں بچوں کو تھوڑی سی آزادی ضرور نصیب ہو جاتی ہے، لیکن ابتدائی مدارس میں اس تھوڑی سی آزادی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اُستاد پُرانے طریقۂ تعلیم کے زیر اثر پرورش پائے ہوتے ہیں، اس لیے قدرتی طور پر وہی پُرانی غلط روایات پر عمل کر کے بچوں کے طبعی اقتضا کو نادانستہ کچل ڈالتے ہیں اور تعلیم کا تمام دار و مدار قوتِ حافظہ کے استعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ فرقۂ یعقوبی کے دقیانوسی اصول کی تقلید میں بچوں کی قوت فیصلہ اور ادراک کی صحیح نشو و نما کے بجائے علم محض کی

تحصیل میں اُن کی تمام قوتوں کو برباد کر دیا جاتا ہے۔

لیکن کچھ مدّت سے اس پرانے طریقے کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو چکا ہے، مگر اس نئی اصلاحی تحریک میں حکومت کا کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی توسیع اور کامیابی کے ذمّے دار خود اُستاد ہیں یا انسپکٹر۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ علم نفسیات کے معلوم کردہ اصولوں کے مطابق بچوں کی مکمل نشوونما کی غور و پرداخت کی جائے۔ اس سلسلے میں جو کوششیں کی گئی ہیں، ان کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

(الف) مدرسے کی مجالس امدادِ باہمی۔ ان مجالس کا قیام ابتدائی تعلیم کے ایک انسپکٹر کے دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ان مجالس کے ذریعے بچے اپنے تعلیمی اخراجات کے بوجھ کو ہلکا کر سکیں اور بعض مجالس کا دائرۂ عمل تو اب تک بھی اسی مقصد کے حصول تک محدود ہے، لیکن ان مدارس کے مختلف کاموں میں حصہ لینے سے بچوں کو مالی مفاد کے علاوہ تعلیمی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ یہ خیال اب عام طور پر یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ ان مدارس میں شرکت کرنے سے بچوں میں نہ صرف معاشری باضابطگی پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے تعلیمی اثرات بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں اور اس لیے اب کئی ایک مدارس میں اس منصوبے کی ترویج محض اس کے تعلیمی فوائد کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کی جاتی ہے۔ ان مجالس کے مختلف قسم کے معاملات میں شرکت کرنے سے بچوں میں ذمّے داری کا احساس پیدا ہوتا ہے، جس کے بعد تکمیل تعلیم کی خواہش ایک لازمی نتیجہ ہے۔

پیداوار اور مجموعی مشاغل کی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً طبّی بوٹیوں اور ترکاریوں کی کاشت، پھل دار درختوں کی پیداوار، دستی کاموں کی فروخت اور بیمہ کا انتظام وغیرہ۔ ان تمام کاموں کو سرانجام دینے کے لیے جو جو کام طالب علموں کو کرنے ہوتے ہیں، ان سے ان کی دماغی اور عملی قوتوں کی

نشوونما کا پورا پورا سامان ہوتا ہے۔ خود اعتمادی اور ذمے داری کا فائدہ مند احساس پیدا ہوتا ہے اور حقیقی زندگی کے روزمرہ کے واقعات سے دوچار ہو کر بچے وہ سبق سیکھتے ہیں، جو محض کتابوں کی بے روح تعلیم سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس زندگی سے لڑکوں کی اخلاقی سیرت کی بنیاد بھی استوار ہو جاتی ہے اور بچے محض انفرادی حیثیت سے نکل کر اپنے آپ کو ایک معاشرے کا جزو سمجھنے لگتے ہیں جو بعد میں اجتماعی زندگی کے احساس کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس تحریک کے باعث، جو بیس سال کے عرصے سے جاری ہے، اس وقت آٹھ ہزار ایسی مجالس مختلف مدارس میں قائم ہو چکی ہیں، جن کے ارکین کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہزار ہے۔

(ب) مدرسے کا چھاپہ خانہ۔ یہ تحریک ایک اُستاد کے دماغ کا نتیجہ ہے اور اس کی مدد سے بچوں میں مدرسے کی روزمرہ زندگی سے گہرا تعلق قائم کیا جا سکتا ہے اور مدرسوں کا افسردہ ماحول یکسر ایک روحانی جاذبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس تحریک کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اُن درسی کتب سے نجات مل سکے، جو فرانس کی مختلف صوبائی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس تحریک کے تعلیمی فوائد بے شمار ہیں۔ یہ مدرسے اور اُس کی معاشری زندگی کے ارتقا کے لیے ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ بچے اپنے روزمرہ کے مشاغل کے لیے چند اوراق تالیف کر کے چھاپ لیتے ہیں اور یہ کام انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں سرانجام دیا جا سکتا ہے اور خود انھیں کا انتخاب کیا اور لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مختلف مدارس کے بچوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے، وہ اس مطبع کی مدد سے چھپ کر جا سکتی ہے، جس سے مختلف علاقوں کی طرزِ بود و باش، ان کی پیداوار اور جغرافیائی حالت کا بخوبی علم ہو سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس سے بچوں کو عملی زندگی میں حصہ لینے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے لیے ایسے مشاغل بے حد لازمی ہیں، جن کے بغیر جوان مرد اور عورت کی صحیح تعمیر بلا مبالغہ نہیں ہو سکتی۔

کسی مضمون کے چھاپنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان صحیح ہو اور اس طرح زبان کے قواعد بچوں کے اچھی طرح ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ طالب علموں کا ذوق اظہار جو ہر فرد بشر کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، نمایاں ہو سکتا ہے، جو کچھ وہ قلم بند کرینگے، وہ حقیقت کا آئینہ دار ہوگا۔ علوم طبیعیہ کا مطالعہ بڑی جانفشانی اور باقاعدہ تجربات کے بعد حاصل کیا جائیگا تاکہ ان کا خلاصہ صحیح چھپ سکے اور دوسرے مدارس کے لڑکوں کے سوالات کا جواب درست دیا جاسکے۔ زندگی کے مشاہدے اور دوسرے مدارس کے مختلف مضامین کے مطالعے سے بچوں میں تاریخی نقطۂ نگاہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح جغرافیے کا علم بچوں کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہوگا۔ ان مقاصد کے لیے تصاویر اور فلموں کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ پندرہ سال کے تجربے کے بعد تقریباً تین سو فرانسیسی اور غیر ملکوں کے اساتذہ اس طریقے کو استعمال کر رہے ہیں پچیس مختلف مدارس میں رسالے انھیں مطابع سے چھپ رہے ہیں اور ایک ماہنامہ طبع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بچوں کا ایک ماہوار رسالہ جس کا تمام کلام بچوں کے سپرد ہے، نکلتا ہے اور ایک چھوٹا رسالہ بھی چھپتا ہے، جس میں بچوں کی درسی کتب کی فہرست بھی ہوتی ہے۔

(ج) اجتماعی کام۔ ایم، کوسینے (M. Cousinet) نے ابتدائی مدارس میں یہ نیا تجربہ شروع کیا۔ ہر جماعت کے بچے اپنی خواہش کے مطابق جمع ہوتے ہیں اور تجربے کے دوران میں انھیں اجازت ہوتی ہے کہ ایک گروہ کو چھوڑ کر دوسرے گروہ میں چلے جائیں اور اُستاد کبھی کسی لڑکے کو ایک گروہ چھوڑنے یا کسی دوسرے میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ بچوں کو خود بخود کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور ان کو کسی کام میں مدد یا ہدایت نہیں دی جاتی، جب تک کہ طالب علم خود نہ پوچھیں۔ بچے مختلف مضامین کے تاریخی ارتقا کی تصویروں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ اُن چیزوں کو خود بناتے ہیں اور تاریخی واقعات کو دہراتے ہیں۔ انشا پردازی کی بھی مشق کی جاتی ہے،

جس میں انھیں پوری پوری آزادی دی جاتی ہے۔ جب چاہیں، لکھیں اور جب چاہیں، چھوڑ دیں۔
یہ طریقے فرانس کے ایک ضلعے کے مدرسوں میں تقریباً تیرہ سال سے جاری ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں مسٹر کوسینے نے اس سے بھی زیادہ شاندار تجربہ شروع کیا جس میں مدرسے کا تمام کام کھیل کے ذریعے ہوتا ہے، یعنی کھیل ہی میں سارا کام کر لیتے ہیں تاکہ دونوں میں کوئی تمیز نہ ہو سکے۔ مقصد یہ ہے کہ بچے اپنی خواہش کے مطابق کام کریں اور جس قسم کے کام کو اختیار کرنا چاہیں اور جتنی دیر کام کر سکیں، کریں اور جب چاہیں چھوڑ دیں۔ ان تمام تجربات کا نتیجہ بہت حیرت انگیز نکلا، یعنی، طالب علم سارا سارا دن کاموں میں پوری توجہ سے منہمک رہے، لیکن اس میں کئی ایک مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔ (۱) جب بچوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے، تو ان کے مشاہدے میں تنگ نظری اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ (۲) متواتر اجتماعی کام کرنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور (۳) مشاہدات کو باقاعدہ منضبط کرنے کا شوق عام طور پر مفقود ہوتا ہے۔ ان تمام مختلف قسم کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ۹ سے ۱۲ برس تک کے بچوں کے کام میں اساتذہ کا دخل دینا صرف عام حالات میں محض ہدایت کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بچوں کو پورا پورا اختیار رہنا چاہیے کہ وہ اپنی حسب منشا مضمون انتخاب کریں اور اس کے سرانجام دینے میں انھیں پوری آزادی ہونی چاہیے۔

تعلیم جدید کے مطابق اب فرانس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے اکھٹے مدرسوں کا زیادہ رواج ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کی مخالفت حکومت کے بجائے لوگوں کی طرف سے زیادہ ہوتی ہے، جو بڑی حد تک پرانے اصولوں پر کاربند چلے آتے ہیں۔ ۱۸۸۲ء کے مقابلے میں ۱۹۲۳ء کا نصاب زیادہ سادہ اور مختصر ہے اور کتابوں کے انتخاب اور طریقوں کے معاملے میں زیادہ آزادی دی جاتی ہے، لیکن طالب علموں کی زیادتی کی وجہ سے مجموعی اسباق مجبوراً دینے پڑتے ہیں جسمانی

سزا ممنوع ہے، لیکن عام اُستاد اس کا استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جبکہ ۵ مختلف قابلیتوں کے لڑکے ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں، جیسا کہ اُوپر ذکر ہو چکا ہے پوری پوری کوشش کیجا رہی ہے کہ ابتدائی مدارس کو دیہاتی ماحول کے مطابق بنا دیا جائے، جس سے نہ صرف تعلیمی بلکہ معاشری اور اقتصادی فوائد بھی مترتب ہوتے ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ مدرسے کو ایسی تعلیم کے ذریعے جو ماحول کے مطابق ہو حقیقی زندگی سے وابستہ کیا جائے۔ دوم، تاکہ مستقبل کے کسان اور دیہاتی عورتوں کا وُہ تمام علم وفن مہیا کیا جا سکے، جو موجودہ زمانے کی دیہاتی زندگی کی ضروریات کے لیے لازمی ہے۔ سوم، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے لیے دیہات کی زندگی میں ایک جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے اور دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں جا بسنے کا خیال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ دیہات کو چھوڑنے کی وجہ اقتصادی مجبوری نہیں، بلکہ محض اخلاقی ہے۔ اس لیے کوشش کی جا رہی ہے کہ لوگوں پر یہ چیز واضح ہو جائے کہ شہری زندگی کے ظاہری شان وشکوہ کے باوجود دیہاتی زندگی زیادہ آزاد، صحت بخش اور کم غیر یقینی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیہات میں موجودہ زمانے کی تمام آسائشیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ مثلاً ذرائع نقل وحرکت، رسل ورسائل کی سہولت، بجلی اور پانی کا بہترین انتظام، سینما اور ریڈیو وغیرہ وغیرہ۔ سرکاری احکامات بھی اس معاملے میں واضح ہیں، جن کے مطابق تعلیمی مضامین کا اکثر حصہ دیہاتی زندگی کے مختلف شعبوں پر مشتمل ہونا چاہیے اور ابتدائی درجے کے امتحان میں مضامین کا انتخاب بھی اسی اصول کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی عمر کو چودہ سال تک بڑھانے کے لیے زراعتی اور خانہ داری کی تربیتی خواندگی کے لیے کئی تجاویز بھی پیش کی جا چکی ہیں۔

تعلیم بعد ابتدائی: ابتدائی تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کو لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم دی جائے اور مذہبی اور شہری زندگی کے اصولوں سے واقف کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کیلیے

۶ برس سے ۱۲/۱۴ برس کی عمر تک کا زمانہ صرف ہوتا تھا لیکن جب طریقہ ہائے تعلیم میں اصلاح کی گئی، تو یہی مقاصد مقابلۃً تھوڑے عرصے میں پورے ہونے لگے۔ چنانچہ عام ملکوں میں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ لازمی تعلیم کے آخری دو یا تین سال کے دوران میں بچوں کی تعلیمی ترقی رک جاتی ہے اور وہ اس دوران میں وقت ٹالنے کے علاوہ کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ مزید برآں جب علم نفسیات کے تجربات نے تعلیمی حالات پر روشنی ڈالی، تو معلوم ہوا کہ قبل از بلوغت اور بلوغت (Adolescent) کے دور میں بہت سے نفسیاتی اختلافات ہیں۔ ان مختلف قسم کے نتائج کی روشنی میں تمام فرنگی ممالک میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ پرانا ہشت سالہ ابتدائی مدرسہ دو حصوں میں تقسیم ہو جانا چاہیے۔ ابتدائی حصہ ۶ یا ۷ برس کی عمر سے ۱۰ یا ۱۱ برس کی عمر تک اور آخری حصہ ۱۱ یا ۱۲ سے لے کر ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر تک۔ کئی ملکوں میں مدارس وسطانیہ کافی عرصے تک بعد ابتدائی تعلیم دیتے رہے، لیکن ان کا دائرۂ اثر صرف چند امیر گھرانوں کے افراد تک محدود تھا اور اس لیے وہ کسی حالت میں بھی عام نظامِ تعلیم کا حصہ نہیں کہلا سکتے تھے۔ اس لیے ایسے مدارس یا ثانوی مدارس کی توسیع سے اس مشکل کا حل ممکن نہ تھا، چونکہ عوام کو ان سے کسی قسم کے فائدے کی اُمید نہ تھی۔ ابتدائی مدارس کی اصلاح کا سوال طلبا کے انتخاب کے ساتھ وابستہ نہ تھا، بلکہ اس یقین پر مبنی تھا کہ بلوغت کا زمانہ اپنے اندر ایک خاص امتیازی خصوصیات کا حامل ہے جس کی بنا پر ایسے بچوں کے لیے نظامِ تعلیم میں ایک علٰحدہ جگہ ہونی چاہیے۔ سوال یہ تھا کہ جب امیروں کے لڑکے گیارہ برس کی عمر کے آغاز میں ابتدائی مدارس کی خواندگی ختم کرنے کے بعد وسطانوی اور ثانوی مدارس میں چلے جائیں، تو باقی ماندہ طلبا کے لیے گیارہ اور پندرہ برس کی عمر کے دوران میں کون سی تعلیم مہیا کی جائے۔ قدیم ابتدائی مدرسہ اس قابل نہ تھا کہ اس معاملے میں کوئی مدد دے سکتا۔ اس تکلیف کو رفع کرنے کے لیے جنگِ عظیم سے پہلے ہی قدم اُٹھایا گیا تھا لیکن

اس کا عملی نتیجہ جنگ کے بعد ہی نمودار ہوا، یعنی، بعد ابتدائی خواندگی کا انتظام، لیکن درحقیقت اس میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اُن طلبا کی بہت سی تعداد، جو سن بلوغت میں داخل ہو چکے ہیں، پُرانے ابتدائی مدارس ہی میں تعلیم پا رہی ہے۔ اعلیٰ ابتدائی مدارس اور خواندگی مزید (Continuation.) مدت سے رائج تھے، مگر بہت کم بچے ان سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔

ان حالات میں حکومت نے ۱۹۱۹ء میں ان مدارس کو از سر نو زندہ کیا تاکہ ابتدائی مدارس کے ساتھ ان کا ایک حقیقی تسلسل قائم رہ سکے اور ثانوی مدارس کے اُس حصے کا بھی نعم البدل ہو جائے، جہاں صرف تحصیل علم پر زور دیا جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو یہ نئی قسم کے مدارس ایک ہی افسر کے ماتحت کالجوں (یعنی، ثانوی مدرسوں) کی عمارتوں میں قائم کیے گئے، لیکن جب سے مفت ثانوی تعلیم رائج ہوئی ہے، اصلاح کی طرف تیزی سے قدم اُٹھایا جا چکا ہے، جس کے مطابق ابتدائی تعلیم ۶ جماعتوں پر منقسم کی گئی (۶ سے ۱۲ سال تک) اور ان کے بعد، بعد ابتدائی مدارس جن کے نصاب میں اختلافات کی کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔

مندرجۂ ذیل نقشے میں یورپ کے مختلف ملکوں کے ابتدائی مدارس کے مختلف درجوں میں بچوں کی تعداد دکھائی گئی ہے:۔

ملک	سال	ابتدائی مدرسہ، بچوں کی تعداد			مدت (سال)	وسطانیہ مدارس		لازمی حاضری	
		ابتدائی درجوں میں	مدت (سال)	تعداد ابتدائی درجوں میں		بچوں کی تعداد	مدت (سال)	عمر	مدرسوں میں فیصدی
فرانس	۱۹۳۳	۴،۵۵۳،۳۵۱			۷	۱۱۵،۵۳۷	۴	۱۳-۶	۹۵
جرمنی	۱۹۳۲	۷،۶۷۰،۲۱۹	۴	۲،۸۸۷،۸۵۴	۴	۲۲۹،۶۶۱	۶	۱۴-۶	۹۹
جمہوریہ چیکوسلواکیہ	۱۹۳۴	۱،۶۵۲،۸۹۴	۴	—	—	۳،۳۶۸،۰۰۰	۳	۱۲-۸	۹۸
انگلستان	۱۹۳۴	۴،۶۵۱،۸۹۷	۵	۸۱۴،۹۲۸		—	—	۱۴-۵	۹۹

ابتدائی تعلیم کے بعد بچوں کے لیے چار مختلف راستے ہیں (۱) درجۂ اعلیٰ ابتدائی۔ ان مدارس کی خواندگی تین سال ہے۔ اس درجے میں تین مختلف قسم کے مدارس شامل ہیں۔ حرفتی، تجارتی اور عام۔ آخری قسم کے مدرسے تربیتِ معلمی کیلیے ہیں۔ (۲) خواندگی مسلسل یا مزید (Contimuation) ابتدائی درجے کے مدرسوں میں ایک یا دو سال کی مزید خواندگی کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے، جہاں اگرچہ تعلیم بالکل صنعتی نہیں، لیکن پھر بھی عملی کام پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ (۳) ایسے حرفتی یا تجارتی مدرسے جو رات کو کھلتے ہیں اور جہاں ابتدائی مدرسوں کے تعلیم یافتہ ملازم داخل ہو سکتے ہیں دیہاتوں میں انھیں اشخاص کے فائدے کے لیے زراعتی مدرسے قائم کیے گئے ہیں۔ (۴) مدارس بالغاں (Adult)۔

خواندگیِ مسلسل۔ ۱۸۸۶ء کے قانون کے مطابق اس درجے کے لیے نظام تعلیم میں کوئی خاص یا اہم جگہ نہ تھی اور عام ابتدائی مدارس کے ساتھ ملحق تھا۔ ۱۹۱۹ء تک اس کی حیثیت اختیاری اور مدت ایک سال تھی۔ اس کا نصاب محض ابتدائی تعلیم کے اعلیٰ درجے کے مضامین کے دُہرانے پر مشتمل تھا اور بعض حالات میں اعلیٰ ابتدائی تعلیم کے پہلے سال کی خواندگی کے نصاب سے ماخوذ تھا، لیکن ۱۸ اگست ۱۹۲۰ء میں اس کی اصلاح کی گئی۔ اس وقت اس کی مدت دو سال ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بچے ابتدائی مدرسوں میں رہ کر ہی کچھ مختصر سی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرلیں اور نصاب تقریباً وہی ہے، جو اعلیٰ ابتدائی مدارس کے پہلے دو سال کا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ علاقے کے عام کاروبار کے مطابق نصاب مقرر کیا جائے تاکہ ابتدائی تعلیم ایک عملی اور حقیقی رنگ اختیار کر سکے۔ جنگِ عظیم کے بعد اس درجۂ تعلیم کی اہمیت کا زیادہ احساس ہوا۔ عام طور پر اس درجے کے لیے صرف ایک اُستاد ہوتا ہے، لیکن بعض حالات میں دو اُستاد بھی مقرر کیے گئے ہیں، ایک عام ادبی مضامین کے لیے اور دوسرا سائنس کے لیے۔ یہ انتظام بہت تسلی بخش

ثابت ہوا ہے اور جہاں ایسی خواندگی کا انتظام ہے، وہاں اعلیٰ ابتدائی مدارس کی تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ خواندگی بچوں کو ابتدائی امتحان کے لیے تیار کرتی ہے، جس میں بیٹھنے کے لیے کم ازکم پندرہ برس کی عمر مقرر کی گئی ہے۔

اعلیٰ ابتدائی تعلیم۔ ان مدارس کی مدّت خواندگی ۳ سے ۵ سال تک ہے۔ ان میں لڑکے عام طور پر تیرہ برس کی عمر میں داخل ہوتے ہیں اور داخل ہونے کے لیے اوّل تو ابتدائی سند کی ضرورت ہے اور اس کے بعد مقابلے کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مدارس میں تعلیم کا معیار کافی بلند ہے اور لڑکے بڑے شوق سے کام کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نصاب اور جماعت کا کام زیادہ احتیاط سے مقرر کیا جاتا ہے اور اُستاد صرف وہی مضامین پڑھاتے ہیں، جن میں وہ تربیت خصوصی کی سند حاصل کر چکے ہوں۔

یہ مذکورۂ بالا مدارس ابتدائی تعلیم کا حصہ نہیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک علیحدہ ادارے کی ہے، جو ایک مختلف ڈائرکٹر کے ماتحت ہے، لیکن بعض حالات میں یہ مدارس، دوسرے مدرسوں کے ساتھ ایک ہی عمارت میں ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۲۰ء میں ایسے مدرسے ابتدائی درجے کے مدارس کے ساتھ تھے۔ ۹ اعلیٰ صنعتی مدرسوں اور ۵۵ کالجوں (یعنی مدارس ثانوی) کے ساتھ۔ صرف ۵۵۲ بالکل علیحدہ تھے۔ نصاب میں فرانسیسی زبان، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، علم اخلاق اور تعلیم شہریت وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ایسے خصوصی مضامین بھی ہیں، جو بچوں کو مختلف کاروبار کے قابل بنا سکیں۔

ایسے مدارس کا قیام زیادہ طور پر مقامی محنت کا نتیجہ ہے، لیکن حکومت اساتذہ کی تنخواہ کا کچھ حصہ اپنے خزانے سے بھی دیتی ہے اور مقامی بلدیہ عمارت اور اُس کے ساز و سامان اور دیگر اخراجات کا ذمے دار ہے۔ ۱۹۲۰ء سے پہلے یہ اصول تھا کہ ہر اعلیٰ ابتدائی مدرسے میں کم ازکم ایک

کتب خانہ، ایک معمل، ایک جمنیزیم ضرور ہونے چاہییں، لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون نے ان تمام ضروریات کی فہرست میں کھیل کے میدان کا اضافہ کر دیا۔ اسی قانون نے یہ بھی اجازت دی کہ خاص مضامین کے لیے علٰحدہ استاد مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ اسی سال صنعتی مضامین (مثلاً زراعت وغیرہ) کو نصاب میں شامل کر دیا اور لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری کا مضمون زائد ہوا۔

ان مدارس کا ہفتہ وار پروگرام ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

علم اخلاق، آئین شہریت، قانون تجارت اور سیاسی معاشیات	۱ گھنٹہ فی ہفتہ
فرانسیسی زبان	۴ " "
تاریخ جغرافیہ	۲ " "
السنۂ مروجہ	۴ " "
حساب	۳ " "
علم کیمیا، طبیعیات، علم طبعی اور حفظانِ صحت	۳ " "
گانا	۲ " "
جسمانی ورزش	۲ " "
عملی کام (لڑکوں کے لیے)	۴ " "
عملی کام (لڑکیوں کے لیے)	۲ " "

پہلے سال میں ایک گھنٹہ فی ہفتہ لکھائی کے لیے اور تین گھنٹے ٹائپ اور اختصار نویسی کی مشق کے لیے وقف ہیں، لیکن یہ دونوں مضمون اختیاری ہیں۔ لڑکیوں کے لیے دوسرے اور تیسرے سال میں ایک گھنٹہ فی ہفتہ امور خانہ داری کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس حساب سے ہر طالب علم ہفتے میں ۲۸ سے ۳۶ گھنٹے تک کام میں مصروف رہتا ہے۔ ان مندرجۂ بالا مضامین کے علاوہ کئی ایک صنعتی اور حرفتی مضامین بھی ہیں، جو خاص شعبہ جات میں پڑھائے جاتے ہیں مثلاً

صنعتی کیمیا و صنعتی کیمیائے برق، زراعت، زراعتی کیمیا، طریقہ ہائے تجارت۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، بعد ابتدائی (Post-primary.) درجہ تعلیم کی موجود اصلاح پذیر حالت سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون کا نتیجہ تھی اور اس جگہ ان تحریکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جن کی بنا پر یہ تمام اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ ان مدارس کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ یونیورسٹی تعلیم حاصل کیے ہوئے اساتذہ کی زیرِ نگرانی ایسے لڑکے پیدا کیے جائیں، جو ملک کی صنعتی اور انتظامی زندگی میں کامیابی کے ساتھ داخل ہو کر قوم کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں۔ اگر خواندگیِ مسلسل سے ہمیں سمجھ دار کاریگر مہیا ہو سکیں گے، تو ان مدارس (اعلیٰ ابتدائی) سے ہمیں لائق اوورسیروں اور فورمینوں کی توقع ہے۔ جب خواندگیِ مسلسل بچّوں کو مدارس معلمی کے داخلے کے قابل بنا دیتی ہے، تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے، لیکن ان مدارس کا حلقۂ اثر بہت وسیع اور تعلیمی معیار کافی بلند ہے۔ اس میں طلبہ مشکل ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر سے تجاوز کرتے ہیں، لیکن اعلیٰ مدارس میں طالب علم عام طور پر ۱۸ برس کی عمر تک رہتے ہیں اور خاص حالات میں اس سے بھی زیادہ۔ خواندگیِ مسلسل کم از کم اعلیٰ تعلیم مہیا کرتی ہے اور مدرسۂ اعلیٰ اس تعلیم کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے قانون کے مطابق ان طالب علموں کے لیے جو بعد میں مدارس معلمی (ادنیٰ) میں داخل ہونا چاہتے ہوں، خواندگیِ مسلسل اور درجۂ ابتدائی اعلیٰ دونوں میں معلمی شعبہ جات کھول دیے گئے ہیں اور ان میں کشش پیدا کرنے کے لیے ۵ لاکھ کی مالیت سے بہت سے وظیفے غریبوں کے لیے وقف ہیں۔

یہاں ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ درجۂ معلمی (ادنیٰ) کے مدارس کی تعلیم ختم کرنے کے بعد طالب علم اگر ایک طرف ابتدائی مدارس کے معلم بن سکتے ہیں، تو دوسری طرف اس سند کی بنا پر عام دفتری ملازمت بھی اختیار کر سکتے ہیں یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

تبصرہ

مفتی عزیزالرحمٰن صاحب، بی اے، پی ای ایس کی ادارت میں گورنمنٹ مردانہ ٹریننگ اسکول پشاور سے "مشعل" ایک تعلیمی رسالہ نکل رہا ہے، جو فی الحقیقت صوبہ سرحد میں مشعلِ راہِ علم ہے اور زبان وقوم کی زرین خدمات انجام دے رہا ہے۔ مجلّہ مذکور کا معیار اپنی ابتدائی حالت ہی میں خاصہ بلند ہے اور نہایت کارآمد ٹھوس مضامین شائع کر رہا ہے، مگر نظمیں اس قدر پست ہیں کہ ہم یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ اس ترقی یافتہ برقی دور میں ان نظموں نے مشعل کو وہی پرانے زمانے کی محفل کو دھویں سے تیرہ و تار کر دینے والی مشعل بنا دیا ہے۔

ہم مفتی صاحب کو اُن کے اس شاندار کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ اس مشعل کو ضیاء بے دود کا حامل بنائینگے اور طباعت بالخصوص پروف ریڈری اور زبان کی طرف بیش از بیش توجہ فرمائیں گے۔

(ادارہ)

کے اعداد و شمار ہمارے سامنے ہیں، لیکن اِن کا مطالعہ سخت مایوس کن ہے۔ صرف صوبۂ مدراس مستثنٰی ہے، جہاں لڑکیوں کی تعلیم پر ۲۴ لاکھ روپیہ زیادہ خرچ کیا گیا ہے اور پانچ سال کے عرصے میں لڑکیوں کی درسگاہوں میں دو ہزار کا اضافہ ہو گیا ہے، لیکن اِن اعداد و شمار کی قدر و قیمت بھی کچھ کم ہو جاتی ہے جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ مدراس میں ۲۴ لاکھ سے ڈھائی گنا زیادہ روپیہ لڑکوں کی تعلیم کے زائد مصارف پر خرچ کیا گیا۔ گزشتہ سال ۳۵-۱۹۳۴ء میں مدراس نے ہندوستان کے سامنے وہ مثال پیش کردی ہے جس کی عرصے سے ضرورت تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم کے مصارف میں زیادتی کردی گئی ہے اگرچہ لڑکوں کے مصارف میں بدقسمتی سے کمی واقع ہو گئی ہے۔

لیکن دوسرے صوبوں کی کیا حالت ہے؟ اِن پانچ سال ۳۲-۱۹۲۷ء کے دوران میں صرف پنجاب نے ۹ لاکھ روپیہ زائد لڑکیوں کی تعلیم پر صرف کیا ہے، لیکن زائد مصارف میں اِس سے تین سو تیرہ گنا زیادہ لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں کے حصے میں آیا۔ ۱۹۳۲ء کے بعد کی ایک مثال بھی پیش کرتی ہوں: ۳۴-۱۹۳۳ء میں صوبجات متوسط کے میزانیے میں باضابطہ لڑکوں کی تعلیم کے مصارف لڑکیوں کی نسبت دس گُنے دکھائے گئے تھے۔ نیز لڑکوں کی درسگاہوں کے لیے مزید ایک لاکھ پچانوے ہزار روپے کی منظوری دی گئی اور اس کے مقابلے میں لڑکیوں کے لیے پندرہ ہزار روپے کا شاہانہ عطیہ منظور ہوا۔

صرف یہی نہیں، بلکہ مالی بدحالی کے دور میں اِس قلیل رقم میں بھی، جو لڑکیوں کے لیے منظور ہوتی ہے تخفیف کردی جاتی ہے، کیونکہ حکومت میں اُن کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں اگرچہ لڑکیوں کی تعلیم کے مصارف میں تیرہ لاکھ کی تخفیف عمل میں لائی گئی، لیکن اسکولوں میں طالبات کی تعداد میں ایک لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔

یہ صورتِ حالات، جیسا کہ ایجوکیشنل کمشنر خود اعتراف کرتے ہیں نازک ہے۔ روپے کے

جرمنی کا نظامِ تعلیم

از

میرزا فیاض الدین ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

یورپ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران میں تعلیم کا زیادہ رواج نہیں تھا، لیکن کم و بیش اس دو سو سال کے عرصے میں جرمنی میں درس و تدریس کا سلسلہ شدت سے جاری رہا۔ تعلیمی ترقی کے اعتبار سے اس ملک کی حالت ایک عرصے سے یورپ کے باقی ملکوں کی بہ نسبت بہت بلند چلی آرہی ہے۔ قطع نظر تعلیم کی نشر و اشاعت کے جرمنی کا نظامِ تعلیم بھی بہت اعلیٰ درجے کا تھا، جس کی تعریف غیر ممالک کے کئی ماہرینِ تعلیم نے وقتاً فوقتاً کی ہے۔ تعلیم کے مختلف شعبے نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظم کیے گئے، جن میں سے ہر ایک بذاتِ خود کامل تھا۔ ۶ برس کی عمر سے ۱۷ برس کی عمر تک تعلیم ہر ایک کے لیے جبری تھی۔ ملک میں مختلف قسم کے ادارے تھے، جن میں علمی، تجارتی، صنعتی اور حرفتی ادارے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تعلیمِ نسواں کے لیے بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ ملک میں اُن اداروں کی تعداد جو لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے، کافی تھی۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ٹریننگ اسکول اور ٹریننگ کالج مہیا کیے گئے تھے اور اساتذہ کو اِن اداروں سے سند حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا۔ غرضکہ اس ملک میں ہر قسم کی تعلیم اور ہر نوع کے کسب کے لیے ادارے موجود تھے اور ہر شخص کے لیے خواہ وہ امیر ہو یا غریب اور خواہ اُسے کسی علمی مشغلے کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا ہوتا یا تجارتی و حرفتی کو۔ بہرحال اُسے کسی نہ کسی ادارے سے فارغ التحصیل ہونا ضروری ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے فرائض زیادہ اچھی طرح سرانجام دے سکے۔

اُن اسباب کی کمی بیشی سے جو کمی بیشی نتائج میں پیدا ہو، اس کا دیکھنا اور مطالعہ کرنا تجربہ کہلاتا ہے اور یہ وہ طریق تحقیق ہے، جو سائنس کی جان اور اس کے امتیاز کی اصل وجہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ نفسیات میں تجربے سے کسی نتیجے پر پہنچنا ایک محال امر نظر آتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ تجربے کے امکان ایسے کھلے کہ اب نفسیات کے بہت کم مسائل ایسے ہیں، جن کی تحقیق تجربے سے نہیں ہو سکتی۔ شروع میں قوائے حسّی کی تحقیق تجربے سے ہونے لگی۔ اس کے بعد حافظے اور قوتِ تخیل کی۔ پھر ذہنی افعال کی رفتار کی طرف توجہ ہوئی اور اب انسان کی سوشل زندگی پر بھی آہستہ آہستہ تجربہ حاوی ہو رہا ہے۔

دوسری شاخ نفسیات کی موجودہ ترقی کی یہ ہے کہ اس میں روز بروز زیادہ تنوع ہو رہا ہے۔ یہ بھی علامت ہے، اس بات کی کہ نفسیات دقیانوسی طریقہائے تحقیق سے نکل کر تقسیمِ عمل اور تنظیم سے کام لے رہا ہے۔ جب کوئی علم ابتدائی منزل میں ہوتا ہے، تو اُس میں کوئی تنوع نظر نہیں آتا، دو تین شاخیں ہوتی ہیں۔ یہی دو تین شاخیں اس علم کا سارا سرمایہ ہوتی ہیں اور اُنھیں پر ہر اُستاد اور ہر متعلم کو حاوی ہونا پڑتا ہے، لیکن جوں جوں اس میں ترقی ہوتی ہے، اس کی شاخیں زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ آج نفسیات کی کئی شاخیں ہیں اور ہر شاخ اپنے مخصوص مقاصد، اپنے مخصوص مساعی اور اپنے مخصوص طریقہائے تحقیق سے ممتاز ہے۔ نفسیاتِ تجربی کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ نفسیات حیوانی، نفسیات طفلی، نفسیات تعلیم، جس میں ذہانت اور طبیعت کی تشخیص پر خاص زور دیا جاتا ہے، سوسائٹی کا نفسیات اور کلچر کے نفسیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پس نفسیات جدید کا شاندار تنوع اور تقسیمِ عمل کا وہ منظر، جو اس میں ہمیں نظر آتا ہے، اس کی ترقی پذیر حالت کی دلیل ہے۔

تیسری شاخ نفسیاتِ جدید کی ترقی کی اس کی عملیت ہے۔ کوئی علم اپنا اثر اور اپنا رعب عام لوگوں پر بٹھا نہیں سکتا، جب تک وُہ اپنا مفید ہونا انسان کے روزمرہ کے کاروبار میں منفعت پیدا کر کے ثابت نہ کر دے، نفسیات جدید کو ترقی کا یہ پہلو بھی حاصل ہے۔ چنانچہ فی زمانہ

۴۔ مدرسہ کے امتحانات کے نتائج کو دیکھنا بھالنا۔

۵۔ طلبہ کے اسباق کو سن کر مدرس کے کام کا اندازہ کرنا۔

پرائمری اور ثانوی مدارس کے امتحانات کا تفاوت

یہاں ضمناً پرائمری اور ثانوی درجوں کے امتحانات کے فرق کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق اسکول کے آخری امتحان مثلاً میٹرک کے ساتھ ہے۔ مدرسہ کا آخری امتحان درجہ ثانوی کے ساتھ وابستہ ہے جو انگلستان میں ۱۶ سال کی عمر پر پہنچ کر لیا جاتا ہے۔ انگلستان میں اسکول کا اعلیٰ سرٹیفکیٹ کا امتحان بھی اسی قسم کا امتحان سمجھا جاتا ہے۔ ان آخری امتحانات کے امیدوار فرداً فرداً نہیں بلکہ مجموعی طور پر امتحان میں شامل ہوتے ہیں۔ انگلستان میں ایسے امتحان کی نگرانی، ثانوی مدارس کے امتحانات کی کمیٹی سے متعلق ہے۔ جسے تعلیمی بورڈ مقرر کرتا ہے۔ اس کمیٹی میں ایسے ارکان شامل کیے جاتے ہیں۔ جو مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ثانوی مدارس کے اساتذہ کی انجمن اور مقامی افسران تعلیم کی انجمن کے رکن ہوتے ہیں۔ امتحانات کی کمیٹی کا تمام کام ایک جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ جس کے پیش نظر ذیل کے دو اہم مقصد ہوتے ہیں:-

۱۔ یونیورسٹی امتحانات کی کثرت کا سدباب کیا جائے۔

۲۔ مختلف امتحانات کے انعقاد میں ایک تسلی بخش معیار کو قائم رکھا جائے۔ جیسے کرسٹی کالج لندن اسکول اور مرکزی ویلش کے امتحانات ہوتے ہیں جن کے نتائج پر سندیں دی جاتی ہیں۔

انسپکٹر اور مدرس کے تعلقات

[illegible] تک انگلستان میں انسپکٹر کی تعیناتی بادشاہ وقت اور کونسل کی جانب سے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت تک ایچ ایم آئی کا خطاب اعزازی نہیں تھا۔ بلکہ بذات خود عہدہ تھا۔ جیسے ہمارے ہاں آئی اے ایس یا پی ای ایس ہوتے ہیں۔ مدرس کے حلقہ اثر سے باہر انسپکٹر

اُٹھنے لگتی ہیں اور اُن کی جگہ خالی ہو جاتی ہے۔ یہ خالی جگہ اُن ہواؤں کے ذریعے پُر ہوتی ہے، جو سمندر کی سطح سے بخارات لے کر اُٹھتی ہیں اور زندگی پیدا کرنے والی برسات لاتی ہیں۔ اس خطے کا انحصار بیشتر انھیں ہواؤں پر ہوتا ہے۔ مون سون ہواؤں کے خطے کا صحیح اور کامل نمونہ ہندوستان، انڈو چائنا اور جنوبی چین ہیں۔ جاپان، شمالی اور مرکزی چین کا شمار بھی اسی خطے میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی برسات انھیں ہواؤں کی وجہ سے ہوتی ہے، لیکن یہ علاقے کلیۃً منطقہ حارہ سے باہر ہیں۔ یہاں سردی بہت پڑتی ہے، اس لیے یہ مون سون ہواؤں کے خطے سے علیحدہ ہیں۔

ہندوستان میں موسم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ گرما، سرما اور برسات۔ موسم سرما میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ یہ موسم نومبر سے شروع ہوتا ہے اور جنوری میں ختم ہو جاتا ہے۔ موسم گرما میں زمین تانبے کی طرح تپنے لگتی ہے اور بارش نہیں ہوتی۔ یہ موسم جنوری سے شروع ہو کر جون کے وسط تک جاری رہتا ہے۔ موسم برسات بالعموم جون کے وسط سے شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتا ہے۔ شدت برسات سے فضائیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ درجہ حرارت کم ہوتا ہے۔ علاقہ اگر خشک ہو تو فضاؤں میں ٹھنڈ بہت کم ہوتی ہے۔ گرمی اور سردی کے حرارت کے درجوں میں تفاوت بہت ہوتا ہے۔ ایسے علاقے کی مثال پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان ہیں۔ تری والے علاقوں پہ سمندر کا اثر غالب ہوتا ہے۔ حرارت کے درجوں کا تفاوت بھی کم ہوتا ہے۔ بمبئی ایسے علاقے کی نہایت اچھی مثال ہے۔ برسات بعض علاقوں میں زیادہ ہوتی ہے، بعض میں کم۔ جن علاقوں میں یہ مون سون ہوائیں ساحل کے آس پاس پہاڑوں سے ٹکراتی ہیں، وہاں بارش شدت کی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے ہندوستان کے کم دباؤ والے علاقوں میں یہ ہوائیں بہت طویل مسافت طے کر کے پہنچتی ہیں اور مقام مطلب تک پہنچتے پہنچتے خشک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بعض مقامات آپ کو ایسے ملیں گے، جہاں بارش سال بھر میں مشکل سے پانچ انچ ہوتی ہے۔ بارش کے کم و بیش ہونے کی وجہ